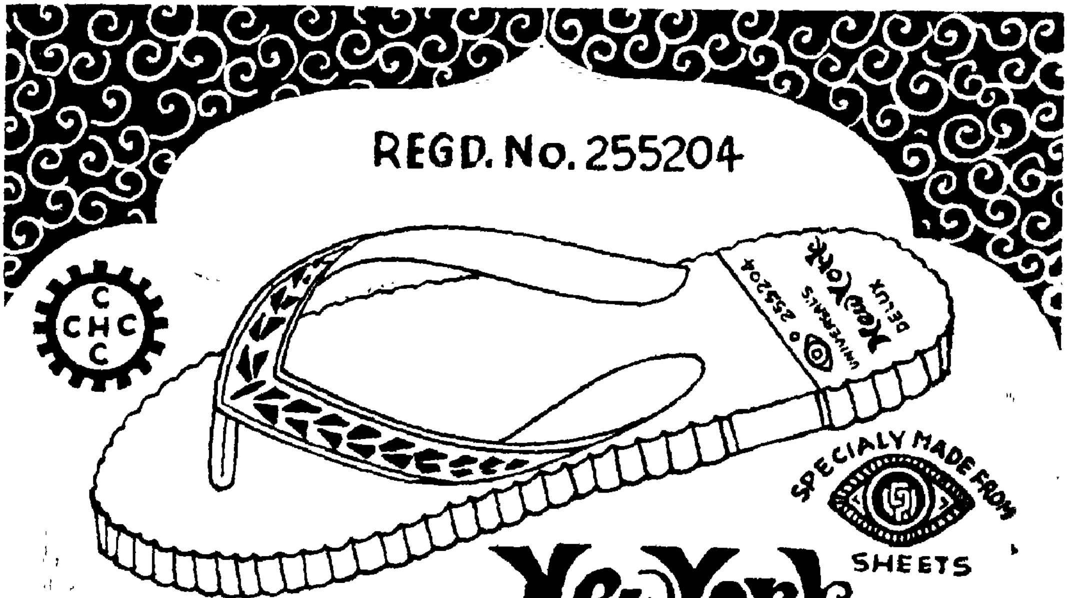
[illegible]

دیکھنے میں خوبصورت، چلنے میں آرام دہ، اور پہننے میں مضبوط

اسکی خاص خوبیاں ھیں جو آپکے بجٹ کو غیر محفوظ ہونیسے بچاتی



NewYork

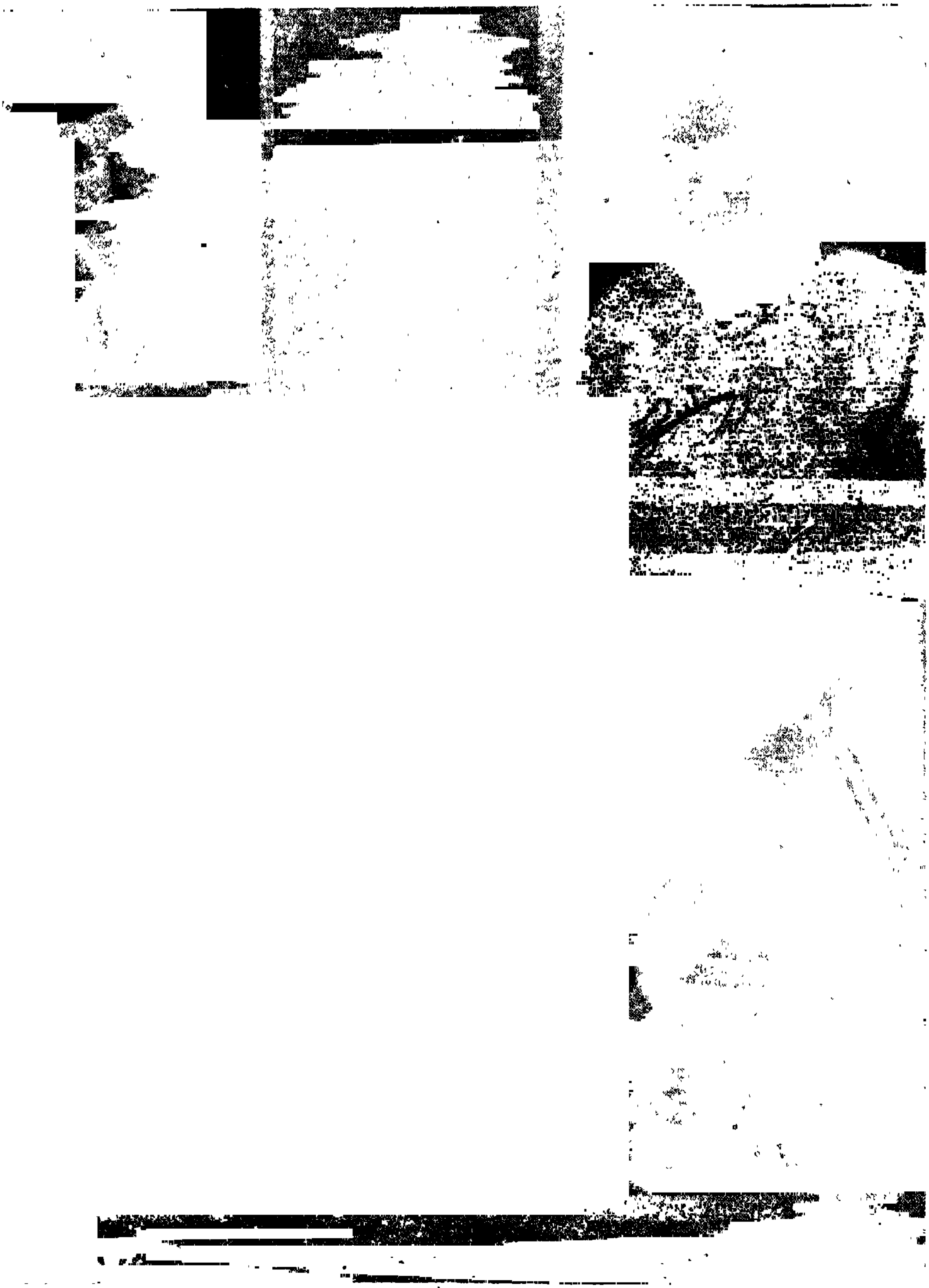
AND ALSO

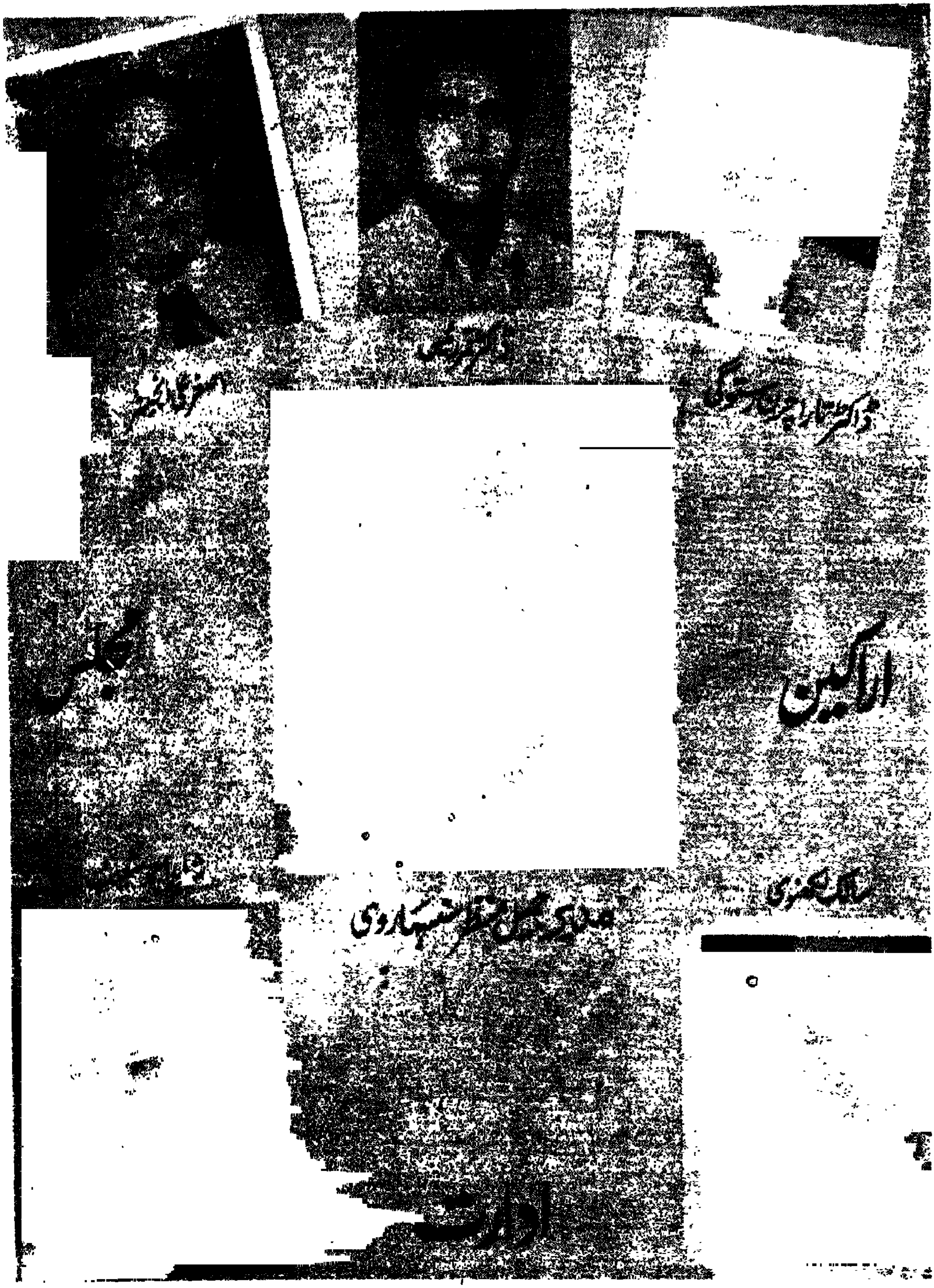
GET THE LATEST FULLY FASHIONED

X 3 X Cushion | Evafilex EXTRA THICKNESS Cushion

CALCUTTA HAWAI CENTRE.

CALCUTTA-700039.




مجلس
اراکین
ادارت

ہم یہ شمارہ

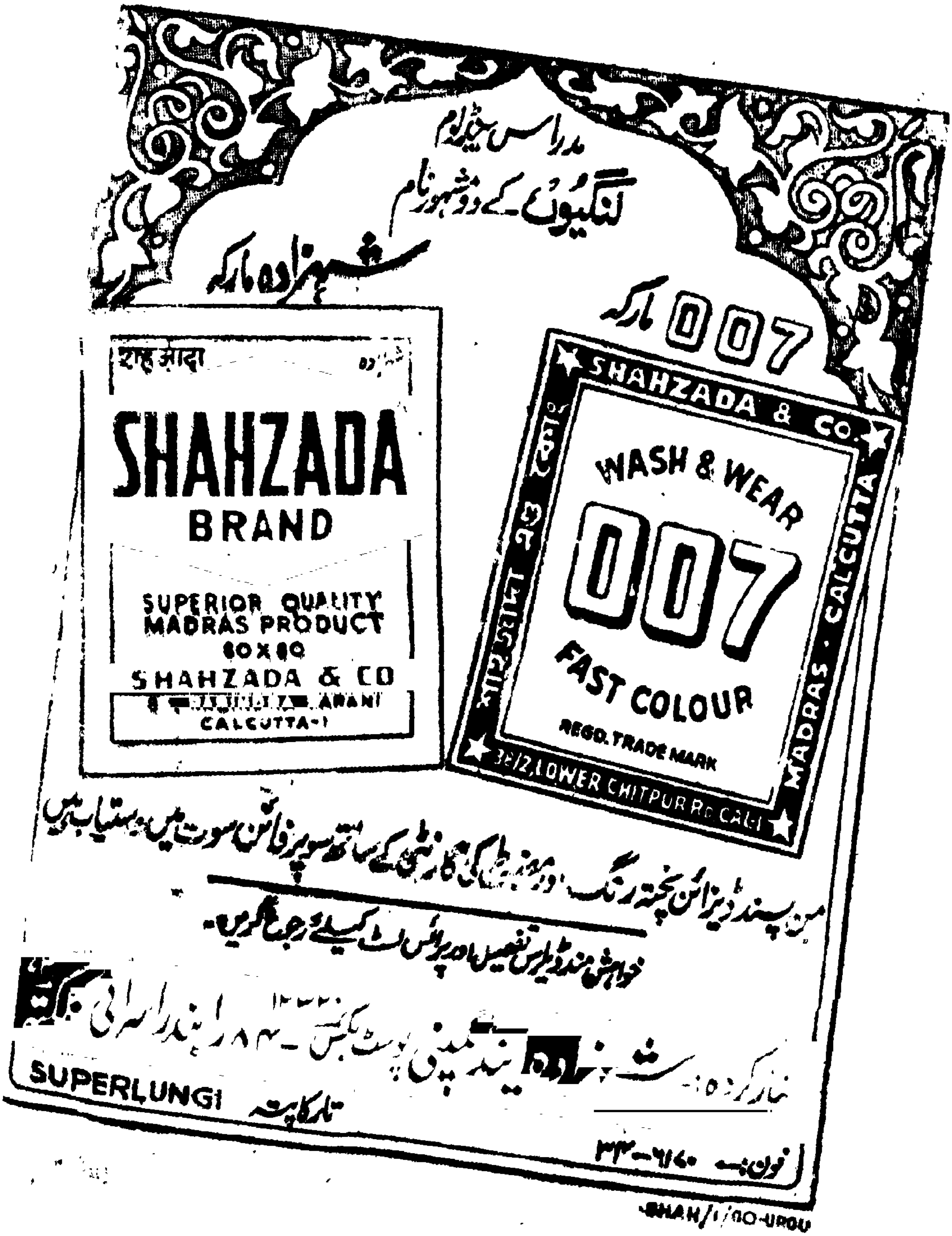
شکیل الرحمٰن

کے نام

انتساب کرتے ہیں

بغض و نفرت کی ہر اک سمت گھٹا ہو پھر بھی
شمع ہر گام پہ الفت کی جلائے رکھئے
(کمال)

جمیل منظر سنسہاروی



مدراس ہینڈلوم
لنگیوں کے دو مشہور نام
شہزادہ مارکہ
007 مارکہ
SHAHZADA
BRAND
SUPERIOR QUALITY
MADRAS PRODUCT
80 X 80
SHAHZADA & CO
CALCUTTA-1
SHAHZADA & CO.
WASH & WEAR
007
FAST COLOUR
REGD. TRADE MARK
MADRAS · CALCUTTA
32/2, LOWER CHITPUR Rd. CAL-1
من پسند ڈیزائن پختہ رنگ، ورمضبوطی کی گارنٹی کے ساتھ سوپر فائن سوت میں دستیاب ہیں
خواہش مند ڈیلرس تفصیل اور پرائس لسٹ کیلئے رجوع کریں۔
SUPERLUNGI
تار کا پتہ
فون نمبر ۳۳-۶۱۶۰
SHAH/1/80-URDU

بانی مولوی حافظ محمد عبدالرحمن بسمل سنہاروی ؒ

یادگار مولوی محمد زین العابدین احمر سنہاروی ؒ

ماہنامہ سہیل گیا

خصوصی پیش کش

فروری، مارچ ۱۹۸۲

سرپرست :- کے ایم آرکیو، کلکتہ

علامہ جمیل مظہری نمبر

مرتب

ادریس سنہاروی

ترقی پسند ادب کا ترجمان

چیف ایڈیٹر ــــ مسعود منظر

مدیر ــــ منظر سنہاروی

معاونین شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی

جلد ۴۳ شمارہ ۲،۳

بدل اشتراک

قیمت فی پرچہ ــــ ۱۵ روپئے

اعزازی ــــ ۲۵۰ روپئے

سالانہ ــــ ۱۵ روپئے

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سہیل ریور سائڈ روڈ، گیا ۸۲۳۰۰۱


سالہاسال سے مقبول عام گھریلو دوا
ہمدتیل
جسمانی درد۔ چوٹ۔ موچ۔ زخم۔ جلنے
کٹنے میں بے حد مفید ہے۔ اس کی
مالش کمزور بچوں کو طاقتور بناتی ہے۔
ایک دو شیشی ضرور گھر میں رہنی چاہئے
ھیکو
ہمدجوشاندہ
بخار نزلہ زکام کے لئے
طب یونانی کی بے حد
مفید دوا ہے۔
ہمدسالٹ
پیٹ کے سب ہی امراض درد شکم مروڑ،
بدہضمی کھٹی ڈکاریں اور پیٹ کی گیس کے لئے
نہایت مفید ہے جگر معدہ کو قوت دیکر ہاضمہ
بڑھاتا ہے۔
سرمہ مقوی نظر
مختلف امراض چشم میں فائدہ مند
ہے۔ اس کا روزانہ استعمال آنکھوں
کو خوبصورت اور نظر کو روشن رکھتا ہے۔
ہمدسی ورکس۔ متوناتھ بھنجن (یو۔پی)

نمود

ادارہ سہیل نے ۱۹۹۱ء میں دو حصوں پر مشتمل "علامہ جمیل مظہری نمبر" شائع کر کے علامہ کو حیات ھی میں خراج عقیدت پیش کرنیکا فخر حاصل کرلیا ھے

ادارہ سہیل نے زندہ شخصیتوں کو خراج عقیدت پیش کرنیکی اس طرح نئی ابتدا کی تھی اس لئے کچھ حضرات نے اسے سراھا بھی اور کچھ نے تنقیدیں بھی کیں لیکن اب یہ طریقہ اتنا عام ھوا کہ اس نے وبائی شکل اختیار کر لی اور ھر چھوٹی بڑی زندہ شخصیتوں پر خاص نمبر نکلنے لگے ھیں

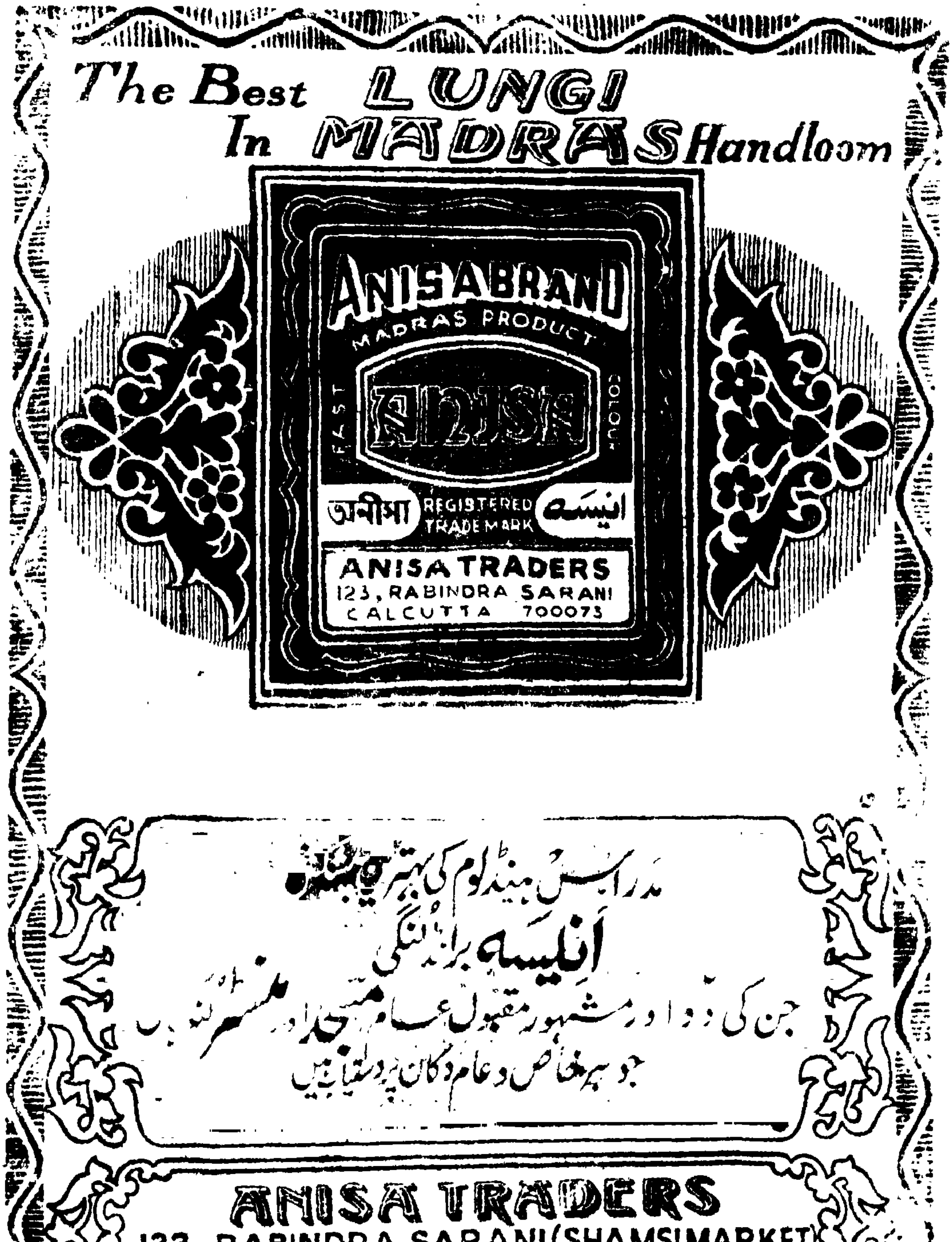
علامہ کے انتقال کے بعد یہ خیال تھا کہ ھندوستان کے دوسرے ادارے اس سلسلے میں اقدامات کریں گے اور علامہ مرحوم پر بہت سے کام ھوں گے لیکن سرکاری ماھنامہ آجکل دہلی اور بہار اردو اکادمی کا زبان و ادب محض گوشہ جمیل ھی تک محدود ھوکر رہ گیا تو ادارہ سہیل نے ھمت سے کام لیکر ایک بار پھر علامہ پر ایک خاص نمبر شائع کرنیکا اعلان کر دیا علامہ مرحوم پر یہ خاص نمبر شائع کرنے میں مجھے کہاں تک کامیابی ھوئی یہ فیصلہ تو قارئین ھی کو کرنا ھے۔ لیکن میں اپنے فنکاروں کے متعلق یہ ضرور کہوں گا کہ انہیں علامہ پر قلم اٹھانے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ علامہ کی کتابیں بازار سے بالکل نایاب تھیں۔ ادارہ سہیل کے پاس صرف ایک کتاب تھی جو بہتوں کو دی گئی یہ سلسلہ مہینوں قائم رہا تب اس نمبر کی تکمیل ھو سکی۔ گرچہ یہ نمبر علامہ کے شایان شان نہیں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جن قلمکاروں نے اس خاص نمبر میں شرکت کی ھے خوب جی لگا کر کی ھے اور بڑے اچھے مواد فراہم کئے ھیں۔

کسی بھی اھم شخصیت پر ایک مخصوص نمبر شائع کرنا آسان کام نہیں۔ یہ تو ھمارے فنکاروں کی مہربانیاں ھیں جو ادارہ کے جوش جنوں کو تقویت پہنچاتی ھیں۔

کچھ بہت اچھے مضامین زیادہ ضخامت ھو جانے کی وجہ کر شامل نہیں ھو سکے کیونکہ مزید تاخیر کا خطرہ تھا اسلئے سہیل کا آئندہ شمارہ بھی ضمیمہ جمیل مظہری نمبر ھی ھوگا۔

آج جب کہ علمی ادبی کاموں کی راہ میں بہت سی دشواریاں [illegible] ھیں ادارہ نے ایک نئی قوت اور تازہ عزم کیساتھ کا شروع کیا ھے اور ھمیں یقین ھے کہ جس طرح پہلے بھی ھم نے مشکلات کا صرف سامنا ھی نہیں کیا بلکہ ان کے درمیان راھیں ڈھونڈ نکالیں ھمیں یقین ھے کہ آپ ھمارے ساتھ تعاون فرمائیں گے اور پچھلے کی طرح ھمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

ادریس سنسہاروی


The Best LUNGI
In MADRAS Handloom
ANISA BRAND
MADRAS PRODUCT
FAST COLOUR
ANISA
অনীসা
REGISTERED TRADE MARK
انیسہ
ANISA TRADERS
123, RABINDRA SARANI
CALCUTTA 700073
مدراس ہینڈلوم کی بہترین پیشکش
انیسہ برانڈ لنگی
جو ہر خاص و عام دکان پر دستیاب ہیں
ANISA TRADERS
123, RABINDRA. SARANI (SHAMSI MARKET)
CALCUTTA - 700073

جمیل مظہری کا نظریۂ حیات

اُن کی مثنوی آب و سراب کے آئینے میں

ڈاکٹر محمد محسن

جمیل مظہری روایتی غزل کے شاعر نہیں تھے۔ وہ ایک فکری شاعر تھے۔ ان کی شعری تخلیقات قاری کو دعوتِ فکر و نظر دیتی ہیں۔ ایک فکری شاعر اپنا ایک خاص نظریہ حیات رکھتا ہے۔ وہ اس عالم کون و فساد کو ایک خاص نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی شاعری اس نظریہ کی فنکارانہ ترجمانی کرتی ہے جس سے اس کی تخلیقات میں ایک ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ قاری اس سے کچھ مثبت نتیجے اخذ کر کے انہیں رد یا قبول کرتا ہے۔ جمیل مظہری کی شعری تخلیقات کے مجموعوں کا بحیثیت ایک فکری شاعر کے مطالعہ کرنے والے کو عام طور سے مایوسی ہوتی ہے۔ ان کے اندر افکار و تخیلات کے حسین و جمیل مرقعے اسے وجد میں ضرور لے آتے ہیں۔ لیکن ان میں کوئی متعین فلسفہ حیات اُسے نظر نہیں آتا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جمیل مظہری تشکیک کے اولین مرحلے ہی میں بھٹکتے رہے ہیں۔ ان کا قدم اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ لیکن جب ہم ان کی مثنوی آب و سراب کا بہ نظر غائر مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے اندر ہمیں ایک مربوط نظریہ حیات کی پیشکش صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس میں بھی ہمیں کہیں کہیں کچھ الجھاؤ سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن وہ ہمیں کھٹکا نہیں دیتے۔ مثنوی میں ابتدا سے انتہا تک جمیل مظہری نے تصورِ حیات کا ایک مربوط و مسلسل خاکہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں ارباب ذوق نے اس مثنوی کو وہ توجہ نہیں دی جس کی یہ مستحق ہے۔

اس مثنوی میں انسان کی ذات، اس کے امکانات اور اس کی کوتاہیاں، اس کائنات سے انسان کا تعلق، انسان کی تخلیق کے پیچھے مشیت ایزدی، آدمی اور خدا کا رشتہ، مذہب اور خدا ترسی، ان ساری حقیقتوں کے سلسلے میں شاعر نے جو نکات پیش کئے ہیں ان کا بہ نظر غائر شاید اب تک جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ بہتوں نے اس مثنوی کے بعض بیانات کو الحاد سے تعبیر کر کے اسے نظر انداز کر دیا ہے لیکن حقیقت میں یہ مثنوی مذہب کی اصلی روح اور عبادت کے صحیح مفہوم کی قرآن حکیم کی تعلیمات اور نفسیاتی حقائق کی روشنی میں ترجمانی کرتی ہے۔ یہ ان خود فریبیوں اور مغالطوں کا پردہ چاک کرتی ہے جو محض رسمی اور ایک حد تک مسخ شدہ مذہبی تصورات و عمل کے پیچھے بروئے کار ہیں۔

مثنوی کا آغاز شاعر اس تشنہ کامی کے بیان سے کرتا ہے جس کا سارا عالم شکار ہے۔ اس تشنگی کو بجھانے کے لئے جن وسائل کا چلن ہو گیا ہے ان کی حیثیت سراب کی ہے۔

آدمی نے اپنی تخلیق کی غرض و غائت کو پس انداز کرکے اُن نہانی طاقتوں پر پردہ ڈال دیا ہے جو کہ اس میں ودیعت کی گئی تھی۔ یہ طاقتیں اپنے اظہار کے لئے مضطرب ہیں اور بار اُسے اظہار نہ پاکر ایک مستقل تشنگی کی صورت میں اپنا وجود قائم رکھے ہوئے رہیں۔ شاعر اس مثنوی میں تخلیق کے راز سربستہ کی عقدہ کشائی کرکے اس الجھن کا حقیقی علاج پیش کرتا ہے۔ باری تعالیٰ نے جب آدمی کا ہیولیٰ تیار کیا تو اس میں اپنی روح پھونکی۔ ؎ قال ربک للملائکۃ انی خالق بشراً من طین۔ فاذا سویتہٗ و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ سٰجدین۔ یعنی اپنے اوصاف کامل کی جلوہ گری کے امکانات سے اُسے نوازا۔

پانی میں بھگو کے آگ کی روح
مٹی میں سمو کے آگ کی روح
اک پیکر معتدل بنایا
تم چونک اٹھے جو دل بنایا
چونکا کے الوہیت عطا کی
رحمانی کی ہر صفت عطا کی

باری تعالیٰ کے منجملہ اوصاف میں اس کائنات کی تخلیق و وجود میں جس وصف کے کرشمے سب سے زیادہ عریاں ہیں وہ اس کا اختیار کلی ہے۔ اس کا ارادہ اٹل ہے۔ وہ ہر ممکن کو ناممکن اور ناممکن کو ممکن بنانے پر قادر ہے۔ وہ جو چاہتا ہے اک آن میں ہو جاتا ہے کن فیکون۔ خدائے لایزال نے اپنی ساری مخلوقات میں صرف انسان کو اپنے وصف سے مزین کیا ہے۔ اُسے اختیار کی صلاحیت عطا کی ہے۔

مقصود یہ تھا بہ فضل باری
آجائے تمہیں خود اختیاری
ظلمت سے نہ نور سے ڈرو تم
اپنی مرضی سے کچھ کرو تم

پیدا ہو شعور میں ارادہ
تو شوق بنائے اپنا جادہ

آدم کی تخلیق کے بعد باری تعالیٰ نے خلد میں انہیں آزادی ارادہ و عمل کی صلاحیت کو بروئے کار لانے کی تربیت کی۔

ہوتی رہی تربیت تمہاری
منظور تھی منزلت تمہاری
جنت ہوا مدرسہ تمہارا
دیتا تھا خدا سبق تمہارا

جب یہ تربیت مکمل ہوگئی تو اُس کی آزمائش آدم کو شجر ممنوعہ کے قریب جانے سے روک کر کی گئی۔

پوری ہوئی جب کہ یہ پڑھائی
منزل تب امتحاں کی آئی
سکھلا کے تمیز خیر و شر کی
شاخوں کو دکھا کے اک شجر کی
فرمان ہوا کہ تم ہو دانا
دیکھو آدم ادھر نہ جانا

اس مقام پر شاعر نے ایک ایسا نکتہ پیش کیا ہے جس نے آدم کے خلد سے نکالے جانے کی داستان میں ایک رنگ پیدا کر دیا ہے۔ گو اقبال نے بھی اپنے اس شعر میں
باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں۔ کار جہاں دراز ہے۔ اب میرا انتظار کر۔ اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مشیت ایزدی کا تقاضا یہ نہ تھا کہ آدم ارشاد ایزدی کی بجا آوری کرکے خلد میں اپنا مسکن بنائے رکھیں۔ بلکہ اس کی خلاف ورزی کرکے اپنی خود اختیاری کا ثبوت پیش کریں۔

دل پر یہ ممانعت تھی بھاری
بے چین ہوئی خودی تمہاری

بے ساختہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا
تخلیق کا حوصلہ نکالا

آدم اپنے اختیار کا استعمال کرکے امتحان میں پورے اترے تو خدا نے انہیں اپنے خلیفہ کے منصب سے سرفراز کرکے اس عالم وجود کی حکمرانی اُن کے سپرد کی۔ ارشاد تعالیٰ
ربک للملٰئکۃ انی جاعلٌ فی الارض خلیفہ

یہ بات نہ تھی خدا کو منظور
مختار کا جانشیں ہو مجبور

مجبوری جماد کی صفت ہے
مجبوری دلیل قدسیت ہے

مجبوری ہے فرض کی وہ زنجیر
وابستہ ہے جس سے بزم تقدیر

جس کے حلقے میں جابرانہ
جکڑا ہے یہ سارا کارخانہ

اس پر جو بنایا جائے حاکم
قدرت اس کے لئے ہے لازم

آدم جنت سے بے آبرو ہوکر نہیں نکلے بلکہ ساری مخلوقات پر فضیلت کا سہرا باندھ کر سوئے زمین روانہ کئے گئے۔

باجاہ و جلال شہریاری شہزادۂ خلد کی سواری
اس محشر آب و گل میں پہونچی

یہ مرتبہ آدم کو اس آزمائش میں کامیاب ہونے پر بخشا گیا جس کے لئے انہیں جنت میں تربیت دی گئی تھی

انعام گناہ بے گناہی رکھا گیا سر پہ تاج شاہی
سمجھائے رموز راہ بینی پہنا کے قبائے جانشینی
بھیجا گیا تم کو اس جہاں میں
آنے لگا رنگ داستاں میں

شاعر کہتا ہے کہ اس نکتے کو وہ خود بھی پہلے نہ سمجھ پایا تھا

حیران ہیں فرشتگان درگاہ
میں سوچ رہا ہوں یہ سر راہ

یہ کیا کہ گناہ اور بغاوت
ہو وجہ بزرگی و فضیلت

آدمی اپنے اختیار اور قوت دماغی کا استعمال کرکے اس عالم کو جنت ارضی بنانے میں مشغول ہوگیا۔

چونکا جو شعور حکمرانی
کی فرض نے روح پر گرانی

ہر آرزو بن گئی ارادہ
وجدان عمل ہوا زیادہ

ہموار کیا زمیں کا سینہ
مٹی نے اگل دیا دفینہ

کہسار رفیع کو بھی ناپا
صحرائے وسیع کو بھی ناپا

سینوں کو پہاڑ کے کیا چاک
سیلاب کے منہ میں جھونک دی خاک

ویرانے میں باغ لہلہائے
ظلمت پہ چراغ مسکرائے

آدمی نے جب اس کرۂ خاک کی تقدیر بدلنے کے لئے خود اختیاری مہم شروع کردی تو اس خلفشار سے مادہ لرزہ براندام ہوگیا اور مادے کی ساری کائنات بغاوت پر کمربستہ ہوگئی۔ آدمی کے مادی عناصر اس سازش میں شریک ہوگئے اور آدمی کو مصالحت پر مجبور ہونا پڑا۔ اس وقت سے اُس کی خود اختیاری پر روک لگ گئی۔

غلبہ کیا تم پر مادے نے
گھبرا کے تمہارے حوصلے نے

چھوڑا دیا سر کو صلح کرلی
مجبوری کی لعنت اپنے سر لی

نتیجہ یہ ہوا کہ آدمی کی الوہیت، اس کی خود مختاری، اس کا جذبۂ شوق اس کے سینے میں ایک تشنگیِ دوام کی صورت مچلتا رہا۔ اسے یارائے اظہار نہ مل سکا۔

یہ ہار تھی جیت مادے کی
فطرت کے عمومی ہتھکنڈے کی

اس نے تمہیں حرصِ خام دے دی
اک تشنگیِ دوام دے دی

کیا یاد نہیں ہیں وہ زمانے
بھیجا تھا یہاں تمہیں خدا نے

تقدیر کا حکمراں بنا کر
فطرت کا نگہباں بنا کر

اور ہو گئے اس کے مبتلا تم
فطرت کے غلام با وفا تم

فطرت سے آمادہ پیکار ہونے کے بجائے آدمی نے فطرت سے ساز باز شروع کر دی۔ اپنی قوت ایجاد و عمل کو حرص و ہوا کا پابند کر دیا۔ پانی کے لئے جدوجہد کرنے کے بجائے اپنی تشنگی کو پیش نظر سراب سے فریب تسکین دینے لگا۔

جو دل تھا الوہیت کا ڈیرا
آ کر اسے خواہشوں نے گھیرا

اے وائے غرورِ خالقیت
سارا وہ شعورِ خالقیت

ہونے لگا حرفِ رنگ د بو پر
صدقے ہوئی عقلِ آرزو پر

جوں جوں ہوئی سخت یہ غلامی
بڑھتی گئی دل کی تشنہ کامی

آدمی اپنی خواہشوں کا غلام ہو کر اپنی حاجت روائی اور اپنی عافیت کوشی کی فکر میں سرگرداں ہو گیا۔ وہ اپنے بے نیازانہ فرض جہانبانی سے غافل ہو گیا۔

تمہاری ہر ضرورت
جذبات کی ماری ہر ضرورت
گڑھنے لگی ہر زمان و ہر آن
اپنے لئے عافیت کے سامان
لیکن جو تھا حق حکمرانی
کہتے ہیں جسے نگاہبانی

وہ فرض ادا ہوا نہ تم سے
آسودہ خدا ہوا نہ تم سے

تم میں اس کی صفت نہ آئی
وہ شانِ ربوبیت نہ آئی

اللہ رب العزت نے اس کائنات کے اندر خامیاں رکھی تھیں۔ یہ نقائص سے آلودہ تھی تاکہ اس کا جانشین جسے اس نے اس کائنات پر حکمرانی کے لئے خلد سے روانہ کیا تھا ان خامیوں کو دور کرے۔ خیر و شر کی تمیز اور اپنے آزادیٔ عمل و اختیار کی صلاحیتوں کا استعمال کر کے اسے خوب سے خوب تر بنائے۔

یہ خامیاں کم ہوں یا زیادہ
رکھی تھی خدا نے بالا رادہ

ہو نقص جہاں جہاں خبر لو
اصلاح تم ان کی آپ کر لو

لیکن جب آدمی حرص و ہوس کا شکار ہو کر دوسروں کی حاجت روائی کی جگہ اپنی حاجت بر آری کی فکر میں لگ گیا تو چاروں طرف نفرت اور دشمنی، جنگ و جدال کا بازار گرم ہو گیا۔ دشمنوں کی سرکوبی کے لئے طاقت کا رواج عام ہو گیا۔ طاقت کے بل پر شخصی حکومتیں قائم ہوئیں۔ عدل و انصاف کا پرچم بلند کیا گیا۔
لیکن

گرچہ تھا اہلِ عدل بادشاہی
تو ہیں عدالتِ الٰہی

منتا رہا سب کو بیش اور کم
اس کو دریا تو اس کو شبنم

چشمہ تھا کوئی تو کوئی چھاگل
کوزہ تھا کوئی تو کوئی بادل

شخصی حکومت کا قلع قمع کرنے کی تحریکیں وجود میں آئیں جمہوری نظام قائم کرکے سماجی نابرابری اور استحصال کو موت کے گھاٹ اتارنے کی تدبیریں عمل میں لائی گئیں۔ لیکن چونکہ اس کے نفاذ کے لئے بھی طاقت ہی سے کام لیا گیا اس لئے

اور آج بھی باوجودِ تحریک
حق ملتا ہے جس طرح ملے بھیک

بیدار ہوئی ہے روحِ جمہور
طاقت کے نشے میں وہ بھی مخمور

لیکن چونکہ طاقت کا چراغ نفرت اور عداوت کے تیل سے جلتا ہے اس لئے کائنات عالم کو سنوارنے کے بجائے طاقت کے استعمال سے اس کا شیرازہ اور زیادہ بکھر گیا

طاقت نہ بدل سکے گی فطرت
طاقت کا جواب دے گی طاقت

یہ صرف ہے اسلحات سازی
اسے وائے غنیم جان سازی

سائنس کا آج کیا ہے شہکار
انسان کشی کے چند اوزار

شاعر اس نفسیاتی حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ نفرت بغض و عداوت، حسد و کینہ، دخیرہ اندوزی سرمایہ داری بخل و خساست یہ سب اعصابی امراض ہیں۔ یہ نتیجہ ہیں ان مجبوری و بیچارگی کا، اس تشنہ کامی اور شوق کی زبوں کاری کا جس کا آدمی اپنے منصب جہانبانی سے دست بردار ہو کر شکار ہو گیا

اس طول بیان سے یہ غرض ہے
نفرت بھی تمہاری اک مرض ہے

دشمن سے جو دشمنی کرو گے
اس قرض کا سود بھی بھرو گے

رفتہ رفتہ وہی شقاوت
کر جائے گی تم میں بھی سرایت

سو دل کی خرابی یہ مرض ہے
یعنی متعدی یہ مرض ہے

طاقت کی بے طاقتی کا ذکر چھیڑنے کے بعد شاعر ایک دوسرے نفسیاتی نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جذباتی عمل اور اس کے ردعمل میں یکسانیت ہے۔ محبت سے محبت اور نفرت سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ شاعر اس حقیقت کی نہایت جامع اور لطیف انداز میں وضاحت کرتا ہے۔

الفت بھی ہے اک ربط ذہنی
نفرت بھی ہے اک ربط ذہنی

ہر ربط کی اپنی اپنی تاثیر
ہر ضبط کی اپنی اپنی زنجیر

دشمن سے کرو گے گر محبت
آجائے گی اس میں بھی سعادت

وہ بھی تمہیں چاہنے لگے گا
ابلیس کرا ہنے لگے گا

شاعر نفرت کو ایک متعدی مرض تسلیم کر چکا ہے مجبوراً کو اس کا علاج باور کرتا ہے۔

نفرت کا علاج ہے محبت
بیمار کو ہے اسی کی حاجت

جسموں کے دکھی دلوں کے بیمار
ہیں چارہ گروں کے دونوں حقدار

دونوں کے لئے ہو دردمندی
اخلاق کی ہے یہی بلندی

شاعر محبت کی اعلیٰ دارفع منزل عشق کے عناصر ترکیبی اور اس کی برکتوں پر روشنی ڈالتا ہے اور عشق کی اس طرح تعریف کرتا ہے:

رستے میں اک آگہی کی منزل
اک تربیت خودی کی منزل

نار اس کی ہے اصل نور بنیاد
یہ خود ہے الوہیت کی اولاد

جملہ آثار اس کے پیچھے
رحم اور انصاف اس کے نیچے

حیران کی عقل نارسیدہ
ایثار اسی کا نور دیدہ

آدمی اپنے مادی وجود کے آگے سپر اندازی کر کے اپنی الوہیت، اپنی خود اختیاری سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ اپنی خواہشوں کا غلام، اپنی حاجتوں کا بندہ بن کر معذوری و مجبوری کا شکار ہو گیا ہے۔ عشق ہی اسے منصب آگہی پر واپس لا سکتا ہے۔ عشق آدمی کو ساری کائنات سے بے غرضانہ محبت کرنے کا درس دیتا ہے

اک سوز نیا ہو روزمرہ
محبوب ہو اس کا ذرہ ذرہ

محبوب ہو اس کا ہر گل و خار
جو بھی ہو حزین و زار و بیمار

ہے بسکہ یہ عشق دلگدازی
اک ربط نیاز و بے نیازی

عشق آدمی کو اس حقیقی اختیار اور آزادی عمل کی تربیت دیتا ہے جس سے اسے صرف عالم خارجی کی حکومت حاصل نہیں ہوتی بلکہ اپنی داخلی دنیا پر بھی اس کی آزادی کا پرچم لہرانے لگتا ہے۔ عشق اسے خاکی فطرت سے بغاوت کا پیغام دیتا ہے۔ حرص و ہوس کی ان زنجیروں سے جس میں اس کی گمراہ خودی جکڑی ہوئی ہے آزادی کی سبیل بن جاتا ہے۔

جب تک نہ کرے گی آدمیت
فطرت کے خلاف اک بغاوت

میدان سے اپنے اک لڑائی
رجحان سے اپنے اک لڑائی

جب تک کہ یہ معرکہ نہ ہوگا
اللہ کا حق ادا نہ ہوگا

رسم و رواج کا پابند، مسخ شدہ مذہب کے رکوع و سجود، خود غرضانہ طاعت و ریاضت سے اللہ کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس رکوع و سجود کی تحریک خوف و حرص کے جذبات سے پیدا ہوتی ہے۔ خوف، مجبوری و معذوری، شکست و پسپائی کی علامت ہے۔ آدمی جب خارجی حالات و واقعات سے نبرد آزمائی کی طاقت نہیں رکھتا تو ان کے آگے سپر اندازی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ خوف کوئی وہبی جذبہ نہیں ہے۔ یہ خارجی ماحول کے مقابلے میں اپنی ناتوانی کے تجربوں کی دین ہے۔ خدائے برتر نے جس کی تخلیق کی بنیاد اسے خلیفۃ الارض بنانے اور ساری کائنات کو اپنے دام تسخیر میں اسیر کرنے کے امکانات پر رکھی، جسے اپنے اختیار کی جھلکیوں سے نوازا ہے۔ اس کے اندر خوف و خطر کا احساس تخلیق انسانی کی غرض و غایت کے منافی ہے۔ وہ سجدہ جو خوف و ہراس کا آفریدہ ہو اللہ اسے پسند نہیں کر سکتا۔ خدائے تعالیٰ اسی سجدہ کو قبول کرے گا جو اس کی محبت اور رضا جوئی کے جذبات سے سرشاری کے عالم میں ادا ہو۔

[illegible]

سجدے کے خراج میں غلامی
دیتی تھی جسے محبت افسوس
کی خوف سے اس کی طاعت افسوس

جس دل میں بسی ہوئی ہو ہیبت
اس دل میں بسے گی کیا محبت

فرعون سمجھ کے اس کو انساں
رہتا ہو ہمیشہ اس سے ترساں

خوف کی طرح حرص بھی احتیاج و بے مائگی دلیل ہے۔ اللہ نے جہاں انسان میں اپنی روح پھونک کر اسے اپنے دوسرے اوصاف کی جلوہ آرائی کے امکانات سے نوازا، اپنی خلقی بے نیازی کی عکاسی کی صلاحیت بھی اسے مرحمت فرمایا۔ انسان پر اللہ کا حق ہے کہ اس کا سر بے نیازانہ درگاہ ایزدی میں خم ہو۔ وہ عبادت جو جہنم کی آگ سے نجات یا جنت کے عیش دوام کے حصول کا وسیلہ سمجھ کر کی جائے اللہ کے ساتھ سوداگری ہے۔ اللہ ھو الغنی ہے وہ اپنے بندوں کے سجدے کا محتاج نہیں ہے۔ اس طرح کا سجدہ فریب عبادت ہے۔

آزادوں کی طاعت اور ہی ہے
مفہوم عبادت اور ہی ہے
جس میں ہو صفات کبریائی
دیتا ہے اسی کو جبہ سائی
مقبول اسی کی ہے عبادت
سمجھے جو اسے نیابت مشیئت
نیکی جو بجائے خود ہے ایثار
کرتی نہیں وہ خدا سے بیوپار

جو لوگ اللہ کی محبت میں تارک دنیا ہو کر اور حجرت نشین بن کر اس کے نام کی مالا جپتے رہتے ہیں ان کی ریاضت بھی مشیت ایزدی [illegible] تقاضہ وہی راہیں مسدود پا کر ایک [illegible] وسیلے کے ذریعے انہیں فریب تسکین دیتے ہیں

اک اور بھی شکل بندگی ہے
جو ننگ شعور و آگہی ہے
کچھ اہل سفر تھکن کے مارے
اپنی جنسی گھٹن سے
معشوق بنا رہے ہیں اس کو
پردے میں بٹھا رہے ہیں اس کو
یہ مسخ شدہ خدا پرستی
بہکی ہوئی خواہشوں کی مستی
لے ڈوبی ہے اور آدمی کو
آلودہ کیا ہے بندگی کو

شاعر اس ریاکارانہ اور غرض مندانہ رکوع و سجود، طاعت و ریاضت کو رضائے الٰہی کی تکذیب کرتا ہے۔ اور اسے اس کا غم ہے کہ مذہب کی صورت نے اس کا رواج عام کر دیا ہے۔ ورنہ یوں وہ طاعت و عبادت کا منکر نہیں ہے۔

سمجھے نہ مگر سمجھ کی خامی
میں مسلک سجود کا ہوں حامی
لیکن نہ سجود [illegible]
لیکن نہ صلوٰۃ تاجرانہ
طاعت نہ اگر ہو اختیاری
پھر تو اک عمل ہے کاروباری

عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ جہاں آدمی اللہ کے بندوں کا حق ان کے ساتھ محبت [illegible] کے جذبے سے متاثر ہو کر ادا کرے وہیں اللہ کے [illegible] مودت اور اظہار تشکر کا جو حق اس کی گردن پر ہے

بلند کرنے میں انہیں کوئی جھجک نہیں ہوتی۔

حق سب کا ادا کرے جو عادل
اللہ کے حق سے کیوں ہو غافل
... سے جدے
... اپنا بندے
... منظری نہ منکر خدا ہیں نہ منکر مذہب
... کا فتویٰ صادر کرنا ان کے ساتھ صریح
... البتہ وہ خدا کے من مانے تصور اور
... شدہ صورت سے بیزار ہیں۔ وہ بانیان

بیشک جو تھے بانیانِ مذہب
ہر ایک تھا اُن میں شاخہ اب
لیکن جو ہیں دن ان سے منسوب
ان کی تشکیل ان کا اسلوب
ان کے آئین ان کے احکام
ان کا قانون ان کا پیغام
با جملہ عقائد و مشاغل
ہیں عقل کے اور خودی کے قاتل
ہیں آج جو دینِ حق کے ناصر
کہہ لیں مجھے ملحد اور کافر



قدرتی تیل
کارخانہ دارالصحت کا ایک بے نظیر تحفہ
QUDRATI TEL
خرید کر
آپ
خاندان کے ہر فرد کو بیک وقت
ان مرضوں میں فوری فائدہ
پہونچا سکتے ہیں

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

رُباعیاتِ جمیلؔ مظہری

سید کاظم علی تخلص بہ جمیلؔ ریاست بہار جو صدیوں سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے یکم جنوری ۱۹۰۵ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ اور اُردو دنیا کو اپنے جمالِ شعری سے مسحور کر کے ۲۲ر جولائی ۱۹۸۰ء میں جھیکن پور (ضلع مظفر پور، بہار) میں داصل بہ حق ہوئے۔ ریاست بہار نے فارسی اور اُردو ادبیات کو بہت کچھ دیا ہے اور جو کچھ دیا ہے وہ دوش بدوش صد اعتنا دیا ہے۔ فارسی کے مشہور شاعر بیدلؔ عظیم آبادی تھے، اور اُردو غزل کو نیا موڑ دینے والے شادؔ بھی عظیم آبادی تھے۔ یاسؔ یگانہ بھی عظیم آبادی تھے۔ میرے دوست سہیلؔ بھی عظیم آباد کے تھے۔ اور جمیلؔ مظہری کا بچپن بھی عظیم آباد سے وابستہ رہا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنا تخلص اپنے دادا مظہر حسین کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اختیار کیا، یعنی جمیلؔ مظہری۔ شروعات میں وہ اپنا کلام اپنے والد سید خورشید حسین خورشیدؔ کو دکھاتے تھے۔ اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد انھوں نے مولانا وحشتؔ علی وحشتؔ سے اصلاح لینا شروع کیا۔ ان کی شاعری سے دنیائے اُردو خاصے عرصے سے متعارف ہو گئی تھی اور ان کا شمار ہندوستان کے ممتاز ہم عصر شاعروں میں ہونے لگا تھا۔ جملہ اصنافِ سخن پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ جملہ دیگر اصنافِ شعر، وہ رباعی سے بھی مخاطب ہوئے۔

رباعی کہنا بچوں کا کھیل نہیں ہوتا۔ معنوی اعتبار سے حکمت و موعظت، اخلاقیات و الٰہیات، رندی و سرخوشی، واردات قلبی و باطنی، زمانہ آشوبی، غرضکہ تمام موضوعات متنوع کے دائرے میں لائے جا سکتے ہیں۔ رباعی کے مخصوص اوزان پر کہے گئے چار مصرعے شیر و شکر ہو کر ابھرنا چاہئے ورنہ منتہی موضوع کی "رنگت بست" بے رنگ و کیف ہو جاتی ہے۔ ایک دلکش و کامیاب رباعی میں غزل کے ایک شعر کی سی تاثیر، چستی، معنوی نمو پذیری، صوتی و صوری ایمائیت، جذبے کی لو میں دمکتی ہوئی خیال آفرینی وغیرہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ رباعی کو دو شعروں کا مجموعہ نہیں کہا جا سکتا۔ پہلے تین مصرعے بہ تمام تسلسل و تواتر چوتھے مصرعے کی منتہایت سے ہم آغوش ہو جائیں رباعی کے اوزان کا مسئلہ قدرے متنازعہ فیہ رہا ہے۔ غالبؔ کا خیال تھا کہ "رباعی کا ایک مخصوص وزن معین ہے .... یہ بحر ہزج سے نکلا ہے۔ مفعول مفاعلن فعولن ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور اس وزن پر فعلن بڑھا دیا ہے۔ مفعول مفاعلن فعولن۔ زحافات بعض کے نزدیک اٹھارہ ہیں اور بعض کے نزدیک ۲۴ ہیں۔ اور وہ سب جائز ہیں اور اس بحر کا نام رباعی ہے ..... اسی راہ سے رباعی کہو ورنہ رباعی نہیں ہے ..." (نکاتِ غالب، نظامی پریس، ص ۲۸)۔ بحر الفصاحت کے مصنف نجم الغنی کی رائے ہے کہ کم از کم ۴۴ ۹ ۶ ۸ اشکال مرض وجود میں لائے جا سکتے ہیں۔ دورانِ گفتگو نیاز فتح پوری نے ایک گر بتایا تھا جو مجھے بہت پسند ہے۔ انہوں نے بتایا کہ رباعی کے مصرع کا پہلا رکن مفعول یا مفعولن، آخری رکن فع، فاع، فعَل میں سے ایک اور درمیانی دو رکن، فاعلن، مفاعلن، مفاعیل، مفاعی لن، فعول لینے سے رباعی کے اوزان بنتے ہیں۔ ایسے عروض داں بھی ہیں جو ۲۴ اوزان ہی پر مصر رہے ہیں۔

جمیل مظہری عروض سے اپنی بیزاری ظاہر کرتے تھے مگر ان کی رباعیاں کو دیکھتے ہوئے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ علم عروض سے واقف نہ تھے۔

۲۴ مخصوص اوزان میں سے تقریب تقریب آدھے اوزان کو انھوں نے استعمال کیا ہے۔ فکرِ جمیل میں صفحہ ۱۷۷ سے لیکر صفحہ ۲۱۲ تک رباعیاں ملتی ہیں یعنی ۳۵ صفحات پر رباعیاں ہی رباعیاں ہیں۔ جن کی تعداد ایک سو سے زائد ہی ہوگی۔ رباعی کے اوزان کچھ کم مشکل نہیں ہوتے۔ لہذا اُردو کے کسی شاعر نے بہت بڑی تعداد میں رباعیاں کہی ہیں۔ تعداد رباعیات کے پیش نظر جمیل مظہری کی قادر الکلامی ظاہر ہو جاتی ہے۔ اُردو میں چوٹی کے رُباعی گو شعراء انیس، دبیر، جگت موہن رواں، یاس و یگانہ، فراق گورکھپوری وغیرہ کے بعد جمیل مظہری کا نام ابھر کر سامنے آتا ہے۔

کوئی صنفِ سخن ہو تنقید جو دراصل ایک عالم و فاضل کا کسی تصنیف کا مطالعہ کرنے پر اس کے متعلق ردِ عمل پر محیط خیالات پر مشمول و مبنی ہوتی ہے۔ جن تین امور بلکہ تین سوالات پر مرکوز ہوتی ہے وہ ہیں 'کیا' 'کیسے' اور 'کیوں'۔ دوسرے لفظوں میں، کسی تصنیف میں کیا کہا گیا ہے یعنی مصنف کے خیالات کا جائزہ۔ کیسے سے مراد ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے کس طرح کہا گیا ہے۔ اس کیسے کے تحت مصنف کا اسلوب بہ تمام لوازمات توجہ کا مرکز ہوتا ہے۔ تیسرا بات ہے 'کیوں'، جس کے تحت پیش نظر تخلیق و تصنیف کے محرکات و متعلقات پر روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مزید برآں کسی تخلیق کو اس کے خالق سے جدا نہیں کیا جا سکتا مگر خالق کی شخصیت اور اس کی ادبی شخصیت کو ایک سمجھ بیٹھنا التباس اور غلط بیانی کا موجب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا محتاط تنقید کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوتا ہے۔ سماج، ماحول، صحبت احباب وغیرہ سے پڑنے والے اثرات نیز اجتماعی شعور سے حاصل کردہ تاثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان تمام نکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تنقید کرنا آسان کام نہیں ہے۔ ایک نقاد کسی کو گوشہ نہیں ہوتا۔ اسکے اپنے محرکات و متعلقات ہوتے ہیں جن کے عمل دخل کو تنقید کرتے وقت روکے رکھنا بڑی ریاضت و دیانت داری کا مطالبہ کرتا ہے۔ تنقید متعلق بالا حقائق اتنا ممکن ہو سکا ہے اور یہ سب ایک نقطۂ نظر سے موضوع سے انحراف کے مترادف بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آمدم بر سر مطلب!

جمیل مظہری کا بچپن پٹنہ اور مظفر پور میں گذرا اور وہیں انہوں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم حاصل کی۔ آئی اے سے لیکر ایم اے (تاریخ اسلام اور فارسی) پاس کرنے تک یعنی ۶ سال کی مدت تک وہ کلکتہ میں رہے۔ کلکتہ میں دورانِ قیام انھوں نے بلاشک دستِ شعر و ادبیات و دانشوری سے بالواسطہ بھی اور بلاواسطہ بھی استفادہ کیا ہوگا۔ گھر کا ماحول شعر و شاعری سے بھرپور تھا کیونکہ ان کے والد ماجد خورشید حسین مرحوم خود شاعر تھے اور خورشید تخلص کرتے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں پبلیسٹی آفیسر تعلقاتِ عامہ دبہار سے مستعفی ہو کر وہ ڈاکٹر راجندر پرساد کے ساتھ رہنے لگے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی جمیل صاحب کے خاصے قریبی مراسم تھے۔ مولانا آزاد اور راجندر پرساد جیسی ہستیوں کے قریب و رابطے نے جمیل مظہری کے خیالات و تخیلات پر گہرا اثر ڈالا۔ حب الوطنی سے سرشار ہو کر جمیل صاحب نے ملک کی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا۔ مسلم لیگ کے جھکڑ بھی ان کے بڑھتے قدموں کو ڈگمگا دینے میں بالکل ناکام رہے۔ تقسیم وطن سے کچھ پہلے شروع ہونے والے فسادات، بلکہ قتل عام کی زد میں آنے صوبوں یعنی پنجاب، بلوچستان، سندھ، بہار وغیرہ چنگیزیت تمام حدود پار کر گئی۔ لاکھوں بے گناہ لوگ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ لاکھوں بے گھر اور بے زر مہاجرین ہو گئے۔ بہار میں مسلمانوں کا یہ عالم تھا جیسے سرد جنگ [illegible] آگیا ہو۔ ہندوستان دو آزاد و خود مختار مملکت [illegible] ہو گیا یعنی بھارت اور پاکستان معرض وجود میں آگئے۔ [illegible]

پائی غلطی کا کفارہ نہیں ہو سکا ہے۔ جمیل صاحب کی شاعرانہ طبیعت خاصی متاثر ہوئی۔ درد و سوز ان کی طبیعت میں رچ بس گئے۔ ان کی شاعری میں انسانیت کے جامع پر خلوص جذبات ملتے ہیں۔ ملک کا افلاس ان کو تڑپاتا ہے۔ سارے جہان کا درد انہیں اپنے جگر کا درد محسوس ہونے لگتا ہے۔ ان کے یہاں تشکیک کی فراوانی بھی ہے اور کار فرمائی بھی مگر وہ تشکیک تخریبی نہ ہو کر تخلیقی ہے۔ شاعر کی نظر آفاقی ہوتی ہے بلکہ ماورائے آفاقی بھی ؎

ممکن ہے سرِ حدِ گماں تک پہنچے
یا قیدِ مکاں سے لامکاں تک پہنچے
واعظ کی نظر نہیں کہ مسجد تک جائے
شاعر کا خیال ہے جہاں تک پہنچے

خدا کے تصور کے بارے میں درج ذیل رباعی بہت خوب ہے۔ تصور کو دماغوں کی تھکن قرار دینا جاذبیت سے بھرا ہوا خیال ہے۔ سُنیے ؎

خوش فکریٔ شیخ و برہمن ہی نکلا
سرمایۂ افکارِ کہن ہی نکلا
حرکت سے محرک کا تصور لے دوست
آخر کو دماغوں کی تھکن ہی نکلا

بہت اچھی رُباعی ہے۔ ایک سقم ہے اور نہیں بھی ہے۔ جمیل صاحب نے 'حرکت' کی 'ر' کو غیر متحرک نظم کیا ہے۔ صحیح تلفظ حَرَکَت ہے یعنی پہلے تینوں حروف متحرک ہیں، لیکن اس کا جواز یہ ہے کہ اُردو بول چال میں 'حرکت' کی 'ر' ساکن رہتی ہے۔ شاعری میں نقاد شعرا صحیح تلفظ پر توجہ صرف کرتے آئے ہیں۔ آج کے عروض ناآشنا دور میں اب کون اتنی چھان بین پر اُترتا ہے۔ نہ جانے کیوں جمیل صاحب نے اس پر فٹ نوٹ دینے کی زحمت نہ کی جب کہ ایک رُباعی میں 'دھرم' کے استعمال پر فٹ نوٹ دیا ہے کہ "دھرم" بہ سکون "ر" صحیح ہے مگر اُردو میں دَھرَم مستعمل ہے۔ اس لئے کوئی قباحت نہیں" (ص ۸۰ فکرِ جمیل ''ہم زندہ ہیں چاہتے زندوں کا دھرم'')۔ درد و سوز سے لبریز رُباعیاں ملاحظہ ہوں۔ بطور نمونہ مشتے از خروارے :

گوتم بدھ

آواز یہ دی کہ تم میں رنجور ہے کون
سو زخم ہیں لیکن ان میں ناسور ہے کون
مت سوچ ہے کون اس جہاں کا مختار
یہ دیکھو کہ اس جہاں میں مجبور ہے کون

مزدک

بولا برہم نظامِ فرسودہ کرو
انسان کی خواہشوں کو آسودہ کرو
مے سے رنگین کرو قبائے تہذیب
خوں سے دامن مگر نہ آلودہ کرو

عیسیٰ مسیحؑ

تھا دل میں ہر اک گل کا ہر اک خار کا درد
سمجھا یہ طبیب اپنے بیمار کا درد
تعذیرِ گناہ کے تو حامی ہیں سبھی
کس کے سینے میں ہے گنہگار کا درد

علیؑ ابن ابی طالب

یارب اک آیتِ جلی پیدا کر
سلطان کے بھیس میں ولی پیدا کر
بھرنی ہے سیاست میں جو روحِ اخلاق
پھر قلبِ محمد سے علی پیدا کر

"آب و سراب" جمیل مظہری کی ایک مثنوی کا نام بھی ہے۔ مثنوی ہذا کے مرکزی خیال کو درج ذیل رُباعیوں میں سمویا ہے۔ اعادہ تمام دیکھا جا سکتا ہے ؎

ہم نے جلووں کو خواب بنتے دیکھا
طوفانوں کو حباب بنتے دیکھا

دُنیا میں تری سراب پانی نہ تھا
پانی کو مگر سراب بنتے دیکھا

بہتی گنگا میں ہاتھ دھو بھی نہ سکے
سوکھے ہوئے ہونٹوں کو بھگو بھی نہ سکے
دریا میں سراب کے کرشمے دیکھے
اور تشنہ لبی پہ اپنی رو بھی نہ سکے

یہاں 'پہ' کی جگہ 'پر' بھی نظم کیا جا سکتا تھا۔ یہ کوئی سقم تو نہیں ہے مگر جہاں 'پر' استعمال ہو سکتا ہو 'پہ' کے استعمال سے احتراز کرنے پر فصحا زور دیتے آئے ہیں۔ مزید برآں 'نہ' کا استعمال بھی قدرے احتیاط کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہاں بادی النظر میں 'نہ' کے بجائے 'نا' سا ہو گیا ہے۔

'قریبِ دعا' عنوان کے تحت کہی گئی جاذبِ توجہ رباعیاں ہے

کوئی اگر آسماں سے بالا ہوتا
آوارہ نہ یوں فضا میں نالا ہوتا
تو کیا ہے، یہ مہر و ماہ کرتے ہیں فریاد
کوئی اگر سننے والا ہوتا

مجبور کا اقتضائے فطرت ہے یہی
وہ ہو کہ نہ ہو مگر حقیقت ہے یہی
ہوتا کوئی تیری آہ سننے والا
تیری سب سے بڑی ضرورت ہے یہی

مت پوچھ جہاں میں کیا بنایا ہم نے
یہ محشرِ فتنہ زا بنایا ہم نے
پیشانیوں میں ہوئے جو سجدے بے چین
مسجودوں کے لئے خدا بنایا ہم نے

تازیانے" کے عنوان کے تحت دو رباعیات سماعت فرمایئے

پھر شوق جو مائلِ خرابی ہے جمیل
یہ نفس کا حملہ جوابی ہے جمیل
کردارِ بلند کی ہوس ہے تو سنو
پہلی سیڑھی خود احتسابی ہے جمیل

کتنوں کا کلیجہ اس سے بسمل ہوتا
مٹھی میں اسی کے خوں بھرا دل ہوتا
ہنگامِ دعا جو لرز رہا ہے ہاتھ
طاقت ہوتی تو دستِ قاتل ہوتا

'خون' بلا اعلان 'نون' نظم ہوا ہے۔ یہاں 'خوں' (یعنی 'ن' کے علان کے ساتھ) افصح ہوتا۔ بہرکیف: رباعی اچھی ہے اور آجکل لوگ اعلانِ نون وغیرہ کو دیکھتے بھی نہیں۔

اپنے مرشدِ فن علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ" کے تحت تین رُباعیاں کہی گئی ہیں۔ گاندھی کے عدم تشدد پر عمل پیرا ہونے والے جمیل مظہری نے فکرِ اقبال پر اچھی تنقید کی ہے، سنئے:

سورج کا جلال آب و گل سے پوچھے
ذروں کا مزاج سفل سے پوچھے
شاہین کی عظمت سے کسے ہے انکار
لیکن کوئی کنجشک کے دل سے پوچھے

عقاب ہے تو شاہیں کا دمساز نہ بن
شہباز نہ بن جمیل شہباز نہ بن
تو اور فضا میں یہ شکاروں کی تلاش
اے طائرِ عرش ننگِ پرواز نہ بن

اور تیسری رباعی ہے

موتی سے ہے ایک بوند آنسو بہتر
غولانِ بیاباں سے ہے جگنو بہتر

عصفور کا خون تو اسکی چنگل میں نہیں
ہے آپ کے شاہین سے اُلّو بہتر

غلط نامہ کے تحت "شاہین سے اُلّو بہتر" کی تصحیح "شاہین سے مِٹھو بہتر" سے کی گئی ہے۔ اُلّو بھی غلط معلوم نہیں ہوتا تصحیح نے ذوق کا پہلو اور اُبھار دیا ہے۔ مِٹھو، پالتو طوطے کو کہتے ہیں۔ چنگل میرے خیال میں مذکر ہے مگر شاعر نے 'کے' کی جگہ 'کی' کہا ہے۔ تانیث غلط معلوم ہوتی ہے۔ بایں ہمہ 'اُلّو' سے "مِٹھو" تک بات کھنچ جانے سے لطف پیدا ہو گیا ہے۔

الٰہیات پر جمیل مظہری کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ 'تصورات' کے عنوان پر کہی گئی رباعیاں یہ دلیل فراہم کرتی ہیں کہ جمیل صاحب نے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا تھا، درحالیکہ یہ مطالعہ گہرا تو نہیں معلوم ہوتا مگر اس امر کا ثبوت ضرور فراہم کرتا ہے کہ وہ کھلے دل و دماغ کے مخلص انسان تھے۔

خدا کا اسرائیلی تصوّر

وہ مالکِ خشک و تر خدا کو سمجھے
وہ خالقِ بحر و بر خدا کو سمجھے
ہے حدِّ ادب مگر جنابِ موسیٰ
فرعون کو دیکھ کر خدا کو سمجھے

عبرانی میں فرعون کے معنی شہنشاہ کے ہوتے ہیں۔ موسیٰ نے مراقبہ (یعنی مراقبہ) میں حقیقت کو وا شگاف دیکھا اور اس کے بعد 'شعلۂ طور' کے ذریعہ۔ ملحوظ رہے یہودی تصوف میں طور یعنی صوف کہا جاتا ہے۔ اور صوف عبرانی میں ابدیت کو کہتے ہیں۔ اسی پر یہودی تصوف کا مرکزی اصول "عن صوف" وضع ہوا۔ اس کی پوری بحث میری تصنیف Islamic Mysticism Sufism (جس کی اشاعت سٹرلنگ اینڈ کو نیو دہلی ۱۶ ۰۰ ۱۱ کر رہے ہیں) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ بطور جملہ معترضہ میرا خیال ہے نکتے کی طرف جھکتا ہے کہ "عن صوف" یا یونانی Sophia بہ معنی مکاشفانہ عرفان یا ان دونوں سے اسلامی صوفی تصوّر نے کچھ نہ کچھ لیا بھی بلکہ لفظ صوفی کا تعلق صوف بہ معنی اون سے کم ہے اور 'عن صوف' (عبرانی میں خورشیدِ ابدیت کو کہتے ہیں) نیز صوفیہ (Sophia) سے زیادہ ہے۔ بحث دلچسپ بھی ہے اور منطقیانہ بھی۔ بہرکیف یہ نظریہ سب سے پہلے راقم الحروف ہی نے پیش کیا ہے۔ ملحوظ رہے کہ کسی نظریہ کو حرفِ آخر کبھی نہیں سمجھا جاتا۔ جمیل صاحب نے جو کچھ کہا ہے اسلامی حلقوں میں بالعموم اسی طرح کہا جاتا ہے۔

خدا کا آریائی تصوّر

سب سے آخر سب سے اوّل ہے وہ
سب سے اعلیٰ ہے پھر بھی کوتل ہے وہ
راج اس کا بید رہن ہے اس کی سنتان
اور اپنی جگہ عضوِ معطل ہے وہ

جمیل صاحب نے ٹھیک ہی سمجھا ہے مگر یہ آریائی نظریہ نہ ہو کر پرانوں کی تمثیلات سے ماخوذ ہے، "وشنو پران" میں کم و بیش یہی نظریہ ہے۔ جہاں تک آریائی نظریہ کا سوال ہے، دائرہ در دائرہ منطقی امور سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ آریائی نظریہ کی بجائے آریائی نظریات کہنا درست ہوگا۔ متعدد دبستانِ خیال جن میں چارواک نظریہ، سانکھیہ نظریہ، اور نیائے نظریہ، بودھ نظریہ، اور جین نظریہ وغیرہ بھی شامل تھے۔ اور ان سب میں خدا کو محض وہم و خیال ہی بتایا گیا ہے۔ بودھ تو آتما (روح) کو بھی نہیں مانتے اور نیائے درشن میں تو واضح طور پر دلائل دیکر ثابت کیا گیا ہے کہ وجودِ خداوندی کا منبع صرف ضعیف الاعتقادی ہے۔ کرم یوگ درشن یعنی فلسفۂ اعمال میں عمل کو مرکزی جگہ حاصل ہے مگر خدا کے وجود سے انکار نہیں کیا گیا ہے یعنی جمیل صاحب کے الفاظ میں آپ اس کو "عضوِ معطل" کہیں تو زیادہ پکڑ کی بات نہیں ہوگی۔

اسلامی تصور پر دو رباعیاں ہیں، ایک "اربابِ شریعت" کی عینک سے اور دوسری "اہل حکمت" کی عینک سے۔

افلاک تو تقسیم ہو، دولت نہ بٹے
لیکن وہ کبھی نہیں ہے جتنا کا راج
جس میں روٹی بٹے، حکومت نہ بٹے

ناقہمی پر مبنی خیال ہے۔ نام نہاد جمہوری دور میں صرف دو آزادیاں حاصل ہوتی ہیں۔ پہلی آزادی فاقہ کشی سے یعنی بھوکوں مرنے کی پوری آزادی ملی ہوتی ہے۔ دوسری آزادی بھونکنے کی یعنی جو چاہو بکتے رہو مگر سب کا سب سعیٔ لاحاصل کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

من حیث المجموع، جمیل مظہری کی رُباعیاں اچھی ہیں، اور ان کے معیار و اسلوبِ فکر و شعر پر روشنی ڈالتی ہیں۔

ملاحظہ فرمایئے ؎

کھلتا نہیں عارف ہے کہ معروف ہر وہ
آپ اپنے مشاہدے میں مصروف ہر وہ
عنصر بھی ہماری طرح آتا ہے اُسے
انسان کی ہر صفت سے موصوف ہر وہ

کہتے ہیں اگر کہ ہے تمنّا اس میں
ہوتا ہے اِک انفعال پیدا اس میں
خواہش دیتی ہے جب اِرادے کو جنم
کس طرح کہیں کہ ہے ارادہ اسمیں

ان رباعیوں پر راقم الحروف اپنی رائے کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی اشتراکیت پر جان چھڑکنے والا شخص اپنے آپ کو مذہبیات و الٰہیات سے کوسوں دُور رکھنا چاہتا ہے۔ اشتراکیت کا ذکر در آیا ہے تو یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جمیل مظہری فلسفۂ اشتراکیت سے بالکل نابلد تھے۔ کم سے کم ان کی درج ذیل رباعی سے تو یہی تاثر دیتی ہے ؎

اشتراکیت — صد حیف وہ دَور جس میں طاقت نہ بٹے

جمیل مظہری کا تخلیقی رویّہ

ڈاکٹر وہاب اشرفی

سوال یہ ہے کہ بڑے شاعر یا اچھے شاعر کی پہچان کیا ہے؟ اسی سوال کا ایک دوسرا رخ ہے کہ بڑی شاعری یا اچھی شاعری کی پہچان کیا ہے؟ ان سوالوں سے پہلے ایک سوال ذہن میں یہ بھی ابھرتا ہے کہ شاعری کیا ہے؟ پھر یہ بھی کہ اچھی شاعری اور بری شاعری یا معمولی شاعری کی حد فاصل کیا ہے؟ اگر ان سوالوں کا جواب آسانی سے مل جائے تو وہ پیمانے حاصل ہو جائیں جن کے ذریعہ کسی بھی شاعر کی اہمیت، قدر و قیمت یا منصب متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

شاعر خالق ہے، شعر کی تخلیق کرتا ہے، تخلیق کے مرحلے سے گزرنا خالص انفرادی عمل ہے، یہ کوئی اجتماعی عمل نہیں، ایسے میں شاعر کی پہلی پہچان یہ ہے کہ وہ خالق ہو اور شعر کی تخلیق میں انفرادی عمل سے گزرا ہو۔ اس صورت حال میں تتبع یا نقل کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی نہ ہی اثرات قبول کرنے اور پھر انہیں توانائی سے برتنے کا جواز باقی رہتا ہے۔ اس لئے بڑا یا اچھا شاعر بنیادی طور پر خالق ہوتا ہے، ایسا خالق جس کی تخلیق بے حد اوریجنل ہوتی ہے، نقل یا تتبع سے اس کا دور کا بھی علاقہ نہیں ہوتا۔ اس کا تخلیقی رویہ بے حد انفرادی ہوتا ہے، اور اب جو چیز سامنے آتی ہے وہ اس کی اپنی ہوتی ہے، اسٹاک کی چیز نہیں ہوتی۔ روایت کے خزانے سے نکالا ہوا کوئی جانا پہچانا سکہ نہیں ہوتا۔ اس لئے بڑا شاعر یا اچھا شاعر بھیڑ میں گم نہیں ہوتا یا بڑی شاعری یا اچھی شاعری روایت کے سلسلے میں ضم ہو کر اپنی صورت کھو نہیں دیتی۔ وہ ہر جگہ نمایاں ہوتی ہے۔ معمولی شاعری یا بری شاعری دراصل شاعری نہیں ہوتی تتبع یا نقل کی بنیاد اسے انفرادی شکل و صورت سے محروم کر دیتی ہے۔ اسے حقیقی شاعری یا شاعری کا فریب کہہ لیجئے، سراب مانئے، اس گروہ کے نام نہاد شاعر روایت کی ٹکسال سے سکے چرانے میں ساری زندگی صرف کر دیتے ہیں اور اسلاف کی اگلی ہوئی نئے کو چاٹتے رہتے ہیں اور انہیں یہ فریب رہتا ہے کہ وہ شاعر ہیں، لیکن ان کی نام نہاد شاعری سفر میں ہی دم توڑ دیتی ہے۔ اس طرح کہ دور دراز کی کوڑی لانے والا اور محنتی ریسرچ اسکالر بھی اسے دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے اپنی محنت کے صلے میں پی ایچ۔ ڈی یا ڈی۔ لٹ کی سند مل سکتی ہے

میں نہیں کہتا کہ روایت پر نگاہ رکھنے والا شاعر اچھا شاعر یا بڑا شاعر نہیں ہوتا یا نہیں ہو سکتا۔ روایت پر نگاہ رکھنی اور روایت کے تتبع میں بڑا فرق ہے۔ روایت راستہ دکھا سکتی ہے، لیکن وہ منزل نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ بڑا شاعر یا اچھا شاعر روایت سے روشنی تو لیتا ہے لیکن اس میں ضم نہیں ہوتا بلکہ اس کی توسیع کر دیتا

ہے اور اس کے حدود بڑھا دیتا ہے۔

میں جمیل مظہری کو اچھا شاعر بھی مانتا ہوں اور بڑا شاعر بھی۔ اس لئے کہ وہ خالق ہیں، نقال نہیں۔ ان کی شاعری میں انفرادیت ہے، اس کے رنگ و روپ اس کے اپنے ہیں، یہ بھیڑ میں گم نہیں ہوتی، یہ خزانے کا چرایا ہوا پرانا سکہ نہیں۔ یہ روایت کے سلسلے میں ضم ہو کر اپنی قدر و قیمت کھوتی نہیں ہے، بلکہ اس کے حدود کی توسیع کرتی ہے۔ جمیل مظہری کا تخلیقی عمل ان کا ذاتی عمل ہے، اس میں ان کی اپنی فکر، اپنے احساسات نمایاں ہیں۔

مجھے اس کی فکر نہیں کہ جمیل مظہری کی غزلوں میں تغزل کی کیا کیفیت ہے؟ یا ان کی نظموں میں کون سا نظامِ زندگی منظوم ہوا ہے۔ مجھے اس کی تلاش نہیں کہ ان کے خیالات کتنے ارفع و اعلیٰ ہیں، مجھے اس کی بھی غرض نہیں ہے کہ ہماری مستحسن قدریں کس حد تک ان کی شاعری کا حصہ نہیں ہیں یا زندگی کے کیسے کیسے اقدار و معیار ان کی فکر رسا کا ساتھ دے سکے ہیں۔ مجھے ان کے تخلیقی رویہ سے بحث ہے، الفاظ کے برتاؤ سے غرض ہے، ان کے استعارے کے نظام اور پیکر تراشی کے طریقۂ کار کی تفہیم مقصود ہے۔ اور ان امور کے پس منظر میں ان کے ملتہب احساس دل کی کیفیت کو سمجھنا ہے۔ ظاہر ہے ان تمام باتوں کی سیر حاصل بحث کے لئے متعدد مضامین کی گنجائش ہے یا ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اس لئے میں یہاں صرف اشارے پر اکتفا کروں گا۔ مجھے اپنے سامعین کی قوت تفہیم پر پورا اعتبار ہے۔ بہر حال، میں جمیل مظہری کے چند اشعار نقل کر رہا ہوں:

(۱) کون فریب کھائے اب فتنۂ رنگ و آب کا
مل گئی تشنگی کو آنکھ، بجھ گیا دل سراب کا

(۲) حقیقتوں نے اوڑھ لی ہے جب نقاب رنگ و بو
تو احترام فرض ہے ہر آنکھ پر نقاب کا

(۳) اک سوال ہے میرا بلندیوں سے جمیل
کہ یہ زمین نہ ہوتی تو آسمان ہوتا؟

(۴) ساری یہ جلوہ گری تیرے حجابات سے ہے
بے حجابی میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

(۵) صبح خود بتا دے گی، تیرگی کہاں جائے
یہ چراغ کی جھوٹی روشنی کہاں جائے

(۶) دماغ تاریکیوں میں گم ہے، چراغ دل رہنما نہیں ہے
ادھر اندھیرا ادھر اندھیرا خرد کو کچھ سوجھتا نہیں ہے

(۷) خرد انہی سے بناتی ہے رہبری کا مزاج
یہ تجربے جو میسر ہیں گمرہی سے مجھے

(۸) اصلیت تھی یا دھوکہ تھا، اک فتنۂ رنگیں برپا تھا
سو جلوے تھے اک پردہ تھا، پردہ نہ رہا تو کچھ بھی نہیں

ان اشعار کا سرسری مطالعہ بھی یہ بتائے گا کہ جمیل مظہری کا شعری مزاج لفظ کے معنوی ڈائمنشن کی توسیع کر دیتا ہے۔ تخلیقی طریقۂ کار یہی ہے۔ یعنی یہ کہ شعر جب لفظوں کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے تو ان کی معنوی سطح بدل جاتی ہے اور اگر کوئی شاعر ایسا نہیں کرتا تو پھر وہ نثری فعل انجام دیتا ہے۔ جمیل مظہری کی عظمت الفاظ کے جدلیاتی اشکال میں مضمر ہے۔ ان اشعار کا جائزہ لیجئے تو اندازہ ہو جائے گا کہ شاعر واقعتاً خالق کے منصب پر فائز ہے۔ میں نے یہ اشعار اس لئے بھی منتخب کئے ہیں کہ یہ الفاظ ہمارے جلتے پہچانے ہیں اور کثرت سے استعمال ہوتے رہے ہیں۔ لیکن جمیل مظہری نے انہیں

نئے رنگ دیئے گئے ہیں۔ ان میں کوئی نہ کوئی تشبیہ، استعارہ یا پیکر چھپا ہوا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی زبان میں کہوں تو جدلیاتی عمل کرنے یا رکھنے والا لفظ اپنے معنی میں خود کفیل ہوتا ہے، اسے کسی خارجی حوالے کی ضرورت نہیں پڑتی اور وہ جب خارجی حوالے کا پابند نہیں تو اس میں معنی کی کوئی حد نہیں۔ کیونکہ اس میں ایک آزاد نامیاتی زندگی ہوتی ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ جمیل مظہری کے متذکرہ اشعار کے الفاظ واقعتاً کن فیکون کی کیفیت رکھتے ہیں۔ یہاں رنگ آب، تشنگی، سراب، تجلیوں، نقاب، بلندی، حجاب، تیرگی، روشنی، چراغ، جلوہ گری وغیرہ سب سامنے کے الفاظ ہیں۔ لیکن لغوی مفہوم سے بہت دور کھڑے ہیں۔ ان میں معنی کی پرتیں جم گئی ہیں۔ مفہوم کی نئی دنیا آباد ہو گئی ہے۔ مختصر یہ کہ جمیل مظہری الفاظ کا جادو نہیں جگاتے ہیں، الفاظ میں جادو جگاتے ہیں اور یہ ایک خالق کا عمل ہے اور ایک شاعر کا عمل ہے، بڑے شاعر کا عمل ہے۔ خلاقانہ طریقہ کار ABSTRACTS کو کنکریٹ اور کنکریٹ کو ABSTRACTS بنا دیتا ہے۔ جمیل مظہری کا بھی یہی طریقہ کار ہے۔ اس طریقہ کار کی تفہیم کے لئے تشنگی کو آنکھ ملنے یا سراب کا دل جھکنے یا تجلیوں کا نقاب اوڑھنے یا حجابات کی جلوہ گری یا چراغ کی جھوٹی روشنی کے عوامل کو سمجھنا پڑے گا۔ ان میں صرف خیالات کی تجسیم یا PERSONIFICATION کا عمل نہیں ہے۔ یہ تو بصورت امیجری یا پیکر تراشی کی بھی مثالیں ہیں۔ اس لئے کہ ان سے ہمارے حواس خمسہ بیدار ہوتے ہیں، ان کا محاکاتی رنگ تصویریت تک محدود نہیں، اس لئے کہ ان میں ہمارے تخلیہ کو متحرک اور بیدار کرنے والے الفاظ اور تراکیب کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً تشنۂ رنگ و آب میں بصری پیکر موجود ہے۔ لیکن فریب کھلنے میں ایک حرکت کا بھی تجربہ شامل ہے۔ اس طرح ایک ہی مصرعے میں بصری اور حرکی پیکروں کا ادغام دیکھئے۔ جمیل مظہری کی شاعری کی پوری ساخت مختلف قسم کے پیکروں سے مالا مال ہے۔ اور حرکی، استعاراتی اور لمسی پیکروں کا ایک سلسلہ ہے اور پیکر اس وقت تک نہیں بن پاتے جب شاعر واقعتاً خالق کے درجے تک نہ پہنچ جائے۔

جمیل مظہری کے تخلیقی رویے کا ایک صورت لفظوں کا جدلیاتی استعمال کا وہ پہلو ہے جو منفی سے مثبت اور مثبت سے منفی مفہوم کی طرف قاری کا ذہن موڑ دیتا ہے۔ یہ شعر دیکھئے :-

اب تو دھوپ آ پہنچی جھاڑیوں کے اندر بھی
اب پناہ لینے کو تیرگی کہاں جائے

یہاں "تیرگی" سے ایسی محبت کا جواز کیا ہے؟ دھوپ آگہی کی علامت ہے، تیرگی جہل کی، لیکن کہیں کہیں آگہی جہل کے منصب سے بھی نیچے گر جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آگہی ہمیں عزیز ہے، لیکن اس کو کیا کیجئے کہ آج کی سائنسی ترقیاں ہمارے ایمان و ایقان کے لئے سخت امتحان بن گئی ہیں۔ مادی ترقیاں روحانی اقدار کو ٹھیس پہنچا رہی ہیں۔ ایسے میں ہمیں تیرگی کی حفاظت کرنی ہے۔ دیکھا آپ نے، کس طرح شاعر IGNORANCE کو BLISS ماننے کی تلقین کرتا ہے، یہاں منفی سے مثبت اور مثبت سے منفی مفہوم کی طرف قاری کے ذہن کو موڑنے کی ایک کوشش ہے۔ یہ صورت حال ان شاعروں کے یہاں اور بھی نمایاں ہو کر ابھرتی ہے جو تشکیک کے مرحلے سے گذرتے ہوتے ہیں۔ اور جمیل مظہری کے یہاں کوئی فکری نظام ہے تو وہ تشکیک ہی سے عبارت ہے لیکن یہاں مجھے جمیل مظہری کے فکری نظام سے بحث نہیں۔ تخلیقی رویہ سے بحث ہے۔ بہرحال منفی سے مثبت اور

مثبت سے منفی پہلوؤں کے حصول کے سلسلہ کے اور اشعار دیکھئے :

یہ اک سوال ہے میرا بلندیوں سے جمیل
کہ یہ زمین نہ ہوتی تو آسماں ہوتا

ساری یہ جلوہ گری تیرے حجابات سے ہے
بے حجابی میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

جھکنا بھی برا اور جھکانا بھی برا ہے
چوکھٹ سے مٹا داغ مری خیرہ سری کا

پاس آکے ہٹ جائے جو ندی جمیل اس سے
وہ سراب اچھا جو دور سے ملتا ہو

اجالے کا پجاری مضمحل کیوں ہے اندھیرے سے
کہ یہ تارے نکلتے ہیں تو سورج بھی اُگتے ہیں

تھی وہ شاید اپنی ہی بے چارگی کی اک پکار
جس کو اپنی سادہ لوحی سے خدا سمجھا تھا میں

کیسا پردہ جمیل کیسا جلوہ
دیتا رہا تیرگی کو دھوکا جلوہ
گہرے ہوتے گئے حجابات فریب
چلاتی رہی نظر کہ جلوہ جلوہ

یہاں تشکیک تو ہے ہی لیکن الفاظ کے استعمال میں وہ جدلیاتی رویہ نمایاں ہے جس سے معلوم نامعلوم اور نامعلوم معلوم بن جاتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بڑے شاعروں کے یہاں تخلیق کے مرحلے میں اشیاء اپنی معلوم اور واضح خو بو ترک کر دیتی ہیں اور بالکل متضاد فطرت اختیار کر لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برف جلاتی ہے تو شعلے ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔ تاریکی روشنی دیتی ہے تو روشنی تاریکی اگلتی ہے۔ ایسے عمل سے پہلی بات تو یہ ہوتی ہے کہ لفظ اپنا نثری میدان ترک کر دیتا ہے اور شعر کی پیچیدگیوں کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔
جمیل مظہری کے یہاں ایسا رویہ بہت واضح ہے۔ لیکن یہ طریقہ کار اتنا آسان نہیں کہ ہر شاعر آسانی سے اسے اپنا لے۔ یہاں تخلیقی اور شدید تخلیقی قوت کی ضرورت ہے۔ یہ قوت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر گہرے تجربے اور مشاہدے کی منزلوں سے گذرا ہو۔ یعنی اپنی باتیں عملی زندگی میں جذبے اور عمل کی کشاکش سے وجود میں آتی ہیں۔ جذبات کی شوریدگی عقلی دلائل کے سامنے بے بس ہو جاتی ہے اور انسان فطرت کی بے پناہ طاقت کے سامنے بے بس اور مجبور نظر آتا ہے۔ جمیل مظہری کے شعری رویہ میں ایسی ہی غور و فکر کا دخل عمل ہے اور ان کا انفرادی ڈکشن کائنات کے بے شمار مسائل کی تفہیم کے پس منظر میں مرتب ہوا ہے۔ اس لئے ان کے ڈکشن میں ایک خلاقانہ آنچ ہے جو پڑھنے والے کے دلوں کو گرما دیتی ہے اور ایک نئی دنیا کی وسیع و عریض سرزمین کی طرف رخ موڑ دیتی ہے۔
جمیل مظہری کے یہاں بڑے اور ممتاز شاعر کے تمام لوازم موجود ہیں۔ وہ خالق ہیں اس لئے شاعر ہیں۔ شعر کی تخلیق میں ان کا انفرادی عمل صاف پہچانا جاتا ہے، اس میں اشتراک کا پہلو کہیں نہیں نکلتا۔ انھوں نے اثرات قبول کئے ہیں اور انہیں توانائی سے استعمال کیا ہے ان کا کم از کم ان کے تخلیقی رویے سے

اندازہ نہیں ملتا۔ نقل یا تتبع جمیل مظہری کا مزاج نہیں ان کا تخلیقی رویہ انفرادی ہے' اس لئے ان کا پورا اسلوب جدلیاتی سطح پر کھڑا ہے' ان کے شاعرانہ پیکر تراشی کے حواس خمسہ کو مہمیز لگاتے ہیں' اور رنگ و نور کی ایک نئی دنیا آباد کر دیتے ہیں۔ روایت نے جمیل مظہری کی راہ ہموار ضرور کی ہے۔ لیکن منزل نہیں بنی ہے۔ ان کی شاعری روایت کے حدود کی توسیع کرتی ہے۔ اس لئے میں جمیل مظہری کو ایک عظیم شاعر تسلیم کرتا ہوں جن کی شاعری پر وقت کی گرد نہیں پڑ سکتی۔

بقیہ مضمون ولی احمد ولی

کون فریب کھائے اب فتنہ رنگ و آب کا
مل گئی تشنگی کو آنکھ بجھ گیا دل سراب کا

حقیقتوں نے اوڑھ لی جب نقاب رنگ و بو
تو احترام فرض ہے ہر آنکھ پر نقاب کا

جمیل اس دل کی بانسری میں بہت سے نغمے بھرے ہیں لیکن
جسے سنانے کی تھی تمنا اسی نے اب تک سنا نہیں ہے

ان کی غزلوں کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان میں تفکر اور تغزل کا حسین امتزاج ہے۔ وہ کلاسیکی روایتوں کی تقلید نہیں کرتے اور نہ ہی اس سے احتراز و انحراف کرتے ہیں۔ بلکہ ایک اعتدال پسندانہ رویہ کے ساتھ روایتی اسلوب شاعری کے مستحسن پہلوؤں کو اپنی شاعری کا جز و بناتے ہیں۔ اسلوبیاتی اور نفسیاتی اعتبار سے ان کی غزلیں تازہ کاری' شگفتگی اور لالہ کاری کا بہتر مرقع ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کا آہنگ غزل نہایت شاداب و شگفتہ ہے اور اس کے اندر ایک انوکھی تازگی و شگفتگی اور گہری معنویت و شفافیت اور توانائی موجود ہے مراثی و مثنوی کو چھوڑ کر ان کے دو مجموعۂ کلام "نقش جمیل" اور "فکر جمیل" منظر عام پر آئے۔ "نقش جمیل" ان کی نظموں کا مجموعہ ہے اور "فکر جمیل" ان کی غزلوں کا ایک نمائندہ مجموعہ ہے۔ اس میں عصری حسیت اور عصری آگہی کے ساتھ ساتھ بشری نفسیات اور انسانی دردمندی و ہمدردی کی ایک صحت مند روایت اور خوشگوار فضا ملتی ہے۔

مجموعی اعتبار سے جمیل مظہری کی غزلوں میں جذبے کا خلوص' فکر کی گہرائی و گیرائی اور اسلوب بیان میں ندرت و جدت موجود ہے۔ گویا ان کی غزلیہ شاعری فکر و فن دونوں جہتوں سے کامیاب' توانا اور کشش انگیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعرانہ قامت دور سے ہی شناخت ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ ان کے عظیم شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

ڈاکٹر سید حامد حسین

جمیل مظہری کا "خلافِ رسمِ تغزّل"

جمیل مظہری کی غزلوں کے مجموعے "فکرِ جمیل" کے تیسرے حصے "آہنگِ نو" کی ابتدا اس مطلع سے ہوتی ہے۔

؎ خلافِ رسمِ تغزل، غزل سرا ہوں میں
ربابِ وقت کی بگڑی ہوئی صدا ہوں میں

مصرعِ ثانی میں جس تاسف کا تاثر ہے وہ رسمِ تغزل سے شاعر کی وابستگی اور اس رسم سے شعوری طور پر گریز کو اظہار بخشتا ہے۔ غزلیہ شاعری کی رسمیات سے وابستگی کے واضح نشانات مظہری کی اُن ابتدائی غزلوں میں نظر آتے ہیں۔ جنھیں "فکرِ جمیل" میں "رنگ و نیرنگ" کے عنوان کے تحت یکجا کیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مظہری کے تغزل کی روح اُن کا جذباتی اخلاص اور اُن کی تخیّل کی ضوفشانی ہے۔ اور ان کی ابتدائی غزلوں کے متعدد اشعار ایک بولتی ہوئی وارفتگی کا کمال معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی نظر آتا ہے کہ اُن کی غزلیہ شاعری کی اُٹھان غزل کی عشقیہ روایت اور مروج علامتی لفظیات کے تحت ہوئی ہے اور یہاں وہاں روایتی مضامین و اسالیب اُن کا دامنِ فکر کھینچتے دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پڑھو، کلمہ کیوں اُس بُت کے ابروئے ہلالی کا
محبّت رو بہ قبلہ ہے اُسی محراب کے خم سے

خبر ہے گرم کہ کل رات حضرتِ واعظ
شرابِ ناب سے دیکھے گئے وضو کرتے

یہ کیا رسمِ محبّت ہے چھری چل جائے بسمل پر
چھری جس نے چلائی ہو وہ ناواقف ہے بسمل سے

جفائے یار محبّت کو آزمانے لگی
تمام عمر کی محنت غرض ٹھکانے لگی

ہوائے نجد جلدی کر کہیں محمل نہ بڑھ جائے
غبارِ قیس کو کچھ پردۂ محمل سے کہنا ہے

جمیل اپنی اسیری پہ کیوں نہ ہوں مغرور
یہ فخر کم ہے کہ صیاد نے پسند کیا

جوشِ وحشت میں جو مجنوں نے اُڑایا تھا غبار
خود وہ اُٹھ اُٹھ کے حجابِ محملِ لیلیٰ ہوا

زلف پُر پیچ میں ہر حلقے میں اک دل لیکر
کوئی محفل سے اُٹھا رونقِ محفل لے کر

۱۹۴۰ء کے قریب مظہری کی غزلیہ شاعری میں ایک موڑ آیا اور اُن کے اشعار میں جہاں دُنیائے فکر کی نئی جہات کا اضافہ ہوا، وہیں اُن کی لفظیات میں بھی نمایاں تبدیلی آئی۔ "فکرِ جمیل" کے پہلے حصے "عرفان و وجدان" میں شاملِ غزلوں میں جہاں وہ غزل کے مروّجہ مضامین و اسالیب کو برتتے ہیں، وہیں ان کے تغزل میں رفتہ رفتہ جگہ پانے والا اُن کا فکری رجحان اُن کے موضوعات کو ایک نیا اعتبار اور اُن کے اسلوب کو ایک نیا آہنگ عطا کرتا ہے۔ چنانچہ وہ موضوعاتی اعتبار سے اس قسم کے مضامین بھی اپنے اشعار میں لانے کی جانب مائل نظر آتے ہیں:

اگرچہ جبر ہے، یہ بھی مگر غنیمت جان
کہ ایک جذبۂ بے اختیار دے تو دیا

صفات بخشتا، مکان بخشتا، جگہ جگہ اک حرم بنایا
ہماری صورت گری نے آخر خدا کو بھی اک صنم بنایا

جو نشیب آئے گا راستہ دکھائے گا
موڑ خود بتائے گا آدمی کہاں جائے

اے میرے خدا جس مٹی سے جباروں کے دل بنتے ہیں
اس مٹی میں مجبوروں کے کچھ آنسو بھی شامل کر دے

کارواں آ ہی گیا تا بہ سوادِ تشکیک
منزل اب زحمتِ یک گام ہوئی جاتی ہے

یہ اور ایسے کئی دوسرے موضوعات جو مظہری کے غزل کی روایت سے حاصل نہیں ہوئے ہیں، اُن کے اشعار کو ایک نئی فکری جہت دینے کا ذمہ دار بنتے ہیں۔ فکر و نظریے کا یہ "نیا میلان" دراصل زندگی کے ایک وسیع تر شعور کا نتیجہ ہے جسکے پسِ پشت کچھ حد تک اُن ترقی پسندانہ رجحانات کا بھی ہاتھ ہے جنہوں نے ۱۹۳۶ء کے بعد کے اُردو ادیبوں کو سماجی مقصدیت سے روشناس کیا اور تخلیقی ادب میں مادی زندگی کی حقیقتوں اور سماجی نظام کی کشمکشوں پر غور و فکر کی طرح ڈالی۔ مظہری نے ان میلانات کو قبول تو کیا لیکن یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اُن سے مغلوب نہ ہوئے۔ چنانچہ نئے تقاضوں کے تحت انہوں نے جو تخلیقی ناآسودگی محسوس کی اُس کا انھوں نے اپنے بعض اشعار میں ذکر کیا ہے، مثلاً

دارو جگر سے طلب کی ہے ہر اپنا خراج

وہ ایک تلخ حقیقت جو شاعری نہ رہی

تمہاری اس غزلیت کو کیا کہوں میں جمیل
جو فلسفہ نہ رہی اور شاعری نہ رہی

مظہری نے اس نئے رجحان کے تحت یہ محسوس کیا کہ :

کو غل مچا رہے ہیں غلامانِ آفتاب
ہے شاعری کنیزِ شبستان ابھی تلک

اور انہوں نے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ :

جمیل خنکیٔ مرہم کا میں نہیں قائل
جراحتوں کو نمکداں دکھا رہا ہوں میں

چنانچہ اس دَور میں انھوں نے شاعری کو فکرِ انسان کو سُلانے کا نہیں بلکہ اس کو بیدار کرنے کا وسیلہ بنانا چاہا ؎

ساز اُٹھا مغنّیہ، چھیڑ جمیل کی غزل
آگ بھڑک دے ہر طرف شعلہ فشاں رُباب ہے

لہٰذا بیداری اور بیدار کرنا اور اُس سے تعلق رکھنے والی لفظیات 'جرس'، نالہ، فغاں، چیخ وغیرہ اُن کے کئی اشعار میں شامل نظر آتے ہیں :

جرس ہوں میں، مرا نالہ مری طبیعت ہے
یہ کیوں کہوں کہ کسی کو پکارتا ہوں میں

مری فغاں سے شکایت ہے سونے والوں کو
مرا گناہ یہی ہے کہ جاگتا ہوں میں

یہی سے ہے کہ فضا کی ٹھنڈک تو کارواں سارا سو نہ جائے
جرس سے کہدو کہ اور چیخے جمیل کو نیند آ رہی ہے

اس بیداری کے ساتھ ساتھ۔ دوسرے ترقی پسند شعرا کی طرح، مظہری بھی ایک نئے دَور کی آمد کو محسوس کرتے ہیں اور اُس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ پُرانے دَور کے لئے تاریکی، ستاروں اور رات اور دَور کے لئے روشنی اور سورج کی علامات اُن کے کئی اشعار میں اُبھر کر آتی ہیں ؎

چلا نہ شمعوں کا زور جس پر، بنی ستاروں کی قبر جس میں
تپش دلوں کی اسی اندھیرے کی ایک سورج اُگا رہی ہے

تیرگی کے مُنہ لگے آنسو ہیں یہ دھندلے انجم
اللہ رے مانگ اپنی سجائے گا شبستاں کب تلک

نظروں کو بُھلاتا ہے شبستان کا منظر
سورج کی طلب ہے تو بجھا دو یہ ستارے

بس کہ سورج کی نیابت تھی بڑی ہمت کا کام
بجھ گئے شمعوں کے دل رنگِ شبستاں دیکھ کر

سیاہیاں بُن رہی ہیں راتیں، تجلیاں گڑھ رہی ہیں سورج
خدا و ابلیس کی شراکت میں چل رہا ہے یہ کارخانہ

اِن ستاروں کی اُجالوں میں ضرورت کیا ہے
جو اندھیرے میں چراغِ رہِ فردا نہ بنے

اُجالے کے پجاری مضمحل کیوں ہیں اندھیرے سے
کہ یہ تارے نکلتے ہیں تو سورج بھی اُگلتے ہیں

اس طرح مظہری کے لہجے میں جو ایک نقیبانہ آہنگ پیدا ہوتا ہے وہ ہر ایسے اندازِ فکر اور ہر ایسے رجحان کی نفی کرتا ہوتا ہے جو زندگی کے ولولے سے عاری اور انفعالیت کی جانب مائل ہو۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں :

کر جو رہے ہیں کسبِ فیض سراب سے
دیں گے وہ تشنگی کو کیا لینگے وہ کیا سحاب سے

وہ حسن پرستی کو بھی زندگی کے عملی کردار سے گریز کا عذر نہیں بننے دینا چاہتے

میرا ذہن افسردہ حُسن کے تصور میں
جیسے چھاؤں میں راہی تھک کے بیٹھ جاتا ہو
حُسن اِک کھلونا ہے شوق کی نگاہوں میں
لیکن اے نظر والو عشق کیوں کھِلونا ہو

چنانچہ ان کے لئے غمِ محبت توسیع پاکر غمِ زمانہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے ؎

تمہاری جوہر شناسیوں نے دیا تھا مجھکو غمِ محبت
ہماری وسعت پسندیوں نے بنایا اس کو غمِ زمانہ

وہ جانتے ہیں کہ ؎

بدل جاتے ہیں دل، حالات جب کروٹ بدلتے ہیں
محبت کے تصور بھی نئے سانچوں میں ڈھلتے ہیں

محبت تو طلب کی راہ میں اک ایسی ٹھوکر ہے
کہ جس سے زندگی کی ریت میں زمزم اُبلتے ہیں

نہ آ اے عشق ادھر اپنی بہارِ رنگ و بو لے کر
کہ اس گلزار کی ہر شاخ میں اب زخم پھلتے ہیں

وہاں تیری شبِ غم کی درازی کون ناپے گا
جہاں فاقہ کشوں کے دن بڑی مشکل سے ڈھلتے ہیں

گئے وہ دن کہ جب زخمِ تمنا گل کھِلاتا تھا
کہ اب تو زندگی کے کھیت انگارے اگلتے ہیں

پرانے نظام کو تہ و بالا کر دینے اور ایک نئے نظام کی تعمیر کے لئے اس نئے جوش و ولولے کے واسطے مظہری نے اپنے ہمعصر ترقی پسند شعرا کی طرح آگ، شعلے اور طوفان کے الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے ؎

دلوں کی آگ تہذیبوں کے خرمن پھونکتی ہوگی
اندھیرے نوحہ گر ہونگے، دھواں افسانہ خواں ہوگا

فطرت سے کبھی ہضم نہ ہوگی یہ کھُلی آگ
پیتے ہیں جو آنسو وہی تھوکیں گے شرارے

کیف و کم کی دُنیا میں کیوں کبھی نہ ایسا ہو
ہر چراغ میں روغن، ہر جگر میں شعلہ ہو

دلوں کے ناخدا اُٹھ کر سنبھالیں کشتیاں اپنی
بہت سے ایسے طوفاں مظہری کے دل میں پلتے ہیں

جوشِ انقلاب اور عزمِ عمل کو ظاہر کرنے کے لئے سفر، کارواں، طوفان، سیلاب اور دھارے کے تصورات سے مظہری نے اپنے اشعار میں بار بار مدد لی ہے ؎

اے شوق سلامت رہیں یہ وقت کے دھارے
تنکوں کا سفر ہے انھیں موجوں کے سہارے

غبار اُٹھ اُٹھ کے سست قدموں کو انکی منزل دکھا رہا ہے
ہوا کی رفتار کہہ رہی ہے کہ قافلہ ہو چکا روانہ

اس جوشِ عمل کی بُنیاد ایک اُمید اور حوصلے پر ہے اور اسی رجائیت نے مظہری کی شاعری میں ذوقِ عمل کو ایک نیا ولولہ عطا کیا ہے ؎

قلبِ تیرۂ شب میں رازہے تجلّی کا
جیسے غم زدہ دل میں اعتبارِ فردا ہو

پاس آکے ہٹ جائے جو ندی جمیل اُس سے
وہ سراب اچھا جو دُور سے بُلاتا ہو

لکھے نہ کیوں نقشِ پائے ہمت قدم قدم پر مرا افسانہ
میں وہ مسافر ہوں جسکے پیچھے اَدب سے چلتا رہا زمانہ

تم تو صحرا میں کبھی ہوتے رہے قربانِ سراب
ہم تو موجوں کے کبھی عاشق لبِ دریا نہ بنے

اسی اُمید اور بیداری کے نئے دَور کا مزاج سمجھتے ہوئے مظہری نے نہ صرف ایک نئے سلسلۂ اقدار کو اپنانے کی ضرورت سمجھی ہے بلکہ اس کے تحت انھیں ایک نئی شعری جمالیات کی بھی احتیاج معلوم ہوئی ہے۔ پہلے وہ کہتے ہیں:

وقت وہ ہے کہ نگاہوں کو ہے احساسِ قصور
وقت وہ ہے کہ طلسماتِ بصیرت ٹوٹے

وقت وہ ہے کہ گرے عقل ترا رنگ محل
وقت وہ ہے کہ صنم خانۂ حیرت ٹوٹے

وقت وہ ہے کہ بدل جائے تمنّا کا مزاج
دل کا سودا ہو گراں، حُسن کی قیمت ٹوٹے

وقت اب وہ ہے کہ صدیوں کا طلسمِ تاویل
ٹوٹے اور آج یہ ایمائے سنیت ٹوٹے

... ... ہے کہ ... کے ... سے جمیل
ایک مدت یہ سکوتِ لبِ قدرت ٹوٹے

اور پھر انہیں ایک نئے شعری مزاج کی ضرورت محسوس ہوتی ہے:

نہ یہ کیفِ سخن ہوگا، نہ یہ سوزِ بیاں ہوگا
ترے افسوں یہی ہوں گے تو افسانہ کہاں ہوگا

فن اپنے سے خجل ہوگا، سبک شاعر کا دل ہوگا
ترنم منفعل ہوگا، تبسم رائیگاں ہوگا

یہی موسم رہا تو اے بہشتِ ذوقِ گل چینی
چمن کے پھول کا اِک ایک تنکا گراں ہوگا

انہیں جھونکوں کی کوشش سے وہ دن بھی جلد آئیگا
کہ جب آندھی کی زد میں اعتبارِ دوجہاں ہوگا

ہم اس دن بھی اپنے مستقبل کی قدریں ناپتے ہوں گے
ہمارے ہاتھ میں پیمانۂ سود و زیاں ہوگا

چنانچہ جمیل مظہری نے "خلافِ رسمِ تغزل" کو اپنی ۱۹۴۰ء کے بعد کی شاعری میں موضوع اور لفظیات دونوں اعتبار سے اپنایا۔ انھوں نے اپنی غزل میں زندگی کے ایک اُمید پرور، ترقی آشنا، باعمل تصوّر کو جگہ دی، غمِ جاناں پر غمِ روزگار کو فوقیت دی اور غزل کے داخلی مزاج کو سماجی مسائل کا حل آہنگ بنایا۔ جذبے کی ہلچل اور تخیل کی طلسماتی رنگا رنگی کی جگہ انھوں نے فکر و احساس کی آمیزش سے ایک ایسا دلآویز مواد تیار کیا جو کہ غزل کی ہیئت کے لئے غیر روایتی حیثیت رکھتا تھا۔

اس نئے رجحان کو اظہار بخشنے کے لئے انھیں ایک غیر رسمی لفظیات کی بھی ضرورت پڑی اور انہوں نے غزل میں کئی ایسی تمثیلات، تشبیہات، علامات اور الفاظ کا استعمال کیا جنھیں اُردو غزل کی روایت سے تائید حاصل نہیں تھی۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

سوچتا کیا ہے کدال اپنی اُٹھا اے گورکن
میّتِ تہذیب بارِ دوشِ امکاں کب تک

مغفوریت کا کفر تو ٹوٹا مگر جمیل
جمہوریت ہے فتنۂ دَوراں ابھی تلک

اے مرے وطن تجھ میں دلِ غریب شاعر کا
جھونپڑی میں مفلس کی جیسے سرد چولھا ہو

کردار، مغفوریت، جمہوریت، اور جو لہا ہی مظہری کی شاعری میں خلافِ رسمِ تغزل نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ اوپر پیش کی گئی مثالوں سے ظاہر ہے، انہوں نے جرس و کارواں، نالہ و فغاں، سورج اور ستارون، سراب و صحرا، طوفان و سیلاب، شعلہ و آتش کے ذریعہ بھی ایک نئے سلسلۂ خیال کو پیش کرنے کی روایت کو مستحکم کیا ہے۔

مظہری نے ترقی پسند روایت کو اعتبار بخشنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ وہ اس نئے رجحان کی انقلابی معنویت کو پہچانتے تھے اور انھوں نے اُسے اپنے ادبی لائحہ عمل کی حیثیت سے قبول کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں ؎

یہ کس کے ذہنِ رسا کے سائے میں پل رہے ہیں نئے تصور
یہ کس کے جوشِ عمل کے سانچے میں ڈھل رہا ہے نیا زمانہ
یہ کس کے افسونِ ادّعا نے طلسمِ صدیوں کے توڑ ڈالے
اُجڑ گئیں ساری بارگاہیں، پلٹ گیا سارا کارخانہ
تصورِ رنگ و بو بھی بدلا، طبیعتِ آب و گِل بھی بدلی
فسانے بننے لگے حقیقت، حقیقتیں بن گئیں فسانہ

چنانچہ ترقی پسند رجحان سے وابستگی نے جہاں مظہری کے تغزل میں نئے رنگ و آہنگ کی گنجائش پیدا کی ہے وہیں اس نے اُن کی بے باک فکر کو نیا اعتماد اور خیالِ رسا کو ایک نئی گہرائی عطا کی ہے۔ اُن کے کلام میں جو اندازِ رندانہ پہلے سے موجود ہے اُس میں ترقی پسند میلان نے ایک حکیمانہ اعتبار پیدا کر دیا ہے۔ ترقی پسند رجحان اس طرح مظہری کے خلّاق ذہن کے لئے ایک اہم تحریک کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔

لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ مظہری کا شعری کردار محض اقتدا سے مرتب نہیں ہوتا۔ ترقی پسند اثرات کے دَور کی ہی وہ غزلیں جو "فکرِ جمیل" میں "عرفان و وجدان" کے عنوان کے تحت یکجا کی گئی ہیں، یہ ظاہر کرتی ہیں کہ انھوں نے "رسمِ تغزل" کو بھی پورے خلوص سے نبھایا ہے اور نئے فکری اعتبار اور تغزل کی روایت کے متوازن میل سے مظہری کے غزلیہ اشعار میں ایک منفرد فنّی وقار پیدا ہوا ہے۔ "عرفان و وجدان" کی غزلیں بڑی حد تک مظہری کے منفرد لہجے کی نمائندگی کرتی ہیں اور اُن سے مظہری کے تخلیقی شعور کی حدود کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے باوجود "آہنگِ نو" کی غزلیں اس لحاظ سے ایک مرکزی اہمیت کی حامل ہیں کہ وہ مظہری کی اس تخلیقی کاوش کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جس کے تحت انھوں نے تغزل کے رسمی دائرے سے باہر نکل کر موضوع و اظہار کی نئی گہرائیوں کو اپنے تخلیقی شعور کا حصّہ بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ مظہری کا "خلافِ رسمِ تغزل" اس طرح ان کی شعری انفرادیت متعین کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

٭٭٭


فن تعمیر کا حسین وجمیل مرقع
جامع مسجد شاہجہانی دہلی
فن دواسازی اور کیمیاوی تجربے
کی حسن افزا تخلیق
رجسٹرڈ
سندری سہاگ
تیل
ایس۔ اے۔ بی بخشی کمپنی ۳۲ لولو لولر اسٹریٹ کلکتہ

ڈاکٹر مظفر حنفی

جمیل مظہری کے قصیدے

جمیل مظہری کی شخصیت خاصی پہلو دار تھی ۔ وہ ایک اچھے معلم اور صاحبِ نظر دانشور تھے ۔ انہوں نے انشائیے اور فکاہیہ مضامین بھی لکھے اور افسانہ نگاری بھی کی ۔ کچھ تنقیدی مضامین بھی ان کے قلم سے نکلے جن سے ان کی گہری بصیرت کا اظہار ہوتا ہے ۔ اصنافِ شاعری میں بھی وہ ایک جو تکھے فن کار تھے ۔ انہوں نے غزل، نظم، مثنوی، رباعی، فلمی نغمے، قصیدہ، سلام اور مرثیے تقریباً ہر صنفِ شعر میں خلّاقی کے جوہر دکھائے ہیں ۔ اُن کے شعری مجموعے "نقشِ جمیل"، "فکرِ جمیل"، "وجدانِ جمیل" اور "عرفانِ جمیل" منظرِ عام پر آچکے ہیں ۔ ان کی قصیدہ گوئی پر اظہارِ خیال کرنے کے لئے مجھے بیشتر عرفانِ جمیل تک محدود رہنا پڑا ہے کیوں کہ وقت کی کمی کے باعث دوسرے مجموعہ ہائے کلام تک میری رسائی ممکن نہیں ہو سکی ۔ ظاہر ہے کہ اُن میں (بطورِ خاص 'وجدانِ جمیل' میں) کچھ اور بھی قصائد شامل ہوں گے ۔ اور ممکن ہے کہ اُن کا رنگ و آہنگ "عرفانِ جمیل" میں شامل قصائد سے قدرے مختلف ہو ۔

اُردو قصائد کا مطالعہ ہمیں بڑے دلچسپ نتائج تک پہونچاتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ مختلف اصنافِ سخن کے عروج و زوال کا تعلق ان ادوار سے بہت گہرا ہوتا ہے جن میں یہ پروان چڑھتی اور اپنے عہدِ شباب کو پہنچتی ہے ۔ مثلاً مثنوی کے لئے سکون، اطمینان اور فارغ البالی درکار ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صنفِ سخن دکن میں اس دور میں پھلتی پھولتی ہے جب سلاطینِ دکن مغل بادشاہوں کی لشکر کشی اور یلغار سے نسبتاً محفوظ تھے ۔ اسکے برعکس مغلیہ سلطنت کے عہدِ زوال کے دوران شمالی ہند میں دبستانِ دہلی کے شعرا نے مثنوی میں کوئی بڑا کارنامہ پیش کیا ہے اور آگے چل کر لوا بینِ اودھ کے دور میں جب معاشرہ نسبتاً خوش حالی سے دوچار ہوا اور چند بائیوں کے لئے اطمینان اور سکون سے آشنا ہوا تو 'سحر البیان' اور 'گلزارِ نسیم' جیسے شہ پارے وجود میں آئے ۔ یہی صورتحال مرثیے کے ساتھ رہی جسے اُردو کے ابتدائی دور میں ایک خاص عقیدہ رکھنے والے عوام کی اکثریت اور درباری پشت پناہی نے دکن میں جنم دیا اور ایسے ہی عوامل نے لکھنؤ میں اس صنفِ سخن کو بامِ عروج پر پہونچا دیا ۔ غزل کو شکست و ریخت اور انتشار کا زمانہ زیادہ راس آتا ہے چنانچہ مختلف ادوار میں اس نقطۂ نظر سے صنفِ غزل کے ارتقا کا بآسانی جائزہ لیا جاتا ہے ۔ قصیدہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک عظیم الشان دربار، جلالت مآب حکمراں، مستحکم سلطنت اور متمول معاشرے کا مطالبہ کرتا ہے ۔ اس صنفِ سخن کی محرومی دیکھیے کہ اس نے اُردو میں آنکھ کھولی تو دکن کی ریاستیں تقریباً تاراجی کی منزل کو پہنچنے والی تھیں اور دوسری طرف شمالی ہند میں سلطنتِ مغلیہ زوال کی صعوبتوں میں داخل ہو رہی تھی ۔ ہمارے

سب سے بڑے قصیدہ گو سودا کو جو زمانہ نصیب ہوا وہ آخری عظیم مغل بادشاہ عالم گیر کے انتقال کے بعد کا دور ہے، جب تخت مغلیہ اکبر اور اس جیسے دوسرے باصلاحیت اور پُر جلال حکمرانوں کی سرپرستی سے محروم ہو چکا تھا اور شاہ عالم جیسے کٹھ پتلی قسم کے حکمران اس تخت پر براجتے تھے، جن کی حکومت ایک کہاوت کے مطابق دلی سے پالم تک سمٹی ہوئی تھی۔ ایسے دور میں کمزور والیانِ ریاست اور نام نہاد روسائے مملکت کی شان میں قصیدے کہنے کے لئے شاعر کے پاس حقیقی واقعات اور سچے کردار کی جگہ لے دے کے زورِ تخیل اور مبالغہ جیسے حربے ہی رہ جاتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسے مصنوعی اوزاروں سے کام لیکر سودا اور ذوق نے شاہ عالم اور بہادر شاہ جیسے نام نہاد بادشاہوں کی شان میں قصیدے کے بلند و بالا ایوان تعمیر کر ڈالے۔ ایسی تخلیقی شان، قوتِ بیان اور قدرتِ کلام رکھنے والے قصیدہ نگاروں کو اگر اکبر جہانگیر اور شاہجہاں جیسے ممدوح نصیب ہوئے ہوتے تو اردو قصیدہ فارسی سے یقیناً کئی ہاتھ بلند نظر آتا۔ ہمارے قصیدے پر تصنع اور مبالغے کی تہمتیں عائد کرنے والے ناقدین کو ان پہلوؤں پر بھی کبھی کبھی غور کر لینا چاہیئے۔ میری اس بات کے جواز میں اردو کے ہجویہ اور مذہبی قصائد بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ جن میں مولانا حالی کے پسندیدہ خصوصیاتِ شعر ــــ سادگی، اصلیت اور جوش کی کمی نہیں ہے، کیونکہ ہجویہ قصائد بہر حال اپنے معاشرے کے خام پہلوؤں کی مذمت کی غرض سے لکھے گئے تھے۔ اور مذہبی قصائد کے ممدوحین کی شان اور کردار کی امتیازی خصوصیات ظاہر ہے کہ کسی دور میں روبہ زوال نہیں ہوتیں تاوقتیکہ عوام کا عقیدہ ہی کمزور نہ ہو جائے۔ البتہ اسے کیا کیا جائے کہ بقول رشید احمد صدیقی " اردو ایک تہذیب کا نام بھی ہے" اور اس تہذیب میں کسی کی برائی کرنا گناہ میں داخل تھا۔ دوسرے ہماری زبان بیگماتی زبان رہی ہے جہاں مردوں کے لہجے میں دانشگاف انداز میں گفتگو اسکے لسانیاتی مزاج کے خلاف جاتی تھی، چنانچہ سودا کی ہجویات ہمارے ادب میں وہ بلند مرتبہ حاصل نہ کر سکیں جو کہ عربی جیسی مردانہ زبان کے ہجویہ قصائد کو حاصل تھا۔ اپنے ہجویہ قصائد کے لئے سودا کو تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے جس طرح ہدفِ ملامت بنایا اس سے آئندہ نسلوں کے شاعروں نے عبرت پکڑی اور نتیجے میں ہجویہ قصائد کا سلسلہ زیادہ دور تک نہ جا سکا۔ مدحیہ قصیدہ، جہاں تک اس کا تعلق حکمرانوں اور رئیسوں سے تھا، شخصی حکومتوں اور ریاستوں کے خاتمے کے ساتھ آخری سانسیں لیکر رخصت ہوا۔ لے دیکر بزرگانِ دین کی شخصیتیں باقی رہیں جن کی روحانی سلطنتوں کو اس وقت تک زوال نہیں ہوتا جب تک کہ اکثریت کے عقیدے ہی متزلزل نہ ہو جائیں۔ سو یہ بھی ہوا۔ انگریزی زبان کے غلبے اور مغربی علوم و فنون سے واقفیت نے قدیم اعتقادات کی جڑیں اس طرح ہلا ڈالیں کہ اہلِ ادب فنِ شعر میں مذہب کو سمتِ ممنوعہ سمجھ بیٹھے اور آزادیٔ ہند کے بعد نوبت بہ ایں جا رسید کہ مرثیے اور مذہبی قصیدے کو ہاتھ لگاتے ہوئے بڑے بڑے شاعروں کے حوصلے چھوٹ جاتے تھے۔ ایسے میں چند استثنائی صورتیں ــــ جوش، نجم آفندی اور جمیل مظہری کے قالبوں میں نظر آ جاتی ہیں جن کے دم سے موجودہ نسل ان اصنافِ سخن کے ذائقے سے لذت یاب ہو سکے۔

"عرفان جمیل" میں کتاب کا ایک حصّہ قصائد کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس میں شامل تخلیقات کے عنوانات ہیں حدیثِ دلبری، تضمین، میخانۂ کوثری، طلوعِ سحر، مداح اور ممدوح، زمزمۂ عرفان، فیضانِ امامت، اور

پیامِ وفا"۔ میرا خیال ہے کہ مرتبین نے "اس حصّے میں "تضمین" شامل کر کے قصیدے کی ہیئت سے بغاوت کی کوشش کی ہے۔ اس مخمّس کو نظموں کے حصّے میں جگہ ملنی چاہئے تھی۔ باقی ماندہ سات قصیدے شاعر کے مذہبی ہیں یعنی یہ ساتوں قصیدے شاعر کے مذہبی رجحانات اور اعتقادات کے ترجمان ہیں۔ جمیل مظہری کے ممدوحین میں پیغمبرِ اسلامؐ، حضرت علی کرم اللہ وجہٗ، امام حسینؑ، اور امام حسنؑ شامل ہیں۔

عام طور پر قصائد کے مطلعے جس طنطنے اور شکوہ کا مطالبہ کرتے ہیں، جمیل مظہری کے قصائد میں اُن کا فقدان ہے۔ اس کے برعکس، ان قصیدوں کے مطلعے ایک خاص نوع کی ملائمت، لطافت، اور خود سپردگی کا سا انداز رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ مطلعے ملاحظہ ہوں:

بزمِ جہاں میں بلند غلغلہ ہائے زرگری
اے دلِ درد آشنا چھیڑ پریم بانسری
(حدیثِ دلبری)

کفِ نکل دیکھ کر رندوں رندوں کو پیمانہ
الٰہی خیر تو بہ کی عجب موسم ہے رندانہ (مے خانۂ کوثری)

طلوعِ صبح کا منظر عیاں ہے آج چلمن سے
تجلّی چھن رہی ہے آفتابِ روئے روشن سے (طلوعِ سحر)

نہ اس صحرا نے پہچانا نہ اس صحرا نے پہچانا
غبارِ قیس مجھ کو کوچۂ لیلےٰ نے پہچانا (زمزمۂ عرفان)

سوچ رہا ہے چپ کھڑا رہروِ راہِ ارتقا
چار طرف ہے منظری سلسلہ ہائے نقشِ پا (فیضانِ امامت)

مطلعوں کی یہ جمالیاتی کیفیت صرف قصیدوں کے آغاز سے ہی متعلق نہیں ہے، مختلف قصائد میں درمیان میں تازگیٔ بیان پیدا کرنے کے لئے جمیل مظہری نے اکثر جو مطلع ہائے ثانی و ثالث استعمال کئے ہیں، اُن کا مزاج بھی اوّلین مطلعوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس طرح جمیل مظہری، سوداؔ اور ذوقؔ جیسے بلند آہنگ قصیدہ گویوں کی صف سے کٹ جاتے ہیں اور مزاجی اعتبار سے اپنا سلسلہ عزیزؔ لکھنوی اور محسنؔ کاکوروی جیسے نرم رو قصیدہ نگاروں سے جوڑتے ہیں، البتہ ایک استثنائی صورت ان کے قصیدے "مداح اور ممدوح" میں نظر آتی ہے جو غالبؔ کی زمین میں لکھا گیا ہے۔ اس پر ہم علاحدہ گفتگو کریں گے اور اسی ذیل میں ان کا قصیدہ "فضیلتِ خاک" بھی آتا ہے (جو "عرفانِ جمیل" میں شامل نہیں) جس کا مطلع نہایت پُرتمکنت اور باوقار ہے۔

جمیل مظہری کے قصائد کی تشبیبیں، قصیدے کی روایتی تشبیب سے مختلف ہیں۔ بیشتر تشبیبیں فلسفیانہ تفکر اور حکیمانہ خیالات پر مشتمل ہیں۔ "مے خانۂ کوثری" میں شاعر نے بہاریہ اور رندانہ تشبیب پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن چونکہ یہ رنگ جمیل مظہری کے مزاجِ شعر سے لاگ نہیں کھاتا اس لئے اس تشبیب میں کوئی خارجی منظر اور بہاریہ پیکر صاف اور روشن نظر نہیں آتا بلکہ یہاں بھی جمیل مظہری کا سوچتا ہوا ذہن اور متجسس طبیعت اپنی جھلک دکھاتی ہے اور خارجی مناظر کی دھندلی سی تصویر سے داخلی احساسات اور فکری ارتعاشات کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ عام طور پر قدمانے قصیدے کی تشبیب کو اپنی علمیت اور فضیلت کا آئینہ دار بنایا ہے۔ درباری قصیدے کے لئے یہ وصف لازمی بھی تھا جہاں ملِکُ الشعرائی حاصل کرنے کے لئے قصیدہ گو کے لئے مختلف علوم و فنون میں اپنی مہارت اور ہمہ دانی کا ثبوت فراہم کرنا ضروری تھا۔ اسی لئے قصیدے کے ناقدین نے یہ شرط لگائی تھی کہ تشبیب کو مدح سے طویل تر نہ ہونا چاہیے۔ بہ صورتِ دیگر قصیدہ گو ممدوح کی ثنا خوانی سے زیادہ تشبیب میں اپنی تعریف کے مواقع پیدا کرتا۔ اوّل تو

جمیل مظہری کے قصیدے دربار میں پیش کرنے کی غرض سے نہیں لکھے گئے تھے۔ دوسرے اُن کے ممدوح بزرگانِ دین ہیں اس لئے ان تشبیبوں میں غیر ضروری مبالغے، موشگافیوں اور ترکیب سازی سے کام نہیں لیا گیا، البتہ چونکہ جمیل مظہری کی تشکیک انہیں الحاد کے خار زاروں میں بھی لے گئی تھی جہاں سے انکا خلوص اور نیک نیتی انہیں عقیدے کی نرم چھاؤں میں لے آئی، اس لئے اُن کے ذہنی سفر کے نشیب و فراز اور تشکیک و اعتقاد کی دھوپ چھاؤں کا عکس ان کے قصائد کی ان تشبیبوں میں جلوہ گر ہے۔ بے ثباتیِ دُنیا، زمانے کی ناقدر شناسی، درویشانہ قناعت پسندی، عظمتِ عشق، انسان دوستی اور اسی قبیل کے حکیمانہ اور اخلاقی مسائل پر مشتمل اشعار جمیل مظہری کی تشبیبوں کو ان کے پیش روؤں کے قصائد سے ممتاز بناتی ہیں۔ یہاں مغلق الفاظ، پیچیدہ تراکیب، لہجے کی گھن گرج، جزالت و ثقالت اور قصیدے سے متعلق اسی قسم کے دوسرے لوازمات سے ہمارا سابقہ کم پڑتا ہے۔ ان تشبیبوں میں ہمیں اپنے عہد کے فکرمند اور نرم دل شاعر کے احساسات و خیالات ملتے ہیں۔ کہیں کہیں ایسا بھی محسوس ہوتا ہے جیسے قصیدہ گو کی بڑھی ہوئی عقیدت نے صبر و تحمل کا دامن چھوڑ دیا ہے اور تشبیب میں ہی مدح سرائی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر جمیل مظہری کی گریز اتنی برجستہ، بے ساختہ اور تحیر خیز نظر نہیں آتی، کیوں کہ مٹھی وقت سے پہلے کھل چکی تھی جس نے قاری کو اس خوشگوار استعجابی کیفیت سے لطف اندوز نہ ہونے دیا جو تشبیب کو مدح کی آمیزش سے پاک رکھنے کی صورت میں پیدا ہوتی۔ گریز کے چند اشعار دیکھیے:

دیر تو خیر دیر ہے، خاکِ حرم کو بھی سلام
اب تو ہے قبلۂ وفا، خوابِ گہہ پیغمبری (حدیثِ دلبری)

سُنا ہے میکدے میں جشن ہے میلادِ ساقی کا
چلیں اور چل کے ہو جائیں شریکِ دورِ پیمانہ (مے خانۂ کوثری)

اے یہ خوشا انتساب، جواہرِ زینب خطاب
از لقبِ بوتراب، دخترِ حیدر ہے خاک (فضیلتِ خاک)

کون وہ کون؟ وہی دشتِ عرب کا رہبرؐ؟
وقت کی گرمیِ رفتار بڑھانے والا؟
(ایک ناتمام غیر مطبوعہ قصیدہ)

گریز کے مندرجہ بالا اشعار متعلقہ قصیدوں میں جن مقامات پر برتے گئے ہیں وہاں ربط اور تسلسل تو پیدا کرتے ہیں لیکن تحیر اور انوکھے پن کے حامل نہیں ہیں۔ مدح کے باب میں مظہری کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے پُر تقدس اور جلیل القدر ممدوحین کی ثنا خوانی میں کم سے کم مبالغہ کرتے ہیں۔ مذہبی شخصیتوں سے فن کار اور پڑھنے والوں کو جو گہری عقیدت ہوتی ہے، اس کے پیشِ نظر قصیدے میں ہر مبالغہ، قرینِ قیاس نظر آتا ہے اس لئے مذہبی قصائد میں سوداؔ سے غالبؔ تک ہر قصیدہ گو نے تخیل آفرینی اور مبالغہ آرائی سے بڑھ چڑھ کر کام لیا ہے اس جزو میں تلمیحات، روایات، حکایات، کرامات اور معجزات کی شمولیت سے عام طور پر قصیدے کو پُر زور اور پُر شکوہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جمیل مظہری کے قصیدوں میں بھی کہیں کہیں ان عناصر سے کام لیا گیا ہے لیکن زیادہ توجہ اپنے ممدوح کی انسانی صفات، اخلاقی اقدار اور اوصافِ حمیدہ کے بیان پر صرف کی گئی ہے۔ مثلاً پیغمبرِ اسلامؐ کی تعریف میں یہ شعر ؎

اے ترے فقر کی دلیل خاک ردائے سیدہ
اے ترے زہد کی دلیل نانِ شعیرِ حیدری (حدیثِ دلبری)

حضرت علیؓ کے بارے میں یہ مطلع ؎

بغل میں ذوالفقار اور دوش پر دلقِ فقیرانہ

دلوں پر کی شہنشاہی بہ ایں وضعِ گدایانہ (مے خانۂ کوثری)

سرورِ کائنات کی تعریف میں ؎

جواں ہو کر وہ بچہ رحمتِ ہر دو سرا نکلا
امیں تو قوم کہتی تھی جسے دنیا لڑکپن سے (طلوعِ سحر)

امام حسنؑ کی مدح میں ؎

تو نے میانِ دین و دہر اک لکیر کھینچ دی
تخت کو چھوڑ کر کیا تو نے قبول بوریا (فیضانِ امام)

اور خلیفہ چہارم کی مدح سرائی میں یہ اشعار ؎

جس کا یہ قول کہ حکام کا خوانِ نعمت
ہو بہ معیارِ غذائے فقرائے مسکیں
ظلم خدام کہ گندم کو ملائیں جَو میں
قہر ہر کارکہ خالص نہیں کیوں مانِ جویں
وہی زاہد جو تقدس سے پھرالے منھ کو
گوشِ دختر میں اگر دیکھ لے در ہائے ثمیں
منزلِ رحم میں قاتل کو بھی دے کاسۂ شیر
عرصۂ عدل میں بیٹے سے بھی ہو چیں بہ جبیں
(مدّاح اور ممدوح)

مافوق الفطرت واقعات کے غائبانہ بہ شانہ مدح خوانی کا یہ حقیقت پسندانہ انداز بتاتا ہے کہ بحیثیت قصیدہ گو جمیل مظہری اپنے سامعین اور قارئین کے مذہبی جذبات اور عقیدت کی تسکین کا سامان فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اخلاق کی تربیت اور کردار کی اصلاح کا جذبہ بھی رکھتے تھے۔ جہاں انہوں نے کرامات اور معجزات کا بیان کیا ہے وہاں بھی توازن اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ جمیل مظہری کے قصائد کے مدحیہ حصّے میں ان کی تشبیب کی بہ نسبت زیادہ جوش، طنطنہ اور شوکتِ الفاظ کا اظہار ہوا ہے۔ اس حصّے میں فارسی تراکیب، علوئے خیال اور قوتِ فکری کی آمیزش نے اشعار کو جلیل اور متین قالب عطا کیا ہے۔

قصیدے کا اختتام اکثر دعا پر کیا جاتا ہے۔ جمیل مظہری کے بیشتر قصائد کا خاتمہ بھی عموماً دعاؤں پر ہوا ہے۔ جن میں ان کا خلوص اور جوشِ عقیدت دامنِ دل کو کھینچتا ہے۔ وہ ممدوح سے دنیاوی آسائشوں کے طلب گار نہیں ہوتے بلکہ قناعت پسندی، انسان دوستی اور اپنے ...... کی قربت کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔ چند اشعار مثال کے طور پر پیشِ خدمت ہیں ؎

سرِ شوریدہ کو بالینِ آسائش میسر ہو
جو سو جاؤں تری چوکھٹ پہ سر رکھ کر غریبانہ (مے خانۂ کوثری)

عطا ہو بے خودی شوق کو احساسِ خودداری
کہ جگنو بھیک جلووں کی نہ مانگے ماہِ روشن سے (طلوعِ سحر)

اب آیا ہوں ترے در پہ مے عرفان کی چھینٹیں دے
تری چوکھٹ کی خنکی کو سرِ سودا نے پہچانا
(زمزمۂ عرفان)

جن دو قصیدوں کا ذکر میں بطورِ خاص کرنا چاہتا تھا وہ ہیں "مدّاح اور ممدوح" اور "فضیلتِ خاک"۔ نہ صرف یہ کہ ان قصیدوں پر اکثر مقامات پر سودا کا سا طمطراق، ذوق کی سی قدرتِ الفاظ اور غالب جیسی علوئے فکر نظر آتی ہے بلکہ ان میں مذہبی شخصیتوں کے ساتھ ساتھ اربابِ دنیا کی عظمت کے ترانے بھی گائے گئے ہیں۔ "مدّاح اور ممدوح" اس اعتبار سے انفرادی شان رکھتا ہے کہ اس میں بیک وقت حضرت علی کرم اور غالب کی مدح کا پہلو ایک ساتھ نکالا گیا ہے۔ اس دوسرے قصیدے کی اساس غالب کے قصیدے "دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں" پہ ہے۔ جو حضرت علی کرم کی منقبت میں لکھا گیا تھا جو جزالت اور گہرائی کے لحاظ سے یہ قصیدہ بے مثل ہے۔ جمیل مظہری نے نہ صرف غالب کی زمین اختیار کی بلکہ

اسی لب و لہجہ مزاج کو اس طویل قصیدے میں برت کر فنکارانہ چابکدستی اور قدرتِ کلام کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ کم و بیش ہر شعر ویسی ہی شاندار ترکیبوں سے مزین، الفاظ کے ویسے ہی تخلیقی استعمال سے مرتعش اور بلندیٔ فکر کی اسی عظمت کا نمونہ ہے جو غالب کے قصیدے کے امتیازات ہیں —— ندرت، جزالت اور جودت اس قصیدے کے ہر شعر سے نمایاں ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت علی اور ان کے مداح غالب کی ثناخوانی اس چابکدستی سے کی گئی ہے کہ قصیدے میں کہیں پیوند کاری کا احساس نہیں ہوتا۔ یہی حال "فضیلتِ خاک" کا ہے جس میں کائنات کے تمام مظاہر اور عناصر ترکیبی پر خاک کو فوقیت دی گئی ہے۔ اور اس فوقیت کا سبب مقدس اور بزرگ ہستیوں کو قرار دیا گیا ہے، اس طرح خاک کی ثناخوانی کے پہلو بہ پہلو بزرگانِ دین کی مدح کے مواقع بھی پیدا کر دیے گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ان دونوں قصیدوں کو جمیل مظہری کے شاہکار قصائد کا درجہ ملنا چاہیئے۔

"مدح اور ممدوح" کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بسکہ دشوار ہے اشیاء کی حقیقت کا سراغ
آسمان گردِ نظر، زنگِ تصور ہے زمین
عرش دیباچۂ تفصیل طلوعِ اسرار
فرش آئینۂ ابہام ظہورِ خود بیں
کون دے دیدۂ حیراں کے سوالوں کا جواب
عالمِ نور میں سب چپ ہیں مکاں ہو کہ مکیں
اک خموشی ہے مذاہب کی زبانِ الہام
اک تحیر ہے مناظر کا سکوتِ سنگیں
حیرت آموز تمنا ہے تماشائے بہار
سر بزانوئے تعقل ہے نگاہِ گلچیں

"عظمتِ خاک" کے چند اشعار بھی پیشِ خدمت ہیں ؎

خاک نشینانِ بزم، تاجورِ مصر و شام
اور بہ نگاہِ امام تخت سے برتر ہے خاک
خاکِ کفِ پا تری، چہرۂ سلماں کا نور
سرمۂ بینائی چشمِ ابوذرؓ ہے خاک
اپنے جگر کا لہو کس نے دیا ہے اسے
جس سے توانا ہے خاک، جس سے تونگر ہے خاک
دیدۂ روح الامیں دیکھتے ہیں رشک سے
کفشِ نبی کے طفیل عرش کے اندر ہے خاک

بحیثیتِ مجموعی جمیل مظہری کے قصیدے اپنی فلسفیانہ شان، متانت، سنجیدگی، علوئے فکر، زورِ بیان، دقیقہ سنجی اور بلند پروازی کے پیشِ نظر انہیں اردو قصیدے کے آخری دور کا ایک اہم قصیدہ گو بناتے ہیں۔ قصیدوں کی شکل میں ایک مٹتی اور بجھتی ہوئی صنفِ سخن نے آخری سنبھالا لینے کی کوشش کی ہے۔



تمام عطروں کا شہنشاہ
عطر نسیم رجسٹرڈ
96
ATTAR
MAJMUA
دنیا کا
بہترین عطر
عطر مجموعہ ۹۶
96
HAMI
JUMA
& CO
MASJID
HAMI & CO BOMBAY-2.

علامہ کیف وکم کی دنیا میں

ڈاکٹر ظفر اوگانوی ــــــــ

(نوٹ: وقت کی راکھ کے نیچے جانے کتنی چاہتیں اور شفقتیں ہیں جو حافظہ کی سطح پر آنا چاہتی ہیں اور علامہ جمیل مظہری کو ہمیشہ چلتے پھرتے اور متحرک دیکھنا چاہتی ہیں۔ ویسے ان کے سینکڑوں شاگرد، بہتیرے احباب اور معتقدین بھی اسی احساس سے دو چار ہوں گے کہ علامہ کے پاس علم و فضل وجاہت اور خلوص کی دولت کی صورت میں جتنا زیادہ تھا انھوں نے اتنا ہی زیادہ تقسیم بھی کیا تھا۔ جس نے بھی علامہ کو دور و نزدیک سے دیکھنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ وہ اپنے اس دعوے میں حق بجانب ہے کہ علامہ صرف اسی کو سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ مجھے دعویٰ تو نہیں لیکن احساس ضرور ہے کہ وہ مجھے بھی بے حد عزیز رکھتے تھے۔ ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۹ء پٹنہ میں مجھے علامہ سے کسب فیض کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس کے بعد کلکتے میں جب بھی ان کا قیام رہتا تو میں حاضری دیتا۔ علامہ کی زندگی ایک کھلی لیکن ایسی وقیع کتاب تھی جس کا ہر ایک صفحہ اپنے قاری کو بہت کچھ دینا چاہتا ہے۔ سینکڑوں واقعات ہیں جو بیان چاہتے ہیں لیکن جن سے علامہ کی شخصیت کے نقوش واضح ہوتے ہیں، میں نے اس عنوان کے تحت انھیں واقعات و تاثرات کو اپنا میڈیم بنایا ہے۔ اس ضمن میں بعض تفاصیل اور جزئیات ممکن ہے بعض کے لئے غیر ضروری ہوں لیکن میرے لئے ناگزیر ہیں۔ ظفر اوگانوی۔ (۲۸-۱۱-۱۹۸۱ء)

ہم کہ چاہتوں کے حصول کے لئے در در بھٹکتے لوگ، کب، کہاں، کس کے سامنے جھولی پھیلا دیں گے، اس راستہ میں خود ہمیں بھی اس کا پتہ نہیں چلتا کہ کون کتنا مفلس اور کون کتنا دبا ہوا ہے۔ رشتے ناطے سب اسی معیار کو چاہتے ہیں، پورے اترتے ہیں اور مضبوط ہوتے ہیں۔ اور جب مزید مستحکم ہوتے ہیں تو نسلوں تک یہ خزینہ خلوص منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔ مگر ان محروم بے دست و پا لوگوں کو کیا کہئے جو جانتے ہی نہیں کہ خلوص کیا ہے۔ یہ دولت تو اللہ کے حصہ میں ہی آتی ہے جو صرف لٹانا جانتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ وہ خالی ہوتے رہیں اور بالکل خالی ہو جائیں۔ مگر ایسا ہوتا کہاں ہے۔ صورت حال تو برعکس ہوا کرتی ہے کہ یہ ظرف کبھی خالی ہی نہیں ہوتا ہے۔ تو کچھ ایسا ہے کہ جوش و فراق کے ہم عصر شاعر جمیل مظہری کے خلوص سے کتنے لوگ فیض یاب ہوئے

اور کس کس طرح ہوئے۔ اگر لوگوں میں خلوص اور بے لوثی ہو تو اس سوال کا جواب آسانی سے مل سکتا ہے۔ جمیل صاحب کے اعزا اور اقربا کو جانے دیجئے کہ ان کا تو جمیل صاحب پر ایک حق تھا۔ اور حق بھی ایسا کہ ان کے لئے متاہل زندگی کی نعمتوں سے خود کو محروم رکھنے میں علامہ ہمیشہ خود کو حق بجانب سمجھتے رہے۔ مگر وہ تنہا کبھی نہیں رہے کہ دوست احباب، شاگرد اور اقربا ان کے پاس بھی رہے کہ ان کے پاس علم کی دولت بھی تھی اور ماہانہ اخراجات کے تناسب سے تنخواہ بھی زیادہ تھی۔ ان کا اپنا خرچ ہی کتنا تھا۔ میں نے جب ان کو پہلی بار ۱۹۶۱ء میں دیکھا تو وہ اپنے دوست سید بہاء الدین (مؤلف گلستان ہزار رنگ اور پٹنہ ہائی کورٹ کے جج) کے مکان میں تھے۔ پہلی منزل پر دو کمروں کا ایک فلیٹ تھا۔ وہ تھے اور ان کی خادمہ اللہ رکھو کی ماں۔ اور خود اللہ رکھو۔ جمیل صاحب سگریٹ سے شوق رکھتے تھے معمولی برینڈ کی سگریٹ پیتے تھے۔ چار مینار یا کیپسٹن۔ یہ سب مل ملا کر اس وقت کتنا ہوتا ہوگا۔ یونیورسٹی کے سینئر استاد کی حیثیت سے آج کل کے مقابلہ میں علامہ کی تنخواہ اس وقت جتنی بھی کم ہو لیکن اس زمانہ کی گرانی کے لحاظ سے زیادہ نہ سہی مناسب ضرور تھی۔ پھر یہ کہ تین نفر پر مشتمل کنبہ کی کفالت کے لئے اس وقت ان کو جتنا ملا کرتا تھا وہ کافی تھا۔ یعنی علامہ قاسم محمود کی پوزیشن میں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شام کی چائے ہو، صبح کے ناشتہ پر یا رات کے کھانے پر کوئی دوست ہوتا۔ شاگرد ہوتا۔ ملاقاتی ہوتا ان کے دسترخوان پر کوئی نہ کوئی ہوتا ضرور تھا۔ وارث خلیل تھے وہ۔

بات دسترخوان کی نہیں ہے بلکہ علامہ کی اس وسعت قلبی کی ہے جو عام طور پر "اردو کے بڑے" لوگوں کے حصہ میں کم آتی ہے۔ یہ میرا مشاہدہ ہے۔ شاید غلط ہو۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ ۱۹۶۱ء میں جب بی۔ اے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایم۔ اے کے طالب علم کی حیثیت سے آیا تو اس وقت سے اب تک جانے کتنی بڑی شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ صحبتیں بھی میسر آئیں لیکن وسعت قلبی کا احساس مجھے اردو کی چند ہی شخصیتوں کے یہاں ہو سکا۔ ان میں ایک علامہ مظہری کی بھی شخصیت تھی۔

ایم۔ اے میں داخلہ کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں بے یار و مددگار ہوں کہ ہر ایک اسٹوڈنٹ تعارفی خط کے ساتھ یہاں داخلہ لینے آیا تھا۔ بعض اجتبیٰ رضوی کے خط کے ساتھ جمیل صاحب اور اختر اورینوی سے اپنا تعارف کرا رہے تھے کہ رضوی صاحب ان دونوں کے محب خاص تھے۔ خاص طور پر علامہ ان سے زیادہ قریب تھے۔ بہار میں شاد کے بعد اردو شاعری میں جمیل مظہری، پرویز شاہدی اور اجتبیٰ رضوی ایک تثلیث کی حیثیت رکھتے تھے۔ میرے بعض ساتھی کسی اور ذریعہ سے آئے۔ مثلاً ایک اسٹوڈنٹ اس وقت پٹنہ سے نکلنے والے ایک ماہنامہ کے مدیر کو پکڑ کر لائے۔ یہ مدیر اہل تشیع تھے اور ان کو زعم خود اس کا یقین تھا کہ وہ علامہ پر اثر انداز ہو جائیں گے۔ مدیر محترم نے تعارف کے لئے ایک اور حربہ استعمال کیا۔ کہا کہ یہ اسٹوڈنٹ ذہنی سطح پر ہمارے عقائد سے قریب ہے۔ غرض کہ حالات یہ تھے اور میری حیثیت شعبہ میں بے یار و مددگار تماشائی طالب علم کی تھی کہ میرے ساتھ کوئی تعارفی خط نہیں تھا۔ انھیں حالات میں پڑھائی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور جب ٹیوٹوریل کلاسز ہونے لگے تو محسوس ہوا کہ علامہ پر تعارفی خطوں کے ساتھ آنے والے طلبہ کا مطلق اثر نہیں ہے۔ چند ہی ہفتوں میں یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ جمیل صاحب عقائد و قرابت کو شعبہ کے حدود میں گوارا نہیں کرتے ہیں۔ میں

میں نے دیکھا کہ وہ اسی طالب علم کو عزیز رکھتے تھے جو طلب علم کے مفہوم سے واقف ہو اور اس پر عمل پیرا بھی ہو۔ ایسے اسٹوڈنٹ کی وہ بساط سے زیادہ ہمت افزائی کرتے اور مشکلات میں اس کی مدد بھی کیا کرتے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے علامہ نے پتہ نہیں مجھ میں کیا دیکھا۔ میرے چہرہ پر انھیں کون سی ویرانی نظر آئی یا کلاسز میں انھیں میری کون سی کج ادائی بھا گئی کہ انھوں نے مجھے قربت کے مواقع فراہم کرنا شروع کر دئے۔ میری اس خوش نصیبی کا نقطۂ آغاز دراصل کلاس ہی میں ہوا۔ اس کا تعلق کسی سفارش سے نہیں تھا۔ اور نہ ذرائع اور قرابتیں ... ہوئیں۔ یہ تو بس علامہ کی جوہر شناسی تھی۔ ویسے علامہ کو ایک سال بعد یعنی سال ختم میں یہ پتہ چلا کہ گیلانی (ضلع نالندہ) کے ڈی۔ ایس۔ پی جناب ظفر الحسن صاحب (جو علامہ کے زمانۂ طالب علمی سے محب خاص تھے) کے بڑے صاحبزادہ جناب ظہیر گیلانی میرے بڑے ساڑھو ہیں۔ میرا عقد میرے بی۔ اے۔ کے نتیجہ کے بعد ہی اوگانواں کے سید قاضی معین الحق صاحب کی منجھلی صاحب زادی کے ساتھ ہو چکا تھا۔ علامہ قاضی صاحب سے بھی بخوبی واقف تھے کہ موصوف کلکتے میں بغرض تجارت اپنی آخری سانس تک مقیم رہے۔ جمیل صاحب کے احباب کلکتہ میں دراصل قاضی عثمان صاحب (اوگانوی) کی ایک اہمیت تھی۔ قاضی عثمان صاحب مغربی بنگال مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری ہوئے۔ کلکتہ کارپوریشن کے ممبر بھی بنائے گئے۔ پریسیڈنسی مسلم ہائی اسکول کلکتہ کے فاؤنڈر سکریٹری بھی تھے۔ نظریاتی اختلافات کے باوجود علامہ اور عثمان صاحب دوست تھے۔ قاضی عثمان اور قبلہ قاضی صاحب اوگانوی کے ایک ہی قاضی خاندان کے افراد تھے۔ اس لئے علامہ اوگانوی کے قاضی خاندان سے نہ صرف یہ کہ واقف تھے بلکہ عزیز بھی رکھتے تھے۔ قاضی عثمان صاحب کو وہ اس حد تک چاہتے تھے کہ جب وہ کلکتہ کارپوریشن کے ممبر منتخب ہوئے تو انھوں نے "زمزمہ" کے عنوان سے پینسٹھ اشعار کا ایک سیاسی قصیدہ لکھا۔ یہ نظم "نقش جمیل" میں اس نوٹ کے ساتھ شامل ہے:

> "اگرچہ یہ قصیدہ ہے مگر چونکہ اس میں سیاسی حالات کی طرف اشارہ ہے اس لئے اس کو سیاسی نظموں میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ قصیدہ لکھ کر شاعر نے یہ ثابت کیا ہے کہ قصیدے کی صنف بھی بے کار نہیں ہے۔"

دوسری طرف قاضی عثمان اور میرے والد (مولانا سید فصیح احمد مرحوم۔ وفات ۲۱ اگست ۱۹۶۹ء) قریبی رشتہ دار بھی تھے۔ قاضی ٹولہ میں دونوں کے مکانات بھی بے حد متصل تھے۔ اور بچپن کے دونوں لنگوٹیا یار بھی تھے۔ مختصر یہ کہ بعد میں علامہ کو جیسے جیسے ان تعلقات کا علم ہوا مجھے محسوس ہوا کہ علامہ کی شفقتوں کی بنیاد کچھ اور مضبوط ہو گئی ہے۔ لیکن جب بھی تعلیمی سرگرمیوں کے مابین میری لاابالیاں حائل ہوئیں، علامہ نے بہت ہی صراحت کے ساتھ اظہار کیا کہ قرابتیں اس وقت تک ان کے لئے بے وقعت ہیں جب تک کہ فکر و نظر کے دونوں چھور قریب آنے کی کوشش نہ کریں۔ نتیجہ میں کبھی کبھی علامہ کی پرخلوص ناراضگی کا میٹھا دکھ بھی سہنا پڑا۔ لیکن یہ تو عارضی مرحلے تھے جو گذر جانے میں راستے پر آجاتا تو علامہ کی شفقتیں پہلے سے زیادہ کھل کر سامنے آجاتیں اور میں پھر نہال ہو جاتا۔

ایم۔ اے۔ میں داخلہ کے کچھ ہی دنوں بعد یہ مرحلہ پیش آیا کہ ڈسرٹیشن کے سبجیکٹ پر ... کس کی نگرانی میں کیا جائے۔ مجھ سے پوچھا گیا تو میں نے علامہ کی نگرانی میں کام کرنے پر اصرار کیا۔ موضوع کا انتخاب علامہ نے مجھ پر چھوڑ دیا۔ خدا بخش لائبریری کے کیٹلاگ

دیکھنے سے میں بہت جلد اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ مجھے صفیر بلگرامی پر کام کرنا چاہئے، کیونکہ ابھی تک کام بھی نہیں ہوا ہے۔ اور پٹنہ میں مواد بھی اچھا خاصا موجود ہے۔ علامہ سے عرض کیا تو کہنے لگے کہ کام دشوار ہے، تم سے نہیں ہوگا۔ میں نے یقین دلایا کہ مجھ پر بھروسہ کیجئے۔ کام کروں گا — راضی ہوگئے۔ لیکن جب میں نے کام شروع کیا تو لگا کہ سمندر میں غوطے کھانے لگا ہوں۔ نتیجہ میں ایم۔ اے کی نصابی کتابوں سے دلچسپی میں کمی آنے لگی۔ اس کے لئے علامہ ناراض ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک دن میں کلاس ہی میں ان کے عتاب کی زد میں آگیا۔ انھوں نے سارے طلبہ کے سامنے یہ کہہ کر مجھے رسوا کیا کہ "یہ صاحب زادے! ایم۔ اے سے پہلے ہی پی۔ ایچ۔ ڈی کر لینا چاہتے ہیں"۔ لیکن علامہ کی ناراضگی کبھی دیرپا نہیں رہی۔ وہ ڈانٹتے ڈپٹتے پھر اتنے پگھل جاتے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کچھ دیر پہلے وہ سخت غصے کے عالم میں بھی تھے۔ علامہ کس بات پر اور کس وقت غصہ میں آجائیں گے اور غصہ کس ڈگری پر ہوگا۔ پہلے سے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ ایک بار ہوا یہ کہ گرمی کے دن تھے۔ علامہ کو دربھنگہ ہاؤس (شعبۂ اردو) جانا تھا۔ تقریباً دس بجے تھے۔ میں دریاپور کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ علامہ کے پاس وہاں سے چلا گیا۔ تیار تھے کہنے لگے کہ چلو کلاس کا وقت ہو رہا ہے۔ ساتھ ساتھ گھر سے نکلے۔ رکشہ نہیں مل رہا تھا۔ ہم دونوں پیدل چلتے ہوئے سبزی باغ پہنچے۔ سڑک کراس کی۔ بانکی پور ڈاک خانہ کے پاس یہ سوچ کر کھڑے ہوئے کہ یہاں سے رکشہ آسانی مل جائے گا لیکن صورت حال یہ تھی کہ دفاتر کا وقت تھا۔ گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ کوئی رکشہ دربھنگہ ہاؤس جانے کے لئے تیار ہی نہیں ہے۔ علامہ کی بےچینی بڑھتی جا رہی ہے کہ وقت کم ہے۔ اتنے میں ایک خالی رکشہ آکر کھڑا ہوا۔ خود علامہ نے پوچھا "دربھنگہ ہاؤس جاؤگے"۔ رکشہ والے کی شامت اعمال دیکھئے کہ اس نے کہہ دیا کہ "مجھے اسٹیشن جانا ہے"۔ "اسٹیشن چلنا ہو تو چلئے"۔ غصہ کی بات تھی۔ ہیں بانکی پور اور وہ کہہ رہا ہے پچھم چلنے کو۔ علامہ کس حد تک ایک عام آدمی ہو سکتے تھے۔ اس دن مجھے اندازہ ہوا۔ رکشہ والے کا جواب سنتے ہی وہ بےقابو ہوگئے۔ اس کو ماں بہن کی بے نقط گالیاں دینے لگے۔ اور تھر تھر کانپنے لگے۔ علامہ کا وہ موڈ آج بھی جب میرے سامنے آتا ہے تو خود میرے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔

شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ اس سے بخوبی واقف ہیں کہ وہاں اختر اورینوی اور صدرالدین صاحب کی دو علیحدہ حیثیتیں تھیں اور دونوں میں کم ہی بنا کرتی تھی۔ اختر صاحب اردو دنیا میں افسانوی اور تنقیدی اہمیت کی وجہ سے مشہور تھے۔ اور پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ دوسری طرف صدر صاحب کو اردو دنیا تقریباً نہیں جانتی تھی اور وہ پٹنہ کالج کے صدر شعبۂ اردو تھے۔ صدر صاحب کے مقابلہ میں اختر اورینوی یونیورسٹی میں بھی زیادہ پوپلر تھے اور شعبہ کے معاملات میں زیادہ بااثر تھے۔ اس وجہ نے صدر صاحب کی انانیت کو ہمیشہ کچوکے دئے اور ان کو اختر صاحب سے اس وقت تک کشیدہ رکھا جب تک کہ وہ خود صدر شعبہ نہیں ہوگئے۔ صدر صاحب صدر شعبہ بنے تو ان کے انتقامی جذبے سرد پڑ گئے اور وہ اختر صاحب سے اس حد تک قریب آئے اور اس حد تک معاون ہوئے کہ لوگوں نے دیکھا کہ اختر صاحب کی موت کا صدمہ ہی برداشت نہ کر سکے اور اختر صاحب کے ساتھ ساتھ۔ صرف ایک دن آگے پیچھے وہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اس پس منظر میں شعبہ کی فضا ہمیشہ

کشیدہ رہی۔ اساتذہ دو گروپ میں منقسم تھے اور اساتذہ کے ساتھ طلبہ بھی الگ الگ گروپ کے ساتھ منسلک تھے۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ صدر صاحب وہ طلبہ قریب ہوا کرتے جو مطالعہ سے زیادہ سیاسی ذرائع کی بنیاد پر اپنا نتیجہ بہتر کرنا چاہتے تھے۔ یہ طلبہ اختر صاحب سے قریب ہو بھی نہیں سکتے تھے کیوں کہ اختر صاحب سے قربت کا معیار تخلیقی اور تنقیدی صلاحیت تھا۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ مظہری بھی اسی تخلیقی ذہن کی قدر کرتے تھے۔ لیکن یہ بھی تھا کہ علامہ اختر صاحب کے زیر اعتماد ہوتے ہوئے بھی شعبہ میں کسی گروپ کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے۔ ان کا دروازہ ہمیشہ سبھوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہتا تھا۔

شعبۂ اردو میں اس گروپ بندی کو تقویت پہنچانے کے لئے کچھ عناصر علامہ کے متعلق بھی بدگمانی پھیلانے کی کوشش کرتے۔ شروع میں مجھ تک بھی یہ بات پہنچائی گئی کہ علامہ کی کمزوری شیعیت ہے۔ یعنی وہ شیعہ طلبہ کو سنی طلبہ پر فوقیت دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ متعصب ہیں لیکن میرے ساتھ وہ لوگ بھی جو عقل کے دریچے کھلا رکھنے کے عادی ہیں، اس سے سو فی صدی اتفاق کریں گے کہ علامہ کے سلسلہ میں یہ بیان ایک عظیم بہتان کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اس بہتان تراشی کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ علامہ سے طلبہ کو بدظن کرا کے ایک خاص گروپ کو تقویت پہنچائی جائے۔ یونیورسٹی کیمپس سے باہر بھی حضرات علامہ میں اس کمزوری کو تلاش کرتے جو اپنی زندگی میں ناکام رہے۔ شاعری کی دنیا میں گمنام اور کم حیثیت و بے مرتبت رہے۔ ظاہر ہے کہ اس قبیل کے بے مایہ لوگ زندہ رہنے کے لئے کچھ تو شوشے چھوڑنے پر مجبور رہیں گے۔ علامہ کس حد تک اہل تشیع تھے۔ اس سوال کا جواب خود مجھے علامہ کے عمل سے اس وقت مل گیا جب ایم۔اے کا امتحان قریب آگیا۔ بہتر سے بہتر نتیجہ کی توقع تھی لیکن وہ طلبہ جنھیں نہ خود پر اور نہ اپنی صلاحیت پر بھروسہ تھا۔ متحرک ہو گئے اور انھوں نے یہ شیوہ اپنایا کہ جن طلبہ سے نمایاں رزلٹ کی امید کی جانے لگی تھی۔ ان کے خلاف اساتذہ کو بہکانے اور بدظن کرانے کی مہم تیز تر کر دی۔ جو خود اس کام کو انجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ ایسے سینئر یا قدیم طلبہ یا کسی ایسے شخص تک رسائی حاصل کرنا چاہتے جو بدظن کرانے میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بعض کمزور دل و دماغ والے اساتذہ اس طرح کے خوشامدیوں سے متاثر ہوتے، اور مشہور ہے کہ ذی صلاحیت طلبہ کے ساتھ تو جانب داری برتتے۔ اور ان کے نمبر کاٹ لیتے۔ (واللہ اعلم) لیکن علامہ کس دل و دماغ کے مالک تھے' اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ خوش نصیبی یا بدنصیبی سے مجھے بھی اپنی جماعت میں نمایاں نتیجہ کی توقع سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ اس لئے میرے خلاف بھی مہم شروع کر دی گئی تھی۔ دوسرے اساتذہ کے یہاں میرے خلاف کیا کہا گیا۔ اس کا مجھے علم نہیں ہو سکا۔ لیکن علامہ کے یہاں ایک صاحب پہنچے۔ یہ خاندان شاد کے ایک ہونہار فرزند تھے اور مجھ سے ایک سال سینئر تھے۔ میرے ایک ہم جماعت نے ان کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ کیوں کہ خاندان شاد سے علامہ کی جذباتی وابستگی سے بھی واقف تھے۔ اور واقف کار حلقہ یہ بھی جانتا تھا کہ علامہ کا یہ لگاؤ برمبنائے شاعری تھا نہ کہ برنائے عقائد۔ لیکن وہ حضرت کہ اپنی کج عقلی کے مشہور تھے، پہنچ گئے علامہ کے پاس۔ اور کہا کہ حضرت! آپ نے جس اسٹوڈنٹ کو اپنی قربت سے نوازا ہے' جس پر آپ نے بھروسہ کر رکھا ہے اور جس پر آپ کی شفقتوں کی کمی نہیں ہے' وہی آپ کے خلاف رحمانیہ ہوٹل میں بیٹھ کر آپ کے عقائد کا مذاق اڑایا کرتا ہے۔

علامہ سمجھ گئے کہ ان کا روئے تخاطب کس طرف ہے پھر بھی، انھوں نے، موصوف سے وضاحت چاہی۔ انھوں نے میرا نام لیا۔ میں اپنے ڈسرٹیشن کے سلسلہ میں ان دنوں ہر دوسرے تیسرے علامہ کے پاس جایا کرتا تھا۔ اتفاق کہ موصوف جیسے ہی گئے میں پہنچ گیا۔ علامہ خلاف توقع بہت اچھے موڈ میں تھے۔ علامہ کے اچھے موڈ میں ہونے کی پہلی پہچان یہ ہوتی کہ وہ آنے والے کو بیٹھنے کے لئے کہا کرتے۔ اور خود ہی گفتگو کا آغاز بھی کرتے۔ برعکس صورت میں وہ اپنے خیالات میں گم ہوتے۔ ملاقاتی کچھ دیر کھڑا رہتا۔ اس کو خود ہی بغیر کہے بیٹھنا پڑتا اور علامہ کی محویت کو ختم کرنے کے لئے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے خود ہی گفتگو بھی شروع کرنا پڑتی۔ اس روز مجھے دیکھتے ہی علامہ نے بیٹھنے کو کہا اور دوسرے ہی لمحہ مسکراتے ہوئے فرمایا کہ آج کل آپ رحمانیہ ہوٹل میں بہت بیٹھ رہے ہیں۔ میں چکرا گیا اور پوچھنا پڑا کہ "سر! کوئی خاص بات" ——— کہنے لگے "ہاں! آج کل آپ رحمانیہ ہوٹل میں بیٹھ کر مجھے گالیاں دیتے ہیں"۔ یہ سنکر مجھ پر فوری تاثر کیا ہوا۔ شاید احاطۂ تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے۔ بس لگا کہ مجھے کسی نے بہت ہی اونچائی سے نیچے ڈھکیل دیا ہو۔ میری اس کیفیت کا اندازہ علامہ کو فوراً ہو گیا۔ انھوں نے مجھے سنبھالا دیا۔ تفصیل بتائی کہ فلاں صاحب آئے تھے اور بہت ہی زور دے کر کہہ رہے تھے کہ تم رحمانیہ میں بیٹھ کر آج کل میرا مذاق اڑاتے ہو۔ میں علامہ کو دیکھتا رہا۔ وہ چار مینار کی ڈبیہ سے ادھ جلی سگریٹ نکال کر چٹکی میں دبائے مسکراتے رہے۔ پھر بولے کہ تم پوچھو گے کہ میں نے ان کو کیا جواب دیا۔ اس کے بعد ان کے الفاظ یہ تھے "اس بے وقوف سے میں نے کہا کہ تم دس بار قرآن لے کر حلفیہ کیا کسی اور کی بھی شکایت کروگے تو میں یقین کرنے والا نہیں ہوں"۔ پھر وہ کچھ جوش میں آگئے۔ "یہ نامعقول سمجھتے کیا ہیں۔ میرے پاس بھی عقل ہے۔ میں بھی باخبر رہتا ہوں۔ میں کسی پر بھروسہ کرتا ہوں تو سوچ سمجھ کر کرتا ہوں"۔ علامہ کو مجھ سے بدظن کرانے والے ممدوح نہ صرف علامہ کی نظروں سے گر گئے۔ بلکہ ہم سبھوں نے دیکھا کہ ان پر سارے اساتذہ کے دروازے ایک ایک کر کے بند ہوتے چلے گئے اور اپنے سازشی رویہ کی وجہ سے خود ہی ہر جگہ معتوب ہوئے یہاں تک کہ اس وقت کے ایک بہت ہی معمولی کالج میں ان کو جائے پناہ مل سکی۔

علامہ کو میرے خلاف ایک بار ان کے پٹنہ کے قریبی احباب میں سے دو ایک نے بھی بدظن کرانے کی اس وقت کوشش کی تھی جب میں نے پٹنہ سے ماہنامہ "اقدار" نکالا تھا۔ جمیل صاحب کے احباب میں سب سے زیادہ بہاء الدین صاحب مجھ سے "اقدار" نکالنے پر ناراض تھے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ ہم اس وقت نئے ذہن اور نئے ادبی رویوں کی حمایت میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی جرأت مند ہو گئے تھے۔ ہم نے اس وقت در آنے والی ادبی اقدار کے ساتھ "اقدار" نکالا تھا۔ ہم اس حد تک حقیقت پسند تھے کہ اخلاقی قدروں کی نئی تفہیم کے ساتھ کچھ کہنے اور لکھنے کو جائز قرار دے رہے تھے۔ کچھ کھل کر اور کچھ استعاراتی پیرایہ میں ہم نے جنسی معروضات کی پیش کش کی بھی اجازت دیدی تھی۔ ہمارا یہ رویہ پرانے لوگوں میں کھلاہٹ کا سبب بن گیا۔ مجھ پر جنسی بے راہ روی کا الزام عاید کر کے "اقدار" کا بائیکاٹ کرانے کی کوشش کی گئی۔ بہاء الدین صاحب ہر جگہ کہتے پھرے کہ یہ رسالہ شریفوں کے گھروں میں جانے کے قابل نہیں ہے۔ بہو بیٹیاں کس طرح پڑھیں گی۔ انھوں نے علامہ سے بار بار شکایت کی کہ آپ کا شاگرد [illegible] سماج کا ناسور بن گیا ہے۔ اس کی سخت گوشمالی

کے ... ہے۔ لیکن علامہ کا رویہ یہاں بھی بالکل برعکس تھا۔ انہوں نے ہمارے نظریات سے اختلاف ضرور کیا مگر ادارہ کو اپنی تخلیقات دے کر ہماری ہمت افزائی بھی کی۔ ... یہ کہ ... دے ہوئے ایک موضوع "نئے معاشرہ کے ... پر "ظفر ادگانوی کے نام" کے عنوان سے ... یہ نظم مثنوی کے فارم میں تھی اور معاشرہ ... کے بعد احساس اور اس کے نتائج پر تھی۔ اتفاق یہ ہوا کہ "ادارہ" صرف تین شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ اس لئے علامہ کی یہ نظم اور مرحوم احتشام حسین اور جناب شمس الرحمن فاروقی کے اس موضوع پر مضامین بعد میں "شب خون" (الہ آباد) میں شائع ہوئے۔ علامہ کی نظم "شب خون" شمارہ ۲۵ جون ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:-

اے میرے عزیز روشن آغاز
اے میرے عزیز فرخ انجام
اے لال ظفر ادگانوی کے نام

اس کی اشاعت سے پہلے علامہ نے اپنے دو ایک جاننے والوں کو بھی یہ نظم سنائی تھی۔ پٹنہ سے نکلنے والے ایک ماہنامہ کے مدیر نے بھی یہ نظم سنی تھی۔ علامہ نے بعد میں بتایا کہ ان اصحاب نے علامہ کو ورغلانے کی کوشش کی تھی کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ ظفر ادگانوی کے علاوہ آپ کو کوئی اور نہیں ملا۔ آپ خواہ مخواہ اس نظم کے تخاطب کے لئے ایک غلط اسٹوڈنٹ کو منتخب کر رہے ہیں۔ آپ اس کو زندہ کر رہے ہیں۔ مدیر محترم نے درخواست کی ... اس نامعقول کا نام ہٹا کر سرنامہ تبدیل کر دیجئے۔ علامہ نے کئی بار میرے سامنے اس واقعہ کو دہرایا اور ہر بار خوب ہنسے۔ مختصر یہ کہ علامہ کی چاہتوں پر کچھ "معصوم" لوگ پریک لگانا چاہتے تھے مگر اس طرح کے لوگوں کو مایوس ہونا پڑتا کیونکہ علامہ کا خلوص سازشوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

علامہ کی بے لوث وضع داری کا ایک چھوٹا سا واقعہ آج بھی میرے لئے بڑا اہم ہے کہ کبھی کبھی بعض چھوٹی اور معمولی باتیں بھی ہماری زندگی میں شدید تاثر دے جاتی ہیں۔ یہ بات اس وقت کی ہے جب ایم۔ اے کے امتحان کا نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ میں پٹنہ ہی میں تھا کہ پٹنہ یونیورسٹی کے دفتر میں میرا ایک کام اٹکا پڑا تھا۔ اس وقت یاور حسین صاحب پٹنہ یونیورسٹی ڈپٹی کنٹرولر تھے۔ علامہ کے قدرداں تھے۔ میں نے اس جہت سے علامہ کو یاور صاحب کے یہاں جانے کی زحمت دینا چاہی۔ وہ فوراً آمادہ ہو گئے۔ تیار ہو کر نکلے۔ رکشہ کیا۔ ہم دونوں بیٹھے۔ جب رکشہ پٹنہ یونیورسٹی آفس کے احاطہ میں داخل ہوا تو میں نے رکشہ رکنے سے پہلے ہی اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کرایہ ادا کرنے کے لئے پیسے نکال لئے۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ علامہ میرے کام سے تشریف لائے ہیں اس لئے کرایہ بھی مجھے ہی ادا کرنا چاہئے۔ رکشہ رکا اور علامہ کے اترنے سے پہلے ہی میں نے رکشہ والے کی ہتھیلی پر پیسے رکھ دئے۔ یہ دیکھ کر علامہ کا جلال اچانک جوش میں آ گیا۔ بے حد طیش میں آ کر بولے "مجھے گدھا سمجھتے ہو"۔ تب ہی مجھے اپنی بے وقوفی کا زبردست احساس ہوا میں نے معذرت چاہی اور رکشہ والے سے پیسے واپس لے لئے۔ اب علامہ نے پیسے دئیے۔ علامہ کا موڈ میری اس حماقت کی وجہ سے بہت دنوں تک خراب رہا۔ کئی دنوں کے بعد نارمل ہو سکے۔ اب ایسے وضعدار بزرگ کہاں ملتے ہیں۔ اب تو زمانہ یہ ہے کہ اساتذہ توقع رکھتے ہیں کہ لڑکے ان کے لئے ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہیں۔

جمیل صاحب کے سلسلہ میں جہاں کئی بدگمانیاں پھیلائی گئیں، وہاں یہ بھی مشہور کیا گیا کہ علامہ اخبارات کا مطالعہ بالکل نہیں کرتے۔ اور یہ کہ سنجیدہ علمی اور ادبی کتابوں کو اب قریب بھی آنے نہیں دیتے۔ لیکن میں ان سے تیس سال کی قربت کے نتیجہ میں اس کو علامہ کے حریفوں اور بے وقوف معتقدوں کے ایک سازشی پروپیگنڈہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا ہوں جہاں تک اخبارات کے مطالعہ کا معاملہ ہے۔ علامہ اخبار خریدا کرتے تھے اور یہ اخبارات ان کے ٹیبل کے صرف زینت نہیں بنا کرتے تھے بلکہ ان کو علامہ جیسا سنجیدہ قاری بھی میسر تھا۔ ان کی سنجیدگی اس حد تک تھی کہ بعض بین اقوامی مسائل پر وہ باضابطہ اپنی ایک رائے رکھتے تھے اور اس پر باخبر لوگوں سے تبادلۂ خیالات اور بحث بھی کیا کرتے تھے۔ دوسری طرف علامہ اردو کے عام اساتذہ کی طرح صرف اردو ادب کی مروجہ نام نہاد تشریحی تنقید پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ وہ صحیح ماخذ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اس لئے ان کی اصل دلچسپی تاریخ کی معتبر کتابوں سے تھی یہی وجہ تھی کہ علامہ نے ریٹائرمنٹ کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ایک اسکیم کے تحت " اردو مرثیہ کا تاریخی پس منظر" کے موضوع کا انتخاب کیا تھا اور بہت ہی دلچسپی کے ساتھ اس کام میں منہمک تھے۔ اس ضمن میں مسئلہ خلافت، واقعۂ کربلا، نیز دیگر امور و واقعات اسلامی کے تناظر میں علامہ نے بہت ہی سنجیدہ مطالعہ کیا تھا۔ وہ کئی زبانوں کے مشاہیر محققین کے مطالعہ کے بعد جن نتائج پر پہنچے تھے ان نتائج کی روشنی میں علامہ دونوں فرقوں کے علماء کی تنگ نظری اور عصبی سیاست کا شکوہ کرتے اور اپنے دعوے کے دلائل میں ٹھوس اور معتبر حوالے دیا کرتے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کافی نوٹس بھی تیار کر لئے تھے۔ امید ہو چلی تھی کہ اسکیم کے خاتمہ پر وہ ایک اور مفصل مقالہ مکمل کرلیں گے۔ لیکن حادثات پیچھا کہاں چھوڑتے ہیں۔ ہوا یہ کہ وہ گرمیوں کی تعطیل میں اپنے سارے نوٹس کے ساتھ بیکن پور (مظفر پور) تشریف لے گئے، کہ وہاں اطمینان کے ساتھ لکھیں گے مگر وہ بیگ جس میں یہ تحقیقی نوٹس تھے اسٹیمر ہی میں چھوٹ گیا۔ اس حادثہ سے وہ ملول ہوگئے۔ پھر بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور نئے سرے سے نوٹس لینا شروع کر دئے۔ مگر جب علامہ افضل پور کے مکان سے منتقل ہو رہے تھے، اس وقت یہ سارے کاغذات پھر ادھر ادھر ہو گئے۔ اس طرح علامہ کی تحقیقی کاوشوں سے اردو ادب محروم ہو گیا۔ ہمیں اس وقت یقین ہو چلا تھا کہ اگر علامہ مقالہ لکھتے تو کئی ہنگامہ خیز چونکانے والے نکات سامنے آتے۔

یو جی سی اسکیم کے تحت علامہ جب تک کام کرتے رہے، ان کی دفتری فائل میرے پاس رہی۔ میں ہی ان کا ماہانہ بل تیار کرتا۔ اختر صاحب سے دستخط کرا کے دفتر میں جمع کرتا۔ علامہ کی سہ ماہی پروگریس رپورٹ، میں ہی ٹائپ کراتا اور اس سلسلہ کی ساری دفتری مراسلت بھی میرے ہی ذمہ تھی نیز لائبریری سے تاریخی کتابیں نکلوا کر چونکہ مجھے ہی علامہ کے پاس پہنچانا ہوتیں اس لئے میں اور میری ہی طرح کچھ اور بھی علامہ کے ذوق مطالعہ سے واقف تھے۔ اصل میں وہ لوگ جو جمیل صاحب کو دور سے دیکھ سکے، انھوں نے صرف یہ دیکھا کہ علامہ اے۔ آر۔ خاتون، رضیہ بٹ، دت بھارتی اور رومانی دنیا کے حقیر اور ہلکے پھلکے ناولوں میں زیادہ انہماک برتتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ علامہ اپنے مرض کے حصار میں زیادہ تر رہنے کے عادی ہو چکے تھے اور ان کا موڈ

فکر اور مطالعہ کا متقاضی تھا۔ وہ سوچتے تھے اور پڑھتے تھے۔ پڑھتے تھے اور فکر کو مہمیز کرتے تھے۔ اس لئے وہ مطالعہ کے قائل تھے۔ اور وہ اس مطالعہ کو سنجیدہ اور غیر سنجیدہ میں تقسیم کرنا نہیں جانتے تھے۔ وہ تاریخ کے خشک موضوع کا بھی اسی انہماک سے مطالعہ کرتے جتنا غیر ادبی قسم کے ہلکے پھلکے ناولوں کا۔ لیکن ان ناولوں میں کبھی ان کی پسند ہوا کرتی۔ ان کا معمول یہ تھا کہ دربھنگہ ہاؤس سے وہ واپسی پر پٹنہ کالج لائبریری جاتے اور وہاں پہلے ہی سے ان کے لئے جو ناولیں نکال کر رکھی ہوتیں وہ بغیر دیکھے لے کر چلے آتے۔ کھانا کھا کر علامہ ان ناولوں میں سے ایک کو اٹھا لیتے اور پڑھنا شروع کر دیتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ یہ ناولیں ایک ایک کر کے پہلے ہی صفحہ کے مطالعہ کے بعد بند کر دی جاتیں۔ دوسرے روز علامہ کا کوئی شاگرد یا خود علامہ ان ناولوں کو ڈھو کر پٹنہ کالج لائبریری لاتے اور واپس کر دیتے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ علامہ بعض ناولوں کے مطالعہ پر بے حد جھنجھلائے ہیں اور کبھی کبھی غصہ کی حالت میں انھوں نے ناولوں کو پھینکا بھی ہے۔ علامہ کے لئے ناولیں مہیا کرنے کا کام پٹنہ سیٹی کے ایک صاحب یحییٰ امام انجام دیا کرتے تھے۔ وہ پٹنہ کالج آفس میں ہیڈ کلرک اور بعد میں سپرنٹنڈنٹ ہوئے۔ بہت چرب زبان تھے۔ علامہ کو انھوں نے اپنے اعتماد میں اس حد تک لے رکھا تھا کہ علامہ کی وہ ساری ڈاک جو پٹنہ کالج یا شعبہ کے پتہ پر آتی اس کے وہ انچارج ہو گئے تھے۔ علامہ کی ملازمت کے دوران موصوف نے ناولوں کو مہیا کرنے اور ڈاک کی حفاظت کی جو اہم خدمت انجام دی، اس کا صلہ علامہ سے انھوں نے یہ لیا کہ وہ ساری کتابیں اور رسائل جو علامہ کے لئے تحفۂ مصنفین اور مدیر بھیجا کرتے، اس پر یحییٰ امام صاحب قابض ہو جاتے۔ اور اتنا زبردست قبضہ ہوتا کہ کبھی کبھی علامہ بعض اہم رسائل اور کتب کا ٹھیک سے مطالعہ بھی نہیں کر پاتے۔ علامہ نے کسی کتاب کی افادیت کے پیش نظر اس کو رکھنے کی خواہش بھی ظاہر کی تو وہ یہ کہہ کر چلتے بنتے کہ آپ کے یہاں یہ کتاب محفوظ نہیں رہے گی۔ کوئی اٹھا کر لے جائے گا۔ یحییٰ امام صاحب نے اسی صورت پٹنہ سیٹی میں ایک ذاتی لائبریری بنا ڈالی۔ کبھی کبھی ہمیں پتہ چلتا کہ علامہ کے پاس کوئی اہم کتاب آئی ہوئی ہے یا کسی رسالہ کا نمبر۔ ہم مانگتے تو علامہ دینے سے کترا جاتے۔ ہمارے احتجاج کرنے پر کہتے کہ اس شخص (یحییٰ امام) نے بڑی خدمت کی ہے۔ بڑا کام آتا ہے۔

ماحصل یہ کہ علامہ کا مطالعہ بے حد وسیع اور متنوع تھا۔ فلسفہ، تاریخ اور فنون لطیفہ کے موضوع پر وہ گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔ مشہور تھا کہ صحیح مشہور تھا کہ علامہ کو اردو ادب کے دور وسطیٰ کی تمام اصناف پر یکساں عبور تھا۔ لیکن میں اس قدر اضافہ اور کرنا چاہتا ہوں کہ علامہ کی دلچسپی نئے ادب اور ادب کے مختلف ادوار سے بھی کم نہ تھی۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ نئی نسل کی سرگرمیوں سے باخبر رہنا چاہتے۔ شاعری ہو یا افسانہ، وہ صرف پڑھتے نہیں تھے بلکہ نئی نسل کی تخلیقات کو پڑھنے کے بعد حاشیہ پر اپنی رائے بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں اپنے افسانہ "آئینہ" کا ذکر کروں گا۔ ماہنامہ شب خون، الہ آباد نیا نیا نکلا تھا۔ اس میں مجھے بھی لکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ میں نے پہلی بار اپنے طور پر نئے انداز کا افسانہ لکھا۔ "نیا آئینہ" عنوان رکھا اور بھیج دیا۔ شب

پہلے ہی دو ایک شماروں نے اردو دانشوروں کو
بنی طرف متوجہ کر لیا۔ نتیجہ یہ بھی نکلا کہ "شب خون"
ور اس کے واسطے سے شمس الرحمٰن فاروقی ہی صرف
رکز نظر نہیں بنے بلکہ شب خون میں ہر ایک لکھنے اور
چھپنے والا ۔۔۔ اہمیت کا حامل قرار دیا گیا۔ شب خون
کے شمارے پٹنہ میں اختر اورینوی اور جمیل صاحب
کے پاس بھی آیا کرتے۔ "نیا آئینہ" شب خون کے
چھٹے شمارہ میں چھپا۔ رسالہ سبھوں کے پاس آیا۔
اختر اورینوی نے یہ افسانہ پڑھا یا نہیں۔ اس کی مجھے
خبر نہیں ہوئی لیکن علامہ نے یہ افسانہ پڑھا اور بغور
پڑھا۔ اس کو پڑھ کر ان پر جو ردعمل ہوا اس کو انھوں
نے حاشیہ پر تحریر کیا اور دستخط بھی کئے۔ علامہ کا جو
ردعمل تھا وہ کچھ اس طرح کا تھا۔ "افسانہ نگار پاگل ہے۔
مصنف کا تعلق اس کرۂ ارض سے نہیں بلکہ کسی اور
دنیا سے ہے۔ ۔۔۔ افسانہ نگار لائق گردن زدنی
نہیں بلکہ جوتا زدنی ہے۔" اور جب میں علامہ کے پاس
پہنچا تو انھوں نے وہ شمارہ بچی امام سے منگا کر میرے
حوالے کر دیا۔ اور تاکید کی کہ اس کو بطور تبرک رکھنا۔
یہ ساری مثالیں علامہ کے مطالعہ کا تنوع، حالات حاضرہ
سے باخبری اور نئی نسل سے بے پناہ شفقت ظاہر کرتی ہیں۔

نئی نسل سے علامہ نے ادبی سطح پر کچھ توقعات
وابستہ کر رکھی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ نئی نسل کا قیمتی
سرمایہ ملک و قوم اور ادب کے لئے بیش بہا سرمایہ بن جائے۔
لیکن ہم لوگ جو اس وقت بالکل ہی نیا ذہن رکھتے تھے
اور انحرافی رویے سے خود کو سرشار رکھنا چاہتے تھے۔
شرارت بھی اس طور کرنا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی ہم انتہا
پسندی کی راہ پر بھی گامزن ہوئے۔ ہم نے انتہا پسندی
کی اسی طرح کی ایک مثال اس وقت قائم کی جب پٹنہ

سے ۔۔۔ "کے دو شمارے نکل چکے تھے۔ اور پٹنہ میں
ہماری نسل کے نئے شعرا اور افسانہ نگاروں کی اچھی
خاصی تعداد بھی تھی۔ انہیں دنوں مرحوم سہیل واسطی بھی
ہمارے حلقہ سے روشناس ہوئے تھے۔ وہ پٹنہ آئے تو
میرے ہی ساتھ "نشیمن" (رمنہ روڈ کا وہ مکان جس
میں میں نے دو کمروں پر مشتمل ایک فلیٹ لے رکھا تھا۔
کبھی یہ دونوں کمرے میرے پاس ہوتے اور کبھی ایک کمرہ کرایہ
پر اٹھا دیا جاتا۔ میں پٹنہ میں ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۹ء
اسی فلیٹ میں مقیم رہا۔ اسی فلیٹ سے "اقرار"
نکالا گیا اور میں نے ہی اس گھر کا نام "نشیمن" دیا) میں
ٹھہرتے۔ غرض کہ سہیل واسطی آئے ہوئے تھے۔ انھیں
دنوں ہمارا شام میں یہ معمول تھا کہ مہندرو گھاٹ (پٹنہ۔
بانکی پور) کے کیفیٹیریا میں ہم سب افسانہ نگار، شعراء جمع
ہوتے۔ ادبی موضوعات اور مباحث پر تبادلۂ خیالات
کرتے۔ ایک شام وہ بھی چلے آئے۔ فی البدیہہ یہ طے
پایا کہ آج کی نشست سہیل واسطی کے معنون ہو اور صدارت
بھی وہی کریں۔ وہ تیار ہو گئے۔ دس بارہ احباب تھے۔
ایک تجویز یہ آئی کہ الفاظ کا میڈیم اشارات و کنایات و
حرکات کے میڈیم کے مقابلہ میں ناقص ہے۔ اس لئے
ہم لوگ ابھی اور اسی وقت اس کا تجربہ کریں گے اور فوری
طور پر کسی نتیجہ پر پہنچیں گے۔ تجویز متفقہ طور پر پاس ہو گئی۔
بات ٹھہری کہ دس منٹ تک کوئی لفظ ادا نہیں کیا جائے
گا۔ اور ضروریات کے لئے یعنی چائے، سگریٹ، پانی یا
دیاسلائی مانگنے کے لئے یا کچھ بھی کہنے یا کرنے کے لئے لفظ
کا سہارا نہیں لیا جائے گا بلکہ اشارات اور اعضا کے
حرکات و سکنات کا مصرف لیا جائے گا۔ ایسا ہی ہوا۔
دس منٹ تک ہم گونگے بنے رہے۔ ہم سب اشاروں سے
بیرا کو یہ سب کچھ سمجھاتے رہے۔ آرڈر دیتے رہے۔ ہم نے چائے

پی۔ سگریٹ پیتے رہے۔ اور کچھ اظہار خیال بھی کرتے رہے۔
اس طرح دس منٹ کا تجربہ مکمل ہوگیا۔ ہم نے متفقہ طور
پر یہ نتیجہ نکالا کہ اگر لفظوں کا استعمال چھوڑ بھی دیا جائے
تو اشارات مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ہمارے
ساتھ قمر اعظم ہاشمی بھی تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس نشست
کی کارروائی اخبارات میں بھی آنی چاہئے۔ اس طرح یہ
خبر "پٹنہ کے ادیبوں کی گونگی نشست" کی سرخی کے
ساتھ دوسرے ہی دن اخبارات میں چھپ گئی۔ اب
اب ہم ردعمل جاننا چاہتے تھے۔ اختر اورینوی کے پاس
پہنچے وہ ہمیں دیکھ کر مسکرائے اور بس۔ اس کے بعد
اسی روز قمر اعظم ہاشمی کے ساتھ میں علامہ کے ہاں آیا
وہ پہلے ہی سے بھرے بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی پھٹ
پڑے۔ "آپ سب لوگ پاگل ہیں۔ نئی نسل کو آپ لوگ
پاگل بنا کر چھوڑیں گے۔ خدارا مجھے پاگل بنانے کی
کوشش نہ کیجئے۔ اور یہاں سے نکل جایئے۔ ہم دونوں
نکل جانے کے بجائے ڈٹ کر بیٹھے۔ خاموشی کے ساتھ
اپنی نسل کی انتہا پسندی پر علامہ کے ریمارکس سنتے
رہے۔ علامہ کا غصہ جب کچھ کم ہوا تو انھوں نے اللہ
رکھو سے بسکٹ اور چائے منگوائی اور ہم چائے پی کر
کچھ یوں اٹھے جیسے بہت کچھ لے کر جارہے ہوں۔

یوں تو شعبہ میں ہمارے کئی اساتذہ تھے
اور سبھی قابل احترام تھے لیکن دو استاذ یعنی اختر
اورینوی اور جمیل مظہری صاحبان کی شخصیتوں میں
استاذ کی شفقت، حوصلہ افزائی اور اپنے شاگردوں
کے مسائل سے گہری دلچسپی اور اس کے عملی اظہار کی
خصوصیات تھیں۔ یہ عناصر علامہ میں کچھ مستزاد تھے
وہ شاگردوں کو بیٹے کی حد تک چاہتے تھے۔ وہ اسی رشتے
سے اس کو جھڑکتے، ڈانٹتے اور پھر بہلاتے۔ مجھے تو اکثر
انھوں نے بیٹا کہہ کر مخاطب بھی کیا ہے۔ انھوں نے اپنا
بیٹا سمجھ کر مجھے کہاں کہاں ٹھوکر کھانے سے بچایا۔
اور کس کس طرح دستگیری کی ہے۔ اس کا اندازہ
صرف ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ ہوا یہ کہ
ایم۔ اے کے امتحانات ختم ہوچکے تھے۔ نتیجہ نکلنے
سے پہلے ہی مجھے پٹنہ کے ٹی۔ پی۔ ایس کالج میں عارضی
طور پر جز وقتی لیکچرار کی حیثیت سے جگہ مل گئی تھی۔
لیکن تین مہینے کے بعد ہی یہ جگہ گرمی کی چھٹیوں کی وجہ
سے ختم بھی ہوگئی، کیونکہ اس طرح کالج کے کچھ روپے
بچ گئے۔ ان حالات کا مجھے بھی اندازہ تھا۔ اس لئے
میں نے پٹنہ کے سب سے معیاری اور بہتر گورنمنٹ
اسکول پٹنہ کالجیٹ میں اردو کی ایک خالی جگہ کے
لئے بہت پہلے ہی درخواست دے رکھی تھی۔ انٹرویو ہوچکا
تھا۔ ان دنوں اردو کے مشہور ناقد کلیم الدین احمد
بہار کے ڈی پی آئی تھے۔ انٹرویو میں امتحانی کمیٹی کے
چیرمین کی حیثیت سے وہ بھی موجود تھے۔ انٹرویو ہوا
لیکن اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ اس کی مجھے کوئی فکر اس
لئے نہیں تھی کہ میں نے کبھی بھی کالج اور یونیورسٹی سے
نیچے کی ملازمت کا خواب نہیں دیکھا تھا۔ ٹی پی ایس کالج
کی جز وقتی اور عارضی تقرری نے مجھے مزید حوصلہ بخشا
تھا اور تسکین بھی فراہم کردیا تھا۔ لیکن یہ عارضی ملازمت
جیسے ہی ختم ہوئی (گرچہ ایک سال کے بعد ہی وہاں مجھے
پھر بلا لیا گیا اور تقریباً تین سال تک وہاں لیکچرار کی
حیثیت سے اس کالج کے ساتھ منسلک رہا) مالی پریشانیوں
نے آگھیرا۔ تباہ کن حالات میں دن گذر رہے تھے کہ
ایک دن پوسٹ مین رجسٹری لے کر آیا۔ کھول کر دیکھا
تو لگا کہ زندگی شاید اب راستے پر لگنا چاہتی ہے۔
پٹنہ کالجیٹ کے لئے تقرری کا حکم نامہ تھا۔ فوراً ہی

جوائن بھی کرنا تھا۔ دوسرے دن چلا گیا اور جوائن کر لیا۔ شام چار بجے تک اسکول میں رہا۔ اس لئے اس روز تو موقع نہیں مل سکا لیکن دوسرے دن صبح ہی صبح علامہ کو خوش خبری دینے پہنچ گیا۔ آٹھ بجے ہوں گے، علامہ ناشتہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ اردو کا اخبار ان کے سامنے کھلا پڑا تھا۔ میں پہنچا اور کرسی پر بیٹھتے ہی خوشخبری سنائی۔ علامہ کو شاید یقین نہیں تھا۔ انھوں نے پوچھنا ضروری سمجھا کہ جوائن کر چکے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ کل ہی جوائن کر چکا ہوں۔ اس کے بعد علامہ چند لمحوں تک مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں اس وقت کیا کیفیت تھی۔ کون سا رنگ تھا۔ شاید وہ درد و غم، وہ حسرت و یاس جو جوان بیٹے کے اچانک مر جانے پر آنکھوں میں جھلکتی ہے۔ میں نے خود کو اس عالم سے نکالنے کے لئے علامہ سے پوچھا کہ سر! کیا ہوا؟ وہ چونکے اور یہ شعر پڑھا!

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی تھا

یہ شعر پڑھ کر علامہ خاموش ہو گئے۔ یہ شعر کئی بار میں نے خود پڑھا ہوگا۔ کئی موقعوں پر دوسروں سے سنا ہوگا لیکن اس وقت اپنے استاذ کی زبانی اس شعر نے میرے ذہن کو جس طرح جھنجھوڑ ڈالا اور جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی۔ اس کا اظہار ناممکن ہے۔ صرف اتنا ضرور بتا دوں کہ میں اپنے فیصلہ پر علامہ کے سامنے نادم ہوا اور اس طرح نادم ہوا کہ پھر پٹنہ کالجیٹ کا کبھی منہ بھی نہیں دیکھا۔ نہ استعفےٰ دینے گیا اور نہ ایک دن کی تنخواہ کی خبر لینے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ٹھیک اسی ماہ مجھے یو جی سی فیلو شپ مل گئی اور محسوس ہوا کہ عزائم بلند ہوں اور بزرگوں کی ہمت افزائی اور دعائیں ساتھ ہوں تو حالات دیر یا سویر سازگار ہو ہی جاتے ہیں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ علامہ جیسی شفیق اور بے لوث و بے غرض شخصیت جو بچوں سے یکساں پیار کرتی تھی۔ جس کے پاس مراتب کا معیار نہ تھا۔ پتہ نہیں میری ہی طرح کچھ اور بھی ملنے جلنے والے اور شاگرد نکل آئیں جو کہیں کہ علامہ ان کو ہی سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس دعوے کے باوجود ہر ایک نے علامہ کو بقدر ظرف پرکھا، چاہا اور تاثر لیا۔ ان کے چاہنے والوں ہی نے ان کی شخصیت پر لطیفے گڑھے۔ اور ادھر ادھر بیٹھ کر تفنن طبع کا سامان بہم کیا۔ کلاس روم سے لے کر گھر تک۔ جلوت تا خلوت علامہ کو مضحکہ خیز واقعات کا کردار بنایا گیا۔ ان کے سلسلہ میں کیا گیا مشہور کیا گیا۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایک بار جناب وہاب اشرفی نے علامہ کے سلسلہ میں لکھا کہ (صنم۔ پٹنہ) کہ علامہ کے ساتھ دسترخوان پر کوئی کھانا نہیں کھا سکتا ہے کیوں کہ وہ سالن کے پیالے میں چمچ رہتے ہوئے بھی ہاتھ ڈالتے ہیں اور انگلیوں سے ٹٹول ٹٹول کر بوٹیاں نکالتے ہیں اور مہمان کی پلیٹ میں ڈال دیتے ہیں۔ وہاب صاحب نے علامہ کے ساتھ پتہ نہیں کتنی بار کھانا کھا کر یہ نتیجہ اخذ کیا۔ لیکن میں نے ایک بار نہیں سیکڑوں بار علامہ کے دسترخوان پر کھانا کھانے کا شرف حاصل کیا ہے لیکن میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ علامہ ہاتھ سے بوٹیاں نکال نکال کر مہمان کی پلیٹ میں ڈال رہے ہوں۔ وہاب صاحب کے اس شوشے سے علامہ بے حد برہم تھے۔ جو آتا اور ان کے کھانے پر اگر شریک ہوتا تو وہ اس سے ضرور پوچھتے کہ کیا میں نے سالن

گندہ کردیا۔" ایک بار مجھ سے بھی پوچھ بیٹھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہاب صاحب کی بات علامہ کے ذہن پر بہت خراب اثر مرتب کر رہی ہے۔ میں نے اور بھی کئی لوگوں نے علامہ کو سمجھایا۔ بہر کیف بہت دنوں کے بعد علامہ اس کوفت سے نجات حاصل کر سکے۔

دوسروں کی طرح میں نے بھی محسوس کیا کہ علامہ کی زندگی میں "استخارہ" کا زبردست عمل دخل تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے استخارہ کرتے۔ جمیل صاحب کو پکا مذہبی نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے علامہ کو میں نے تسبیح پڑھتے تکیہ پر سجدہ کرتے ضرور دیکھا ہے۔ شاید ان کی وہی نماز اور عبادت ہو۔ وہ روزہ نہیں رکھتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ علامہ سے پوچھا کہ روزہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ برجستہ بولے۔ میرا خدا اتنا ظالم نہیں ہے کہ وہ اپنے بندوں کو بھوکا دیکھ کر خوش ہو۔ علامہ توہم پرست بھی نہیں تھے۔ مگر پتہ نہیں کہ کیوں وہ ضرورت سے زیادہ استخارہ کے زیر اثر تھے۔ کبھی کبھی یہ استخارہ ان کے لئے خود پریشانی کا باعث بن جاتا۔ اس ضمن میں مجھے یاد آ رہا ہے کہ ایک دن مجھے تین بجے مقالہ کا باب لے کر علامہ نے بلایا کہ سنیں گے۔ یہ باب طویل تھا۔ وہ سنتے چلے گئے۔ مشورے دیتے رہے۔ کہیں کہیں ترمیم و تنسیخ پر بھی اصرار کرتے رہے۔ اس دوران کچھ ادھر ادھر کے موضوعات بھی آگئے۔ ایک صاحب اور آگئے۔ ان سے باتیں ہوئیں۔ وقت نکلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ شام کی چائے آگئی۔ چائے کے بعد ہی اللہ رکھو کی ماں سامنے آئی۔ اس نے پوچھا کہ رات کے کھانے میں کیا پکایا جائے گا۔ روٹی یا چاول۔ علامہ اپنے گھر ہمیشہ پلنگ پر بیٹھا کرتے۔ پلنگ سے متصل چائے کا چھوٹا ٹیبل اور اس کے سامنے دو کرسیاں۔ پلنگ پر سرہانے تکیہ اور اس کے نیچے تسبیح ہوا کرتی۔ علامہ نے تکیہ کے نیچے سے فوراً تسبیح کھینچ لی۔ دو سکنڈ میں استخارہ نکل آیا۔ بولے چپاتیاں۔ اللہ رکھو کی ماں کو پھر پوچھنا پڑا کہ سالن کیا بنایا جائے گا۔ علامہ نے پھر استخارہ دیکھا اور حکم دیا کہ کلیجی پکاؤ۔ وہ آرڈر لے کر چلی گئی اور مقالے کے بعض دوسرے موضوعات پر علامہ نے اظہار خیال شروع کر دیا۔ مقالے کا کام رات کو آٹھ بجے تک چلتا رہا۔ میں اٹھنے لگا تو علامہ نے اصرار کیا کہ کھانا کھا کر جانا۔ کھانا تیار ہو چکا تھا۔ اللہ رکھو نے کھانا لگایا۔ علامہ اٹھ کر کرسی پر تشریف لے آئے۔ انھوں نے حسب معمول میزبان کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کئے۔ سب سے پہلے میری پلیٹ میں چپاتیاں رکھیں پھر ایک طشتری میں کلیجی نکال کر میرے سامنے کر دی۔ اس کے بعد اپنے لئے کھانا لیا۔ کھانا شروع ہوا۔ اللہ رکھو کی ماں کھانا بہت مزیدار پکایا کرتی تھی۔ کلیجی کا ذائقہ واقعی اچھا تھا۔ کلیجی گل گئی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ علامہ کلیجی کا ایک ٹکڑا منھ میں لیتے، دانتوں سے اس کو کاٹنے کی کوشش کرتے مگر ہر بار وہ ناکام ہو رہے تھے اور یکے بعد دیگرے کلیجی کی بوٹیاں ایک خالی پلیٹ میں رکھتے جاتے تھے۔ علامہ کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کا موڈ خراب ہو رہا ہے۔ اصل میں ان کے کمزور دانت گلی گلی ہوئی کلیجی کو بھی چبانے میں معاون ثابت نہیں ہو رہے تھے۔ آخر کار چار پانچ کوششوں کے بعد انھوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ غصہ میں اللہ رکھو کی ماں کو آواز دی۔ وہ تو نہیں آئی، اللہ رکھو آیا۔ کہنے لگے کہ تمہاری ماں کو کیا ہو گیا ہے۔ کھانا پکانا بھول گئی ہے۔ ان کا طیش بڑھتا رہا اور جب غصہ سے بے قابو ہو گئے تو سارا غصہ استخارہ پر نکال ڈالا۔ بے ساختہ استخارہ کو گالیاں دیں۔ کہ اسی استخارہ میں کلیجی نکلی تھی۔ لیکن اس پر معاملہ

ختم نہیں ہوا۔ غصہ ایک ڈگری اور بڑھ گیا اور دوسرے ہی لمحہ سالن کا پیالہ کمرہ سے باہر تھا۔ ایک چھناکہ ہوا اور فضا خاموش ہوگئی۔ اب وہ خاموشی سے اٹھے باتھ روم میں ہاتھ دھویا۔ مجھ سے کہا کہ جاؤ ہوٹل میں کھا لینا۔ میں نے کاغذات سمیٹے اور چلا آیا۔ ہوٹل میں پیٹ بھر کر کھانا بھی کھا لیا لیکن اس رات پھر علامہ نے کچھ کھایا یا یوں ہی سو گئے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں چل سکا کیوں کہ جب پھر کئی دنوں کے بعد علامہ کے یہاں حاضری دی تو میں اللہ رکھو یا اس کی ماں سے پوچھنا ہی بھول گیا۔

اس طرح ایک بار اور علامہ کو استخارہ نے پریشان کیا۔ اس مرتبہ تو مجھے اس کا شکار بننا پڑا۔ ہوا یہ کہ یونیورسٹی میں گرمیوں کی چھٹیاں ہونے والی تھیں جب چھٹیاں ہونے والی ہوتیں تو گیلانی سے علامہ کے محب خاص ڈی ایس پی جناب ظفیر الحسن گیلانی جمیل صاحب کو گیلانی آنے کی دعوت دیتے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح ٹال جاتے۔ کبھی بھیکن پور (مظفرپور) چلے جاتے یا اپنے بھائی جناب رضا کاظمی کے یہاں کلکتہ کا پروگرام بنا لیتے اور ہر بار ڈی ایس پی صاحب کو مایوس ہونا پڑتا۔ گیلانی صاحب علامہ کو آموں کے موسم میں بلانا چاہتے تھے کہ خود ان کے پاس بھی آموں کا بہت بڑا باغ تھا۔ گیلانی کے آم تو مشہور نہیں تھے لیکن آموں کے باغات وہاں کثرت سے تھے اس لئے یہ چھوٹا سا مردم خیز گاؤں مولانا مناظر احسن گیلانی کے علاوہ آموں کے باغ کی وجہ سے بھی شہرت رکھتا تھا۔ غرض کہ علامہ گیلانی نہیں جا پاتے۔ لیکن اس بار انھوں نے اس شرط کے ساتھ گیلانی جانے کی حامی بھر لی کہ میں جب گرمیوں میں استھانواں جانے لگوں تو علامہ کو بھی ساتھ لیتا جاؤں گا۔ مجھے جمیل صاحب کے ساتھ سفر کا ایک موقع ہاتھ آگیا۔ تقریباً ایک مہینہ پہلے ہی یہ پروگرام طے کیا گیا تھا۔ چھٹیوں سے ٹھیک تین دن پہلے تاریخ کا تعین بھی ہوگیا۔ یہ بھی طے پایا کہ شیخپورہ ایکسپریس وہ بس تھی جو پٹنہ سے بہار شریف استھانواں، گیلانی ہوتے ہوئے شیخپورہ جایا کرتی تھی گاندھی میدان بس ڈپو سے دو بجے دن میں روانہ ہوتی تھی اور شام ساڑھے چھ بجے تک گیلانی پہنچا دیا کرتی تھی۔ سفر سے ایک دن قبل علامہ کے پاس پہنچا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ سفر کی تیاری تقریباً مکمل کر چکے ہیں۔ دھوبی کے ہاں سے کپڑے آچکے تھے بکس میں ضروری سامان کے ساتھ سگریٹ کا کوٹہ بھی رکھ دیا گیا تھا۔ علامہ نے حکم دیا کہ کل دس بجے تک آجانا۔ دن کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔ اور ایک بجے گھر سے نکل چلیں گے۔ میں پروگرام کے مطابق دوسرے دن دس بجے اپنا ایک بکس اور بیگ لے کر علامہ کے یہاں پہنچ گیا۔ دیکھا کہ علامہ کچھ خاموش سے ہیں۔ گیلانی جانے کے لئے کل انھوں نے جس سرگرمی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ آج نہیں ہے۔ میں نے اپنے طور پر سوچا کہ ابھی وقت کافی ہے اور تیاری بھی ہو چکی ہے۔ اس لئے علامہ مطمئن ہیں۔ میں کچھ دیر تک بس یوں ہی بیٹھا رہا۔ مگر مجھے کچھ گڑبڑی کا احساس ہو رہا تھا اس لئے میں نے اپنے تردد کو دور کرنے کے لئے گفتگو اس طرح شروع کی کہ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ فرمایا کہ طبیعت تو ٹھیک ہی ہے لیکن آج استخارہ میں سفر کا التوا نکل آیا ہے۔ اب کل چلیں گے۔ یہ سن کر میرا منہ چھوٹا سا ہو گیا۔ چھٹیوں میں گھر جانے کے پروگرام میں کتنی امنگیں شامل ہوتی ہیں۔ جلد سے جلد پہنچنے کی کتنی بے تابی ہوتی ہے علامہ کے ایک استخارہ نے ان امنگوں پر پانی ڈال دیا۔

بہر حال کرنا [illegible] تھا۔ اپنا سامان لے کر واپس نشیمن چلا آیا۔ سامان [illegible] پڑے رہے اور آئندہ چوبیس گھنٹوں کے انتظار [illegible] کرب کو جھیلنے کے لئے مستعد ہو گیا۔ خدا خدا کرکے یہ [illegible] کٹا [illegible] صبح ہوئی۔ پھر رخت سفر باندھا [illegible] علامہ کے پاس پہنچ گیا۔ آج ان کے چہرے سے بشاشت کا اظہار ہو رہا تھا۔ لگا کہ موڈ ٹھیک ہے کہ آج استخارہ نے علامہ کا نہیں بلکہ میرا ساتھ دے [illegible] ہے۔ وقت گذرا۔ کھانا آیا۔ لیکن کھانے کے بعد علامہ پلنگ پر جس اطمینان کے ساتھ بیٹھے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ایک بجنے کو تھا۔ میرا خیال تھا کہ جلدی بس اسٹینڈ پہنچ جانا چاہئے تاکہ ٹکٹ اور جگہ کے مسئلہ کو حل کرنے میں دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

میں نے علامہ سے درخواست کی کہ اب چلنا چاہئے۔ علامہ یہ سنکر مسکرائے اور ان کا ہاتھ تکیہ کی طرف جیسے ہی بڑھا مجھے ایک [illegible] محسوس ہوا جیسے اچانک میری نبض رک گئی ہو۔ انھوں نے تسبیح نکالی۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اور انجام کار بات وہی ہوئی جس کا ڈر تھا یعنی آج پھر منع نکل آیا۔ اور سفر کل کے لئے پھر ملتوی ہو گیا۔ میرے چہرہ کی افسردگی کو علامہ بھانپ گئے اور یہ کہہ کر میری ڈھارس بندھائی کہ کل میں چلوں گا اور استخارہ کے بغیر چلوں گا۔ ان کی اس یقینی دہانی سے مجھ پر جو زبردست پژمردگی کا عالم طاری ہو گیا تھا وہ ختم تو کیا ہوتا لیکن اس کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ میں آج پھر اس پوزیشن میں آ گیا کہ میں نے اپنا سامان لیا اور پھر واپس نشیمن چلا آیا۔ کل جانا ہو گا یا نہیں۔ یا تیسرے دن بھی اسی طرح استخارہ ہماری راہ میں حائل ہو گا۔ بہر کیف چوبیس گھنٹے پھر اسی کشمکش میں گذارنا پڑے۔ مگر تیسرے روز واقعتہً علامہ نے استخارہ کے جبر سے نجات حاصل کر لی۔

یعنی استخارہ کے بغیر علامہ وقت پر گھر سے نکل پڑے۔ اور کسی طرح ہم گیلانی آئے۔ میں نے ان کو ڈی ایس پی صاحب کے حوالہ کیا اور شب گیلانی [illegible] [illegible] کر [illegible] صبح بستھا نہ [illegible] چلا آیا۔

علامہ سفر سے بہت گھبراتے تھے ۱۹۶۱ء کے بعد سے میں نے ان کو بس چند ہی جگہ آتے جاتے دیکھا تھا۔ زیادہ تر وہ کلکتے جاتے کہ اس شہر سے ان کا جذباتی لگاؤ تھا۔ طالب علمی کا دور وہیں گذرا تھا۔ نوجوانی کی راتیں اور دن جس جگہ سے وابستہ ہوں۔ اس جگہ سے جذباتی تعلق ناگزیر بن جاتا ہے۔ کلکتہ میں ان کے چھوٹے بھائی جناب رضا کاظمی تھے۔ ان کے بے تکلف احباب کا ایک حلقہ تھا۔ جاڑوں میں اکثر کلکتے آتے کہ یہاں سردیوں میں بہار کے مقابلہ میں سردی کم پڑتی ہے اور موسم تکلیف دہ نہیں ہوتا ہے۔ گرمیوں میں وطن بھیکن پور جاتے۔ علامہ کہتے کہ بھیکن پور میں گرمیوں کا موسم خوشگوار رہتا ہے۔ وہ ایک دو بار لکھنؤ بھی گئے۔ غالب ایوارڈ لینے دلی بھی تشریف [illegible] [illegible] ورنہ علامہ بالعموم سفر سے گریز کرتے۔ اس کی بڑی وجہ شاید ان کا اختلاج بھی اور ان کی قناعت پسند طبیعت۔ جمیل صاحب تو سفر کے ان مواقع کو بھی ضائع کر دیتے یا ان کو وہ اہمیت نہیں دیتے جن سے ان کو کسی طرح کے فائدے حاصل ہو سکتے تھے۔ مثلاً وہ لال قلعہ کے مشاعرہ میں بطور خاص بلائے گئے۔ مگر وہ خود تشریف نہیں لے گئے بلکہ انھوں نے اپنے شاگرد کلیم عاجز اور جناب رضا نقوی واہی (جو علامہ سے قریب بھی تھے اور کسی زمانہ میں اپنے کلام پر علامہ سے اصلاح بھی لیا کرتے تھے) کو یہ موقع فراہم کر دیا۔ ان دونوں کے لئے جمیل صاحب نے قاضی عبدالودود صاحب کو تیار کیا کہ وہ فخر الدین علی احمد صاحب کو سفارشی خط لکھ دیں۔ قاضی صاحب کی یادداشت ان دنوں کمزور ہو چکی ہے۔ ورنہ وہ اس بیان کی تصدیق ضرور کر دیتے۔ لیکن علامہ چونکہ دونوں

صفت انسان تھے۔ شہرتوں سے فرار اور قناعت و توکل کو اپنا شیوہ بنا چکے تھے اس لئے کبھی بھی انھوں نے اپنے لئے ان ذرائع کا استعمال نہیں کیا۔ مختصر یہ کہ علامہ سفر سے گھبراتے تھے۔ جب بہت ضروری ہوتا اور استخارہ بھی انھیں اجازت دیدیتا تو وہ بھی اکیلے نہیں بلکہ کسی کو ساتھ لے کر سفر کا قصد کرتے تھے۔

مجھے معلوم تھا کہ علامہ سفر سے بہت گھبراتے ہیں اختلاج اور استحالہ ان کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود میں نے ایک مرتبہ ان کو ایک چھوٹے سے سفر پر اکسایا تھا۔ یہ تھا کہ قاضی معین الحق صاحب (اورنگ آباد) کی منجھلی صاحبزادی روشن آرا کے ساتھ میرا عقد بی۔ اے کے نتیجہ کے بعد ۱۹۶۱ء ہی میں ہو چکا تھا۔ رخصتی میں تاخیر میری طرف سے ہو رہی تھی کہ حالات ابھی تک اس کے لئے موافق نہیں ہوئے تھے۔ ابا جان موقع کی تلاش میں تھے۔ اس لئے مجھے جیسے ہی مارچ ۱۹۶۴ء میں یو جی سی فیلوشپ ایوارڈ ہوئی انھوں نے رخصتی کے لئے ۳۰ مئی کی تاریخ مقرر کر دی۔

ابا جان (مولانا سید فصیح احمد رحمہ) کو جو لوگ جانتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ زبردست متقی اور اسلام کی صحیح اسپرٹ رکھنے والے ایک جید عالم دین تھے۔ وہ جہیز کے سخت مخالف تھے۔ اور شادی بیاہ کی مروجہ رسموں کے دشمن تھے۔ وہ اس کے بھی خلاف تھے کہ باراتیں زیادہ لوگ جائیں اور لڑکی والوں کو زیربار کریں۔ اس لئے اس موقع سے ان کے سامنے دو مسئلے آ گئے۔ ایک تو یہ کہ اپنے اعزا اور اقربا کی کثیر تعداد کے باوجود کم سے کم لوگوں کو باراتی کی حیثیت سے لے جانا۔ دوسرے یہ کہ اس سے دو ماہ قبل ہی جمشید پور کا جو ہندو مسلم فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا، اس میں میرے سسرال کے کچھ قریبی رشتہ دار بھی شہید کر دیئے گئے تھے۔ اس لئے اورنگ آباد میں قبلہ قاضی صاحب کے گھر اور خاندان میں فضا بھی بہت سوگوار تھی۔ ایسے حالات میں بارات کا کوئی خاص تو کیا ایک عام تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فریقین اسلامی طرز کی رخصتی کی تقریب پر رضامند ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود میری خواہش تھی کہ میری بارات میں کوئی آ جائے یا نہیں علامہ کو میں بہرحال زحمت دوں گا۔ لیکن اس خواہش کی تکمیل ہو، یہ خیال کیسے خارج ہو گیا کہ علامہ کو جتنا آرام، جتنی فکر اور جتنی ضیافت چاہیئے وہ میں یا ہمارے گھر والے استھاواں میں مہیا نہیں کر سکیں گے۔ نتیجہ میں ان کو تکلیف ہوگی۔ وہ ناراض ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر میں نے علامہ کو دعوت دینے کی بات ختم کر دی۔ لیکن خبر تو بہرحال دینی تھی کس طرح یہ خبر سنائی جائے گی۔ میں نے ذہن میں اس کے لئے خاکہ مرتب کر لیا اور پہنچ گیا علامہ کے پاس۔ اور شروع ہو گیا کچھ اس طرح "سر! جمشید پور کے حالیہ فساد میں کئی سسرالی رشتہ دار شہید ہو گئے۔" یہ سنتے ہی علامہ سنبھل کر بیٹھے اور ہمہ تن گوش ہو گئے۔ میں نے عرض کیا۔ "اس کے باوجود قاضی صاحب رخصتی پر مصر ہیں۔" میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ علامہ بیچ میں بول اٹھے "میں حامد (سید حامد حسن پٹنہ یونیورسٹی میں تاریخ کے اسٹوڈنٹ اور ڈی ایس پی ظفر الحسن گیلانی کے چھوٹے صاحبزادہ) کے ساتھ ۲۹ مئی کو استھاواں پہنچ جاؤں گا۔" یہ سن کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ سوچا تھا کہ میری اس سوگوارانہ تمہید کو سن کر علامہ خود ہی بارات میں شرکت کی خواہش نہیں کریں گے۔ لیکن میرے لئے علامہ کے پاس جو پدرانہ شفقت تھی وہ کس طرح گوارا کرتی کہ بیٹے کی شادی میں باپ شریک نہ ہو۔ علامہ کے اس جواب سے مجھے ان کی چاہتوں کا ایک ایسا خزانہ ہاتھ لگ گیا جو میرے پاس بہت محفوظ ہے —— قصہ مختصر یہ کہ علامہ اپنے پروگرام کے مطابق

۲۹ مئی کو استھاواں پہنچ گئے۔ اس بار استھاواں بھی علامہ کے پروگرام کو ملتوی نہیں کر پایا۔ وہ صرف تشریف ہی نہیں لائے بلکہ ایک عدد سہرا بھی لکھ کر لائے۔ استھاواں کی میزبانی/ضیافت' ظاہر ہے کہ ان کے مرتبہ کے مطابق نہیں ہوئی تھی لیکن انھوں نے بار بار یہ کہا کہ وہ اپنے بیٹے کے گھر آئے ہیں۔ اور اپنے ہی گھر میں خاطر تواضع اور تکلف کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ۳۰ مئی کو علامہ اور ڈی ایس پی صاحب ایک ہی ساتھ جیپ میں بارات کی بس کے ساتھ پہنچ گئے۔ بارات اوگانواں مسجد کے پاس ناروفرعلی امام صاحب کے مکان میں ٹھہرائی گئی۔ سخت گرم رات تھی اس لئے مکان کے باہر میدان میں مہمانوں کے لئے فرش لگا دیا گیا تھا۔ اور جو لوگ مکان کے اندر آرام کرنا چاہتے تھے ان کے لئے ٹیبل فین کا عمدہ انتظام تھا۔ کچھ بزرگ مہمانوں کے لئے علٰحدہ پلنگ اور بستر کا بھی انتظام تھا۔ قبلہ قاضی صاحب اور اگانواں کے لوگ علامہ کی موجودگی کو قابل فخر سمجھ رہے تھے۔ قبلہ نے علامہ کے لئے دو تین کارکن بطور خاص مقرر کر دئے تھے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد یہ معلوم ہوا کہ مہمان باراتیوں کے ساتھ علامہ بھی بے یار و مددگار چھوڑ دئے گئے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کے اسباب تھے۔ اوگانواں میں بھی زمینداروں کے دوسرے گاؤں گراموں کی طرح عزت سادات خطرے میں تھی۔ ذات پات کے نام پر گروہ بندیاں تھیں۔ اگلے زمینداروں نے، چھوٹی ذات کے لوگوں کے ساتھ جو برتاؤ روا رکھا تھا۔ اب تقسیم ملک کے بعد نئی نسل کو یا وہ جو کسی وجہ سے ہجرت نہیں کر پائے تھے۔ ان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا تھا بغض و حسد کی آگ میں صرف اوگانواں اور استھاواں ہی نہیں بلکہ پورا مگدھ دیس جل رہا تھا۔ اس کی ایک ہلکی سی لپیٹ ہم سبھوں نے ۳۰ مئی کی اس رات محسوس کی

جب پروگرام کے مطابق میری بارات آٹھ بجے اوگانواں پہنچ گئی تھی۔ سادات یعنی میزبانوں کی اتنی مختصر تعداد تھی کہ وہ بارات کے مہمانوں کی ضرورتوں کو پوری نہیں کر پا رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ مہمانوں کے لئے کھانا دس بجے تیار ہو جانا چاہئے تھا لیکن جیسا کہ ہمیں بتایا گیا کہ دس بجے تو باورچی ہی آیا تھا۔ اوگانواں میں اس روز اتفاق سے تین مختلف باراتیں آئی ہوئی تھیں۔ قاضی صاحب نے یہ دیکھ کر اپنے معتبر کارندوں سے کہا تھا کہ علٰحدہ باورچی کا انتظام کر لیا جائے۔ لیکن قبلہ کو علٰحدہ باورچی منگانے سے روک دیا گیا۔ انھیں ان کے بہی خواہوں نے یہ یقین دلا دیا تھا کہ ایک ہی باورچی دو جگہ کم وقت میں پروگرام کے مطابق کھانا تیار کرے گا اور ٹھیک دس بجے تک آپ کے مہمان دسترخوان پر کھانا کھا رہے ہوں گے۔ دس بجے دسترخوان پر کھانا تو کیا چنا جاتا باورچی ہی دس بجے رات میں آیا۔ اس بدانتظامی کی وجہ یہ بھی ہوئی کہ قاضی صاحب کے خاندان کے وہ لوگ جن کو اس شادی میں شرکت کے لئے آنا تھا نہیں آسکے کیوں کہ وہ اب تک افسردہ تھے۔ اور (خورشید پور میں) ان کو جو زخم لگا تھا اس کو مندمل ہونے میں طویل مدت درکار تھی۔ خود قاضی صاحب کے اپنے کنبہ میں بھی مرد کم تھے۔ قاضی صاحب کے علاوہ میرے بڑے ہم زلف، ظہیر گیلانی تھے جو مصروف کار تھے اور دیکھ بھال کر رہے تھے۔ بقیہ بچے تھے اور ناتجربہ کار تھے۔ علاوہ ازیں گاؤں کی سیاست بھی جو اس وقت رنگ لا رہی تھی۔ عصبیت کا بھوت چند نوجوانوں پر اس حد تک سوار تھا کہ وہ دعوت کے باوجود نہیں شریک ہوئے۔ یعنی انھوں نے بزعم خود قاضی ٹولی کی اس تقریب کا بائیکاٹ کیا تاکہ قاضی معین الحق صاحب ذلیل و خوار ہوں ——— بہرکیف اب صورت حال یہ ہو گئی کہ مہمان خانہ میں چائے کا سامان موجود لیکن چائے بنا کر

دینے والا کوئی فرد نہیں۔ بعض لوگ سویرے کھانا کھانے کے عادی تھے۔ ان میں علامہ بھی تھے۔ اس لئے جیسے ہی سالن تیار ہوا علامہ کے لئے کھانا آگیا۔ علامہ نے چپاتی کا حکم دیا تھا۔ چپاتی بھی تیار ہو چکی تھی۔ قاضی صاحب نے کافی قیمتی کھانے کا اہتمام کیا تھا۔ سیب کا قلیہ اور بٹیر کا قورمہ تیار کرایا تھا مگر تکلیف دہ بات یہ ہوئی تھی کہ باراتیوں کو جہاں ٹھہرایا گیا تھا وہاں سے باورچی خانہ کافی فاصلہ پر تھا۔ اس لئے علامہ نے جب کھانا شروع کیا تو سیچوئیشن کچھ اس طرح کی تھی کہ کبھی چپاتی ختم۔ اور گرم گرم چپاتی جب تک باورچی خانہ سے لائی گئی تو بٹیر غائب ہو چکے تھے۔ کسی طرح علامہ نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد انھوں نے چائے کی خواہش ظاہر کی تو چائے نہیں ملی کہ کوئی بنا کر دینے والا ہی نہیں تھا۔ بزرگ مہمانوں نے رات بارہ بجے کھانا کھایا۔ اور بقیہ باراتیوں کو دو بجے کھانا میسر آیا۔ اور چند مہمان عورتیں جب کھانا کھانے بٹھائی گئیں تو اس وقت صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ بدنظمی سے پیدا ہونے والی تکالیف سے علامہ نے بھی اثر لیا۔ رات میں وہ ٹھیک سے سو بھی نہیں سکے نتیجہ میں وہ جلال میں آئے اور ہمدھی کی حیثیت سے انھوں نے قاضی صاحب قبلہ کی منظوم ہجو لکھی۔ وہ نظم کس کے ہاتھ لگی پتہ نہیں چل سکا لیکن اس ہجویہ نظم کا ایک شعر اس حد تک مشہور رہا کہ صبح ہوتے ہی ہر ایک کی زبان پر تھا شعر یہ تھا

خدا قعر جہنم میں گرائے
مگر ہم کو اودھ کا پھر نہ لائے

علامہ نے کلکتے میں اپنی نصف زندگی گزاری۔ اس دوران انھوں نے وحشت، آغا حشر، ابوالکلام آزاد کی صحبتوں سے کسب فیض بھی کیا۔ بے تکلف احباب کا ایک حلقہ بھی تیار کیا۔ محبوب طرزی۔ بے خود کلکتوی۔ پرویز شاہدی۔ ڈاکٹر لطیف اور جانے کتنے ان کی جلوت و خلوت کے رازدار تھے۔ پٹنہ میں مشہور تھا کہ علامہ کا پٹنے میں جی نہیں لگتا ہے۔ جب بھی پوجا یا گرمیوں کی چھٹیاں ہوتیں وہ پہلی ٹرین سے کلکتہ کے لئے روانہ ہو جاتے اور چھٹیاں ختم ہونے کے بعد آخری ٹرین سے لوٹتے۔ کلکتہ میں جمیل صاحب کے چھوٹے بھائی جناب رضا کاظمی اپنے بھیا کے لئے فرش راہ رہتے۔ سبھوں نے دیکھا ہے کہ رضا صاحب نے جو محبت و عقیدت اپنے بھیا کو دی ہے، وہ ایک بھائی سے نہیں، ایک لائق بیٹے ہی سے ممکن ہے۔ رضا صاحب بھی ہائی بلڈ پریشر کے مریض ہیں۔ اس لئے ان کو بھی آرام، ذہنی سکون اور کھانے پینے میں سخت احتیاط اور پرہیز کی ضرورت ہے۔ ہم نے دیکھا کہ علامہ جب بھی کلکتہ میں مقیم رہے اپنے بھائی رضا کاظمی کا مکمل چارج لے کر رہے۔ وہ کیا کھائیں گے کس وقت کہاں اور کتنی دیر کے لئے جائیں گے۔ اس کا فیصلہ کاظمی صاحب نہیں بلکہ انچارج کی حیثیت سے علامہ کرتے بسا اوقات رضا صاحب کے لئے بھی علامہ استخارہ کرتے نتیجہ میں یہ استخارہ رضا صاحب کے لئے وبال جان بن جاتا۔ لیکن ان کی عقیدت و احترام کا یہ عالم کہ زبان سے کوئی حرف احتجاج بلند نہ ہوتا۔

کلکتے میں علامہ کی سرگرمیاں کوئی خاص نہیں ہوا کرتیں۔ مطالعہ کتب میں زیادہ تر وقت گذارا کرتے۔ لیکن آنکھ کے آپریشن کے بعد مطالعہ کتب میں کمی آگئی تھی۔ ویسے نوجوان شعرا ان کے پاس آتے رہتے۔ اور اصلاح لیا کرتے۔ کبھی کبھار "بزم احباب" یا "بزم تمنا کرو" کے جلسوں میں بھی شریک ہو جاتے اور اپنی تخلیقات سے نوازتے۔ کلکتے میں ایسے شعرا کی کمی نہیں جنھوں نے علامہ کی شاعرانہ فیاضی اور شعری عطایا سے زبردست فائدہ اٹھایا ہو۔ لیکن ان کا نام لینا اس وقت بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے

کے مرادف ہے۔ علامہ کلکتہ کی دوسری صنف کے شعرا میں جناب احسان دربھنگوی کو بہت چاہتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ احسان صاحب نے اپنی کاوش اور حسن ذوق سے علامہ کے رنگ و مزاج شاعری کو اپنانے کی کسی حد تک کامیاب کوشش کی تھی۔ خیر شاعری سے الگ ہٹ کر علامہ تاش کے کھیل سے بھی جی بہلاتے تھے کلکتہ میں شام کے وقت ان کے کچھ بے تکلف احباب چند معتقد رضا صاحب کے فلیٹ نمبر ۵ صندل اسٹریٹ میں جمع ہو جاتے اور تاش کا کھیل شروع ہو جاتا۔ وہ تاش کا سب سے معمولی اور ہلکا پھلکا کھیل کوٹ پیس کھیلا کرتے جب احباب کسی وجہ سے کم ہوتے تو وہ مجھ جیسے شاگرد کو بھی بلوا بھیجتے۔ کبھی کبھی میں بغیر بلائے بھی پہنچا ہوں۔ کھیلتے وقت علامہ عرش سے اتر کر فرش پر آجاتے۔ یعنی چوری بھی کرتے۔ اشارے کو بھی جائز سمجھتے۔ اگر اس کے باوجود ہار جاتے تو اپنے پارٹنر پر غصہ اتارتے۔ اور جب لگاتار کئی کوٹ کھا جاتے تو غصہ تاش پر آتا اور یہ کہتے ہوئے کہ تفریح کے لئے تاش کھیلتے ہیں یا طبیعت مکدر کرنے کے لئے۔ تاش ٹیبل پر پٹخ دیا کرتے اور کھیل بند ہو جاتا۔

ایک طرف علامہ کا سبھوں کے ساتھ پر خلوص برتاؤ تھا۔ ہر ایک کے لئے فیاضی رویہ تھا۔ پوری زندگی سراپا قربانی اور تیاگ کی وہ علامت تھے لیکن ان کے معتقدوں اور چاہنے والوں نے ان کے ساتھ کس طرح کا سلوک روا رکھا۔ یہ سوال علامہ کی زندگی کا وہ پہلو ہے جو کسے کم ہم جیسے لوگوں کے لئے بے حد تشویشناک اور سخت تکلیف دہ ہے۔ کلکتہ کے لئے علامہ جس حد تک جذباتی وابستگی رکھتے تھے۔ اور بارہا اپنے عمل سے اس کا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔ علامہ کے اسی وطن ثانی کلکتے میں جب ایفرو ایشیائی کانفر

ہوئی۔ اس میں شرکت کے لئے فیض احمد فیض یہاں آئے اور چار دنوں تک مقیم رہے۔ علامہ بھی ان دنوں کلکتے میں تھے اور یہاں ان کا یہ آخری قیام تھا کہ اس کے بعد جب بھیکن پور (مظفر پور) گئے تو وہیں پیوند خاک ہو گئے فیض جب تک کلکتہ میں رہے۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی مسلم انسٹی ٹیوٹ اور دیگر ادارے ان کو استقبالیہ دیتے رہے۔ مگر علامہ کو نہ دعوت دی گئی اور نہ ملاقات کے مواقع فراہم کئے گئے۔ فیض کے سننے کے لئے رابندر سدن ہال میں ایک مشاعرہ بھی ہوا۔ مقامی شعرا کو بھی بلایا گیا۔ مگر علامہ کے معتقدین اور چاہنے والے جوان استقبالیوں اور مشاعروں کے اہتمام میں پیش پیش تھے۔ وہ فیض کے ساتھ فوٹو کھچوانے میں اتنے منہمک رہے کہ انھیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ شہر میں اردو کا عظیم شاعر بھی موجود ہے۔ یہ بے چارے معصوم لوگ اتنے کم عقل ٹھہرے کہ اپنے شہر اور اپنی زبان کے وقار کو نظر انداز کر کے اپنے قدرداں کی نکہ پیر ماشن ہی کو قابل فخر سمجھتے رہے۔ کاش وہ یہ بھی سمجھ پاتے کہ فیض و جمیل کی ملاقات سے ان کے ہونے قدروں کا وقار کچھ اور بڑھ سکتا ہے۔

پٹنہ میں بھی جمیل صاحب کے ساتھ تقریباً اسی طرح کے سلوک کا مظاہرہ کیا گیا۔ حلقۂ ادب (انجمن ترقی اردو بہار) کے زیر اہتمام ۲۲ ۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو یوم جمیل منایا گیا۔ ۲۲ اکتوبر کو گورنمنٹ اردو لائبریری میں اردو کے ممتاز ناقد کلیم الدین احمد کے ذریعہ ڈاکٹر عبدالمغنی نے یوم جمیل کا افتتاح کرایا۔ کلیم صاحب جمیل مظہری تقریب کا افتتاح کرنے کھڑے ہوئے۔ موصوف نے اپنی مختصر سی تقریر میں دو باتیں کہیں کہ ہر جلسہ میں تثلیث کی رسم چل نکلی ہے جو غیر ضروری ہے۔ یعنی صدر، افتتاح کرنے والا اور مہمان خصوصی۔ دوسرا جملہ یہ تھا کہ جمیل مظہری پر

سی می نادا اگر آج ہوتا تو میں شرکت کرلیتا۔ مگر مجھ کو بھی فرصت نہیں ہے۔ عظیم ناقد کا تیسرا جملہ یہ تھا: میں افتتاح کرتا ہوں۔ اس طرح یوم جمیل کا افتتاح جمیل مظہری کے ... چاہنے والوں نے ... گوارا کرلیا ... کلیم الدین احمد ایک عظیم ناقد ہیں اور ان کو ... ہے کہ وہ جمیل مظہری ... اور شخصیت سے لاعلمی کا اظہار کرکے عملاً ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ کلیم الدین صاحب تین مجلدوں میں نہ جمیل مظہری کا نام تھا۔ نہ ان کی شاعری اور

فن پر کوئی رائے تھی۔ کلیم الدین احمد ... میں اردو کا وہ مخصوص مزاج کہ ہر جگہ موجود ہے اور اس سے الدین میں ایک مخصوص رعونت فروغ ... ہے

اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے عاشقوں کا

ساوات کا علاج میں نے ... دیا کہ دولت مند دولت

... کے اپنے منفرد لہجہ اور دلنشیں ... جمیل مظہری کی فکری بصیرت ... الگ حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں ... نے شروع کی۔ کلکتہ ادبی عقیدت ... ذوق شعری کی جدت پسندی ... فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے ... بعد میں انھوں نے عملی حصہ لیا ... یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ... ۶۹ تک اردو زبان و ادب ... نظمیں، افسانے اور ناول لکھے ... قطعات اور رباعیات کے ... گویا ہشت قلم تھے۔ ... سے میری ملاقات ہوئی ... ملاقات ۔۔۔۔ آج ان ملاقات کی ... ہوں تو یادوں باتوں کا ایک ... تصور کی آنکھ کے سامنے کھڑا

ہمنا کرنا پڑگیا ۔

کے فرائض سے
میں جناب احسان
کی ایک وجہ یہ بھی
اور حسن ذوق سے
کی کسی حد تک کامیاب
الگ ہٹ کر علامہ تا
سکتے ہیں شام کے وقت
معتقد رضا صاحب کا
جمع ہوجاتے اور تاش کا
سب سے معمول اور

جب احباب کسی وجہ
کو بھی بلوا بھیجتے ۔ کبھی
چھوٹی بھی کرتے ۔ اشارہ
باوجود ہار جاتے تو نہیں یا
لگاتار کئی گوٹ کھا جاتے تو
کہتے ہوئے نعرہ
مکدر کرنے کے لئے ۔ تاش
بند ہو جاتا ۔

ایک طرف علامہ
برتاؤ تھا ۔ ہر ایک کے لئے
قربانی اور ایثار کی وہ
اور چاہنے والوں نے ان کے
دکھا ۔ یہ سوال علامہ کی زندگی
جیسے لوگوں کے لئے بہت
سکتے کہ علامہ جس حد تک
اللہ بالا اپنے عمل سے اس کا
علامہ کے اسی وطن

علامہ جمیل مظہری ——— یادیں باتیں

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

کلام کا توانا منظم اور پرکشش فکری پہلو ——— سوز و گداز، تندی و سرمستی اور سرکشی و بے باکی ——— زبان کے تخلیقی امکانات ——— جمالیاتی پہلو ——— تجربے کی آنچ اور جذبے کی تپش ——— اپنے عہد کے سلگتے ہوئے مسائل ——— فطرت اور انسان کی باہمی ہم آہنگی و غیر ہم آہنگی کا انکشاف ——— غالب، اقبال، ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، وحشت کلکتوی، غزالی، رومی، عرفی، کبیر، ورڈس ورتھ، روسو، کانٹ، نطشے، شیلی اور مذاہب عالم میں اسلام کے علاوہ بدھ ازم، زرتشت، قادیانیت، مسیحیت، گاندھی ازم اور اشتراکیت کا گہری نگاہ سے مطالعہ ———:

" اشتراکی بھی ہوا اور کارل مارکس کا مرید بھی لیکن میرے ذہن کو سو فیصدی اتفاق کسی نظریے سے نہ ہو سکا ——— ایک مستقل انقلاب انسان کے نفس و ذہن کی تربیت ہی سے ممکن ہے "

" گاندھی کے فلسفۂ عدم تشدد پر میرا پورا ایمان ہے اور میں پورے یقین کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ تشدد کا استیصال تشدد سے ممکن نہیں اور تشدد ہی کیا کسی برائی کو برائی سے ختم نہیں کیا جا سکتا ، لیکن جب معاشرے کے عدم مساوات کا علاج میں نے باپو سے پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ دولت مند دولت کا امین ہے "

کلاسیکی روایات کے امین، منفرد لہجہ اور دلنشیں انداز بیان کے مالک، علامہ جمیل مظہری کی فکری بصیرت اور فنی لطافت اپنی جگہ پر الگ حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے ادبی زندگی صحافت سے شروع کی۔ کلکتہ اور عشرت نے انہیں بہت کچھ دیا۔ ذوق شعری کی جدت پسندی اور ناموری ——— وہ فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ جنگ آزادی کی جد و جہد میں انھوں نے عملی حصہ لیا۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد ہوئے اور ۱۹۶۷ء تک اردو زبان و ادب کا درس دیتے رہے۔ مثنوی، افسانے، اور ناول لکھے۔ غزلیں، نظمیں، مرثیے، قطعات اور رباعیات کے علاوہ فلمی گیت بھی لکھے۔ گویا ہشت قلم تھے۔

جمیل صاحب سے میری ملاقاتیں ——— سینکڑوں بار کی ملاقات ——— آج ان ملاقات کی خوشبو کو سمیٹنے بیٹھا ہوں تو یادوں باتوں کا ایک سلسلہ ہاتھ باندھے تصور کی آنکھ کے سامنے کھڑا نظر آ رہا ہے۔

اُن دنوں میں نے پٹنہ یونیورسٹی میں ایم۔اے میں داخلہ لیا تھا۔ معلوم ہوا جمیل صاحب بھی کلاس لیتے ہیں۔ مرثیہ اور مثنوی کا کلاس ان کے ذمے تھا۔ جب وہ پہلی بار کلاس میں آئے تو حاضری رجسٹر ہم طالب علموں کی طرف بڑھا کر بولے "حاضری لے لیجئے" اور خود سگریٹ سلگا کر آہستہ آہستہ کش لینے لگے۔ خیالات کہیں اور تھے۔ آنکھوں میں سائے سے لہراتے رہے۔ سگریٹ بجھ چکا تھا۔ طالب علم لڑکے لڑکیاں اشاروں کی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ اور پیریڈ ختم ہو گیا۔ اعجاز علی ارشد نے ہمت کر کے کہا "سر، اگلے پیریڈ کا وقت ہو گیا۔"

"ہاں، اچھا" جمیل صاحب چونک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی، لیکن پھر ماچس اٹھا کر بجھے ہوئے سگریٹ کو سلگانے لگے۔ لڑکے لڑکیاں کلاس سے باہر آ گئے ——— میں نے رک کر اپنا تعارف کرایا تو ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کر کے بولے "اچھا اچھا سنا تھا کہ آپ بھی داخلہ لے رہے ہیں۔ ٹھیک کیا یہاں آ گئے۔ میں آپ کو پڑھا رہا ہوں۔ بہت چھپتے ہیں۔"

پھر کئی ملاقاتوں میں جمیل صاحب سے میں بے تکلف ہو گیا۔ اکثر وہ اپنے یہاں بلاتے۔ میں جب بھی گیا انھیں ناولوں کے بیچ پایا، وہ تفریحی قسم کے ناول بہت شوق سے پڑھتے تھے ——— [illegible] رضیہ بٹ اور اسی قبیل کے کمرشیل ناول نگاروں کے ناول ان کے بستر پر پڑے رہتے تھے۔ لیکن گفتگو بے حد عالمانہ انداز میں کرتے تھے اور ہر بات دلیل کے ساتھ کہتے تھے۔ جب بھی ادبی موضوعات پر باتیں ہوتیں، وہ علم کا دریا بہا دیتے تھے۔ کلاس میں پڑھانے کا موڈ بن جاتا تو انہیں اور دیر کے یہاں ایسے ایسے نکتے نکالتے اور مرثیہ کے بند سنا کر ایسی نقشہ کشی کرتے کہ اپنی کم مائیگی کا احساس شدت سے ہونے لگتا ——— پڑھاتے پڑھاتے وہ خود کھو جاتے۔ ہمیشہ ایسا ہوا کہ وہ پڑھا رہے ہیں اور لڑکے کلاس سے باہر آنے جانے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں، لیکن جمیل صاحب کو مطلق خبر نہیں ہوتی تھی۔ ہم طالب علموں میں بعض ایسے تھے جو پڑھنے سے زیادہ خوش گپی یا عشق بازی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ جمیل صاحب کے کلاس میں ان کی مطلب برآری کے مواقع خوب ملتے تھے۔ میں اپنے دو ساتھیوں نیاز احمد اور بشارت اللہ نیازی کو زچ کیا کرتا تھا۔ یہ دونوں جسمانی طور پر بے حد کمزور تھے لیکن خود کو رستم اور یوسف ثانی سمجھتے تھے۔ اور ہر لڑکی سے یہ توقع رکھتے کہ وہ ان پر عاشق ہے۔ دو تین لڑکیوں سے میری سانٹھ گانٹھ تھی اور ہم مل کر ان دونوں کو بے وقوف بنایا کرتے تھے ——— لیکن ایک دن عجیب واقعہ ہو گیا۔ جمیل صاحب کا کلاس تھا وہ مثنوی "زہر عشق" پڑھا رہے تھے۔ ایک وفا پرست لڑکی ماہ جبیں کی نامرادیوں اور قربانیوں کی داستان جس میں عزم و استقلال تھا۔ نیاز، جمیل صاحب کے لکچر سے زیادہ "ش" کو دیکھنے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ "ش" نے ایک بار مڑ کر دیکھا، اشاروں میں کچھ باتیں ہوئیں اور میں نے عمل کر ڈالا۔ کاپی سے کاغذ کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر اس کی گولی بنائی اور نیاز کو دکھلا کر "ش" کی گود میں پھینک دی۔ "ش" نے خاموشی سے کاغذ کی گولی اپنے پرس میں رکھ لی۔ نیاز میری طرف مڑ کر بولا:

"کیا کرتے ہو!"

اسی وقت ڈپارٹمنٹ کی چھت پر کسی کبوتر کے

بہنے کی آواز آتی "غٹر غوں غٹر غوں"۔

نیاز، منصور اور صغیر زور زور سے ہنس پڑے۔ زیبا، تسنیم، شاہینہ اور جبین بھی ہنس پڑیں۔ جمیل صاحب نے لیکچر روک کر ہم سب کی طرف دیکھا۔

"سر، وہ اوپر کبوتر بول رہا ہے۔" میں نے کہا لیکن جمیل صاحب کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ پہلی بار میں نے دیکھا کہ وہ ڈسٹرب ہوئے ہیں ————

بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر اس کا ردعمل دوسرے دن ہوا۔ جمیل صاحب کا کلاس تھا۔ وہ مرثیہ پڑھا رہے تھے۔ میں آگے بیٹھا ہوا تھا۔ اور ٹھیک میرے پیچھے کی سیٹ پر نیاز تھا۔ کلاس کے دوران نیاز نے پیچھے سے کہا "کل تم نے 'ش' کو خط کیوں دیا تھا"۔

میں چپ رہا۔ نیاز پھر بولا "سالے کباب میں ہڈی بنتے ہو۔ تم سے سمجھ لوں گا"۔

اس کے لہجے پر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر ایک ہاتھ جڑ دیا۔ میرا تھپڑ نیاز کے گال پر پڑا۔ چٹاخ کی آواز سناٹے میں گونج گئی۔ جمیل صاحب پڑھاتے پڑھاتے رک کر حیران نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ نیاز بپھر کر کھڑا ہو گیا، اور اول فول بکنے لگا۔ میں نے دو چار ہاتھ اور جڑ دیئے۔ جمیل صاحب کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بغل کے روم میں کلاس لیتے ہوئے پروفیسر یوسف خورشیدی کو بلا لائے "خورشیدی دوڑو، دنگا ہو گیا، خورشیدی دوڑو"۔

خورشیدی صاحب دوڑتے ہوئے آئے اور مجھے باہر لے گئے۔ جمیل صاحب اس واقعہ سے [illegible] تھے کافی دیر تک چپ رہے تھے۔ انہیں اس [illegible] اور خوفزدہ میں نے پہلی بار دیکھا۔

[illegible]

مجھے بلا بھیجا۔ "آج شام آپ میرے یہاں آئیے [illegible] انتظار کروں گا"۔

میں اس شام جمیل صاحب کے یہاں نہیں گیا۔ اگلے دو تین روز تک ڈپارٹمنٹ بھی نہیں گیا۔ میں بےحد خفت محسوس کر رہا تھا اور خود پر نادم تھا کہ مذاق کی بات پر اتنا سنجیدہ کیوں ہو گیا تھا۔ تیسرے دن شام کو خلافِ توقع نیاز میرے کمرے میں آ گیا۔ "تم ایک نمبر کے جذباتی ہو۔ بھری کلاس میں میری عزت اتار دی اور اب ڈپارٹمنٹ سے خود منہ چھپائے پھر رہے ہو۔ جمیل صاحب تمہیں بڑی شدت سے یاد کر رہے ہیں۔ اور ہاں یار، مجھ پر ایک احسان کر دو۔"

"کیا؟" میں نے نیاز کو پاس بٹھا لیا۔

"'ش' مجھے مارنے پیٹنے کے موڈ میں نظر آ رہی ہے۔ تم اسے سمجھا دو۔ اب اور بے عزتی نہ کراؤ۔"

"ٹھیک ہے، میں سمجھا دوں گا۔ اور ہاں سنو، 'ش' سے میرا کوئی معاملہ نہیں ہے......" میں نے نیاز کو تفصیل بتا دی اور ہم دونوں پھر دوست ہو گئے۔

اگلے دن ڈپارٹمنٹ میں جمیل صاحب سے ملاقات ہوئی تو بولے "کل صبح آپ میرے ساتھ نہاری کھائیے۔ ضرور آئیے گا۔"

اگلی صبح میں تقریباً [illegible] بجے ان کے پاس پہنچا۔ وہ بگڑنے لگے "یہ نہاری کھانے کا وقت ہے۔ صبح [illegible] ہوتی ہے۔ میں نے اپنے ایک عزیز کو اور آپ کو بلایا تھا ———— وہ تو کھا کر چلے گئے۔ آپ کا حصہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

اور [illegible] لگے۔ میں نے پوچھا "آپ نے کھا لی؟"

"نہیں، [illegible]"

الدین جیب ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ ہر کام
سے پہلے جمیل صاحب استخارہ نکالتے ہیں۔ اگر استخارہ
میں "نا" ہوگیا تو مرغوب سے مرغوب غذا کھانے سے انکار
کردیتے تھے۔ یہی بات کہیں آنے جانے یا کسی کام کے
کرنے میں بھی ہوتی تھی مجھے یاد ہے، ایک بار ظفر گیلانی
ڈی ایس پی کے یہاں جمیل صاحب نے اپنی پسند سے کھانا
بنوایا اور جب دسترخوان پر بیٹھے تو استخارہ "نا" نکلا۔
ظفر صاحب کے لاکھ کہنے پر بھی انھوں نے نہیں کھایا۔
جمیل صاحب مجھے بہت مانتے تھے۔ اسی لئے اکثر
اپنی باتیں بتایا کرتے تھے۔ ایک بار پرویز شاہدی اور
اجتبیٰ رضوی کی بات نکلی تو کہنے لگے ـــــ میرا یہ
قطعہ سنئے:

میں یہ نہیں کہتا کہ اچھوتی دے دے
ساقی مجھے پرویز کی جوٹھی دے دے
آلودہ ہے اجتبیٰ کی داڑھی
مجھ کو اس داڑھی کی نچوڑی دے دے

حالانکہ جمیل صاحب اپنے اشعار لوگوں کو بہت کم
سناتے تھے۔

جمیل صاحب، ابوالکلام آزاد کے بحد قریب
رہ چکے تھے اور ان سے متاثر بھی تھے۔ اکثر گفتگو میں
مولانا آزاد کا ذکر آیا تو بھولی بسری یادوں کو تازہ
کرنے لگتے۔ ایک بار انھوں نے بتایا:
"کلکتہ میں، میں، پروفیسر عبدالباری اور
کئی احباب مولانا آزاد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔
باری اتفاق سے چائے نہیں پیتے تھے بلکہ اس سے
نفرت کرتے تھے اور چائے نہ پینے والوں کو آزاد خبطا
خطرناک آدمی سمجھتے تھے۔ میں نے مولانا سے پوچھا:
"پروفیسر باری اتفاق سے چائے نہیں پیتے ہیں، ان
کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"
مولانا مسکرا کر بولے: "یہ خطرناک تو نہیں ہیں
لیکن ایک گوشہ ان کے ذہن کا بہر حال خالی ہے،
سو وہ چائے نہ پینے کا نتیجہ ہے۔"

ایک دوسری نشست میں جمیل صاحب نے بتایا!
"بار مجھے اختلاج قلب کی شکایت ہوئی۔
مولانا ابوالکلام آزاد نے مزاج کی کیفیت پوچھی تو میں نے
اپنا حال یوں بیان کیا ـــــ جب تکیے پر سر رکھتا ہوں
تو کان بولنے لگتے ہیں اور کچھ بڑبڑاہٹ کی آوازیں آنے
لگتی ہیں۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔"
مولانا نے کہا "گھبرانے کی کیا بات ہے بھئی،
یہ تو نبوت کے آثار ہیں۔"

پٹنہ کے دوران قیام، جمیل صاحب کو قریب سے
دیکھنے اور جاننے کے مواقع مجھے بہت ملے۔
نومبر ۷۲ء کی بات ہے، جمیل صاحب سے راستہ
چلتے ملاقات ہوگئی۔ بولے "آپ کو میرے ساتھ ریڈیو
اسٹیشن چلنا ہے۔"
"کب؟"
"ابھی! مظہر امام نے بلایا ہے۔"
اور رکشہ پر بیٹھ کر ہم ریڈیو اسٹیشن پہنچے۔ ان
دنوں مظہر امام آل انڈیا ریڈیو پٹنہ، میں پروگرام
ایگزیکیٹو اور اردو سکشن کے پروڈیوسر تھے۔ انھوں
نے جمیل صاحب سے فرمائش کی "محرم کے موقع پر ۷۳ء
میں پٹنہ ریڈیو سے خاص پروگرام نشر کرنے کا ارادہ
ہے۔ اس لئے آپ کا مرثیہ ضروری ہے۔"
"میرا مرثیہ؟ ابھی سے؟ مگر پڑھے گا کون؟"
جمیل صاحب نے بڑی سادگی سے پوچھا۔
"آپ کا مرثیہ خود آپ پر نہیں ہوگا۔ اپنا لکھا ہوا

مرثیہ آپ خود ریکارڈ کرائیں گے۔" مظہر امام نے تفنن طبع سے کام لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

جمیل صاحب دیر تک ہنستے رہے تھے۔

دسمبر ۷۲ء میں راج بھون پٹنہ میں (اُس وقت کے گورنر بہار) دیو کانت برواکی طرف سے فراق گورکھپوری کی آمد پر چند ادیب و شاعر اور صحافی مدعو تھے۔ میں بھی گیا تھا۔ اور راج بھون بھی جمیل صاحب کے ساتھ ہی گیا تھا۔ ناشتے کے دوران دیو کانت بروا، جمیل مظہری اور فراق گورکھپوری آپس میں باتیں کرنے لگے۔ گفتگو جب خالص ادبی موضوع پر ہونے لگی تو جمیل مظہری نے فراق گورکھپوری سے پوچھا "ادب کی افادیت کیا ہے؟"

فراق نے جواب دیا "ایک بچہ گولی کھیل رہا تھا۔ اس کے باپ نے اسے سمجھایا کہ گولی کھیلنا مناسب نہیں ہے، اس سے کوئی فائدہ نہیں اس لئے مت کھیلو۔ بچہ گولی کھیلنے کی بجائے لٹو نچانے لگا۔ باپ نے اس کھیل سے بھی اسے منع کیا کہ لٹو نچانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، تب وہ بٹیر لڑانے لگا۔ لیکن باپ نے اس حرکت سے بھی اسے منع کیا کہ اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بچے نے جھنجھلا کر باپ سے پوچھا ــــــ آخر فائدے کا فائدہ کیا ہے؟ آپ ہی بتائیں۔"

فراق کے اس جواب پر ہم سب ہنس پڑے تھے۔

ایک روز مظہر امام نے جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی اور مجھے دن کے کھانے پر بلایا ــــــ

جمیل مظہری کچھ دیر سے پہنچے۔ آتے ہی کہنے لگے "بھئی، آنے میں دیر ہو گئی۔ ذرا میں داڑھی بنوانے ایک سیلون چلا گیا تھا۔ لیکن ایک خاص بات یہ ہوئی کہ اپنی کمزور نظروں سے آج میں نے آئینہ میں صورت دیکھی۔ سچ کہتا ہوں، عمر کی زیادتی سے اپنی شکل نہیں پہچانی گئی۔ ابوالمجد کشفی کی یہ رباعی بے طرح یاد آ رہی ہے ؎

پیری کا عجب طور نظر آتا ہے
ہر دور عجب دور نظر آتا ہے
بھولے سے جو آئینہ اٹھاتا ہوں
اس میں تو کوئی اور نظر آتا ہے

پٹنے کے ہی دوران قیام، کمال الدین صدیقی کے رسالہ "کارواں" صاحب گنج کو میں ایڈٹ کر رہا تھا۔ کارواں کے لئے میں نے جمیل صاحب سے غزل مانگی تو انھوں نے ایک نظم اور تین غزلیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیں۔ ایک غزل میں نے شائع کی تھی۔ نظم اور بقیہ غزلیں ابھی تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ نہ معلوم شائع ہوئیں یا نہیں۔ دونوں غزلوں سے چند اشعار درج کر رہا ہوں ؎

(۱)

مفاہمت ہو تو کس طرح ہو کہ جب کسی کی کوئی نہ سمجھے
دکھ آدمی کا خدا نہ سمجھا خدا کا دکھ آدمی نہ سمجھے
نہ جانے کہ ایک شیشہ ہزار آئینوں پر ہے بھاری
غرور آہن گری کے مارے مزاج شیشہ گری نہ سمجھے

(۲)

الم اپنا ہی رہا یہ ہنس لیا وہ ہنس ملا
نہ تپش ملی نہ کشش ملی نہ جنوں ملا نہ یقیں ملا
چہ فراغت و چہ تونگری، چہ کلاہ داری و سروری
وہ جو مل رہا تھا نہیں لیا وہ جو مانگتا تھا نہیں ملا

نظم کا عنوان "نکہت و رنگ" ہے۔

۱۹۷۹ء میں جب میں نے ہزاری باغ سے "کوہسار" نکالا اور جمیل صاحب سے غزل کی فرمائش

کی تو انھوں نے فوراً ایک غزل اور ایک نظم "فرزندانِ اہرمن سے" بھیج دی۔ غزل "نوادرات" میں شامل ہے۔ ؎

پرنشہ بھی آزما کے دیکھو
پی کے دیکھا پلا کے دیکھو
آپ اپنے کو دیکھنا اگر ہے
آپ اپنے سے باہر آکے دیکھو

نظم ابھی تک میں نے نہیں چھاپی ہے۔ ؎

"فرزندانِ اہرمن سے"

کس کو عظمت سے ہماری انکار
تم نے معذور مشیت کو کیا
تم نے جو چاہا بہرحال ہوا
اس نے جو چاہا وہ ہونے نہ دیا
تم نے ہر چاند کو دھبا دے کر
ہر تجلی سے خراج اپنا لیا
تم سے اندھا نظرستانِ شعور
تم سے ٹھنڈا نفسِ گرم ضیا
منفعل تم سے ہوا نورِ ازل
تم نے جلنے نہ دیا اس کا دیا
پرستش شمس و قمر کیا ہوتی
تم سلامت بچے پھر کیا ہوتی

نسلِ آدم ہے تمہاری ممنون
تم نے سر بھی دیا سودا بھی دیا
تم نے ایمان کو وحشت بخشی
تم نے وجدان کو بہکا بھی دیا
تم نے توفیق کا رشتہ بھی موڑا
تم نے تصدیق کو جھٹلا بھی دیا

مگر چلا جب نئے رستے پہ وقت
پیچھے قدموں سے لوٹا بھی دیا
روشنی میں جو چھپے تھے خفاش
ان چمگادڑوں کو اندھیرا بھی دیا
ظلم کو عدل کا پہنائے لباس
تم نے تاریخ کو دھوکا بھی دیا
کھل گئے تھے جو ہوس کے چہرے
تم نے اُن چہروں کو پردا بھی دیا
روشنی ہوگئی تم سے گمراہ
اہرمن کہتا ہے ماشاء اللہ

جمیل مظہری

۴ر جنوری ۱۹۷۵ء

مجموعۂ کلام کی نظموں میں سے "ڈر دے خدا سے ڈرو" ایک شاہکار نظم ہوتی لیکن :
"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" [1]

---

[1] یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ لکھنا ضروری ہے کہ کسی فن کار جبکہ وہ اللہ کو پیارا بھی ہو چکا ہے، مشورہ دینا کسی بھی اہلِ قلم کے شایانِ شان نہیں ہوا کرتا، ایسا چند نقادوں کا خیال ہے لیکن تنقید مشورہ بھی ہے اور مشعلِ راہ بھی اور مستقبل کے لیے بشارت بھی۔ اور ماضی، حال و مستقبل کی کسوٹی بھی۔ لہٰذا اس طرح کی تحریریں روشن دماغ نقادوں کے لئے ایک معمولی کی مصداق ہیں۔ انہیں سے روشنی لیکر یہ جرأت کی گئی ہے جو اوپر آپ نے ملاحظہ فرمایا۔

سالک لکھنوی

جمیل مظہری — ایک تنہا مسافر

جمیل مظہری اُن مشکل شاعروں میں سے ہیں، جن کے مقامِ شاعرانہ کا صحیح تعین ابھی آسان نہیں۔ وہ معمّہ تو نہیں ہیں لیکن بذاتِ خود ایک ایسی شاعرانہ منزل ہیں، جس کی راہیں اتنی خم بہ خم ہیں کہ راہی گم ہوکر رہ جاتا ہے۔ وہ کسی اَدبی فرقے سے منسلک نہ تھے۔ انہیں صرف شاعر کہنا یا [illegible] کہنا بھی غلط ہے۔ انہوں نے بڑے خوبصورت مضامین، گہرا تنقیدی شعور اور بڑے ہی دلکش افسانے بھی اُردو اَدب کو نذر کئے ہیں۔

رومانیت، وجودیت، ردیانیت، تصوّر، اِشاریت، وطن پرستی، انقلاب پسندی، روحانیت اور دہریت —— جمیل ان میں سے کسی کا مجموعہ نہیں لیکن اُن کی شاعری اِن سبھوں کا دلآویز مجموعہ ہے! عرفی کی بلند آہنگی اور وقار، نظیری کی نغمگی، میر کی غمگینی، اور غالب و اقبال کی فلسفیانہ چبھن اور جستجو لئے ہوئے وہ دُنیائے شعر کے سفر اور شاہدے کیلئے روانہ ہو جاتے ہیں، جیسے وحشت، اصغر، حسرت، فانی بلند مقام بنا گئے ہیں۔ جس میں درد کی لذت بھی ہے اور انیس کا پاک ماتم بھی۔ وہ اگرچہ تلمیذِ وحشت تھے اور اس رشتے پر نازاں بھی، لیکن جہاں وہ اپنے مخصوص رنگ سے ہٹتے ہیں وہ کہیں انیس کہیں اقبال اور کہیں جوش سے متاثر نظر آتے ہیں۔

جمیل کا مذاق بلند الفاظ کے استعمال میں بہت محتاط ہے۔ اُن کی غزلیں متوازن اور مناسب اور چُنے ہوئے الفاظ کا ایک ایسا نمونہ ہیں، جن کی مثال دُنیا کے اُن منقّش پردوں سے دی جاسکتی ہے جو تہہ بہ تہہ ہوتے ہوئے مختلف رنگوں کے حامل ہیں اور نقش نگار کی نازک و حسّاس انگلیوں کے غمّاز! ان کی شاعری ایک ایسی امتیازی صدا ہے، جو خوش آہنگ بھی ہے اور بلند و باوقار بھی۔ انہوں نے اپنے پیش رَو عظیم ماہرینِ فن شعرا کے نغمے بھی سُنے ہیں، ماتم بھی۔ لیکن جمیل کی بانسری ان کی اپنی ہے اور جمیل کا ماتم کائنات کا ماتم ہے۔ اپنے سفر میں جمیل نہ کوئی نقشِ قدم مٹاتے ہیں، نہ کسی کی ہم قدمی کرتے ہیں۔ وہ اپنے پیش رَوں کے ساتھ بھی ہیں اور الگ بھی —— وہ اپنی راہ کے تنہا مُسافر ہیں!

برج نرائن چکبست، اقبال احمد سہیل، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، پرویز شاہدی اور ایسے ہی بہت سے دیگر انقلاب پسند اہلِ فن کی طرح جنھوں نے اپنے اپنے زمانے کے قومی مسائل کو حل کرنے میں جدوجہد میں حصّہ لیا۔ جمیل مظہری بھی برطانوی حکومت کی غلامی سے قوم کو وطن آزاد کرانے کی تحریک میں شامل رہے اور جیل چلے گئے۔ قید میں قیدی کا ذہن و تخیل قید خانے کی چہار دیواری سے دُور، بہت بُلندی تک پرواز کرنے لگتا ہے۔ جمیل کی نگاہوں نے بھی تاریخ کے ہر

زمانے میں وہی دیکھا جو خود اُن کے زمانے میں انھیں دکھایا گیا اور جس سے وہ ایک حد تک خود گذرے ـــــ ایک ایسا زمانہ جسمیں غلامی کی بے بسی اور بے چینی تھی۔ آزادی کی تمنّا میں ہیبت ۔ غرت کیلئے مغرب کی حقارت تھی۔ ایشیائی جاپان کے دو شہروں ـــــ ہیروشیما اور ناگاساکی ـــــ پر امریکی آیٹم بم کی ہولناک غارت گری تھی۔ مسلم لیگی " ڈائرکیٹ ایکشن " کے تحت کلکتے کا عظیم قتل عام تھا۔ نوا کھالی اور بہار میں اُس قتل عام کا رَدِ عمل تھا، آزادی سے قبل اور بعد دونوں پنجابوں میں بہیمیت کا وُہ انسانیت سوز ننگا ناچ تھا جس نے بیس لاکھ بے گناہوں کو لاشوں میں تبدیل کر ڈالا اور کروڑوں برباد و بے خاماں ہو گئے ـــــ یعنی وہی قوی کے مقابلے میں کمزور کی بے بسی، چند کے مفاد کیلئے بہتوں کی قربانی، سیاست و طاقت، فریب و ریا کی قربانگاہ پر بُنیادی و اخلاقی قدروں کی بھینٹ، جس سے ابتدا سے آج تک تاریخِ انسانی کے صفحے سیاہ ہوتے رہے ہیں۔

جمیلؔ کا دعویٰ تھا کہ وہ فلسفی نہیں۔ ممکن ہے، وہ نہ ہوں، لیکن حالات کے تقاضوں نے اُنہیں بڑی حد تک فلسفی بنا دیا تھا۔ اگرچہ اُن کے فلسفے نے کسی عقیدے کی شکل اختیار نہیں کی تھی لیکن وہ "تشکیکِ ناتواں" کی اس منزل تک ضرور آگئے تھے، جہاں زندگی کی بنیادی قدریں آپس میں ٹکراتی نظر آتی ہیں اور "ایمانِ مسلسل" کی کڑیاں کہیں کہیں سے ٹوٹ جاتی ہیں؛ وہ دہریہ نہ ہوتے ہوئے بھی تصوّرِ مذہب پر چوٹ کرتے ہیں ؎

دانشور کا فتور کچھ نہ پوچھو
مذہب کا تصور کچھ نہ پوچھو
اَوہام کا سبز باغ لایا
اندھوں کے لیے چراغ لایا
یہ دیر وحرم کی سجدہ گاہیں
یہ مدرسے اور یہ خانقاہیں
درماندگیوں کے ہیں بسیرے
گھبرائی ہوئی تھکن کے ڈیرے
ہے جہل اس آگہی سے بہتر
ظلمت اس روشنی سے بہتر وغیرہ

اور مارکسی فلسفۂ حیات سے عقیدت نہ رکھتے ہوئے بھی وہ "مزدور کی بانسری" جیسی بھرپور مارکسی نظم پیش کرتے ہیں اور اپنی غزلوں میں کتنے ہی ایسے بے پناہ اشعار کہہ جاتے ہیں جس سے آگے مارکسی تنقید سے متاثر شاعری نہیں جا سکی ہے۔ جمیلؔ نہ خدا کے وجود پر شک کرتے ہیں، نہ تصوّرِ خدا سے ٹکراتے ہیں نہ بحث کرتے ہیں، لیکن جمیلؔ کا خدا ایک بے عمل، قوی اور امیروں کا طرفدار، اور خود اتنا کمزور سا نظر آتا ہے کہ غریبوں اور ناتوانوں پر پڑنے والی مصیبتوں اور آنے والی بلاؤں کو روک نہیں سکتا۔ جمیلؔ کے تصوّرِ خدا کو والٹیر کی زبان میں کچھ یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ "یا تو خدا بُرائی کو روک سکتا ہے لیکن روکے گا نہیں، یا خدا برائی کو روکنا چاہتا ہے لیکن روک نہیں سکتا۔" دونوں صورتوں میں نتیجہ واحد ہے۔ یا خدا بے عمل ہے، یا خدائی کے قابل نہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر جمیلؔ ایک مصلحت، ایک سمجھوتے سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

"سیاہیاں بن رہی ہیں راتیں، تجلّیاں گڑھ رہی ہیں سورج
خدا اور ابلیس کی شراکت میں چل رہا یہ کارخانہ

دُنیا کے دیگر مفکروں کی طرح جمیلؔ بھی عقائد کے بارے میں تذبذب اور بے چین نظر آتے ہیں۔ مثنوی "آب وسراب" میں (جسے میں اُردو شاعری میں ایک شاہکار اضافہ سمجھتا ہوں) یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر گرے ہوئے رُوحانی دودھ پر ماتم کر رہا ہے؛ یقین و ناامیدی کے درمیان عقائد کی تنی ہوئی باریک ڈور پر جمیلؔ خود کو قائم رکھتے ہوئے مصروفِ سفر ہیں لیکن

جہاں وہ یقین کی تابناک سرشاری سے گذرتے ہیں، وہاں وہاں ہمیں یہ صدائیں ملتی ہیں :-

ہماری وحشت نے اس خرابے کو اپنے دل کا فروغ بخشا
ہماری حیرت نے اس خرابے کو کر دیا اک نگار خانہ
ہمارے تیور سے ہر نظر میں ٹپک پڑی اک نئی حقیقت
ہماری ٹھوکر سے ہر قدم پر ابل پڑا اک شراب خانہ

کون فریب کھائے اب فتنۂ رنگ و آب کا
مل گئی تشنگی کو آنکھ بجھ گیا دل سراب کا

وہ ہیں امیر نظام جہاں بناتے ہیں
میں ہوں فقیر، مزاجِ جہاں بدلتا ہوں

وہ بھی ہے دستِ ہوس، دستِ دعا جسکو کہیں
انفعال اپنی خودی کا ہے، خدا جسکو کہیں

ہستی ہے جدائی سے اس کی، جب وصل ہوا تو کچھ بھی نہیں
دریا میں نہ تھا تو قطرہ تھا، دریا میں ملا تو کچھ بھی نہیں

اے میرے خدا اُن تنکوں کو کشتی کی طرح بہنے جو نہ دیں
کشکول نہ بھر اس دنیا کا، اس دریا کو ساحل کر دے

وقت اب وہ ہے کہ صدیوں کا طلسمِ تاویل
ٹوٹے اور آج بہ ایمائے مشیت ٹوٹے

وہ ہر زمانے میں مایوس بھی ہیں اور پُر امید بھی، ضیائے یقین سے مالامال بھی ہیں اور ظلمتِ شکوک کے اسیر بھی۔ انسانیت کے بلند قدروں کے خطیب و دعویدار بھی ہیں اور اسی انسانیت کی تذلیل و بےکسی پر نوحہ خواں بھی۔ آپ کے یہاں انسان "مختارِ کل" بھی اور "مجبورِ محض" بھی۔ اُن کا انسان کہیں "بھٹکا ہوا راہی" ہے اور کہیں "صاحبِ منزل"۔ ان کے کلام میں شدتِ احساس اور ایک رچے ہوئے درد کی کیفیت ملتی ہے۔ اُن کا کلام دماغ و دل، جنون و خرد، نگاہ و نظر کے امتزاج کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر باشعور اور درد آشنا انسان اپنی دلی اور ذہنی کیفیتوں کی جھلکیاں دیکھ سکتا ہے اور اُن جھلکیوں سے حسبِ حالت تسکین حاصل کر سکتا ہے۔

فکری طور پر جمیل میں تضاد کم اور نیم اختلافیت (Subcontrariness) زیادہ ہے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ اقبال اور اس کے بعد جمیل و پرویز تک ذہن و فکر کی ان متخالف کیفیتوں سے کون بچا ہے؟ یا کون بچ سکتا ہے؟ جس فن کار کی تخلیق میں صرف ایک رنگ، ایک جذبہ، ایک کیفیت کا اظہار ہو اُسے آپ مشینی تخلیق تو کہہ سکتے ہیں، انسانی تخلیق نہیں۔ انسانی جذبات و خیالات، فکر و نظر اور مسائل و شعور پر متبدل حالات و ارتقائے وقت کے تحت جو چھاپیں پڑتی رہتی ہیں اور ایک حساس فن کار کا ذہن اُن سے جس طرح شعوری یا لاشعوری طور پر متاثر و متغیر ہوتا ہے اس سے کسی وقتی، جذباتی کیفیت سے انکار کرنا ایمان داری کے منافی ہے۔ جو فن کار ان تغیرات کی زد میں آئے لیکن اپنی تخلیقات میں اُن سے زبردستی بچنے کی کوشش کرے۔ اُسے یا تو غیر ایمان دار سمجھا جائے گا یا پھر ایک ایسا مفلوج دماغ جس سے قبولیتِ مزید کی صلاحیت فنا ہو چکی ہو۔

جمیل کی شاعری میں بھی تضاد و تخالف کا ہونا لازمی تھا۔ وہ ذہنی طور پر انقلاب پسند اور سیاسی طور پر کانگریسی تھے۔ ان کی طبیعت نے کانگریسی تحریکوں میں سکونِ خاطر محسوس کیا، انہیں کو انقلاب انگیز سمجھا اور انہیں کی خاطر قید و بند

کی آزمائشوں سے بھی گذرے۔ اس لئے اُن کی تخلیقات میں ایک انقلاب پسندانہ ہیجانیت ہمیشہ ملتی ہے۔ ان کے ادبی شعور کی آنکھیں ایک ایسے قدامت پرست ماحول میں کھلیں جہاں روایت سے بغاوت کا شائبہ بھی کفر کے مترادف تھا۔ انقلاب و روایت ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے لیکن کبھی کبھی ایک دوسرے کا سہارا ضرور بن سکتے ہیں۔ جمیل کی شاعری میں بھی کہیں روایت ہے اور کہیں یہ دونوں ایک دوسرے کا سہارا ہیں۔ حضرتِ جمیل ایک انتہائی حساس دل کے مالک تھے اور ہر واقعہ، ہر تحریک، ہر سکون و اضطراب سے ان کے دل و دماغ نے اثر قبول کیا جس کا عکس اُن کی شاعری میں جھلکتا ہے۔ اُن کا دل جب انقلاب و بغاوت کی صحیح روح سے آشنا ہوتا ہے تو وہ کہہ اُٹھتے ہیں:

"گلہ داروں سے کوئی کہہ دے کہ یہ تاریخ کی عدالت
کھڑی ہوئی ہے قطار باندھے یہاں نبوت بھی مجرمانہ"

لیکن انقلاب و بغاوت کی یہ روح جب روایت کے پردے میں چھپ جاتی ہے تو جمیل کے قلم سے کچھ اس قسم کے شعر ٹپکتے ہیں:

یہی تو انجامِ جستجو ہے کہ ٹھوکریں کھا کے بتکدوں کی
جبینِ رسوا کو رکھ کے حرم کی چوکھٹ پہ سو گیا ہوں

حالانکہ انہیں یقین ہے کہ:

ہمارے تیور سے ہر نظر میں ٹپک پڑی اک نئی حقیقت
ہماری ٹھوکر سے ہر قدم پہ اُبل پڑا اک شراب خانہ

لیکن اس چھپی ہوئی مایوسی اور اعلانِ شکست کو کیا کہیے:

شعور بدلا، نگاہ بدلی، بدل گیا شوق کا تصور
مگر تلاشِ سکوں وہی ہے، وہی نتیجہ ہے جستجو کا

اور جب جمیل کا شک فانی بدایونی کا شک بن جائے:

جمیل یہ مانتا ہوں تم نے مزاجِ فطرت سمجھ لیا ہے
کہاں تک معتبر ہے لیکن مشاہدہ چشمِ آرزو کا

لیکن "چشمِ آرزو" کی حسین ترکیب کی تخلیق سے شاعر نے جس خوبصورتی کے ساتھ فطری تشکک سے اپنی برأت حاصل کی ہے وہ لاجواب ہے۔ شدتِ آرزو میں شدتِ نظر باقی نہیں رہتی۔ بیتاب عظیم آبادی کا شعر ہے:

فریفتہ مجھے عالم کے رنگ و بو نے کیا
بڑا ستم ترے جلوے کی آرزو نے کیا

جمیل کا اعتراف ہے اگر خود اُس کی چشمِ آرزو معتبر نہیں ہے تو قصور جمیل کا نہیں ہے، شدتِ آرزو کا ہے جس سے وہ خود آگاہ تھے اور آگہی کی گود میں شکوک پروان نہیں چڑھتے۔ آج جمیل کے رنگ میں شعر کہنے والوں کی تعداد درجنوں تک پہنچ چکی ہے۔ جمیل اس تہذیب کے باوقار نمائندہ ہیں جسے اُردو تہذیب کہا جائے گا۔

جمیل نے ماضی کو سمجھا، حال کو سمجھایا اور اب یہ مستقبل کا فرض ہے کہ جمیل کو سمجھے اور سمجھائے۔

+++

اکاڈمی کی اشاعتی پیش رفت

۱	کلیات شاد (فی جلد ۳۵ روپئے)	مرتب کلیم الدین احمد	۱۰۰/=
۲	دیوان جوشش	" "	۲۵/=
۳	مقالات قاضی عبدالودود	" "	۳۰/=
۴	رقص شرر (مسلم عظیم آبادی کا منتخب کلام)	" "	۱۰/=
۵	دیوان سجاد اکبرآبادی،	ڈاکٹر شمیم احمد	۱۰/=
۶	کلیات منتظر	مرتب سلیمان شمس ندوی	۴/۵۰
۷	اختر اورینوی کے افسانے کا انتخاب	" عبدالمغنی	۱۵/=
۸	بہار کے نظم نگار شعراء	" قمر اعظم ہاشمی	۲۰/=
۹	ودیاپتی، حیات اور شاعری	" شمیم احمد صدیقی	۱۰/=
۱۰	سوانح عمری مولانا آزاد	" مشتاق احمد	۱۰/=
۱۱	آموزش اردو	مصنفہ رضیہ تبسم	۱۲/=
۱۱	سلک آتش (عزیز عظیم آبادی کی رباعیوں کا مجموعہ)	مرتب سید فضل محمد	۱۲/=
۱۲	دنکر، حیات اور شاعری۔	" خواجہ بدیع الزماں	۱۰/=
۱۳	سوانح عمری مولانا آزاد	مرتب مشتاق احمد	۱۰/=
۱۴	نامۂ شوق (شہباز کے خطوط بیوی کے نام)	" صابر حسین	۱۰/=
۱۵	سہ ماہی زبان وادب (اکادمی کا ادبی ترجمان)		

نوٹ :- ایجنٹ حضرات کو مذکورہ بالا مطبوعات پر ۲۰ فیصد کمیشن دیا جائے گا۔ محصول ڈاک بذمہ خریدار۔ (۲) انفرادی طور پر جو حضرات اکاڈمی کی مطبوعات کا مکمل سٹ خریدیں گے انہیں بھی ۲۰ فیصد کمیشن دیا جائے گا۔ (۳) زبان وادب کے غیر مقامی حضرات کو رسالہ منگانے پر ۲۵ فیصد کمیشن دیا جائے گا اور محصول ڈاک بذمہ بہار اردو اکادمی ہوگا۔ دس کاپی سے کم وی۔ پی روانہ نہیں کی جائے گی۔

سکریٹری بہار اردو اکاڈمی،
۸/ بی سری کرشنا پوری پٹنہ ۱

کلامِ جمیل کے فکری نقوش

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

سن لے مری طبع مضمحل کی
نغموں سے بجھا دے پیاس دل کی
تو بھی پیاسا ہے اور ہم بھی
پیاسا ہے ستار بھی قلم بھی
یہ کارگہ زیاں پرستی
رنگ اور سراب کی ہے بستی
نفرت ہو یہاں کہ ہو محبت
دونوں یہ ہے تشنگی کی حالت
ہر جذبۂ ناصبور پیاسا
دانش پیاسی شعور پیاسا
مزدوری و بندگی بھی پیاسی
دارائی و خواجگی بھی پیاسی
پیاسا ہے جنوں بھی اور خرد بھی
پیاسا ہے غرور بھی حسد بھی
حق یہ ہے کہ دوستی بھی پیاسی
حد یہ ہے کہ دشمنی بھی پیاسی

(اقتباس از مثنوی آب و سراب)

جمیل مظہری کی شاعری کا بنیادی موضوع ہی تشنگی ہے۔ انھوں نے زندگی کے حقائق کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ آفرینش سے لے کر اب تک کائنات کی ساری چیزیں پیاسی ہیں لیکن یہ پیاس کیا ہے اور اس پیاس کا علاج کیا ہے؟ یہ مسئلہ نہ جمیل مظہری کی شاعری میں حل ہو سکا ہے اور نہ شاید میرے سے بڑا مفکر اسے حل کر سکتا ہے۔ جمیل مظہری بنیادی طور پر صاحب فکر ہیں۔ فکر کی شدت اور توانائی اکثر و بیشتر ان کے موضوعات کو سفینۂ شعری ہیئتوں کی شکست و ریخت پر آمادہ کر دیتی ہے اور وہ کبھی کبھی اپنے شعری اظہار میں بری طرح ناکام ہو جاتے ہیں، غالب نے اپنے شعر ؎

ہم دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

میں جس کیفیت و احساس کو پیش کرنا چاہا ہے جمیل مظہری کی شاعری اس کی عملی مثال ہے۔ جمیل مظہری کی شاعری نے اگرچہ مختلف منزلیں طے کی ہیں مگر ہر جگہ ان کے احساسات کی شدت برقرار رہی ہے۔ ان کے تخلیقی سفر کی ایک منزل یہ ہے جہاں انھوں نے عشق و محبت کے جذبات پیش کئے ہیں، اس میں جسمانی طلب اور ناآسودگی کی داستان بیان کی ہے۔ عشق کے فرسودہ انداز اظہار اور اس کے مظالم کی کہانی پیش کی ہے۔ ایسی رومانی نظموں میں بھی جمیل مظہری کا فکری پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ کیا ہوا تم کو۔ عشق نا تمام۔ ڈرو خدا سے ڈرو، اسے بھول جا بھلا دے، جیسی خالص رومانی نظمیں بھی محض رومانی نہیں ہیں، ان میں جذبہ و فکر شیر و شکر ہیں۔ محبت اور فلسفہ ان کے یہاں دو الگ چیزیں نہیں رہتیں۔

جمیل مظہری کی شاعری کی دوسری منزل وہ ہے جہاں انھوں نے قومی ملکی معاشرتی اور عصری میلانات و موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں ان میں وہ تخلیقات شامل ہیں جن کا تعلق حریت پسندی، وطن دوستی اور سماجی استحصال سے ہے۔ ایسی نظموں میں بھی جمیل مظہری کا بنیادی رویہ متفکرانہ ہے۔ محبوب سے عشق ہو یا وطن سے عشق۔ جمیل مظہری کے جذبات ہر جگہ فکر و فلسفہ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان کی نظمیں ہندوستان چھوڑ دو، بھارت ماتا، صدائے جرس، موسم کے اشارے، جشن آزادی، یوم آزادی، تعزیت، قول اپنے کو تول، اور ان کے علاوہ متعدد نظمیں جمیل مظہری کے انقلاب میں جذبہ و فکر کے اتصال کی غماز ہیں، جوش اور جمیل مظہری کی انقلابی، قومی اور سماجی نظموں میں یہی فرق ہے کہ جوش نے ان موضوعات کو تمام تر جذباتی سطح پر پیش کیا ہے، سماجی برائیوں کے خلاف نفرت ہو یا بیزاری، سیاسی تبدیلیوں کی تمنا ہو یا استحصال کے جذبات جوش نے ان سارے موضوعات کو فکری سطح پر نہیں بلکہ محسوسات کے انداز میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوش کی ایسی نظمیں وقتی تاثیر کے لحاظ سے زیادہ کامیاب معلوم ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ موضوعات ہنگامی ہیں اور کسی مخصوص دور کے مخصوص حالات پر روشنی ڈالتے ہیں، ایسے ہنگامی موضوعات ایسے ہی لب و لہجہ کے متقاضی ہیں جو سریع الاثر ہو اور جس سے ایک ہیجانی اور انقلابی کیفیت پیدا ہو۔ جمیل مظہری جب ان موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں تو فکر کی پیچیدہ اندھی ماہیوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ ان کے یہاں وہ شدید فوری تاثر پیدا نہیں ہوتا جو ایسی نظموں میں بجلیاں بھر دیتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ بھی ہے اور وہ یہ کہ جمیل مظہری کے یہاں یہ موضوعات نعرہ بازی نہیں بن جاتے بلکہ یہ عصری اور ہنگامی معاملات و مسائل ایک دور رس فکر کا وسیلہ بنتے ہیں جس میں جمیل مظہری کے محسوسات شعری دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ جمیل مظہری کا یہ دلکش متفکرانہ انداز اکثر و بیشتر نظموں میں سوالیہ نشان بناتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ یوم آزادی کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

ع

گر احساس مسرت کی یہ بربادی کیا	روح آزاد نہیں ہے تو پھر آزادی کیا
ہے یہ وہ قید کہ جس قید کی میعاد نہیں	زندگی کیوں نہ ہو زنداں کہ دل آزاد نہیں

یہ سوال اور استفہام جمیل مظہری کی خصوصیت ہے۔ جشن آزادی میں کہتے ہیں:

ع

تم نے مفلس کے شبستاں میں کبھی دیکھی ہے بہار؟	اس کے سینے میں چراغاں تو کبھی دیکھی ہے بہار؟

غرض جمیل مظہری کی انقلابی نظمیں ہماری سماعت کے ذریعہ ہمارے جذبات میں ہیجان پیدا نہیں کرتی بلکہ فکر کو بیدار کرکے ایک ذہنی انقلاب پیدا کرتی ہیں۔ جمیل مظہری کی سیاسی نظمیں مادی انقلاب پیدا کرنے میں اس حد تک کامیاب نہیں جس حد تک وہ شعور اور فکر کی دنیا میں اتھل پتھل پیدا کر دیتی ہیں۔

جمیل مظہری کی شاعری کی تیسری اور آخری اور سب سے زیادہ بالیدہ اور ارتقا یافتہ منزل وہ ہے جہاں وہ عشق اور سیاست سے ہٹ کر زندگی کے دوسرے مادی اور ماورائی موضوعات سے متعلق نظمیں لکھتے ہیں۔ ان موضوعات میں جمیل مظہری کا فکر پورے بسط و تفصیل کے ساتھ پیش ہوا ہے۔ ان کی مختصر نظموں میں بھی فکر کے مختلف SHADES نظر آتے ہیں۔ لیکن طویل نظموں میں افکار و خیالات کی جلوہ سامانی خاص طور پر نظر آتی ہے۔ انھوں نے مختلف قصیدے

اور مسدس میں فکر و دانش کے در نایاب پیش کئے ہیں، غالب کے قصیدہ کی زمین میں جس کا یہ شعر زبان زد خلائق ہے کہ ؎

ہاں وہ دانش غلط و نفع عبادت معلوم
دُرد یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

جمیل مظہری نے جو قصیدہ لکھا ہے اس میں ان کے افکار و پری جولانی کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ جمیل مظہری کا کمال یہ ہے کہ غالب ہی کی زمین میں غالب کی تعریف میں قصیدہ لکھتے ہیں، قصیدہ کی عام روش سے ہٹ کر جمیل مظہری اپنے فکر و احساس کو فلسفہ کی بلندی تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، ایک جگہ کہتے ہیں: ؎

ہر صنم تیری خدائی کا طلب گار سجود
تیرا دیو الا ہے اک عالم بت خانہ چین

دیکھتے سب ہیں اس آئینہ میں صورت اپنی
چہ تعقل چہ توہم چہ تحیر چہ یقیں

جمیل مظہری نے مرثیہ میں بھی یہ مفکرانہ انداز قائم رکھا ہے۔ مختلف مراثی میں جمیل مظہری کی جو خصوصیت مشترک ہے اور جو انہیں دوسرے شعراء سے ممتاز بناتی ہے وہ حقائق تک رسائی کی ایک کوشش پیہم ہے انھوں نے ایک مرثیہ میں اپنے امتیاز کو اس طرح ظاہر کیا ہے، کہتے ہیں: ؎

درد بھی اک خلش جزو ہے طاعت کے لئے
چاہئے ذوق نظر منظر عبرت کے لئے

آئینہ عبادت ہے عکس حقیقت کے لئے
نرم ہو دل کی زمیں تخم محبت کے لئے

ساغر چشم لئے اشک سے لبریز رہے
نہ بجھے شمع وفا لاکھ ہوا تیز رہے

صبح منزل کی تمنا ہے سر شام عمل
کس قدر گرم تخیل ہے سبک گام عمل

اے خوشا بے خودیٔ نشۂ خود کام عمل
غور کیجئے تو شکستیں بھی ہیں پیغام عمل

وہ شکستیں جو نتائج کو اثر خیز کریں
عشق شوریدہ طبیعت کا جنوں تیز کریں

انھوں نے اپنے مسدس میں ایک جگہ غیر تسکین یافتہ اور مضطرب فکری کیفیات کو یوں پیش کیا ہے ؎

کس سے پوچھوں کہ ہنگامۂ ہستی کیا ہے
یہ فسوں کیا ہے جنوں کیا ہے یہ مستی کیا ہے

اے [illegible] ابر کا ہر گوشہ یہ ہستی کیسا ہے
جب بلندی کی یہ فطرت ہے تو پستی کیا ہے

چہرۂ نور پہ یہ پردۂ ظلمت کیوں ہے
یہ اجالے کو اندھیرے کی ضرورت کیوں ہے

حیرت افزا خالق نیرنگ تماشائے مجاز
یہ تجلی ہے کہ پردہ یہ تبسم ہے کہ راز

جس طرف جائیے اک مرحلۂ دور و دراز
جس طرف دیکھئے اک معرکۂ راز و نیاز

ذرے سمٹے ہوئے بیٹھے ہیں بیاباں کیا ہے
ذرہ ذرہ سے گریزاں ہے یہ طوفاں کیا ہے

غرض جمیل مظہری کی یہ مختصر اور طویل نظمیں ہوں یا مسدس و مراثی ہوں یا مثنوی ہر جگہ فکر ان کی شاعری کا بنیادی

محرک ہے۔

اب یہ بات توضیح طلب ہے کہ جمیل مظہری کا فکر ہمیں کس سمت لے جاتا ہے۔ جمیل مظہری کے افکار و خیالات اور فلسفیانہ نکات ہمیں کسی منضبط اور مربوط نظام حیات یا نظام فکر تک نہیں پہنچاتے ان میں انتشاری کیفیت ہے۔ ان کا فکر کوئی نظریہ نہیں بن سکا ہے۔ ان کی شاعری میں فکر کے ساتھ تہ نشین جذبات و محسوسات بھی کام کرتے نظر آتے ہیں فکر کی یہ لپسی ہوئی بجلیاں ان کی شاعری میں جودت و رفعت اور التہاب و اضطراب پیدا کرتی ہیں۔ جمیل مظہری اپنے باتیں FRAGMENTATIVE انداز میں بیان کرتے ہیں، ایک ذہین قاری کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان ٹکڑوں سے وہ ان کی کائناتِ فلسفہ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

جمیل مظہری کی ذاتی زندگی شکست و ریخت کی ایک داستان ہے۔ زندگی کی ناتکمیلیت کا احساس انھیں ہمیشہ ستاتا رہا ہے۔ محبت کی شدت اور ناکامی نے ان کی نفسیات میں ایک مخصوص کیفیت پیدا کر دی تھی اور اس کی وجہ سے ان کے یہاں بے یقینی، اضطراب، افسردگی اور کلبیت کی ملی جلی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ بنیادی طور پر جمیل مظہری کا پہلا ذہنی رجحان عشق و رومان تھا لیکن اس میدان میں ان کی نارسائی نے ایک مخصوص اور محدود عرصہ تک انہیں انقلاب اور اس کے توسط سے سیاست کے محبس میں گرفتار رکھا، جمیل مظہری نے نئے مناظر سے کبھی مکمل دلچسپی نہیں لی۔ ان کی شخصیت پر جو ضرب اولین دور میں لگی تھی وہ ہر دور کی شاعری میں سر اٹھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنی انقلابی شاعری میں بھی وہ لب و لہجہ قائم رکھا جس میں ان کا گہرا رومانی جذبہ جگہ جگہ سے آشکارا ہوتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

بدل جاتے ہیں دل حالات جب کروٹ بدلتے ہیں — محبت کے تصور بھی نئے سانچوں میں ڈھلتے ہیں
اجالے کے پجاری مضمحل کیوں ہیں اندھیرے میں — کہ یہ تارے نکلتے ہیں تو سورج بھی نکلتے ہیں

ایک دوسری جگہ شاعر بدلے ہوئے حالات کا جائزہ یوں لیتا ہے ؎

ہے یہ نزدیک کہ اب خواب محبت ٹوٹے — فکر عاشق کی بنائی ہوئی جنت ٹوٹے
وقت وہ ہے کہ بدل جائے تمنا کا مزاج — دل کا سودا ہو گراں حسن کی قیمت ٹوٹے

جمیل مظہری کا ارتقائی ذہن جب کسی فکر کی عمیق تہوں سے فلسفہ کے نکات ڈھونڈھتا ہے تو وہاں بھی اپنی شکست کو بار بار یاد کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں ناآسودہ احساسات اپنے اظہار کے لئے تشنگی، پیاس، تشنگی، سراب، شکست، تیرگی، صحرا، فریب، انفعال، زوال، خزاں، تاریکی، سوز ناتمامی، راکھ اور آگ جیسے الفاظ کو وسیلہ بنا لیتے ہیں۔ ایسے ہی الفاظ جمیل مظہری کے ذہن میں منفی نقوش بناتے ہوئے فکر کے متنوع گوشے ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ان کی مثنوی 'آب و سراب' تو سراسر ان کے جذبۂ ناصبور کی غماز ہے۔ اس میں ان کا احساس ناتکمیلیت اور غم بے حاصل بے پایاں وسعتوں کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ عام طور پر قصائد کی تشبیب اور مرثیہ کے چہرہ میں بھی جمیل مظہری نے ایسے ہی یاس آگیں جذبوں سے فکر کی بنیادیں استوار کی ہیں۔ ایک جگہ ایک مسدس میں کہتے ہیں ؎

عشق کیلئے غم ہستی سے رہا ہو جانا — اور رہا ہو کے گرفتار بلا ہو جانا
بے پیئے مستیِ مے جام فنا ہو جانا — بسکہ دشوار ہے پابند وفا ہو جانا

قید یہ اس میں پڑی ہے کہ دل آزاد رہے
فکر انجام نہ ہو کوشش برباد رہے

ایک دوسری جگہ انسان کے حالت زار کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے :

اور وہ انسان کہ جو تخلیق کا تیری شہکار
متحیر، متفکر، متردد، ناچار

پشتِ احساس پہ صدیوں کی روایات کا بار
تہ میں جذبات کی بے چین عناصر کا فشار

وقت کی تیز خرامی کا غبار آنکھوں میں
بادہ در خوشۂ انگور، خمار آنکھوں میں

جمیل مظہری کے فلسفہ میں عام طور پر انسان کی وہی حیثیت و نوعیت بیان کی گئی ہے جو آخرالذکر بند میں پیش کی گئی ہے۔ یہ تصور جمیل مظہری کی اپنی شخصیت اور اپنے حالات کی پیداوار ہے۔ نامساعد حالات اور محیط میں شکست کے احساس سے بچنے کے لئے فکر و فلسفہ ان کے یہاں ایک DEFENCE MECHANISM کا کام کرتے ہیں۔ وہ جذبات کو فکر کے تہ خانہ میں ڈال دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن شاید انہیں خود بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ جس فکر کو اور جس فلسفہ کو وہ فلسفہ سمجھتے ہیں وہ ان کے ذہن کے علمی نتائج نہیں ہیں بلکہ گستہ و شکستہ محسوسات کی ایک بدلی ہوئی شکل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفہ کے تمام ظاہری نکات کے باوجود ان کی شاعری میں کوئی فکری نظام ابھر کر سامنے نہیں آسکا ہے۔

اجتماعِ ضدین

رضا مظہری

اب سے تقریباً پینتیس سال پہلے ۱۹۴۵ء میں روزنامہ عصر جدید کلکتہ نے اپنا سلور جوبلی نمبر شائع کیا تھا۔ اس نمبر میں بھیا مرحوم (حضرت جمیل مظہری) نے ایک دلچسپ مضمون اسی عنوان سے لکھا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے مولانا شائق احمد عثمانی مالک عصر جدید سے اپنے گہرے دوستانہ تعلقات کی داستان مزے لے کر بیان کی تھی۔ اس مضمون کا عنوان "اجتماع ضدین" انھوں نے اس لئے رکھا تھا کہ شائق صاحب اور ان کی طبیعتوں میں نسلی، مذہبی، تعلیمی اور سیاسی لحاظ سے بعد المشرقین تھا۔ شائق صاحب نسلاً عثمانی یعنی اموی تھے اور بھیا ہاشمی۔ شائق صاحب مذہباً حنفی۔ بھیا شیعہ اثنا عشری۔ تعلیمی اعتبار سے شائق صاحب فاضل دیوبند۔ بھیا کلکتہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے۔ سیاسی لحاظ سے مولانا کٹر مسلم لیگی اور بھیا پکے کانگریسی۔ وہ جناح کے مقلد اور یہ مولانا ابوالکلام آزاد کے پیرو۔ ان تمام اختلافات کے باوجود دونوں کی دوستی کا یہ عالم تھا کہ ایک دوسرے کے لئے جان چھڑکنے کو تیار۔ ایک دن بھی ملاقات نہ ہو تو دونوں بے چین اور پھر یہ کہ جب مذہبی یا سیاسی مباحثہ دونوں میں چھڑ جاتا تو آستینیں بھی چڑھ جاتیں معلوم ہوتا کہ اب ایک دوسرے پر حملہ ہو جائے گا سے بھی باز نہ رہے گا مگر تھوڑی دیر بعد ہی یہ گرما گرمی آہستہ آہستہ ٹھنڈی پڑ جاتی اور پھر دونوں شیر و شکر ہو جاتے۔ شائق صاحب تو تقسیم ملک کے بعد ہی کراچی سدھار گئے۔ بھیا ہندوستان میں جمے رہے۔ مگر دونوں کے دلوں میں دوستی کی یہ آگ کبھی نہ بجھی۔ شائق صاحب تو کئی سال پہلے تک زندہ تھے مگر مختلف امراض کی وجہ سے زندہ درگور تھے۔ سنا ہے اب شاید وہ بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔ بھیا مرحوم ۲۳ جولائی کی رات کو گیارہ بجے راہی جنت ہوئے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اگر زندگی میں شائق صاحب کو بھیا کی موت کی خبر ملی ہوتی تو وہ اسی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے جیسے ایک بڑا بھائی چھوٹے بھائی کی موت پر روتا ہے۔ بھیا تو زندگی بھر انھیں بھول نہ سکے کبھی کبھی مراسلت ہو جاتی تھی۔ افسوس ہے کہ وہ خطوط محفوظ نہ رہ سکے۔ بھیا اس معاملے میں ہمیشہ سے بے پروا رہے۔ جو اپنی تخلیقات کو محفوظ نہ رکھ سکا وہ دوستوں کے خطوط کیا سنبھال کے رکھتا۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد یہ بتانا ضروری ہے کہ میں نے مقالے کے اس مضمون کا عنوان بھی "اجتماع ضدین" کیوں رکھا ہے جن لوگوں نے بھیا مرحوم کی نظم و نثر کا مطالعہ کیا ہے یا ان کو قریب سے دیکھا بھی ہے۔ انھیں یہ احساس ہوا ہے کہ بھیا کے افکار اور کردار دونوں میں ہم آہنگی نہیں بلکہ تضاد ہے۔ بھیا کو

ہیں اور جمیل مظہری بنیادی طور پر نظم نگار۔ میں نے یہ بات اس لئے نہیں کہی کہ جمیل مظہری کی پہلی مطبوعہ تخلیق ایک نظم ہے یا ان کا پہلا مجموعۂ کلام نظموں پر مشتمل ہے بلکہ یہ بات کہتے وقت میرے ذہن میں مطالعۂ شاد و جمیل کی روشنی میں سامنے آنے والی یہ حقیقت رہی کہ شاد کے ذہن نے ظاہر سے باطن کی طرف اور جمیل مظہری کے ذہن نے باطن سے ظاہر کی طرف سفر کیا ہے۔ مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ شاد کی مشہور غزل ہے ؂

ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

اور ؂

مرغان قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آ جاؤ جو تم کو آنا ہے ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

یہ اشعار بظاہر داخلی کیفیات کے ترجمان ہیں مگر دراصل یہ خارجی تجربات و اثرات ہیں جنہوں نے داخلی شکل اختیار کر لی ہے۔

اب جمیل مظہری کی ایک غزل دیکھئے جس کا مطلع ہے ؂

جمیل اس دل کی بانسری میں ہزاروں نغمے چھپے ہوئے ہیں
جسے سنانے کی تھی تمنا اسی نے اب تک سنا نہیں ہے

یہاں جمیل کے ذاتی احساسات ہیں جنہیں وہ خارجی روپ دے رہے ہیں۔ یہ "اسی کی تلاش" جسے وہ دل کی بانسری میں چھپے ہوئے نغمے سنانا چاہتے ہیں دراصل احساس کے اندرونی روپ کو خارجی شکل دینے کی ایک کوشش ہے جس کے سبب بعد میں ان کا میلان زیادہ تر نظموں کی طرف ہو گیا۔ چونکہ نظموں میں انداز بیان عام طور پر یہی ہوتا ہے۔

جمیل اور شاد کے مزاج اور انفرادی اندازکی وضاحت کے لئے یکساں قوافی اور ردیف کے ساتھ کہی گئی ان غزلوں کے چند اشعار بلا تبصرہ پیش خدمت ہیں :

جمیل مظہری	شاد عظیم آبادی
نہ اب وہ تکلیف خار و خس ہے نہ اب وہ سودا ہے رنگ و بو کا طبیعتِ آب و گل بھی بدلی مزاج بدلا جو آرزو کا	یہاں نہ نشو و نما کا حاصل نہ کوئی ثمرہ ہے رنگ و بو کا ہنسوگے خود اس چمن پہ غنچو زمانہ آنے دو اپنا نمو کا
وہ رندِ فیاض و مردِ قانع جو اپنے حصے کی بھی پلا دے وہی ترے میکدے میں ساقی امین ہو ساغر و سبو کا	پلانے والا ہے سلامت یہاں تو دل سے یہی لگی ہے نہ جام و مینا و خم کا شاکر نہ مرہون احسان ہے سبو کا
ہے تیرے صحرائے آفرینش میں کوئی جائے پناہ ایسی لگا سکے بستر جہاں مسافر لٹا ہوا شہر آرزو کا	نگاہ و ناز و ادا و غمزہ شریک سب میرے قتل میں ہیں بہے گا کوئی دیا ہے دامن جو خون ابلا رگِ جنوں کا

بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاد اور جمیل دونوں ہی نے کائنات کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کیا ہے اور

اپنے اشعار میں حقائق کے دریا بہائے ہیں۔ شاعری کے بارے میں ان دونوں کے بعض خیالات بھی یکساں ہیں۔ مثلاً شاد کہتے ہیں ؎

شاد غزلیں نہیں آیاتِ زبور اس کو سمجھ　　　لحنِ داؤد سے کچھ کم نہیں نغمہ تیرا

اور جمیل بھی یہ پسند کرتے ہیں کہ غزل کے اشعار میں زبور کی شان پیدا ہو جائے ؎

زبور ہند کہیے مظہری رضوی کی غزلوں کو　　　حقائق کو جو لفظوں میں سمو کر معجزہ کر دے

لیکن غزل کا یہی وصف جو بظاہر جمیل کو پسند ہے خود ان کے لئے اس وقت معیارِ سخن نہیں بنتا جب وہ شعر کہنے بیٹھتے ہیں بلکہ اس وقت جو دل پہ گذری ہے اسے رقم کرنے کو ان کا دل بے چین ہو جاتا ہے ؎

غزل جمیل ہے شرحِ حدیثِ ناز و ادا　　　ذرا سا لوچ تو اندازِ گفتگو میں رہے

اور ؎

جمیل اپنی غزل دل کی زباں میں ہو تو بہتر ہے　　　کہ دل کا راز ہے اور صاحبان دل سے کہنا ہے

حقیقت بھی یہی ہے کہ جمیل مظہری کو "دل کی زبان" میسر ہوئی ہو یا نہیں مگر وہ اپنی غزلوں کے بیشتر اشعار میں اور اکثر نظموں میں اپنے دل و دماغ کی الجھنیں ہی بیان کرتے رہے۔ یہی الجھنیں کبھی زیادہ پیچیدہ ہو گئیں یا حیات و کائنات کی بعض ازلی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو گئیں تو لوگوں نے انہیں فلسفہ بھی سمجھ لیا۔ "فکرِ جمیل" میں عرضِ حال کے تحت انھوں نے خود بھی لکھا ہے:

"میرے ذہن کی الجھن میری غزلوں میں الفاظ و افکار کی الجھن بنتی رہی اور لوگ اسے اپنی سادگی سے فلسفہ سمجھتے رہے۔"

اس مختصر سے عرضِ حال میں ان ذہنی الجھنوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے لیکن جو لوگ جمیل مظہری کی کبھی سنجیدہ اور کبھی بظاہر خنداں شخصیت میں چھپی ہوئی غم کی تہوں سے واقف ہیں، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جمیل مظہری کے شاعرانہ ذہن کی تعمیر میں غم دوراں سے زیادہ غمِ جاناں کا ہاتھ رہا ہے۔ وہ خود ہی کہتے ہیں ؎

درد جمیل اس دنیا میں شاعر کا سرمایہ ہے　　　شاعر اس کو کہتے ہیں جو اپنی بیتی گاتا ہو

جمیل اس کی وضاحت کریں یا نہ کریں مگر ذرا غور و فکر سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ جو درد ان کے دل میں موجود ہے وہ آپ بیتی کا ہے جگ بیتی کا نہیں۔ جمیل کے یہاں جو ٹوٹے ہوئے سازِ دل کی صدا ہے اور اس دل میں جو صداقت اور کسک ہے وہ شاد کے یہاں نہیں ملتی، چونکہ شاد کے پاس عشق کا ذاتی تجربہ نہیں ہے اور جمیل مظہری نے نہ صرف عشق کیا ہے بلکہ اس کی مختلف کیفیتوں میں ڈوب کر ابھرے بھی ہیں۔ پھر یہ کہ جمیل کو غمِ دوراں سے بھی شاد کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی واسطہ پڑا ہے۔ زندگی کے جو دشوار گذار راستے انہیں حصولِ ملازمت سے پہلے طے کرنے پڑے ہیں ان کی یاد ہمیشہ ان کے ذہن کے واسطے سے ان کے شعروں میں منتقل ہوتی رہی ہے اور انھوں نے اپنے ذاتی غم کو کچھ اس طرح عمومی شکل میں پیش کیا ہے کہ وہ ان کا ذاتی غم معلوم ہی نہیں۔ صرف ایک مثال اور دیکھئے۔ شاد کی ایک مشہور غزل کا مطلع ؎

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں　　　کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

یہاں خارجی محرکات کو کس خوبصورتی سے اپنے داخلی تجربات کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کیفیت شاعر کے ذاتی تجربوں پر مبنی ہے۔ یہی ظاہر سے باطن کی طرف جانے کا انداز ہے۔ یا پھر یہ شعر دیکھئے ؎

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ محبت کے بحر بیکراں سے وہی تیر کر نکلتے ہیں جو دل میں حوصلہ رکھتے ہیں ورنہ سبک ساران ساحل کی قسمت میں پایابی کہاں؟ شاد نے بڑی خوبی سے اس خارجی حقیقت کو اپنا داخلی غم بنا کر پیش کیا ہے۔ دوسری طرف جمیل کو دیکھئے ؎

کسی کی ناؤ کو طوفاں نے غرق آب کیا
کسی کی ناؤ کنارے اسی بہانے لگی

بظاہر یہ شعر بھی ایک عمومی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر محمل نشیں کے دل کا حال خود محمل کا پردہ بیان کرتا جاتا ہے۔ جمیل کے ذاتی تجربۂ عشق کے پیش نظر اس کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس طوفان حوادث کا بیان تذکرہ ہے وہ خود جمیل کی کشتئ محبت کو غرق آب کرنے کا سبب بنا ہے۔ اور جس کی ناؤ کو ساحل ملا ہے اس سے بھی جمیل بخوبی واقف ہیں مگر اپنے اس ذاتی تجربے کو وہ عمومی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جمیل مظہری نے اکثر اپنے غم کو غم کائنات بنا کر پیش کیا ہے جب کہ شاد نے کائنات کے غموں کو اپنا غم بنانے کی کوشش کی ہے اور دونوں ہی اپنی کوششوں میں کہیں کامیاب بھی رہے ہیں اور کہیں ناکامیاب بھی۔

جمیل مظہری کے سلسلے میں عشق کے جن ذاتی تجربے کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے اس کے سبب جمیل کے جذبات عشق میں شدت، تاثیر اور اصلیت کی فراوانی ہے۔ واردات حسن و عشق کا بیان ان کے یہاں جس خوبی سے ہوا ہے وہ شاد کو میسر نہیں۔ شاد کے یہاں ایک نوع کی آسودگی کا احساس ہوتا ہے اور جمیل کے یہاں اضطراب کا حسن مجسم اور اس کے جذبات کو لفظوں میں اسیر کرنے کی کوشش شاد نے بھی کی ہے ؎

ہے ہے مری چشم حسرت کا سب حال دل ان سے کہہ جانا
دانتوں میں دبا کر ہونٹ اپنے کچھ سوچ کے ان کا رہ جانا

اف اف وہ ہتھیلی سے ان کا شرما کے چھپانا آنکھوں کو
برچھی کا ادا کی چل جانا، اس تیر نگہ کا رہ جانا

اور ؎

رس بھری جائے وہ آنکھیں نری کالی کالی بے پئے متوالی
ساغر لالہ رنگ نمک بر جراحات وفا اف کہاں صیاں گیا

شعریت موجود ہے۔ الفاظ عام فہم ہیں۔ محاورات کا لطف بھی موجود ہے۔ تشبیہوں سے بھی کام لیا گیا ہے مگر تجربہ ذاتی نہیں اس لئے تجربے میں وہ صداقت نہیں جو جمیل مظہری کے ان اشعار میں ہے ؎

جھکا کے سر کو جو بیٹھوں تو تم نظر آؤ
کبھی کتاب جو کھولوں تو تم نظر آؤ
اٹھا کے آئینہ دیکھوں تو تم نظر آؤ
نہ یوں نظر میں سماؤ ڈرو خدا سے ڈرو

مجھے نہ یاد کرو

ادھر ادھر نظر اٹھے تو سامنے تم ہو — ہلیں ہوا سے جو پردے تو سامنے تم ہو
کروں خدا کو جو سجدے تو سامنے تم ہو — نماز میں دغا نہ دو، ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو

جو پاس چولھے کے ارماں کے ڈر سے جاتی ہوں — تو خود بھی جلتی ہوں سالن کو بھی جلاتی ہوں
نمک سمجھ کے شکر دال میں ملاتی ہوں — نہ یوں دوانہ بناؤ، ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو

صاف ظاہر ہے کہ شاد کو عشق کی مختلف لذتوں اور کیفیتوں سے ذاتی واقفیت نہیں۔ اس لئے ان کے یہاں عاشقانہ تجربوں میں صداقت کی کمی ہے۔ بات عموماً تمنائے وصال سے آگے نہیں بڑھتی ؎

پچھلے پہر اٹھ اٹھ کے دعائیں ناک رگڑنی سجدے پہ سجدے
جو نہیں جاتی اس کی دعائیں اف ری جوانی ہائے زمانے

شاد نہ وہ دیدار پرستی اور نہ وہ بے نشہ کی مستی
تجھ کو کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں اف ری جوانی ہائے زمانے

اور وحشتِ دل کچھ زیادہ بڑھتی ہے تو کہہ اٹھتے ہیں ؎

بوسہ لینے کا مری خاک کو بھی ہے ارماں، تاب اٹھنے کی کہاں
جامہ زیبی کا بھلا اے صنمِ تنگ قبا، کچھ تو دامن کو جھٹکا

اس کے برخلاف جمیل مظہری کی زندگی میں وصال کی گھڑیاں بھی آئی ہیں اور اگرچہ وہ وصال کو ایک غیر شعوری جذبۂ محبت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں مگر اس کی لذت اور یاد بہر حال ان کے ذہن میں عمر بھر باقی رہی ہے۔ کہانی کے عنوان سے کہی گئی جمیل کی ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن سے ان کی زندگی کی کہانی سمجھنے میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے ؎

وہ لڑکپن کے گھروندے میں جوانی کا کھیل — اور اس کھیل کا اک فتنۂ فردا ہونا
عشقِ معصوم کے وہ غیر شعوری اقدام — یعنی رخساروں پہ رخساروں کا رکھا ہونا
دفعتاً قلزمِ جذبات میں طوفانِ شباب — دفعتاً کشتیٔ دل کا تہ و بالا ہونا
وہ مرے عشق کے چرچے وہ بزرگوں کا عتاب — وہ ترا پردے میں چھپنا مجھے سودا ہونا
اف ترا پھولوں میں تلنا وہ سہاگن بن کر — میرے گلزارِ تخیل کا وہ صحرا ہونا
شاعری اب دلِ مرحوم کا ماتم ہے جمیل — میرے شعروں کو مبارک مرا نالا ہونا

شاد کو کبھی عہدِ گذشتہ کی یاد ستاتی ہے تو بقول ان کے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ ؎

کہنے لگتے ہیں جوانی کی کہانی جو کبھی — پہلے ہم دیر تلک بیٹھ کے رو لیتے ہیں

اس تجربے میں وہ تاثیر بھی نہیں جو ایک لکھنوی شاعر کے اس شعر میں ہے ؎

رات ہم روئے بہت دیکھ کے تصویرِ شباب
یاد تازہ ہوئی بھولے ہوئے افسانوں کی

اور جمیل مظہری جب "اسے بھولا بھلا دے" یا "سلام ماضی" کے تحت عہدِ گذشتہ کا تذکرہ چھیڑتے ہیں تو خود کہیں روتے نہیں دکھائی دیتے لیکن قاری کی آنکھوں میں ساون اتر آتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جمیل کی عشقیہ شاعری شاد سے زیادہ حقیقی اور عظیم ہے کیونکہ اس میں تجربے کی صداقت شاد سے زیادہ ہے۔

شاد اور جمیل کے تصورِ عشق میں بھی واضح فرق ہے۔ شاد عشق کے روایتی تصور پر عمل پیرا ہیں اس لئے محبوب کے ہر ظلم و ستم کو ہنس کر سہتے ہیں اور راضی برضا رہتے ہیں۔ اردو کے دوسرے غزل گو شعراء کی طرح ان کے محبوب کی "خوئے جفا" بھی نہیں بدلتی۔ ؎

دہر میں کیا کیا ہوئے ہیں انقلاباتِ عظیم
آسماں بدلا، زمیں بدلی، نہ بدلی خوئے دوست

ان کا محبوب عرضِ مطلب پر خفا ہو جاتا ہے لیکن محبوب کی اس ادا پر بھی انہیں پیار ہی آتا ہے کیونکہ۔ ع

شاد دیوانہ بھی تیرا ہے گدا بھی تیرا

اس کے برخلاف جمیل مظہری عرضِ مدعا بھی کرتے ہیں تو اپنے لئے نہیں بلکہ خیالِ خاطرِ محبوب کے تحت ؎

کسی دن اے غرورِ عشق عرضِ مدعا کر دے
مزاجِ حسن کو تھوڑی سی بے چینی عطا کر دے

غالب کی طرح وہ درِ کعبہ سے الٹے قدموں واپس تو نہیں آتے لیکن خالق کی شانِ بندہ نوازی پر خندہ زن ضرور رہتے ہیں۔ ؎

میں ادھر ادھر جو بڑھا رہا ہوں ہوس کے دستِ سوال کو
مری بندگی کا یہ طنز ہے تری شانِ بندہ نوازیہ

اور عموماً ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ ؎

وہ جگر پہ زخم نہ دے سکے میں جبیں پہ داغ نہ لے سکا
وہ نگاہِ ناز اٹھی نہیں یہ سرِ نیاز جھکا نہیں

اقبال نے اسی خیال کو فلسفے کا روپ دیتے ہوئے کہا تھا ؎

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

ظاہر ہے کہ عاشق اگر سجدہ ریز ہو کر جبیں پر داغ نہیں لیتا تو محبوب کا حسن و غمزہ موضوعِ بحث بن سکتا ہے اور اس کے لئے گیسوئے تابدار میں مزید تابداری لانا ضروری ہو جاتا ہے۔ جمیل کے یہاں اس خیال کی پیش کش میں نہ صرف تازگی ہے بلکہ انھوں نے بڑے متغزلانہ انداز میں یہ بات کہی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ شاد کی طرح جمیل مظہری نے بھی عشق اور ہوس میں نمایاں امتیاز کیا ہے لیکن یہ امتیاز بظاہر ایک عمومیت کے باوجود دراصل ایک خصوصی حیثیت رکھتا ہے اور جمیل اس کے پس پردہ اپنے اس نظریۂ عشق کی بھی وضاحت کر دیتے ہیں جس پر وہ عمل پیرا رہے ؎

لے سجدہ فروش کوئے بتاں ہر سر کیلئے ایک چوکھٹ ہے
یہ بھی کوئی شانِ عشق ہوئی جس در پہ گئے سر پھوڑ لیا

شاد اور جمیل کا تقابلی مطالعہ کرتے وقت ایک عجیب پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ گرچہ شاد کی بہ نسبت جمیل کی زندگی زیادہ رنج وغم سے عبارت ہے لیکن جمیل کے کلام میں شاد کی بہ نسبت سوز وگداز کی کمی ہے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ شاد کے یہاں جذبات وارفتہ رہتے ہیں جب کہ جمیل کے یہاں خیال کی توسیع ہو جاتی ہے، مثلاً شاد کا شعر ہے ؎

جفائے یار کا دل کو ملال آہی گیا
ہزار دھیان کو ٹالا خیال آہی گیا

جمیل کہتے ہیں ؎

دنیا کی معاشی فکروں میں یاد رہی کے روئے زیبا کی
اک بجلی تھی جو رہ رہ کے تاریک گھٹا میں چمکا کی

شاد کے یہاں اختصار اور پردہ ہے جس سے سوز وگداز کی کیفیت نمایاں ہے۔ جمیل کے یہاں مفہوم کی توسیع اور ایجاب کی وضاحت ہے جس سے سوز وگداز کی کمی ہو گئی ہے۔ اس موقع پر میں جذبی کا ایک شعر بھی پیش کرنا چاہونگا وہ کہتے ہیں ؎

اے موج بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

کم وبیش یہی خیال توسیع کے ساتھ جمیل کے یہاں اس طرح بیان ہوا ہے ؎

فرصت وغم کی کش مکش عین حیات ہے جمیل
جو کہ ہیں ساحل آشنا ان کو مرا پیام دو

دونوں اشعار کا فرق ظاہر ہے۔

میرا خیال ہے کہ جمیل کے یہاں چونکہ ذہانت اور عقلیت کا عنصر زیادہ ہے اس لئے سوز وگداز کو زیادہ ابھرنے کا موقع نہیں مل سکا ہے۔

شاد اور جمیل کے پہلو بہ پہلو مطالعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جمیل معنی آفرینی کے زیادہ قائل ہیں اور اس کے لئے کبھی کبھی فنی پابندیوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ اس لئے جمیل کے یہاں تازہ خیال بھلے ہی کچھ زیادہ ہو مگر وہ پختگی فن کے لحاظ سے شاد کے مرتبے تک نہیں پہنچتے۔ طوالت کے خوف سے صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ انسانی نفسیات کی تہوں پر جمیل کی بھی نظر ہے اور شاد کی بھی۔ بلکہ جمیل کے بعض اشعار میں تو نفسیاتی ژرف بینی نے ہی فلسفے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں جمیل کا ایک شعر بے حد مشہور رہا ہے ؎

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

اب انسانی نفسیات سے متعلق شاد کا بھی ایک مشہور شعر دیکھئے ؎

تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے
خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے

ایک جگہ بلاغت خیال ہے، دوسری جگہ پختگیٔ فن۔

مجموعی طور پر جمیل مظہری کے کلام کا وہی حصہ قابل قدر ہے جو رومانیت وخمریات سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ کچھ وہ نظمیں اور اشعار بھی قابل توجہ ہیں جن میں حیات وکائنات سے متعلق ان کے گہرے اور وسیع مشاہدات تفکرات وتاثرات کی شکل میں ڈھل گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جمیل کے کلام کا وہ تمام حصہ جو وقتی حالات اور جذبات کے تحت

وجود میں آیا اور جس کے سبب انہیں عارضی طور پر کچھ شہرت و مقبولیت بھی نصیب ہوئی۔ ان کے ذخیرۂ شاعری میں اضافہ کر سکتا ہے لیکن ان کے شاعرانہ مرتبے میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ جس قسم کی شاعری نے جوش کو برباد کیا اسی قسم کی شاعری نے وقتی طور پر جمیل مظہری کو بھی اچھالا۔ مگر جس طرح اقبال کی نظم "تصویر درد" یا جوش کے اس قسم کے اشعار ؎

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

اب اپنی معنوی حیثیت کھو چکے ہیں۔ اسی طرح کا روانِ انقلاب کے لیے جمیل کی لو آئے جرس بھی اب بے رنگ اور بے اثر ہو چکی ہے۔ براؤننگ جیسے عظیم شاعر کا انقلاب فرانس (FRENCH REVOLUTION) کا زور فتہ فتہ ہکا پھا حشر ہوا تھا۔

اختتام بحث کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جمیل مظہری نے اپنے بیشتر اشعار میں اپنے ذاتی تجربے کو عوامی تجربہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاد کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بہرحال شاد اور جمیل دونوں کی انفرادیت وہیں نمایاں ہوتی ہے جہاں انھوں نے تغزل اور تصوف کے روایتی رنگوں سے نئی تصویریں بنائی ہیں۔

شاد ——— اور ——— جمیل

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

شاعری کی دبستان تقسیم میری نگاہ میں کبھی پسندیدہ نہ رہی مگر اسے کیا کہا جائے کہ اردو کے مستند اور مشہور ناقدین بھی نہ صرف حصول آزادی سے قبل بلکہ اس کے بعد بھی ادب کی علاقائی حد بندیوں کے قائل رہے ہیں مثلاً آل احمد سرور نے ۱۹۵۰ء میں اپنی مرتبہ کتاب "ہمارا ادب" میں شاد کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا :

"عظیم آباد نے یوں تو بہت سے شاعر اور ادیب پیدا کئے مگر ان میں تین خاص طور پر ممتاز ہیں۔ راسخ، شاد اور یاس اور ان تینوں میں شاد فی الحال سب سے زیادہ مشہور ہیں"

مجھے اس رائے سے انکار کی ضرورت نہیں چونکہ صورت حال اب بھی کم و بیش یہی ہے۔ البتہ مذکورہ بالا تین ناموں میں ایک اور نام کا اضافہ کرنے کے بعد میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ شاد عظیم آبادی اور جمیل مظہری دونوں ہی دبستان عظیم آباد سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک منفرد قسم کی سنجیدگی و رعنائی جو دبستان عظیم آباد کے ساتھ مخصوص رہی ہے' ان دونوں شعراء کے درمیان غالباً واحد نقطۂ اشتراک ہے۔

جمیل مظہری جن سیاسی اور عمرانی حالات سے دوچار تھے وہ شاد کے عہد میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور تھے۔ اپنے عہد کے مخصوص حالات کے پیش نظر جمیل نے کچھ سیاسی اور سماجی موضوعات کو بھی موضوع سخن بنایا اور بظاہر یہ کہہ کر ان نظموں اور غزلوں کی قدر و قیمت بھی بڑھانی چاہی کہ

شکستِ رنگِ رخ تو اک فسانہ ہے شباب کا
حکایتیں ہیں اور بھی ورق الٹ کتاب کا

مگر حقیقت یہی ہے کہ یہی "شکستِ رنگِ رخ" ان کی شاعری کا وہ اہم ترین موضوع ہے جو ان کی شہرت عام اور بقائے دوام کا ضامن ہے۔ ورنہ وقتی موضوعات پر کہی گئی نظموں میں سطحیت، بے کیفی اور ایک نوع کی خشکی ہوتی ہے وہ جمیل کی ان نظموں اور اشعار میں بھی موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نظمیں اپنے عہد میں اہم اور مشہور رہی ہوں مگر ان نظموں میں انقلاب کے سطحی نعرے اور خفائق کی جانب دلدارانہ پیشکش کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس میدان کا شاعر کو اول تو کوئی ٹھوس تجربہ ہی نہیں ہے اور جو تجربے ہیں بھی انہیں وہ شاعرانہ تجربہ نہیں بنا پایا ہے۔ ہو سکتا ہے میری یہ بات وضاحت طلب بھی ہو مگر میں فی الحال سیاسی و سماجی موضوعات پر لکھی گئی جمیل کی نظموں کو نظر انداز کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔ چونکہ یہاں موازنہ شاد سے ہے اور شاد کے یہاں رنگ و بوئے محبت کی زمزموں کے علاوہ اگر کوئی اور چیز ہے تو وہ مسائل تصوف کا جلوہ ہے۔

شاد اور جمیل مظہری کے تخلیقی رویے کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شاد بنیادی طور پر ...

خود بھی اس کا شدت سے احساس تھا کہ ان کے دل و دماغ میں کبھی مفاہمت نہ ہو سکی۔ جہاں ان کا ذہن یکسر فلسفیانہ اور متفکرانہ تھا وہاں ان کا دل بے حد جذباتی تھا۔ ان کو اپنے دوستوں، عزیزوں بلکہ اپنی گود کے پالوں سے بھی ہمیشہ شکایت رہی کہ وہ ان کی دوستی اور محبت کا جواب اسی گرم جوشی سے نہیں دیتے جس کے وہ متوقع تھے۔ ان کے دوستوں اور عزیزوں کو ان سے یہ شکوہ رہا کہ وہ بے حد جذباتی ہیں۔ ان کی خفیف سے خفیف فروگذاشت کو بھی وہ کم التفاتی یا بے توجہی سمجھ لیتے ہیں۔

انسان کے کردار کی تعمیر میں جہاں وراثت اور ماحول کے اثرات کارفرما ہوتے ہیں وہاں بعض خارجی اور مختلف المزاج و متضاد دھارے بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور یہ عمل و ردّ عمل ایام طفولیت ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ بھیا مرحوم کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان کی تاریخ ولادت کے متعلق کچھ اختلافات اس لئے پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کا سال ولادت ان کے تاریخی نام میر کاظم علی کے مطابق ۱۳۲۱ھ ہے۔ عیسوی سال کے حساب سے تاریخ ولادت ستمبر ۱۹۰۳ء ہوتی ہے مگر اسکول کے رجسٹر میں کرانی بابو نے سہولت کے لحاظ سے یکم جنوری ۱۹۰۵ء درج کر دیا۔ یہی تاریخ سرٹیفکٹ میں بھی درج ہوئی۔ ان کی زندگی کے ابتدائی دو ڈھائی سال کے متعلق مجھے کوئی اطلاع بجز ایک معمولی سے واقعے کے نہیں جو والدہ مرحومہ نے مجھے سنایا تھا۔ شاید ڈھائی یا تین سال کی عمر تھی ان کی جب وہ والد مرحوم کے ساتھ ایک مجلس عزا میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مجلس شروع ہو چکی تھی مگر ایک لڑکا جو ان سے عمر میں کچھ بڑا تھا اب بھی شور و غل کر رہا تھا۔ بھیا نے برجستہ کہا "بڑا بدتمیز ہے یہ لڑکا"۔ سب لوگ ان کا یہ فقرہ سنکر ہنسنے لگے۔ اس واقعے سے ان کی ذہانت اور اخلاقی حس کی جھلک سی نمایاں ہوتی ہے۔ اس چھوٹی سی عمر میں بھی وہ دوسرے بچوں سے زیادہ سنجیدہ تھے اور ان کی اخلاقی حس بیدار تھی۔ اسی زمانے میں دادی نے ان کو اپنا چہیتا پوتا بنا لیا۔ حالانکہ بڑے بیٹے کی اولاد موجود تھی۔ دو پوتے بھی تھے۔ ایک ان میں سے بھیا سے کافی بڑے تھے مگر دوسرے تقریباً بھیا کے ہم عمر تھے مگر نہ جانے کیوں ان کو یہی چھوٹا پسند آیا۔ انھوں نے اس پوتے کو اپنے ساتھ سلانا اور اس کے لئے خود سب سے الگ اچھے اچھے پکانا اور سب سے چھپا کر کھلانا شروع کیا۔ وہ خود طہارت، نماز، روزہ کی بے حد پابند تھیں۔ ان کے بستر پر ان کے صاحبزادوں کو بھی بیٹھنے کی اجازت نہ تھی مگر یہ لاڈلے پوتے ضد میں آکر آنگن میں لوٹ لگاتے اور اسی حالت میں دادی کے بستر پر سو جاتے۔ مجھے اپنے بچپن کا ایک دن اب تک یاد ہے۔ میں اس وقت شاید تین برس کا اور میری چھوٹی بہن ڈیڑھ سال کی تھی۔ ہم دونوں کھیلتے ہوئے اس برآمدے میں نکل آئے جہاں دادی اپنے چہیتے پوتے کے لئے کچوریاں تل رہی تھیں۔ انھوں نے یہ کچوری ایک ایک کچوری ہم دونوں کو تھما دی اور وہاں سے بھگا دیا کیونکہ ان کو اندیشہ تھا کہ شاید ہم دونوں کی نظر ان کے پوتے کے کھانے پر لگ جائے گی۔ ان کی اسی بے توجہی کا اثر تھا کہ میں انھیں بھیا کی دادی کہا کرتا تھا اور ان کی ایک چچازاد بہن کو اپنی دادی کہتا تھا۔

جب بھیا نے پانچویں سال میں قدم رکھا تو ان کی مکتب ہوئی۔ موضع عشری جو حسن پورہ سے ملی

ہونی تھی سو ہوئی۔ وہیں کے مولوی سید طالب حسین صاحب ان کے معلم مقرر ہوئے۔ پڑھائی شروع ہوئی۔ بھیا کبھی جانے میں کچھ تامل کرتے تو اماں انھیں زبردستی بھیجنا چاہتیں۔ وہ ماں کے ڈر سے جانے لگتے تو دادی کہتیں کیسا لڑکا ہے کہہ دے سر میں درد ہے جا کے لیٹ رہ۔ اس صورت حال کو دیکھتیں تو اماں جز بز ہوتیں مگر ساس کے سامنے کچھ نہ کہہ سکتیں۔ ان کا تعلق اس گھرانے سے تھا جو عظیم آباد میں گریجویٹ خاندان کہلاتا تھا۔ اس لئے وہ تعلیم کو مقدم سمجھتی تھیں۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ صاحبزادے اگر اسی طرح دادی کے لاڈ میں پلے تو بھی مرزا پھویا ہو کر رہ جائیں گے۔ وہ موقعہ کی منتظر رہیں کہ کسی طرح بہ عنوان شائستہ پوتے کو دادی سے الگ کریں۔ حسن اتفاق سے یہ موقعہ انہیں سنہ ۱۰ء میں مل گیا۔ والد مرحوم کو علمی اور ادبی ذوق بہت تھا۔ زمیندار خاندان سے تھے اس لئے ملازمت کی ضرورت نہ تھی مگر میرے منجھلے ماموں خان بہادر سید احمد علی خاں علیم نے ان کی علمی صلاحیت اور ادبی ذوق کو رائیگاں جاتے دیکھ کر انھیں مشورہ دیا کہ وہ پٹنہ کے محمڈن اینگلو عربک اسکول میں عربی فارسی اور اردو کے معلم کی حیثیت سے شریک ہو جائیں۔ والد نے یہ مشورہ قبول کیا اور محمڈن اسکول میں معلم مقرر ہو گئے۔ اب والدہ کو مستقل طور سے پٹنہ رہنے کا موقعہ ملا تو بھیا کو دادی سے جدا کر کے پٹنہ لے آئیں۔ مولوی صاحب بھی ساتھ آئے۔ گھر پر وہ پڑھاتے لکھاتے مگر بھیا کو مدرسہ سلیمانیہ کی ابتدائی جماعت میں داخل کرایا۔ مگر یہ سلسلہ بھی دو سال بعد ختم ہو گیا اس لئے کہ والد کا تقرر موتی ہاری ضلع اسکول میں ہو گیا۔ اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر چھتر داری بابو منجھلے ماموں کے ہم جماعت اور دوست تھے۔ یہ واقعہ سنہ ۱۲ء کا ہے۔ اسی سال دادی کا بھی انتقال ہو گیا۔ مولوی طالب صاحب نے بھی پٹنہ چھوڑ دیا۔ وہ اپنی جگہ اپنے ایک عزیز مولوی سید امداد امام صاحب عشروی کو رکھوا گئے تھے۔ سنہ ۱۳ء میں والدہ موتی ہاری میں رہنے لگیں۔ بھیا کا داخلہ ضلع اسکول کی چوتھی یا پانچویں جماعت میں ہو گیا۔ والد کے ایک شاگرد ابی صغیر صاحب انھیں انگریزی وغیرہ پڑھانے لگے۔ مگر سنہ ۱۵ء میں والدہ ہم سب کو لے کر پٹنہ اس لئے چلی آئیں کہ ان کے میکے میں شادی کی تقریب تھی۔ سنہ ۱۶ء میں والد کا تبادلہ مظفر پور ضلع اسکول میں ہو گیا۔ بھیا بھی وہیں داخل ہوئے۔ اسی سال سالانہ امتحان میں اردو کے پرچے میں گھوڑے پر مضمون لکھنا تھا۔ انھوں نے جو مضمون لکھا اس میں میر انیس کے ایک مرثیے کے وہ اشعار بھی لکھے جو گھوڑے کی تعریف کے متعلق تھے۔ مضمون کی کاپی جب مولانا شعیب عربک ٹیچر کے پاس آئی تو ان کو ایسی حیرت و مسرت ہوئی کہ شہر میں لوگوں کو دکھاتے پھرتے کہ دیکھئے یہ ایک بارہ سالہ لڑکے کا لکھا ہوا مضمون ہے۔ اور پیش گوئی کی کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر ضرور بڑا ادیب ہوگا۔ ایسا ہی واقعہ اسوقت ہوا جب بھیا آٹھویں جماعت میں تھے۔ سالانہ امتحان میں جو مضمون لکھا وہ اس وقت کے عربک ٹیچر مولوی سید اعجاز حسین جعفری (جو بعد میں ڈاکٹر اعجاز حسین جعفری پی ایچ ڈی اور ڈاکٹر کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور کئی سال تک ہگلی کے امام باڑہ محسنہ کے متولی بھی رہے) نے بھی خوش ہو کر یہ مضمون سب کو دکھایا اور کہا کہ مجھے ناز ہے کہ میرا شاگرد ایسا ہونہار ہے۔ اور جب بھیا کی ادبی زندگی شروع ہوئی اور وہ مشہور ہوئے تو ان کے ان قدردان اساتذہ کی پیش گوئی سچی ثابت ہو کر رہی۔ جعفری صاحب

ہمیشہ اس پر ناز کرتے رہے۔ ۱۹۱۶ء میں جب والد کا تبادلہ مظفرپور ہوا تو چند ماہ بعد ہی شہر کے ایک رئیس امام الدین خاں صاحب نے اپنی امام منزل میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد کیا۔ یہ مشاعرہ اس لئے منعقد ہوا تھا کہ رامپور کے ایک تاجر عطر ثابت صاحب ان دنوں شہر میں آئے ہوئے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ ان سے امام الدین خاں سے ربط ہوا تو انھوں نے ایک دن بڑے فخر سے کہا کہ شاعری تو یوپی والوں کا حصہ ہے بہار والے شاعری کیا جانیں۔ امام الدین خاں کو تاؤ آگیا اور انھوں نے ان کے چیلنج کو قبول کر کے مشاعرہ منعقد کر دیا تاکہ وہ بھی دیکھیں کہ بہار کے اس چھوٹے سے شہر میں بھی اردو کے اچھے شاعر ہیں۔ والد مرحوم خود تو مشاعروں میں غزل خوانی کرتے نہ تھے اپنے چھوٹے بھائی کے اصرار پر انھوں نے طرح میں ایک غزل کہہ کر بھیا کو دیدی۔ اس وقت میری عمر شاید آٹھ سال کی ہو اور ان کی بارہ سال کی ہوگی مگر والد نے ان کو محلوں میں میر انیس کے سلام اور مرثیے پڑھنے کی تربیت دی تھی۔ مشاعرے میں جھک کر جو انھوں نے غزل پڑھی تو مشاعرہ ان کے ہاتھ رہا۔ ثابت صاحب خجل تو ہوئے مگر بھیا کی داد بھی دل کھول کر دی۔ اس کے بعد تو سارے شہر میں ان کی غزل خوانی کی دھوم ہو گئی۔ شہر میں جب کوئی مشاعرہ ہوتا تو وہ ضرور بلائے جاتے۔ اس مشاعرے کا مصرعہ طرح تو مجھے یاد نہیں۔ زمین غالباً غبار دکھ کر بہار دیکھ کر تھی۔ ایک مصرعہ ان کی غزل کا یاد رہ گیا ہے۔ ع

مسکے وہ مزار زار میرا مزار دیکھ کر

بھیا کی غزل خوانی کا یہ سلسلہ ۱۹۲۰ء تک چلتا رہا۔ پھر وہ بغرض تعلیم کلکتہ چلے گئے۔ جب ۱۹۲۳ء میں انھوں نے میٹرک پاس کیا تو مظفرپور کے مشہور وکیل مولوی بدرالحسن صاحب نے اپنے مکان پر ایک بڑا مشاعرہ منعقد کیا۔ طرح تھی:

آسماں کی طرح جہاں کی طرح

اسی مشاعرے میں بھیا نے چند شعر خود کہے باقی اشعار والد مرحوم نے کہہ کر غزل پوری کر دی۔ اس مشاعرے میں بھی بھیا کی غزل بہت پسند کی گئی۔ مجھے اشعار تو یاد نہیں۔ ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے۔ ع

میں اٹھ کے بیٹھ گیا گرد کارواں کی طرح

یہ تھی ابتدا ان کی شاعری کی۔

میں ذرا اپنے موضوع سے بھٹک گیا ہوں۔ موضوع تھا بھیا کے کردار پر متضاد اثرات کی کارفرمائی دادی کا لاڈ پیار انھیں خود پسند ضدی اور خود سر بنا رہا تھا۔ دوسری طرف ماں کے رعب اور خوف نے انھیں محکومیت اور احساس کمتری میں مبتلا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اماں جہاں اتنی محبت کرنے والی ماں تھیں کہ آدھی آدھی راتوں کو اٹھ کر گھنٹوں بچوں کی سلامتی صحت اور طول حیات کی دعائیں مانگتی رہتیں وہاں تعلیم و تربیت کے معاملے میں بے حد سخت گیر بھی تھیں۔ مجھے بچپن کا ایک واقعہ اب تک یاد ہے۔ ایک دن بھیا نے خس پورہ میں کسی اپنے دوست کو بسکٹ کا ایک ڈبہ بغیر اماں سے پوچھے دیدیا تھا۔ اماں کو پتہ لگا تو انھوں نے مولوی صاحب کو دروازے پر پس پردہ سے حکم دیا کہ انھیں سزا دیں۔ مولوی صاحب تجھ متامل ہوئے تو انھوں نے سختی سے مولوی صاحب کو تنبیہ کی کہ اگر وہ اس وقت لڑکے کو سزا نہیں دیتے تو پھر وہ کیا اس کی تعلیم و تربیت کر سکیں گے۔ مولوی صاحب نے بادل ناخواستہ بھیا کو چند چھڑیاں لگائیں اماں

سے کو بہ کراتی کہ وہ پھر کوئی چیز بغیر ماں کی اجازت لئے کسی کو نہ دیں گے۔

اماں خود بہت فیاض تھیں اور اس ڈبے کی کوئی حقیقت نہ تھی مگر انھوں نے اصولاً اس حرکت کو نازیبا سمجھا کہ لڑکا بغیر ماں کی اجازت کے اس طرح کی فیاضی کرے۔ بات تھی گذری ہوئی مگر بھیا کی طبیعت پر اس کا اثر رہا۔ دادی کے بعد وہ ماں کے لاڈلے تھے اس لئے کہ اولاد اکبر تھے مگر اس کے باوجود اماں کا رعب بہت دنوں تک ان پر طاری رہا مگر فیاضی چونکہ ان کی فطرت ثانیہ تھی وہ بہر صورت جاری رہی۔ بلکہ جب وہ برسر کار ہوئے تو اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ خود تکلیف اٹھاتے مگر دوسروں کی تکلیف ان سے دیکھی نہ جاتی۔ اپنے بھائی بہن، گود کے پالے بچوں کے علاوہ نادار اعزا اور حاجت مندوں کے لئے ہمیشہ ان کی دریادلی جاری رہتی۔ اگر بر وقت پاس پیسے نہ ہوتے تو کسی حاجت مند کی حاجت روا کرنے کے لئے وہ قرض لینے سے بھی گریز نہ کرتے۔ اور یہ فیاضی روپے پیسے تک محدود نہ تھی۔ اپنی ذہنی تخلیقات بھی وہ اسی فیاضی کے ساتھ تقسیم کرتے رہے۔

جہاں فیاضی کا یہ عالم تھا وہاں ان کی چھوٹی چھوٹی خساستوں کو دیکھ کر لوگ حیران ہوتے۔ دیا سلائی کی ڈبیا کے تنکے گنتے اور ان میں بچی ہوئی تعداد سے کچھ کمی ہوتی تو دکاندار یا ماچس کمپنی والوں کو صلواتیں سناتے۔ سگریٹ بجھا بجھا کے پیتے تھے۔ اگر ان بجھے ہوئے ٹکڑوں میں سے کوئی ادھر ادھر ہو جاتا تو اس کی تلاش میں پریشان ہوتے۔ سگریٹ کی ڈبیا میں جتنے سگریٹ بچتے ان کو گنتے رہتے کہ کہیں کوئی نوکر یا لڑکا چرا نہ لے۔ ایک مرتبہ تکلف عزیز اکثر ان کو پریشان کرنے کے لئے دو ایک سگریٹ نکال لیتے۔ پیسے اپنے پاس وہ کم ہی رکھتے تھے مگر جو پیسے ان کی جیب میں رہتے ان میں سے اگر ایک پیسہ بھی گم ہو جاتا تو اس کے لئے پریشان ہوتے۔ اگر کبھی اتفاق سے بازار جانے کا شوق ہوتا تو ہم میں سے کوئی ساتھ ہوتا مگر وہ خود دکانداروں سے قیمت پر الجھتے۔ زیادہ کرایہ مانگنے پر رکشا والوں پر بگڑتے۔ مگر کوئی رکشا والا انھیں بہت نادار اور پریشان نظر آتا تو فیاضی سے اس کی امداد کرتے۔ ۱۹۶۶ء کے نومبر میں وہ لکھنؤ سے کلکتہ واپس آ رہے تھے۔ رات کے وقت ایک بڑھیا اسی ڈبے میں چڑھ آئی۔ وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ یہ خود گرم شیروانی پہنے تھے۔ میرا چھوٹا لڑکا جو ان کے ساتھ تھا وہ بستر پر چادر اوڑھے سو رہا تھا اس کو جگا نہ سکے اور کچھ ہاتھ نہ آیا تو سرہانے رکھا ہوا بڑا سا تولیہ اٹھا کر اس بڑھیا کو اوڑھا دیا۔ یہ نیا تولیہ گلو بابو سلمہ نے دہلی سے لا کر دیا تھا اور انھیں پسند بھی بہت تھا۔

ان کی فیاضی اور خساست کی داستان کہاں تک بیان کروں۔ ان کے کردار میں تضاد کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ان کا تصور مذہب اور اس کے ساتھ ان کی توہم پرستی کا ہے۔ ان کی تخلیقات نظم و نثر میں ان کے خیالات خدا و مذہب کے متعلق ایسے تھے کہ انھیں مذہبی لوگ کافر و ملحد بھی کہنے سے باز نہ آتے۔ سنی حضرات انھیں کٹر شیعہ کہتے اور شیعہ حضرات انھیں سنی سمجھتے اس لئے کہ ان کے مخلص اور بے تکلف احباب میں سنی ہی زیادہ تھے۔ کچھ ہندو انھیں کٹر مسلمان سمجھتے مگر ہندو دوست بھی تھے جو ان کو اپنے سے بہت قریب سمجھتے تھے کیونکہ وہ سری کرشن جی اور ان کی گیتا کی بڑی عظمت کرتے۔ جیسا تما گوتم بدھ، کبیر

اور گرونانک جی کو عظیم ہستی انسانیت سمجھتے اور ان کی تعلیمات کو گہری عقیدت سے پڑھتے۔ حضرت عیسیٰ کو پیغمبر انسانیت کہتے تھے مگر عیسائیوں سے بدظن تھے۔ کفر و ایمان کے متعلق ۱۹۲۳ء میں ان کا یہ شعر بہت قابل گرفت سمجھا گیا تھا ؎

کفر کیا ہے حرم و دیر کی تفریق جمیل
سخت کافر ہے وہ ہندو جو مسلماں ہو جائے

ایک اور غزل میں ان کا یہ شعر بھی مذہبی حلقے میں قابل گرفت سمجھا گیا۔ ؎

بت و بت خانہ توڑنے والے
اسی زد میں خدا نہ آجائے

مذہب سے تو نہیں مگر کٹر مذہبیت سے جہاں ان کو سخت بیزاری تھی وہاں بانیانِ مذاہب سے بھرپور عقیدت بھی رکھتے تھے۔ نماز کبھی باقاعدہ نہیں پڑھی۔ لڑکپن میں سیکھی تھی۔ روزے بھی کبھی کبھی رکھتے تھے مگر جوانی میں یہ سب چھوڑا۔ کبھی افطار پارٹی میں بلائے جاتے تو اس دن کھانا پینا تو ترک کر دیتے مگر سگریٹ پیتے رہتے۔ عاشورہ محرم کو بھی یہی طریقہ تھا۔ محرم کی مجلسوں اور محافل میلاد النبی میں بھی شرکت کرتے مگر مولویوں اور ذاکرین کی یاوہ گوئی پر کڑی تنقیدیں بھی کرتے۔ کلکتہ میں جب تک مولانا ابوالکلام آزاد عیدین پڑھاتے رہے وہ نماز عیدین انہیں کے پیچھے اپنے سنی دوستوں کی طرح ہاتھ باندھ کر پڑھتے۔ جب سے مولانا نے نماز عیدین پڑھانا ترک کیا بھیا نے نماز عیدین پڑھنا بھی ترک کیا۔ شیعوں کی مسجد میں تو کبھی نماز عیدین بھی نہ پڑھی۔ تمام مذہب بیزاری کے ساتھ ساتھ رات کو سونے سے پہلے اور صبح کو اٹھنے کے بعد اپنے خدا کے سامنے ہاتھ اٹھا کر ہم لوگوں کے لئے ہی نہیں تمام اعزا اور احباب بلکہ ساری انسانیت کی بھلائی کے لئے دعائیں کرتے اور اس طرح گڑگڑا کر دعائیں مانگتے جیسے کوئی عابد و زاہد مانگتا ہے۔ اوہام پرستی کا یہ عالم تھا کہ اگر راستہ چلتے کوئی بلی راستہ کاٹتی تو خود بھی کھڑے ہو جاتے اور ہم میں سے کوئی ساتھ ہوتا تو اس کو بھی آگے بڑھنے نہ دیتے تاوقتیکہ کوئی دوسرا راہ گیر ادھر سے گزر نہ جاتا۔ شام کو کہیں جانے کے لئے گھر سے نکلتے اور اتفاقاً آسمان کی طرف نظر اٹھ جاتی اور وہاں صرف ایک تنہا ستارہ نظر آجاتا تو کھڑے ہو جاتے اور دوسرے ستارے کے نمودار ہونے کا انتظار کرتے رہتے۔ بدھ کے دن نہ خود سفر کرتے نہ ہم میں سے کسی کو سفر کرنے دیتے۔ جمعہ کو بھی نماز جمعہ کے پہلے سفر نہ کرتے۔ کوئی نئی دوا [illegible] کو نہ خود کھاتے نہ ہم لوگوں کو استعمال کرنے دیتے۔ رکشا پر خود داہنی طرف بیٹھتے اور مجھ کو یا اپنے کسی عزیز کو بائیں طرف بٹھلاتے تاکہ اگر خدا نخواستہ کوئی حادثہ درپیش ہو تو اس کا اثر ان پر ہو ساتھ والے پر نہ ہو۔

لباس کے معاملے میں وہ بے پرواہ تھے۔ کپڑے میلے ہیں تو میلے ہی سہی۔ استری شدہ ہوں تو اس کی بھی پرواہ نہیں مگر جب نہا دھو کر کپڑے پہنتے تو کرتے اور پاجامے کا یکساں طور پر اجلا ہونا ضروری سمجھتے۔ [illegible] فرق کرتے پاجامے اور شیروانی کے اجلے پن میں ہوتا تو نہ پہنتے۔ وہ شاعری کی طرح ان روزمرہ کی باتوں میں بھی ترتیب کے قائل اور پابند تھے۔ [illegible] بے [illegible] کھانا کھاتے۔ اکثر کہتے تھے [illegible] ہوں تو ان کے ساتھ [illegible] ہوں یا پڑ [illegible] تو ان کے ساتھ [illegible] روکھی روٹی کے ساتھ کر لیتے۔ [illegible]

نان۔ اگر اس کے خلاف ہوتا تو کھاتے ہی نہیں یا کھاتے تو جبراً۔ کھانے میں اڑہر کی دال بہت پسند تھی بشرطیکہ وہ خوب سوندھی اور آب و نمک سے درست ہو۔ دال کے اس شوق کی بنا پر ان کے استاد بھائی حضرت آصف بنارسی کی بی بی انھیں دال والا کہہ کر یاد کرتیں۔ مرغ اور جھینگڑی کے قورمے انھیں پسند تھے خاص طور پر میری اہلیہ کے ہاتھ کے پکائے ہوئے مگر لذیذ سے لذیذ کھانا اگر ان کے معیار سے درست نہ ہو تو نہ کھاتے۔ اچھی چیز پکانے والے یا پکانے والی کو انعام دیتے مگر خراب پکی ہوتی تو ڈانٹ بھی اسی سختی سے پلاتے۔

نوکروں کا اتنا خیال کرتے کہ جو چیز خود کھاتے پہلے اس کے لئے نکال کر الگ رکھ دیتے۔ کوشش تو یہی کرتے کہ نوکر ساتھ ہی کھائے مگر وہ راضی نہ ہوتا۔ گھر میں جب شادی کی تقریب ہوتی تو وہ سب سے آخر میں کھانے پر بیٹھتے اور گھر کے تمام نوکروں کو ساتھ بٹھلا کر کھلاتے۔ جاڑے میں اس کے لئے سوئیٹر ضرور خرید کر دیتے یا ہم میں سے کسی سے مانگ کر دیتے۔ جہاں نوکروں کا اتنا خیال رکھتے تھے وہاں اگر کسی نوکر یا چھوکرے سے کوئی فروگذاشت یا غفلت ہوتی تو اس کو بڑی سختی سے ڈانٹتے۔ چھوٹا لڑکا ہوتا تو ایک آدھ چپت بھی لگا دیتے۔ لیکن جب غصہ اترتا تو اس کو کچھ نہ کچھ انعام بھی مل جاتا۔

حق العباد کا اتنا خیال تھا کہ عزیزوں اور دوستوں کے یہاں عیادت۔ تعزیت یا تہنیت کے لئے باوجود خرابی صحت کے ضرور جاتے۔ خاص طور پر اپنے غریب اعزہ سے حمایتہً ان کے مجمع میں بھی عزیز اد تے تاکہ اسکو احساس غربت کا نہ ہو۔ دعوتوں میں شرکت شوق

سے کرتے۔ مگر ہمیشہ یہ فکر کرتے رہتے کہ جس کے یہاں دعوت کھائی ہے اس کو اپنے یہاں بھی مدعو کر کے اس کا بدل ادا کر دیں۔ وہ خوش خور تو تھے مگر بسیار خور نہ تھے ان کو کھانے سے زیادہ کھلانے میں خوشی حاصل ہوتی۔ مہمان کو بہ اصرار زیادہ سے زیادہ کھلاتے اور خود اس دن کم کم ہی کھاتے۔

جب بڑھاپا آیا تو عمر کے آخری سالوں میں استخارے کے اتنے پابند ہو گئے تھے کہ کہیں جانے آنے ہی میں نہیں کھانے پینے میں بھی استخارہ کرتے۔ جب تک استخارہ مناسب نہ آتا نہ کہیں جاتے نہ کھانا کھاتے۔ تسبیح جیب میں رکھتے تھے۔ مگر کہیں تسبیح ساتھ نہ ہوتی تو دیا سلائی کی کانٹیوں سے استخارہ کرتے۔ دعوتوں میں اکثر ایسا ہوتا کہ وہ میز کے نیچے تسبیح یا کانٹیوں سے استخارہ کر کے کوئی چیز کھاتے یا مجھے کھانے دیتے۔ ایک بار ہزاری باغ گئے وہاں ان کے پرانے اور بے تکلف دوست ظفیر الحسن صاحب ڈی ایس پی متعین تھے۔ انھوں نے ان کے اعزاز میں عمائدین شہر کی دعوت کی۔ مگر ان کو کچھ بھی کھانے پر استخارہ نہ آیا اس لئے بغیر کچھ کھائے چلے آئے۔ جنوری [illegible]ء میں والدہ کا انتقال بھیکن پور (مظفر پور) میں ہوا۔ شدید بیماری کا تار پٹنہ گیا جہاں وہ مقیم تھے۔ مدن سلمہ ساتھ تھے۔ گو سلمہ بھی دہلی سے آ گئے مگر ابا کو استخارہ نہ خود جانے کا آیا نہ ان دونوں کے جانے کا آیا۔ والدہ راہی جنت ہوئیں تجہیز و تکفین سب ہو چکی تو یہ لوگ آ سکے۔

استخارہ کے اس توہم کو خود بھی توہم سمجھتے تھے مگر کہتے کہ یہ عادت بد ایسی پڑ گئی ہے کہ بغیر استخارے کے کوئی کام کرنے سے سکون قلب نہیں ہوتا۔ یہ مرض استخارہ بھی در اصل ان کی اعصابی کمزوری کا نتیجہ

تھا۔ لڑکپن میں پیچش کا مرض لاحق ہوا۔ جب اس میں شدت ہوئی تو والد مرحوم سنہ ۲۰ء میں انھیں دہلی لے گئے۔ وہاں حکیم اجمل خاں صاحب سے علاج کرایا۔ صحت ہو گئی، مگر اسی سال وہ بغرض تعلیم کلکتہ چلے گئے۔ کلکتہ کی زندگی اور ہوٹلوں کے کھانے نے پھر اس مرض کو ابھارا تو زندگی بھر ساتھ نہ چھوڑا۔ معدہ خراب ہوا تو اختلاج قلب نے سر اٹھایا۔ اسی اختلاج کی وجہ سے ایم۔ اے کے امتحان میں آخری پرچہ چھوڑ کے چلے آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے فرسٹ کلاس کے سکنڈ کلاس ملا۔ حالانکہ اپنے جس دوست کو انھوں نے فارسی ادب پڑھایا تھا وہ فرسٹ کلاس لے آئے۔ اختلاج کی اس شدت کو بعض اعزا نے جنون سمجھنا شروع کیا۔ بچپن سے پھوپھی زاد بہن سے رشتہ طے تھا مگر اس غلط فہمی نے یہ رشتہ بھی منقطع کرا دیا۔ یہ واقعہ سنہ ۲۸ء کا تھا۔ اسی سال چھوٹی بہن کی شادی ہوئی مگر وہ کم نصیب صرف ساڑھے تین سال سہاگن رہی اور صرف دو بچوں (گلو اور مدن سلمہما) کی ماں ہو سکی۔ اب تک زندہ ہے۔ اس حادثے نے بھیا کے دل پر ایسا اثر کیا کہ انھوں نے باوجود والدین کے اصرار کے شادی نہ کرنے کا عزم کر لیا۔ بہن کے بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پالا۔ سنہ ۳۸ء میں میری شادی بڑے حوصلے سے کر دی۔ میرے یہاں جو بچے ہوئے وہ سب انھیں کے بچے رہے انھیں کو ابا کہتے اور سمجھتے رہے مجھے صرف آج تک باوجی کہتے ہیں۔ میں نے، میری بی بی نے اور بہن نے اپنے بچوں کو انھیں کے بچے سمجھا اور کہا۔ سوا گھر کے لوگوں یا قریبی دوستوں کے کوئی جانتا ہی نہیں تھا کہ یہ ان کے نہیں ہم لوگوں کے بچے ہیں۔ صرف میری چھوٹی لڑکی مجھے ابا کہنے لگی وہ بھی اس لئے کہ اس کے بچپن کے زمانے میں بھیا کا قیام کلکتہ میں بہت کم رہا۔ باوجود اس کے وہ اس کو بھی اپنی بیٹی ہی کی طرح مانتے تھے۔ صرف وہی ان کو بڑے ابا کہتی تھی۔ اس بے پناہ محبت کے باوجود بھی ہم میں سے کسی کی ادنیٰ بھول اور چھوٹی چھوٹی فروگذاشت کو نظر انداز نہ کرتے۔ خفا ہو جاتے مگر یہ خفگی بھی پیار کی خفگی ہوتی اور تھوڑی دیر بعد ہی غصہ فرو ہو جاتا تو کہتے کہ ہم تم لوگوں سے خفا اس لئے ہوتے ہیں کہ تمہاری تادیب ہو جائے۔

وہ کان کے ذرا کچے تھے۔ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اکثر شاطر لوگ دوسروں کی جھوٹی شکایت کر کے ان کو برہم اور بدگمان بنا دیتے۔ مگر وہ شخص جس سے بدگمان یا برہم ہوں اگر بیمار ہوتا یا کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا تو ساری برہمی بھول کے اس کی مزاج پرسی کو جاتے اور حتی الوسع اس کی تکلیف دور کرنے کی کوشش کرتے۔

وہ مجھ سے عمر میں صرف پونے چار برس بڑے تھے مگر انھوں نے محبت کے ساتھ ساتھ مجھ پر پدرانہ رعب رکھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ میں جب دسویں جماعت کا طالب علم تھا تو اتفاقاً والد کے ساتھ ہم دونوں بھائی ان کے ساتھ فیض آباد گئے تھے۔ وہاں بیچ بازار میں نہ جانے مجھ سے کیا غلطی ہوئی تھی کہ انھوں نے وہیں مجھے تھپڑ رسید کر دیا۔ میں رو کر رہ گیا۔ اس کے کئی سال بعد جب میں کالج میں تعلیم پا رہا تھا مجھ سے کوئی گستاخی سرزد ہو گئی تو انھوں نے چار پانچ دن تک مجھ سے بول چال ترک کر دی تھی۔ آخر والد کی سفارش اور میرے دست بستہ معافی مانگنے پر انھوں نے قصور معاف کیا اور مجھے گلے لگا لیا۔ وہ مجھ سے ایسی ہی محبت کرتے تھے جیسی کوئی اپنی اولاد سے کرتا ہے۔ اس بڑھاپے میں بھی کلکتہ میں رات کو اگر مجھے کہیں جانا ہوتا تو کسی نہ کسی کو ساتھ کر دیتے۔ دن کو اگر کہیں سے آنے میں مجھے دیر ہوتی تو بے چینی سے ٹہلتے رہتے جب

سکھلاتا نہ جاتا نہ چھوٹے بیٹھتے نہ کھانا کھاتے۔ ان کی شفقتوں کی کہانی کہاں تک بیان کروں۔ ایک ایک بات یاد آتی ہے اور مجھے رُلا جاتی ہے۔ جب تک وہ زندہ تھے میں اپنے کو بوڑھا نہ سمجھتا تھا۔ اب ایک سال کے اندر مجھ پر بڑھاپا بڑی تیزی سے طاری ہو گیا ہے اس لئے کہ اب نہ مجھے کھانے پینے میں ٹوکنے والا ہے نہ آنے جانے میں روکنے والا، نہ تاکید سے دوائیں کھلانے والا۔

جہاں وہ اپنے سے کم عمر اور کمتر شعرا اور ادبا کے ساتھ بے حد منکسرانہ خلوص کے ساتھ پیش آتے وہاں اہل دول اور ارباب اقتدار سے کنارہ کش ہی رہتے۔ جس زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم گورنر بہار تھے، ایک ریڈیائی مشاعرے میں وہ صدارت کے لئے تشریف لائے۔ بھیا اپنے دوست ایوب صاحب ایڈوکیٹ کے اصرار پر کلکتہ سے پٹنہ مجھے ساتھ لے کر آئے اور مشاعرے میں ان کو پڑھنا بھی پڑا۔ مگر وہ ذاکر صاحب کے پاس جا کر نہ ملے۔ بس دور سے رسمی تعظیم کر دی۔ اس کے بعد ذاکر صاحب متوقع تھے کہ بھیا ان سے گورنمنٹ ہاؤس میں جا کر ملاقات کریں گے۔ مگر یہ نہ گئے شاید ایک یا دو سال بعد کسی شادی کی تقریب میں ذاکر صاحب بھی شریک تھے جسٹس خلیل احمد بھی تھے۔ دوران گفتگو ذاکر صاحب نے پوچھا کیا جمیل مظہری صاحب اس تقریب میں آئے ہیں۔ خلیل صاحب نے کہا وہ کیا ادھر کنارے بیٹھے ہیں۔ ابھی جا کر پکڑ لاتا ہوں وہ گئے اور بھیا سے کہا کہ "گورنر بہار کے حکم سے بہار کا چیف جسٹس تمہیں گرفتار کر کے ان کے سامنے پیش کرے گا" یہ کہہ کر انھیں کھینچ کر ذاکر صاحب کے پاس لائے۔ ذاکر صاحب نے ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود ان سے نہ ملنے کی شکایت کی تو بھیا کچھ شرمندہ ہوئے اور پھر کچھ دن بعد ان سے ملنے گورنمنٹ ہاؤس گئے۔ ذاکر صاحب ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور وہ بھی ذاکر صاحب کا گورنر کی حیثیت سے نہیں ایک عالم و ادیب کی حیثیت سے بڑا احترام کرتے تھے۔

بھیا مرحوم کے مخلص اور بے تکلف دوست قاضی جعفر امام صاحب جب بہار میں منسٹر ہوئے تو بھیا نے ان کے یہاں جانا ترک کر دیا حالانکہ دونوں میں خلوص اور بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ جعفر امام بھائی بھیا کو ملا جی کہہ کر پکارتے تھے۔ جنہوں اپنے یہاں پکڑ کر رکھتے۔ ان کے لڑکے لڑکیاں بھیا حقیقی چچا کی طرح مانتی تھیں جب جعفر بھائی منسٹری سے سبک دوش ہوئے تو پھر ان سے ملنے گئے۔

جگ جیون بابو اور بہار کے وزیر اعلیٰ کرشن بلب سہائے سے ان کی ملاقات پروفیسر بالی مرحوم کے ذریعہ ہوئی تھی۔ وہ دونوں بھیا سے مساویانہ انداز میں ملتے تھے۔ کرشن بلب سہائے جب وزیر اعلیٰ ہوئے تو بھیا نے ان سے ملنا چھوڑ دیا۔ ایک جلسہ میں ملاقات ہوئی تو سہائے صاحب نے شکایت بھی کی کہ جمیل صاحب آپ تو کبھی ملتے ہی نہیں۔ بھیا نے کہا میں سیاسی حلقے سے اب باہر ہوں اور آپ وزیر اعلیٰ ہیں۔ سیاسی سرگرمیوں سے آپ کو فرصت کہاں کہ سماجی ملاقات کے لئے آپ وقت نکالیں۔ اس لئے میں آپ سے نہیں ملتا۔ وہ مسکرا کر چپ ہو گئے۔

اس بے نیازی کے باوجود اگر کسی کی سفارش کرنے کے لئے کسی بھی صاحب اقتدار کے پاس جانا ہو تو بے عذر چلے جاتے۔ اپنی جیب سے رکھتا کا کرایہ ادا کر دوسروں کے کام کے لئے اپنے سے کم عمر اور کم رتبہ انسان

کی مدح سرائی کرنے میں بھی انھیں عذر نہ ہوتا حیرت ہے اس خیال سے کہ کسی ضرورت مند کی حاجت روائی ہو جاتی تھی مگر اپنے لئے کبھی کسی کے پاس نہ گئے۔ کانگریسی حکومت کا دور تھا اور وہ اس حلقے میں مقبول بھی تھے مگر وہ دوسرے لوگوں کی طرح انھوں نے اپنے کو آگے بڑھانے کی کوشش نہ کی۔ بہار کا نسل کی رکنیت انھیں حکومت دینا چاہتی تھی مگر انھوں نے انکار کیا۔ پبلسٹی ڈپارٹمنٹ میں ان کا اور دنکر جی کا تقرر ایک ساتھ ہوا تھا۔ مگر چند سال بعد ہی دنکر جی محکمہ تعلیم میں ہندی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ گریڈ ون ملا۔ بھیا کے پبلسٹی ڈپارٹمنٹ سے پٹنہ کالج میں تبادلہ کرنے کی بات ان کی خواہش کے مطابق چلی۔ پٹنہ کالج میں صدر شعبۂ اردو اختر اورینوی صاحب تھے۔ بھیا نے خود چیف سکریٹری ایل پی سنگھ سے کہا کہ میں اختر صاحب کی حق تلفی کراکے وہاں گریڈ ون کی جگہ پر جانا گوارا نہیں کرسکتا آپ مجھے گریڈ ٹو میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے بھجوا دیجئے۔ اختر صاحب کی ماتحتی مجھے ہرگز ناگوار نہ ہوگی میں بخوشی ان کے ماتحت کی حیثیت سے کام کرنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ مگر اختر صاحب مرحوم بھی بھیا کی بزرگی کو ہر دم ملحوظ رکھا۔ برابر یہی کہتے تھے کہ صدر شعبہ تو دراصل مظہری صاحب ہیں۔ میں تو صرف دفتری حیثیت سے صدر ہوں۔ واقعہ چھوٹا سا ہے مگر دو بڑوں کی بڑائی اور کشادہ دلی کا بین ثبوت ہے۔ بقول میر:

"اب کہاں ایسے پراگندہ طبع لوگ"

اللہ ان دونوں کو خلد میں سکون و سرور عطا کرے۔

عام طور پر شاعروں کو اپنا کلام سنانے کا شوق ہوتا ہے۔ اور بعض میں تو یہ شوق بحد جنون پایا جاتا ہے۔ مشاعروں میں بلوانے جانے کے لئے جوڑ توڑ کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ بھیا مرحوم شاید اس معاملے میں بھی مختلف اور منفرد تھے۔ عام مشاعرے تو کیا نجی صحبتوں میں بھی وہ اپنا کلام سنانے سے گھبراتے۔ بہت اصرار ہوا تو چند شعر پڑھ دئیے۔ ملک کے مختلف شہروں خصوصاً دہلی۔ بنگلور۔ کشمیر۔ ڈھاکے سے بلاوے آتے تا آتے مگر وہ ہمیشہ انکار کرتے۔ شاید ہی دو چار بڑے مشاعروں میں انھوں نے شرکت کی۔ دہلی سے لال قلعہ کے مشاعرہ میں شرکت کے لئے بلاوے آتے تو وہ اپنی جگہ بہار کے ابھرتے ہوئے شعرا کو وہاں بھجوا دیتے۔ ایک بار تو علی جواد زیدی صاحب نے تار پہ تار دئیے۔ کشمیر آنے کے لئے زاد راہ بھی تار سے بھجوائی مگر وہ نہ گئے اور زاد راہ لوٹا دی۔ کشمیر یونیورسٹی سے ایک پی ایچ ڈی کی تھیسس کے اگزامنر بنائے گئے وائی وا کے لئے بلائے گئے مگر نہ گئے۔ صرف رپورٹ بھیج دی۔

جوش صاحب جب تک پاکستان نہیں گئے تھے جب بھی بہار یا بنگال کے مشاعرے کے لئے آتے تو پہلے سے بھیا کو خط لکھ کر بلاتے کہ اگر تم شریک نہ ہوگے تو میں نہ آؤں گا۔ ان کے اصرار سے انھیں جانا پڑتا مگر وہاں بھی حتی الوسع شعر پڑھنے سے گریز کرتے۔ ایک بار دہلی گئے تھے۔ اسی دن ہولی کے سلسلے میں مشاعرہ تھا۔ جوش صاحب ان کو بھی کھینچ لے گئے۔ مگر انھوں نے پڑھا نہیں۔ دوسرے دن جوش صاحب پنڈت نہرو سے ملنے گئے تو بھیا کو بھی زبردستی ساتھ لے گئے۔ پنڈت جی سے زوردار تعارف کرایا تو پنڈت جی نے کہا رات جب یہ مشاعرے میں تشریف رکھتے تھے تو پڑھا کیوں نہیں۔ جوش صاحب نے کہا یہ ایسے اپنا کلام یوں نہیں سناتے جب ڈنڈے مارے جائیں تو سناتے ہیں۔ پنڈت جی نے مسکرا کر کہا آپ نے رات کو مجھے بتا دیا ہوتا

تو میں ڈنڈے کے زور پر ان سے پڑھواتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحبت میں برسوں ہفتہ وار حاضری دیتے رہے۔ مختلف قسم کی علمی، ادبی گفتگو ہوتی۔ مگر بھیا نے کبھی اپنا کلام ان کے سامنے نہیں پڑھا۔ ان کے اس رویے سے بعض دفعہ بڑی ناگواری سی بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں جب پٹنہ میں جشن جمیل منایا گیا تو اس کے مشاعرے میں بھی انھوں نے صرف تین چار شعر پڑھے اور چلے آئے۔ لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ کچھ لوگ اسے ان کا غرور سمجھتے تھے مگر سبب وہی احساس کمتری تھا جو ان کی اعصابی کمزوری کا نتیجہ تھا۔ دوسروں کا کلام شوق سے اصرار کر کے سنتے اور کلام کی داد جی کھول کے بلکہ بعض وقت حدِ اعتدال سے بڑھ کر حد مبالغہ تک دیتے تھے۔ نوجوان شعرا کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے۔ کہتے کہ آپ لوگ جیسے اچھے اشعار پڑھتے ہیں اس کے بعد مجھے اپنے اشعار پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ پڑھتے شرم آتی ہے۔ اچھے اشعار سن کر ان پر ایسی محویت طاری ہو جاتی کہ پڑھنے والا آگے کے کئی شعر پڑھ چکا ہوتا اور وہ اسی شعر میں ڈوبے رہتے۔ پھر چونکتے تو دوسرے اشعار کی داد دیتے۔ حال میں کلکتہ کے ایک نوجوان شاعر انجم عظیم آبادی نے اپنی ایک غزل میں "جرمِ پیمبرانہ" کی ترکیب نظم کی۔ بھیا نے بزم احباب کلکتہ کے ایک جلسہ میں یہ شعر سنا تو بہت تعریف کی۔ اس کے بعد اپنی ایک غزل میں یہی ترکیب کو استعمال کیا تو اس غزل کے نیچے یہ نوٹ لکھ دیا کہ:

"یہ ترکیب میں نے عزیزی انجم عظیم آبادی سے مستعار لی ہے۔" اب تک وہ غزل اس نوٹ کے ساتھ میرے پاس محفوظ ہے۔

باوجود اپنی بڑائی اور تبحر علمی کے وہ چھوٹوں سے بھی کسی لفظ کے متعلق تحقیق کرنے میں عار نہ سمجھتے۔ مجھ سے اکثر پوچھ لیتے کہ اس لفظ کے معنی کیا ہیں۔ تذکیر ہے یا تانیث۔ بعض وقت ان کا کوئی شاگرد بھی ان کے کسی شعر میں کسی لفظی ترمیم کی طرف اشارہ کرتا تو وہ خوش ہوتے اور ترمیم کر دیتے۔ لیکن بعض وقت مجھ سے جھنجھلا کر کہتے کہ تم ابا مرحوم کی طرح بڑے کٹر عروضی ہو گئے ہو۔ اس لئے کہ بعض وقت وہ اپنے اشعار میں کچھ آزاد روی بھی برت لیتے تھے۔ جن میں مجھے کچھ تامل ہوتا۔ میرا مزاج شاعری ان کے مزاج شاعری سے قدرے مختلف تھا۔ اس لئے انھوں نے باضابطہ اصلاح میرے کلام پر کبھی نہ دی۔ ہاں کبھی کبھی برسر مشاعرہ بھی میرے کسی شعر میں اگر کوئی سقم یا کمی نظر آتی تو اسی وقت مجھے ٹوک دیتے اور ترمیم کر دیتے۔ تین چار سال پہلے ایک صحبت میں جب میں نے یہ مقطع پڑھا ؎

دل میں اب تک ہے رضا یاد ان کی
ایک ہلکی سی چبھن ہو جیسے

تو فوراً بولے ہلکی کی جگہ میٹھی کر دو۔ میں نے اسی وقت ترمیم کر دی۔

ایک بار اسلامیہ کالج کلکتہ کے سالانہ مشاعرے میں میرا یہ شعر بہت پسند کیا گیا تھا ؎

تو ہی اے ہوا مٹا دے یہ اثر غلط روی کے
کہ بھٹک نہ جائیں رہرو کہیں میرے نقش پا سے

انھوں نے فوراً ٹوکا اور مصرعہ ثانی یوں بنا دیا کہ ع

بھٹک نہ جائیں رہرو مرے نقش ہائے پا سے

اہل ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ ان معمولی ترمیموں سے شعر میں کتنی وسعت اور فصاحت پیدا ہو گئی۔ کبھی تو ایسی ہی ہلکی سی اصلاح دیتے اور کبھی شاگردوں کے کئی کئی شعر کاٹ دیتے اور ان کے بدلے دوسرے اشعار لکھ دیتے۔ شاگردوں کی غزل یا نظم بناتے وقت کوئی اچھا سے اچھا

شعر بھی اپنی زمین میں نکل آتا تو اپنے لئے کبھی نہ رکھتے، وہ شاگردوں کو دیدیتے۔ وہ اکثر عرفی کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

بہ آں تتبع حافظ رواست چوں عرفی
کہ دل بہ کاورو دردخوری داند (یاد ادد)

ان کے اندر یہ دونوں کیفیتیں بدرجہ اتم تھیں۔ جب تک وہ شعر کو اپنے معیار پر نہ لاتے انھیں چین نہ آتا۔ اکثر گھنٹوں کسی شاگرد کے مصرعہ پر دوسرا مناسب مصرعہ لگانے میں صرف کرتے۔ اور جب اپنے لئے کچھ کہتے تو قلم برداشتہ پوری پوری نظم یا غزل منٹوں میں کہہ ڈالتے۔

حافظے کا یہ عالم تھا کہ اساتذہ قدیم کے سیکڑوں اشعار انھیں یاد رہتے مگر اکثر اپنا کہا ہوا کلام بھی بھول جاتے۔ لوگوں کے نام اور پتے تو اکثر بھول جاتے تھے ۱۹۶۲ء میں انھوں نے اپنا مرثیہ "پیمان وفا" ۱۲۰ بندوں کا کہا تھا۔ چند ماہ بعد حسین آباد ضلع مونگیر کچھ اعزا سے ملنے گئے۔ ان کے ایک بے تکلف دوست اور عزیز نے اصرار کیا کہ چند بند ہی سہی اس مرثیے کے لکھوا دو۔ مسودہ ساتھ نہ تھا۔ زبانی لکھوانا شروع کیا تو ۱۱۹ بند مسلسل لکھوا گئے۔ میر انیس، مرزا دبیر وغیرہ کے مرثیوں کے سیکڑوں بند اس طرح یاد تھے کہ معلوم ہوتا تھا حفظ کئے ہیں۔ باوجود اپنے فلسفیانہ اور ترقی پسند رجحان کے داغ، امیر، ریاض وغیرہ کے بھی چیدہ اشعار انھیں یاد تھے۔ ان کا ذوق سخن اور ذہن اس سلسلے میں بہت وسیع تھا۔ اچھا شعر کسی کا بھی ہو کسی موضوع کا ہو انھیں حفظ ہو جاتا، بشرطیکہ اس میں شعریت ہو۔

ذوق مطالعہ کا بھی یہی حال تھا۔ جس موضوع کی بھی کتاب مل جاتی پڑھتے۔ فلسفہ اور تاریخ تو خیر ان کے پسندیدہ مضامین تھے۔ انگریزی، فارسی، اردو جس زبان میں ان مضامین کی کتاب مل جاتی انہماک سے پڑھتے اور ان پر تنقیدی نگاہ بھی ڈالتے۔ جہاں ایسی ثقیل کتابیں پڑھنے کا شوق تھا وہاں وہ ناول اور افسانے بھی شوق سے پڑھتے۔ رومانی دنیا اور جاسوسی دنیا جیسے ناول بھی پڑھتے۔ کہتے تھے کہ یہ ہلکی پھلکی تخلیقات پڑھنے سے میرے تھکے ہوئے ذہن کو ذرا آرام اور فرصت مل جاتی ہے۔ ان کا ذوق ادب بھی ان کی تخلیقات کی طرح ہمہ جہت تھا۔

ان کے فکر و فن پر روشنی ڈالنے کا نہ میں اہل ہوں اور نہ یہ مناسب ہے۔ اس لئے کہ میں ان کا چھوٹا بھائی ہی نہیں ان کا پروردہ ذہنی بھی ہوں۔ یہ کام ارباب فن کا ہے۔ کچھ تو یہ کام کر چکے ہیں اور کچھ اب کریں گے۔ ان کے فکر و فن کا ہر پہلو ایک کتاب مانگتا ہے۔

یہ داستان جو مختصر ہونی چاہئے تھی طویل ہوگئی۔ اس لئے معذرت کے ساتھ اپنے ہی ایک شعر پر اسے ختم کرتا ہوں۔ ؎

ہمارے بعد سننا دوسروں سے
کہانی یہ ابھی پوری نہیں ہے

بقیہ اختر اورینوی

ساریاں کیں۔ اور بعد ازاں باضابطہ نظم نگاری کی طرف بھی مائل ہوئے۔ غزل کے شعر پہ نگاہ نیاز کی تعریف صادق آتی ہے ؎

پھیلائے کیا نیاز محبت کی داستاں
سمٹی سی اک نگاہ جو خود نا تمام ہے

مگر داستان محبت کی اثر خیزی طول بیان پہ منحصر نہیں ہے
جمیل کا سوز ناتمامی لطیف جذبوں کی تشنہ کامی ؟!
یہی تو وہ خوف آرزو ہے جو سنگ پیر [illegible]

جمیل مظہری کا شعری مرتبہ

مہر علی حماد عباسی

اگر بات صرف جمیل مظہری کی نثر نگاری تک محدود ہوتی تو بس ایک ہی جملہ کہہ کر میں چپ ہو رہتا اور وہ جملہ کچھ اس طرح کا ہوتا کہ اردو فکشن میں جمیل مظہری کے افسانے " فرض کی قربان گاہ پر" کا وہی ادبی مرتبہ ہے جو اردو مزاح نگاری کی تاریخ میں "پطرس کے مضامین" کا۔

ویسے تو یہ جملہ بالکل صاف اور غیر مبہم ہے لیکن ایک تو بے حد اختصار اور دوسرے موضوع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تخلیقات کے ادبی مقام کی مماثلت کے سوال کو لے کر کچھ کنفیوژن پیدا ہو سکتا ہے اس لئے تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے۔

'پطرس کے مضامین' میں احمد شاہ بخاری (پطرس) کی بے مثل مزاح نگاری کے دیباچے کو ملا کر کل ایک درجن چھوٹے بڑے نمونے شامل ہیں جو اپنی سیدھی سادی غیر مصنوعی زبان، صاف ستھرے شائستہ مزاح اور طنز کے بے پناہ تیکھے پن کی بنا پر طنز و مزاح کی ایک لازوال تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ اردو کے کم و بیش سارے نقاد اس کی اہمیت کے معترف ہیں۔ پطرس کے ایک پرستار نے انگریزی تنقید کے ایک مشہور جملے "کم از کم دوسروں نے انگریزی زبان میں بہت اچھے فرنچ ناول لکھے ہیں" کے انداز میں یہاں تک کہہ دیا کہ پطرس نے اردو زبان میں انگریزی مزاح نگاری کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس جمیل مظہری کے ایک اچھوتے اور ناقابل فراموش طویل افسانے " فرض کی قربان گاہ پر" کی طرف جو ہر لحاظ سے ایک درجہ اول کی چیز ہے۔ کسی کی نظر نہیں گئی اور وہ افسانہ ارباب نقد و نظر کی بے توجہی اور گمنامی کا شکار ہو کر رہ گیا۔

جمیل مظہری کا یہ افسانہ ایک زمانے میں رسالہ ندیم (گیا) کے 'بہار نمبر' میں شائع ہوا تھا اور بعد میں 'شکست و فتح' کے نام سے ۱۹۵۰ء میں کتابی صورت میں چھپا۔ موضوع کی فکر انگیز معنویت، رومانی حقیقت پسندی کے کامیاب تجربے اور الفاظ کے تخلیقی اور فنکارانہ استعمال کی وجہ سے اردو فکشن میں ایک کلاسک کا درجہ پانے کا مستحق ہے۔ اس افسانے کی سب سے بڑی خوبی اس کی پہیلیوں کی کہانیوں جیسی ذہن پر چھا جانے والی مزید ار والی کیفیت ہے۔ میں نے یہ افسانہ پہلے پہل کب پڑھا تھا مجھے ٹھیک یاد نہیں لیکن اگر زندگی کے ماہ و سال کی گنتی کروں تو یہ مدت چوتھائی صدی سے کوئی دس سال زیادہ ہی نکلے گی اور اس بیچ عرصے میں گرتے جاتے چلتے پھرتے محفل کے ہنگاموں میں اور تنہائی کی خاموشی میں مجھے یہ افسانہ ہمیشہ ہانٹ (HAUNT) کرتا رہا اور میں اپنے ذہن کو اس کے اثرات سے کبھی بے دخل نہ کر سکا۔ اردو میں ایسی کتنی تخلیقات ہیں جو مطالعے کے بعد بھی اپنے قاری کو ہانٹ کرنے کی تاثیر رکھتی ہوں۔ "فرض کی قربان گاہ پر" کا شمار بلا شبہ ایسے ہی غیر معمولی، اہم اور بے مثال افسانوں

کارناموں میں ہونا چاہئے تھا لیکن اپنی زبان کے نقادوں کے بارے میں کیا کہا جائے جو پطرس کے مضامین جیسی دبلی پتلی اور ضعیف و ناتواں کتاب میں ادبی صحت مندی کی ساری علامتیں تلاش کرلیں تو یہ ان کی ادبی نبض شناسی تصور کی جائے اور ہم ان کے اعتراف عظمت کو بلا عذر گزارش احوال واقعی سمجھ لیں اور اگر یہی دنیائے شعر و ادب اردو فکشن کے ایک اہم ادبی سنگ میل کو گرد راہ سمجھ کر نظر انداز کر دیں تو کوئی ان کی تنقیدی عصبیت اور بے بصری پر انگلی بھی نہ اٹھائے۔ اس افسانے کا اس طرح فراموش کیا جانا اردو تنقید کے لئے ایک سانحے سے کم نہیں۔

میرے خیال میں اگر جمیل مظہری صرف یہی ایک افسانہ لکھ کر شعر و ادب کی محفل سے اٹھ جاتے تو بھی ان کا یہ عظیم کارنامہ انھیں دنیائے ادب میں زندہ رکھنے کے لئے کافی تھا۔ اگر ایملی برانٹی صرف ایک ناول "وُدرنگ ہائٹس" لکھ کر امر ہوسکتی ہے تو جمیل مظہری ایک افسانہ لکھ کر زندہ جاوید کیوں نہیں ہوسکتے "فرض کی قربان گاہ پر" اردو زبان کا وہ نورس پھول ہے جو کبھی مرجھا نہیں سکتا اور اپنی لطیف خوشبو سے گلزار ادب کو ہمیشہ معطر رکھے گا۔

تو یہ رہا جمیل مظہری کی ایک اولین نثری تخلیق کے بارے میں میرا ذاتی ردِ عمل۔

جمیل مظہری کے شعری مرتبے کا تعین بڑا ہی دشوار اور پتا مارنے کا کام ہے۔ اس کا سبب ان کی زود گوئی اور تخلیقی ضخامت ہے۔ سنا ہے کہ جمیل مظہری نے اردو زبان میں رائج تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے نظمیں، غزلیں، رباعیاں قطعے، مرثیے، قصیدے، مثلث، مسدس، گیت، ہجو، مثنوی، ریختی، ہجو سبھی کچھ لکھے ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ احباب کی فرمایش پر لکھی جانے والی نظموں کا بھی ایک خاصا بڑا انبار انھوں نے اپنے پیچھے چھوڑا جس کا کافی حصہ یا تو تلف ہوگیا یا ابھی تک قارئین کی نظروں سے اوجھل ہے۔ ان کی ایک ایسی ہی معرکتہ الآرا نظم "فریاد" ہے جو مجھے ماہنامہ تہسیل (گیا) کے "جمیل مظہری نمبر" (نقش اول) میں پڑھنے کو ملی۔ یہ نظم اقبال کے "شکوہ" کے طرز پر ہے لیکن اس کو پڑھ کر مجھے جمیل مظہری کی فنی چابک دستی، فراخ دلی اور مذہب و ملت سے اوپر اٹھ کر نوع انسانی کے دکھ درد کو محسوس کرنے اور پھر اپنے محسوسات کو بیان کرنے کی قدرت پر ایمان لانا پڑا۔

تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جمیل مظہری کے شعری اکتسابات اتنے کثیر اور بوقلموں ہیں کہ جب تک وہ سب کا سب یا اس کا معتدبہ حصہ سامنے نہ ہو ان کے شعری مرتبے کے متعلق کچھ کہنا اور وہ بھی کسی خاص نتیجے پر پہنچنے کے خیال سے کم سے کم مجھ جیسے کم پڑھے لکھے معمولی قاری کے لئے بڑا ہی مشکل کام ہے۔ یہ کام کرنے کا تو اصل میں ہے ہمارے ان ریسرچ اسکالروں کا جو اردو کے نئے پرانے شاعروں کے "حیات و کارنامے" ٹائپ کے تحقیقی مقالے لکھ لکھ کر اردو کے نقادوں کی صف میں شامل ہوتے جارہے ہیں۔

تاریخی طور پر تو جیسا کہ ہمیں معلوم ہے جمیل مظہری کا شمار جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، احسان دانش اور روش صدیقی کے ہم عصروں میں ہوتا ہے۔ یہ سارے شعراء ایسے ہیں جن کے نام بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ابھرے۔ ان شعرا میں اقبال کا اثر قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ جمیل مظہری بھی اقبال کے اثر سے نہ بچ سکے۔ لیکن بیا

بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ کوئی شاعر کسی بڑے شاعر کا اثر قبول کر کے یا اس کی تقلید کر کے بڑا شاعر نہیں بن سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اقبال کی کورانہ تقلید کرنے والے شعراء مثلاً آجن حزیں سیال کوٹی یا اسد ملتانی اردو کے بڑے شاعروں میں گنے جاتے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ کسی شاعر کی تقلیدی شاعری چاہے وہ کتنے ہی بڑے شاعر کی پیروی میں ہو چاہے کسی بھی زبان کی عام ادبی روایت کے اتباع میں ہو کسی بھی اہمیت کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ صرف وہی شاعر اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے جو روایت سے اوپر اٹھ کر کوئی انفرادی تجربہ کرلے اور نئی روایتوں کو جنم دے۔ روایت سے تعاون عام روش سے انحراف اور اندیشہ پیروی (ANXIETY OF EXAMPLE) سے آگاہ ہو کر ہی۔ کوئی شاعر اپنی دنیا آپ پیدا کر سکتا ہے اور شاعری کے نئے امکانات کا پتہ دے سکتا ہے۔ جمیل مظہری بھی ایک ایسے ہی شاعر ہیں جو اپنی شاعری میں انفرادی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے رہے اور کبھی ان کے قلم ایک مقام پر ٹھہرے نہیں۔ وہ ان شعرا کی طرح نہیں ہیں جو اپنے تخلیقی سفر میں کچھ عرصے تک انفرادی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے کے بعد پھر اپنی ہی نقل کرنے لگتے ہیں۔ جمیل مظہری کی انفرادیت ایک تدریجی عمل ہے اور رسد کی چھاپ ان کے کلام میں ہر جگہ ملتی ہے۔ ان کے سارے ہم عصروں سے ان کے لہجے کا آہنگ، پیرائہ اظہار، فن کی جدلیاتی کلیت اور صنعت گری جدا ہے۔ ان کی شاعری میں وہ کلاسیکی وقار اور توازن ملتا ہے جو ان کے عہد کے دوسرے شعرا میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ خلیل الرحمن اعظمی نے جمیل مظہری کی انفرادیت کے متعلق کتنی جامع اور مکمل بات کہی ہے:

"ان کے یہاں نہ تو جوش کی کھوکھلی نعرہ تخریب اور بکھری ہوئی آواز ہے اور نہ ہی اختر شیرانی کا تخیلی رومان اور حقائق زندگی سے فرار، ان کے یہاں حفیظ و ساغر کی آواز کا پتلا پن اور ہلکی موسیقی والا انداز نہیں ہے...... ان کے نغموں میں ٹیگور، غالب اور اقبال کے طرز فکر کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے"۔

(فکر و فن۔ ص ۱۶۶)

جمیل مظہری کی انفرادیت کے نقوش ان کی اہم نظموں میں ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ ان کی نظمیں 'ڈرو خدا سے ڈرو' 'یہ کیا ہوا تم کو' 'کہتے ہیں اسی کو کیا محبت' 'کلو بابو' 'عشق ناتمام' 'پیام' 'شاعر کی تمنا' اور 'ارتقا' اپنی سادگی، فنی رچاؤ، کلاسیکی نظم و ضبط اور اثر انگیزی کی بنا پر ان کی نمائندہ تخلیقات کہی جا سکتی ہیں جن میں ان کا اپنا لب و لہجہ اپنا رنگ نمایاں ہے۔ ان نظموں میں بلا کی اثر انگیزی اور احساس کی گرمی اور ذاتی تجربے کی نقش گری ہے۔ ان کی یہ نظمیں ان کے ذہن کے تنوع اور مزاج کی لچک کا بین ثبوت ہیں۔ ان کی نظم 'ڈرو خدا سے ڈرو' اپنی سادگی اور فنی رچاؤ اور متانت کی گہرائی کے لحاظ سے اردو شاعری کے ایک شاہکار فن پارے کا درجہ رکھتی ہے۔ اس نظم میں نہ کسی طرح کا ابہام ہے نہ کوئی اشکال اور نہ کوئی جھنجھوڑ دینے والی کیفیت ہے۔ اس کی حزنیہ فضا قاری کو اپنے آپ میں ڈبو لیتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ نظم دل کو چھو لینے والی ایک تصویر ہے، ایک مجروح پکار ہے جو نظم کے پیکر میں ڈھل گئی ہے۔ جمیل مظہری نے ایک محبت زدہ عورت اور محبت کی کشمکش میں مبتلا گھریلو لڑکی کو جذبات کی عکاسی [illegible] ہے کی [illegible] اردو کے سارے عشقیہ شاعری میں [illegible]

پائے گی نظم ختم ہوتے ہوتے مل سکے گی۔ اس باعث خلیل الرحمٰن اعظمی نے 'ڈرو خدا سے ڈرو' کو [illegible] کے خطوط کے بعد اردو زبان میں عورت کی مظلومیت پر دوسری کامیاب تخلیق قرار دیا ہے۔ نظم کا سارا حسن گھریلو جزئیات نگاری میں روحانی حقیقت پسندی کا کامیاب تجربہ ہے۔ نظم کی ہیروئن عذرا اپنے روحانی کرب کو گھر کے اندر رہ کر اس طرح بیان کرتی ہے:

جو پاس ہو کے ماں کے قریب سے جاتی ہوں
تو خود بھی جلتی ہوں سالن کو بھی جلاتی ہوں
نمک بجائے شکر دال میں ملاتی ہوں
نہ یوں دوانہ بناؤ، ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

اور پھر اس کے بعد عذرا کا اعتراف و التجا کے ساتھ یہ کہنا:

جو گھٹ کے ساز میں رہ جائے وہ صدا ہوں میں
نہ درد سے نہ محبت سے آشنا ہوں میں
یہی سمجھ لو کہ کم بخت بے وفا ہوں میں
مجھے وفا نہ سکھاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!

لیکن حرماں نصیبی اور غم عشق کے تپتے ہوئے صحرا سے گزر کر بھی عذرا محبت و استقامت کا دامن نہیں چھوڑتی اور کہتی ہے:

کہاں دکھو گے دل خانہ خراب کی میت
کہ زاد سے بھی کچھ ہے ارمان خواب کی میت
میں خود اٹھا لوں گی اپنے شباب کی میت
نہ [illegible]، ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو

اور اس طرح جمیل مظہری اس نظم کو اس کے فطری انجام تک لے جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو المیہ ڈراموں کے انجام کی طرح سکون اور تمکین اور جذباتی اور روحانی مسرت کے احساس کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی نے جلتے ہوئے زخم پر ٹھنڈا پھاہا رکھ دیا ہو۔ نظم کا مجموعی تاثر المناک ضرور ہے لیکن اس میں فانی کی:

"نفس سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ"

والی کیفیت نہیں ہے بلکہ زندگی کے غموں کو جھیلنے اور ان پر فتح پانے اور مایوس نہ ہونے کی تلقین ہے۔

جمیل مظہری کی عشقیہ شاعری اردو کی عشقیہ شاعری کی عام روش سے ایک اور لحاظ سے الگ ہے۔ ان کے کلام میں محبت کے ازلی مثلث کا ذکر ضرور ہے لیکن اس میں رقیب کی وہ روایتی شکل نہیں ہے جس کی جھلک اردو کی غزلوں میں ملتی ہے۔ وہ عشق میں ناکامی کے باوجود اپنے رقیب کو "رقیب رو سیاہ" نہیں سمجھتے بلکہ اس کے لئے اپنے دل میں ہمدردی کے جذبات رکھتے ہیں اور اپنی محبوبہ سے آخری بار جدا ہوتے وقت یہ کہنا نہیں بھولتے:

چلی ہو لیکن یہ یاد رکھو کہ اس میں کوئی کمی نہ کرنا
ہمارا خونِ جگر بھی ملنگے اگر تمہارا سہاگ تم سے

اور اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں:

یہ ساری تمنائیں میری اس مانگ کے سیندور پہ صدقے
جو تیرا جیون ساتھی ہے وہ میرا جیون ساتھی ہے

تو اس سے ان کے جذبۂ عشق کی وسعت اور رقیب سے نفرت کے بجائے ہمدردی اور اپنے پن کا احساس ہوتا ہے۔ فراق گورکھپوری نے اردو کی عشقیہ شاعری، فیض احمد فیض کی نظم "رقیب سے" کے متعلق لکھا ہے کہ جب انھوں نے اس نظم کو پڑھا تو ان کے دل کا چور نکلا کیونکہ اس نظم میں فیض نے رقیب کا بالکل ایک نیا

تصور پیش کیا ہے اور رقیب سے نفرت کے بجائے احسان مندی کا رویہ اختیار کیا ہے اور کہا ہے :

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں

کیونکہ اس سے شاعر نے " عاجزی سیکھی ' غریبوں کی حمایت سیکھی ' یاس و حرماں کے ' دکھ درد کے معنی سیکھے جمیل مظہری رقیب کے لئے صرف احسان مندی ہی کا نہیں بلکہ دوستی اور خیر سگالی کا بھی جذبہ رکھتے ہیں ۔

جمیل مظہری کی عشقیہ نظمیں ان کے بالغ شعور " تربیت یافتہ ذہن اور فکر و فن کے ٹھہراؤ اور توازن کا پتہ دیتی ہیں ۔ ان نظموں میں ان کا ایک مخصوص لب و لہجہ ہے صوتی آہنگ اور لفظ و معنی کا تخلیقی رچاؤ ہے جو بہ آسانی پہچانا جا سکتا ہے ۔ لیکن عشقیہ نظموں کے بعد وہ بھی ان کی ایسی ان گنت نظمیں ہیں جن میں ان کی انفرادیت نمایاں ہے ۔ ان کی ایک ایسی ہی نظم " گلو بابو " ہے ، نظم کے کچھ خاص اشعار اس طرح ہیں :

یہ چھوٹے سے گلو بابو جو گود میں ماں کے سوتے ہیں
دو کام بس ان کو آتا ہے یا سوتے ہیں یا روتے ہیں
ہر شخص کے منہ کو تکتے ہیں اپنی گہرائی نظروں سے
یا دل میں محبت بوتے ہیں کچھ گمشائی نظروں سے
ہنس ہنس کر آنکھوں آنکھوں میں اماں کی محبت لوٹتے ہیں
جب دودھ نہیں ملتا ہے انہیں تو کوشش کرتے روتے ہیں
معصوم نیچی نظروں سے جب ماں کی جانب تکتا ہو
جب ننھے سے ہونٹوں میں ننھا سا تبسم ہمکتا ہو
ملنے جو اٹھائی چادر کھلنے سے ننھے منا بولا ہو
آزادی اس کی فطرت ہر پابندی سے گھبراتا ہے

اس نظم کی صرف یہ خوبی نہیں ہے کہ اس کو پڑھ کر گلو بابو کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے بلکہ اس کی خوبی اس کی سادگی اور لفظوں کا مناسب استعمال ہے جس کے ذریعے ایک ننھے منے بچے کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے ۔ یہی نظم میں وہی حسن کاری اور تازگی ہے جو ان کے " شیشو " اور " شیشو بھولا ناتھ " میں تمام بچپن پر ان کی نظروں میں تھی ہے ۔ جمیل مظہری نے گلو بابو کو انسانی فطرت کا مظہر بنا دیا ہے اور انسان کی فطرت کے حقائق ۔ بچہ بھی آزادی کا طلب گار ہے اور اپنے اوپر عائد پابندی کو پسند نہیں کرتا ۔

جمیل مظہری کی سیاسی شاعری میں خاصے کی چیز ہے ۔ سیاست کا انہیں ذاتی اور عملی تجربہ تھا ۔ تحریک آزادی کی تحریک میں شریک ہو کر ۱۹۴۲ء میں سرکاری ملازمت سے استعفا دے کر جیل یاترا بھی کر آئے تھے ۔ ان کی سیاسی شاعری میں گہرائی ہے اور نعرہ بازی کی جھلک نہیں ملتی ۔ ان کی سیاسی شاعری میں نہ تو شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کے یہاں کی جھلاہٹ ملتی ہے اور دوسرے شعرا کی سستی خطابت ۔ ان کی سیاسی نظموں میں گہرا سماجی و سیاسی شعور اور فنی بصیرت کے نشان ملتے ہیں اور اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ اگر شاعر کا ذہن بیدار ہے اور شعور کی پختگی سے آشنا ہے اور اپنے ارد گرد کے حالات و واقعات سے باخبر ہے تو وہ سیاسی موضوعات کو بھی اعلا شاعری کا نمونہ بنا سکتا ہے ۔ جمیل مظہری کی بیش تر نظمیں ان کے شاعرانہ کمال اور ذہنی شعور کے قابل قدر نمونے ہیں ۔ ان کی نظم ' موسم کے اشارے ' دوسری جنگ عظیم اور ۱۹۴۲ء کی ' بھارت چھوڑو ' تحریک کے پس منظر میں لکھی گئی ہے جس میں [illegible] استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جس میں [illegible] دوسری جنگ عظیم [illegible]

یہ آزادی سامراج کی اکھڑتی ہوئی ساکھ کو بڑے ہی تیکھے پن کے ساتھ پیش کیا ہے اور آخر میں ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ ملک کو محکوم بنائے رکھنے والوں سے صاف الفاظ میں کہہ دیتے ہیں

اب خیر اسی میں ہے آؤ
کشتی کو ڈبو کے بھاگ جاؤ

لیکن اس نظم میں کہیں بھی سیاست شاعری پر غالب نہیں ہونے پائی۔ نظم کا موضوع خالص سیاسی ہے لیکن اس کا اظہار فنکارانہ ہے۔ انھوں نے ایسی بے شمار سیاسی نظمیں لکھی ہیں جن میں وہ اپنی شاعرانہ انفرادیت کو زخمی کیے بغیر فکر و فن کی ان بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں جہاں تک ان کے ہم عصر شعرا نہیں پہنچ سکے۔ سیاسی شاعر کی حیثیت سے جمیل مظہری کا مرتبہ ان کے عہد کے تمام شعرا سے اونچا اور ان سے بلند تر درجہ صرف اقبال کا ہے۔ ان کے یہ دو اشعار آج بھی سنگین معنویت کے حامل ہیں۔ حالانکہ آزادی حاصل کیے ہوئے کئی دہائیاں بیت چکی ہیں :

آج دنیا میں نہ احمق کوئی تم سا ہوگا !
اس اندھیرے میں چراغوں سے اجالا ہوگا ؟
(جشن آزادی)

یہ غلام ابن غلام ابن غلام ابن غلام
کرتے آئے ہیں زبردست کی لاٹھی کو سلام

مختصر یہ ہے کہ سجدے وہی ڈیوڑھی بھی وہی
آستانہ وہی سکتے وہی ٹڈی بھی وہی

یہ آزادی کے بعد ملک کی صورت حال نہ بدلنے کی شکایت ہی نہیں ہے بلکہ ایک زبردست احتجاج بھی ہے۔

فکری اور فلسفیانہ نظموں میں بھی جمیل مظہری اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں اور بنیادی طور پر فن کار ہی رہتے ہیں۔ ان کے اشعار فلسفیانہ افکار سے کبھی بوجھل نہیں ہوئے۔ ان کے کلام میں فکری عناصر کئی طرح سے رونما ہوتے ہیں اور بقول احتشام حسین

"یہ عنصر کبھی تشکیک کی شکل میں، کبھی صوفیانہ اور کبھی مابعد الطبیعاتی اشارات کی صورت میں کبھی فلسفیانہ سوال بن کر کبھی قلندرانہ راز و آگہی کے روپ میں اس قدر نمایاں ہیں کہ وہی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متوجہ کرتا ہے۔"

لیکن ان کے فلسفیانہ افکار کتابوں سے اخذ کیے ہوئے نہیں ہیں بلکہ زندگی کے ٹھیٹ تجربات اور مشاہدے و مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ نظیر صدیقی نے یہ ٹھیک ہی کہا ہے کہ

"وہ اقبال کے فلسفۂ عمل، اور انسان کی ذات میں بے پایاں امکانات کے تصور سے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ 'پیام شاعر کی تمنا'، 'آدم نو کا ترانۂ تخلیق'، 'افسانۂ آدم' میں اور تو' اقبال کی گرفت بہت واضح ہو... ہیں۔"

لیکن میرے خیال میں جمیل مظہری کی بہت سی فکری نظمیں ایسی ہیں جو خود ان کی اپنی اپج کا نتیجہ ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظموں 'ہم کون ہیں ہم کیا ہیں؟' اور 'ارتقا' کو پیش کیا جا سکتا ہے جو جمیل مظہری کی انفرادیت اور فنکارانہ چابک دستی کی ضامن ہیں۔ نظم 'ارتقا' تو خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ کیونکہ یہ جدید فلسفے کی حامل ہے اور جدلیاتی نظریے کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کرتی ہے جس میں فکر کی گہرائی بھی ہے اور روحانی حوصلہ مندی بھی ہے۔ جمیل مظہری کی فلسفیانہ شاعری کا ایک امتیازی وصف

یہ بھی ہے کہ وہ انسان کا ایک نیا تصور پیش کرتے ہیں جو کسی مخصوص نظام اخلاق سے وابستہ نہیں ہے جیسی وابستگی اقبال کے یہاں اسلامی نظام سے پائی جاتی ہے۔ جمیل مظہری کو انسان کی قوت عمل پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان اگر چاہے تو نظام عالم میں ایک انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ ان کا یہ کہنا :-

ڈھل سکتا ہے ہر سانچے میں انسانی کردار
فطرت یہ ہو فطرت وہ ہو کب تک یہ تکرار
فطرت کیا ہو فطرت کیا ہو فطرت کو کر زیر
وقت کا دھارا پھیرنے والے وقت کا دھارا پھیر

تسخیر فطرت کی طرف کی طرف کتنا بلیغ اشارہ ہے جو انسان کی تخلیقی قوت پر ان کے گہرے اعتماد کا ثبوت ہے۔

ایک اور بات جو جمیل مظہری کو ان کے ہم عصر شعرا سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ غالب اور اقبال کے بعد اردو کے واحد شاعر ہیں جو خدا کے متعلق والہانہ انداز سے سوچتے ہیں۔ وہ اپنے خدا سے ہم کلام ہوتے ہیں، شکوہ کرتے ہیں، جھگڑتے ہیں، جبر و اختیار کی بحث کرتے ہیں لیکن وہ کبھی نہیں بھولتے کہ انسان جس نور سے ازل میں بھرا گیا تھا وہ اسی تمام فضا میں کہیں نہ کہیں ضرور ہے۔ وہ اس خیال کو یوں ادا کرتے ہیں :-

تو اس فضا میں جہاں ہو وہیں سے دے آواز
پکارتا ہے تجھے قلب ناصبور مرا

خدا کے بارے میں جمیل مظہری کا رویہ حقیقت پسندانہ ہے :-

سالے میرے جھگڑے ہیں جمیل اپنے خدا سے
منکر ہیں ائمہ کا نہ منکر ہوں نبی کا
تھی وہ شاید اپنی ہی بے چارگی کی اک پکار
جس کو اپنی سادہ لوحی سے خدا سمجھا تھا میں
میں چلتا رہا مظہری اپنی دھن پر
ہمیوں نے بلایا خدا نے پکارا

اور آخر میں اپنی راہ میں چلتے رہنے کی دھن ان سے کہلواتی ہے :-

میں نہیں کہتا سویرا کر دے
دو کام میں ایک کام میرا کر دے
یا روشنی تیز کر کچھ دیکھ سکیں
یا اور بھی گھنگھور اندھیرا کر دے

ان اشعار میں تشکیک کا جذبہ ضرور ہے لیکن ان کے پیچھے خدا اور کائنات کا ایک مفکرانہ تصور کارفرما ہے۔ کہیں کہیں وہ ایک طرح کی ماورائیت کا شکار ہو گئے ہیں مثلاً ان کے اس شعر :

دیر میں وہ حرم میں وہ عرش پہ وہ زمیں پہ وہ
جس کی پہنچ جہاں تلک اس کے لئے وہیں پہ وہ

میں نظیر صدیقی نے متصوفانہ خیالات کی پرچھائیں ڈھونڈھی ہے لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ یہ اگر واقعی تصوف ہے تو پھر تصوف کی مادی تاویل ہے۔

جمیل مظہری کے شعری مرتبے کا تعین کرتے وقت ہم ان کی منظر دغزل گوئی سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ نظموں کی طرح غزلوں میں بھی جمیل مظہری اپنی ایک مخصوص آواز رکھتے ہیں۔ ان کی وہ غزلیں بڑے معرکے کی ہیں جن میں انھوں نے ہندی کے خوب صورت اور سجل الفاظ کے استعمال سے غزل کو ہندوستانی ماحول و معاشرت سے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک انقلابی تجربہ ہے، انقلابی اس لئے کہ اردو غزل کے رنگ ڈھنگ کے مزاج میں تبدیلی لانا ہر لحاظ سے بڑی جرأت مندانہ کوشش ہے جس کا کامیاب تجربہ شاد عظیم آبادی نے اپنی غزلوں میں پہلے پہل کیا تھا بعد میں جمیل مظہری

نے ۔ فراق گورکھپوری کی "روپ" کی رباعیاں ۔ یہ ہمیں
ہوئی رباعیاں بعد کی چیزیں ہیں ۔ جمیل مظہری کی غزل
کے یہ اشعار :-

پڑا تھا سوتا ستار دل کا ہوئی اچانک یہ بھول تم سے
جو تنگ ہو چکی تھی وہ بن گئی آج راگ تم سے
اٹھا کے شعلے ہمارے دل میں الاؤ سے وہ جب کھڑی ہو
نہ ڈالا جاتا ہے تم سے پانی نہ تاپی جاتی ہے آگ تم سے
اگرچہ ان گیسوؤں نے رادھا تمہیں سپیرن بنا دیا ہے
مگر سنبھالے نہیں سنبھلتے یہ بے حیا کالے ناگ تم سے
یہ میرے جیون کی راگنی پریم کی میٹھی بانسری کیا
یہ دان تم نے دیا ہے جس نے ملا ہے من کو یہ راگ تم سے
جلا سکی دھوپ بھی نہ مجھ کو بجھا سکا روپ بھی نہ مجھ کو
یہ میرا سارا گھمنڈ تم سے یہ میرا سارا تیاگ تم سے
تمہارے بس کے نہیں ہیں رادھا جمیل کی روح کے یہ شعلے
فضول آنسو بہا رہی ہو نہ بجھ سکے گی یہ آگ تم سے

یہ پوری غزل ہندوستانی ماحول میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس قسم کے مزید اشعار مثلاً :

تمہے چھوڑ کر جیت میں اب کے جو بھی حالت اس کی ہو
جس نے اسے متوالی رادھا تم سے ہولی کھیلی ہو

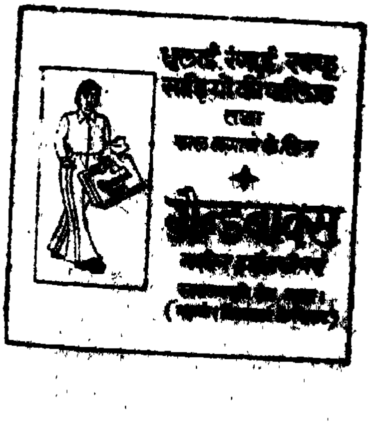
نیا گھر کر ہماری رادھا نے بتیسو دھانی ساری
بیٹھی ہیں شانتی سے پیچھی بیل کر کھیت بار بار جھومتا ہے

نشیلی آنکھیں ہیں یہ بڑی ہاں گلابی چہرہ ستارہ ہوا ہے
چھپا ہوا لاڈ ڈھل آئے آخر تو [illegible] رادھا ہو گیا ہے
میں تیری معصومیت کے قربان یہ بال الجھے یہ میلی ساری
ہوا ہے کم بخت جذبۂ دل کہ تجھ کو جوگن بنا دیا ہے

جمیل مظہری کی غزلوں میں فضا آفرینی کے کامیاب نمونے ہیں۔ ان اشعار میں ہندوستان کی مٹی کا سوندھا پن ہے۔ دھرتی کا نرم گرم لمس ہے۔ دھوپ کا سانا پن ہے۔ صبح کی تازگی ہے اور چاندنی راتوں جیسا سکون اور ٹھہراؤ ہے۔

جمیل مظہری کی شاعری کا مجموعہ تاثر قاری کے اندر زندگی سے محبت کرنے کا ذوق اور عرفان و آگہی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ ان کے کلام میں ایک ایسے انسان کی جھلک ملتی ہے جو اپنے امتحان ہونے سے گھبراتا نہیں۔ زندگی کے آلام اگر قدم آگے بڑھنے سے روکتے ہیں، تو اس کی صلاحیتیں، فکر و عمل کی طاقت اس کو منزل راہ تمنا پر گام زن رکھتی ہیں اس امید سے کہ آخری جیت بہرحال انسان کی ہوگی۔

جمیل مظہری کا شعری مرتبہ ان کے ہم عصروں میں اقبال کو چھوڑ کر سب سے بلند ہے۔ وہ غالب اور اقبال کی طرح عظیم شاعر نہ ہوں لیکن وہ اردو کے اچھے اور اہم شاعر ضرور ہیں۔



علامہ الحاج جمیل مظہری غفرلہٗ

کیلئے

نذرانۂ عقیدت

نیک خواہشات کیساتھ

اسماعیل کریم عطر والا

۴۶ ـ مورلینڈ روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

فون آفس ۳۰۷۹۲۳۴۳۰، ریزیڈنس ۵۰۴۸۳۹

علامہ جمیل مظہری سے میری چند ملاقاتیں

قیصر عثمانی

بہ قدرِ پیمانۂ تخیّل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

اس مشہور و معروف شعر کے خالق اور بیدل کا داغ

۔۔۔ عظیم و مقبول جہاں کا نام روشن کرنے والے سب سے بڑے شاعر علامہ جمیل مظہری سے ہماری شعری محفل محروم ہو گئی۔ لیکن شاعر کبھی نہیں مرتا ۔۔۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اس کی تخلیق کاوشوں اور حسین یادوں کی کہکشاں شعور و فکر کے افق پر سدا جگمگاتی رہتی ہے ۔۔۔

آج جب وہ اس دنیا میں نہیں ۔۔۔ ان کی یادیں میرے سینے میں تیر بن کر چبھ رہی ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ میں نے مرحوم سے اپنی زندگی میں صرف پانچ بار ملنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ میں جیسے ان کا کوئی قریبی عزیز ہوں۔ میں اُن سے جب بھی ملا ہوں۔ انھوں نے مجھ پر اپنی شفقتوں کی بوچھار کی ہے۔ اتنے خلوص و محبت سے پیش آتے ہیں کہ وہ میرے دل میں ہمیشہ کے لئے گھر کر گئے

علامہ جمیل مظہری کی سادہ دلی۔ زود رنجی۔ شدت ۔۔۔ اور ہمیشہ بے خود و سرمست رہنے کا عالم میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ لیجئے میری یادوں کے آئینے میں علامہ جمیل مظہری کی عجیب و غریب شخصیت کی جھلکیاں آپ بھی دیکھئے :-

پہلی ملاقات :

سنہ ۱۹۶۲ء کے وسط کی بات ہے۔ رسالہ سہیل کا خاص نمبر بڑے اہتمام سے شائع ہونے والا تھا اور میں بحیثیت مدیر اس کے لئے علامہ جمیل مظہری سے اُن کا غیر مطبوعہ کلام حاصل کرنے کے لئے گیا سے پٹنہ کا سفر اختیار کر کے جب ان کی قیام گاہ پر پہنچا تو وہ اُس وقت اپنے والد صاحب سے کسی ادبی نکتہ پر بڑے زور و شور کے ساتھ بحث کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی خاموش ہو گئے۔ میں نے بڑی عقیدت کے ساتھ انھیں سلام کیا اور جب انھوں نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا تو میں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد فوراً اپنی غرض و غایت بیان کر دی۔ معاً اُن کے چہرے پر تفکر کے آثار پیدا ہو گئے۔

" میرے پاس اس وقت کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو میں سہیل کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر کر سکوں "۔ علامہ جمیل مظہری نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا

" لیکن میں تو یہ ٹھان کر آیا ہوں کہ آپ سے کلام حاصل کئے بغیر میں یہاں سے نہیں ٹلوں گا۔ خواہ اس کے لئے مجھے ہفتہ بھر، زیادہ ہی کیوں نہ رکنا پڑے " میں نے بڑے زور دے کر کہا۔ اس کے بعد اُن کے چہرے پر ایک خوش آئند تبسم کی لکیر کھنچ گئی ۔۔۔ اور میں قدرے مطمئن سا ہو گیا۔

" دیکھئے میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں آپ کے لئے۔ لیکن اس سے پہلے میں آپ سے کچھ سننا چاہوں گا۔ آپ اپنی کوئی تخلیق ضرور

سنائیے" ۔ علامہ جمیل مظہری نے بڑی سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ فرمایا ۔ یکایک میرے دل کی حرکت تیز ہو گئی ۔ گھبراہٹ سے میرا بُرا حال ہونے لگا ۔ لیکن چند ہی لمحوں کے بعد میں نے اپنی ایک مطبوعہ نظم " ایک نوجوان بیوہ سے خطاب " سنانے کی ہمت کر ہی ڈالی ۔ یہ میری مختصر سی نظم تھی جس کا ایک شعر سنتے ہی وہ تڑپ گئے ۔ اور دل کھول کر اس شدت سے تعریف کرنے لگے جیسے کہ یکایک اُن پر کوئی دورہ پڑ گیا ہو ۔ وہ مجھے اپنے گلے سے لگائے ہوئے تھے اور فرما رہے تھے ـــــ " بیوہ سے متعلق سینکڑوں اشعار ہوں گے لیکن آپ کا یہ شعر بالکل اچھوتا ہے ـــــ آپ کی کیا عمر ہوگی ؟ "

" یہی کوئی بیس اکیس سال " ـــــ میں نے انہیں مطلع کیا

" صرف بیس اکیس سال " ؟ مجھے یقین نہیں آتا ـــ علامہ جمیل مظہری نے فرمایا ۔ لیجئے وہ شعر جو انہیں بے حد پسند آیا تھا ۔ آپ بھی سن لیجئے ـــــ

اُجلے کپڑوں میں ہے تو کیسی مگن
زیب تن ہو جیسے شوہر کا کفن

اس نظم کے سننے سے قبل ہم دونوں کے درمیان جو اجنبیت کی ایک دیوار سی کھڑی تھی ۔ وہ گر چکی تھی ۔ میں جذباتی طور پر اُن کے بالکل قریب ہو چکا تھا اور میری خاطر تواضع کرنے میں انہوں نے اتنی گرم جوشی سے کام لیا کہ میں کچھ حیران سا ہو گیا ۔ اسی دوران میں نے اپنی ایک غیر مطبوعہ نظم جو ۶۵ اشعار پر مشتمل تھی علامہ مرحوم کی خدمت میں برغرض اصلاح پیش کی ۔ جب انہوں نے بڑی خوشی سے اُسے دیکھ لیا تو فرمایا کہ " آپ کی بیوہ والی نظم اس طویل رومانی نظم پر بھاری ہے " اس کے بعد وہ باہر کے کمرے سے اندر [illegible] کی طرف گئے اور تھوڑی ہی دیر [illegible] جب وہ لوٹے تو اُن کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا ـــــ

" لیجئے یہ ہے میری وہ غزل جسے میں شائع کرانا نہیں چاہتا تھا ۔ لیکن آپ کی ضد نے مجبور کر دیا ۔ آپ اسے صرف اس شرط پر شائع کر سکتے ہیں کہ اس کے ساتھ یہ نوٹ ضرور ہو کہ یہ شاعر کے موجودہ رنگِ سخن سے بہت کچھ علیحدہ ہے ۔ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

اندیشہ ہائے فردا شاعر کی زندگی میں
یا دل کے چند ٹکڑے بکھرے ہیں [illegible] میں
کل رات نبضِ فطرت کچھ تیز چل رہی تھی
دو دل دھڑک رہے تھے جنگل کی خامشی میں
اک چشمِ مست کر دے بیگانہ دو جہاں سے
اتنا ہی ظرف تھا بس پیمانۂ خودی میں ؟
اے زندگی عطا کر قیمت اُن آنسوؤں کی
جو ڈبڈبا رہے ہیں اس چشمِ نرگسی میں
آؤ جمیل آؤ اک گیت سنتے جاؤ
نغمے ہیں دو جہاں کے شاعر کی بانسری میں

جب مجھے غزل مل گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا اور بڑے احترام کے ساتھ شکریہ ادا کر کے رخصت ہونے کی اجازت چاہی لیکن یہ اُن کے بے پایاں خلوص و محبت کا شدید جذبہ تھا کہ انہوں نے مجھے جانے کی اجازت نہیں دی اور آمدن بہ ارادت رفتن بہ اجازت کہتے ہوئے فرمایا " سہیل " کے " خاص نمبر " کے سلسلے میں آپ کا کام جب تک مکمل نہ ہو جائے آپ میرے غریب خانہ ہی پر قیام فرمائیں ۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی "

" بات یہ ہے کہ پیر بیگھہ میں [illegible] جہاں میرے قریبی رشتہ دار رہتے ہیں ۔ میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے ورنہ انہیں شکایت ہوگی [illegible]

" ٹھیک ہے لیکن کھانا کھائے بغیر [illegible] نہیں

جا سکتے۔" علامہ نے فرمایا۔ اور میں نے اُن کی مثالی خوش اخلاقی اور شفقت و محبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

ایک کمرے میں دسترخوان بچھ چکا تھا اور میں ——— علامہ جمیل مظہری اور ان کے والد ماجد جناب خورشید حسین صاحب کے ساتھ خورد و نوش میں مصروف تھا کہ یکایک علامہ مرحوم نوکرانی پر محض اس وجہ سے برس پڑے کہ دال میں نمک زیادہ پڑ گیا تھا۔ میں تو کانپ ہی گیا تھا لیکن میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اُن کے والد صاحب بھی کچھ سہمے سہمے سے تھے۔ میں نے سوچا کہ باپ بیٹے کی ناز برداری کرنے کا شاید عادی ہو چکا ہے۔ جب کھانا کھا کر ہم لوگ اٹھ گئے تو پھر باہر کے کمرے میں باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسی اثنا میں مجھے رسالہ "نگار" کے "شاعر نمبر" کا خیال آگیا جو انہیں دنوں شائع ہوا تھا۔ نیاز فتح پوری نے اپنے اس تاریخی نمبر کے لئے خود ہندوستان بھر کے متعدد شعراء کو اپنے بہترین کلام کے ساتھ خود نوشت حالاتِ زندگی بھیجنے کی دعوت دی تھی لیکن میرے لئے یہ بڑی حیرت کی بات تھی کہ اس نمبر میں علامہ جمیل مظہری شریک نہیں تھے۔

"مجھے بے حد تعجب ہے کہ مدیر نگار نے آپ کو دعوتِ نگارش کیوں نہیں دی؟ آپ کے بغیر یہ نمبر کسی طرح مکمل نہیں کہا جا سکتا۔" میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"حقیقت یہ ہے کہ میں ہی بھول گیا تھا اور کچھ نہ بھیج سکا"
علامہ مرحوم نے بڑی سادگی سے فرمایا۔

یہ سنتے ہی مجھے اُن کی خود فراموشی کے کئی واقعات یاد آگئے ——— میں نے سنا تھا کہ ایک دفعہ جب علامہ جمیل مظہری کسی دوست کے گھر پہنچے تو پان کی پیک سے داغدار شیروانی جو نہ جانے کب سے نہیں دھلی تھی، اس کی توجہ کا مرکز ہو گئی۔ جب کافی دیر تک میزبان کی نظریں ان کی شیروانی پر گڑی رہیں تو اُن سے نہ رہا گیا اور خفا ہو کر بولے

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ ——— میں یہاں کب سے کھڑا ہوں اور تم ہو کہ مجھے دیکھنے کے بھی روادار نہیں" ———

"بات یہ ہے علامہ ——— کہ آپ سے زیادہ مجھے آپ کی شیروانی میں کشش محسوس ہوتی ہے۔ کبھی آپ نے اپنی شیروانی پر بھی نظر ڈالی ہے؟"

"اچھا۔ اچھا۔ کیا یہ اتنی میلی ہو گئی ہے؟ مجھے تو اس کا خیال ہی نہیں آیا۔" علامہ جمیل مظہری نے اس طرح جواب دیا جیسے ابھی ابھی خواب سے چونکے ہوں۔

ایک دوسرے واقعہ کا بھی لطف اٹھائیے:۔

ایک دن علامہ کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں انھوں نے استنجے سے فارغ ہونا چاہا۔ جلدی جلدی۔ ادھر ادھر دیکھا اور ایک درخت کے نیچے آکر اپنی شیروانی کے بٹن کھول دیے اور بیٹھ گئے ——— بعد میں انہیں محسوس ہوا کہ کہیں کچھ غلطی ہو گئی ہے ——— ورنہ پاجامہ اس طرح تر نہ ہو جاتا۔

"آپ خاص گیا شہر کے ہیں؟" ——— علامہ جمیل مظہری کے اس سوال نے یکایک میرا سلسلۂ خیال توڑ دیا۔

"جی گیا میں مکان ہے لیکن آباؤ اجداد گیا سے قریب موضع پیر بیگہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہی پیر بیگہ جہاں کے شاہ باقر حسین باقر کو مرزا غالب سے تلمذ حاصل تھا"
میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب" ——— علامہ نے خوش ہو کر کہا۔

"اچھا اب اجازت دیجئے"

"پھر کبھی پٹنہ آنا ہو تو ضرور ملئے گا"

"انشاء اللہ"

اور اس کے بعد میں اُن کی قیام گاہ سے باہر

دوسری ملاقات:

سنہ ۱۹۴۲ء کے اواخر کا زمانہ تھا۔ میں کلکتہ میں ایک باوقار فلمی ادارہ فضلی برادران لمیٹڈ سے منسلک تھا۔

ایک دن حسب معمول میں اپنی جائے رہائش سے شام کی تفریح کے لیے "چورنگی" کے بخشت آگیں علاقہ کی طرف جا رہا تھا کہ ٹیپو سلطان کی مسجد کے قریب دوسرے تلا اسٹریٹ پر بالکل خلاف توقع علامہ جمیل مظہری کو دیکھ کر میرے دل میں خوشی کی ایک لہر سی پیدا ہو گئی ——— بجلی کی طرح یہ خیال بھی میرے دماغ میں دوڑ گیا کہ اسی کلکتہ میں انھوں نے میٹرک سے ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ کلکتہ تھا، اور آغا حشر کی شہرت کے علاوہ علامہ جمیل مظہری کی شاعری کے ڈنکے بھی یہیں بج رہے تھے اور اسی کلکتہ کی ادبی دنیا نے انہیں علامہ بنایا تھا ——— وہ سامنے سے اس طرح کھوئے کھوئے چلے آ رہے تھے کہ دفعتاً مجھے اُن کا ایک شعر یاد آگیا:

میں چلتا مظہری اپنی دھن میں
بتوں نے بلایا خدا نے پکارا

جب وہ قریب آگئے تو میں نے لپک کر انہیں سلام کیا۔ لیکن اُن کے چہرے کے آثار بتا رہے تھے کہ وہ مجھے پہچان نہیں رہے ہیں اور پہچاننے کی ایک اضطرابی کوشش فرما رہے ہیں ———

"آپ مجھے بھول گئے — میں قیصر عثمانی ہوں"۔

یہ کہنا تھا کہ علامہ جمیل مظہری نے بے تحاشہ مجھے بیچ سڑک پر اپنے گلے سے لگا لیا اور کہا "بھئی آپ کا نام تو میرے دل پر نقش ہو چکا ہے"۔

وہ مجھے لپٹائے ہی ہوئے تھے کہ کسی راہ گیر نے ہم دونوں کو بڑی تیزی کے ساتھ ایک طرف گھسیٹ لیا۔ اگر اس فعل میں تھوڑی سی بھی تاخیر ہو جاتی تو اُس دن کلکتہ کی تیز رفتار ٹرام کی زد میں آکر شاید ہم دونوں کو ایک ساتھ جان سے ہاتھ دھونا پڑتا۔

کچھ دن بعد اردو کے ایک اور جلیل القدر شاعر حضرت پرویز شاہدی سے جب سرراہے کلکتہ میں ملاقات ہو گئی تو میں نے باتوں باتوں میں اپنی نظم بیوہ کے متذکرہ بالا شعر پر علامہ جمیل مظہری کے تڑپ جانے کا واقعہ سنایا۔ مجھے انھوں ہی سے یہ معلوم ہوا کہ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ سنہ ۱۹۳۲ء میں اُن کی ایک بہن کم سنی ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ علامہ جمیل مظہری کے دل پر اس کا بے حد جذباتی اثر ہوا اور اس خیال سے کہ بہن کو اپنی بیوگی اور بے چارگی کا احساس نہ ہو انھوں نے چالیس سال کی عمر تک شادی نہیں کی۔

یہ المناک واقعہ سن کر میری آنکھیں نم ہو گئیں

تیسری ملاقات:

یہ بات ہے سنہ ۱۹۴۳ء کی۔ کلکتہ میں جاپان کی بمباری کا خدشہ بڑھتا جا رہا تھا اس لئے اکتوبر ۱۹۴۲ء میں فضلی برادران کے ساتھ میں بمبئی آگیا تھا اور پبلسٹی آفیسر کے عہدے پر مامور تھا۔ ایک دن جب میں دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ حسنین صاحب (فلم ساز و ہدایت کار ایس۔ ایف حسنین) کے کمرے میں حضرت جوش ملیح آبادی اور علامہ جمیل مظہری تشریف فرما ہیں۔ تھوڑی دیر بعد مجھے کسی ضرورت سے حسنین صاحب کے کمرے میں جانا پڑا۔ میں جب وہاں پہنچا تو اس وقت جوش صاحب علامہ جمیل مظہری کی شاعرانہ عظمت پر روشنی ڈال رہے تھے۔ حسنین صاحب نے مجھے دیکھتے ہی جمیل مظہری صاحب پر نظر ڈالی اور ارشاد فرمایا "آپ انہیں جانتے ہیں؟ یہ بھی بہار کے ہیں"۔

علامہ جمیل مظہری نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر میں

نے محسوس کیا کہ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

"یہ ہیں قیصر عثمانی۔ ہمارے پبلسٹی آفیسر" حسین صاحب نے کہا اور علامہ جمیل مظہری کرسی سے اٹھ کر فوراً بغل گیر ہو گئے ——— اپنے باس کی موجودگی میں علامہ جمیل مظہری کا مجھے اس طرح گلے لگا لینا کچھ عجیب سا لگا اور میں کوئی بہانہ کر کے کمرے سے باہر چلا آیا۔ اس کے بعد علامہ جمیل مظہری کی بمبئی میں آمد سے متعلق ایک خبر تحریر کی اور مقامی اخبارات تک پہنچا دی ——— خبر چھپ گئی لیکن علامہ جمیل مظہری کے اعزاز میں نہ کسی ادبی انجمن نے کوئی جلسہ منعقد کیا اور نہ کہیں کوئی مشاعرہ ہی ہوا ——— اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ علامہ جمیل مظہری نہ محفل کے آدمی تھے اور نہ مشاعرے کے شاعر ——— وہ تو بس خود کو ہر دم بے خودی و بے نیازی کے خول میں چھپائے رکھتے تھے۔ وہ قطعاً ان آدمیوں میں نہیں تھے جو اپنی ترقی شہرت کے لئے تمام دنیاوی ہتھکنڈے استعمال کرنا اچھی طرح جانتے ہیں۔

چوتھی ملاقات:

چونکہ دفتر میں ملاقات بہت تشنہ رہی تھی۔ میں دوسرے دن ان کی قیام گاہ پر گیا اور کافی دیر تک گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہا۔ مجھے اُن سے وہیں معلوم ہوا کہ وہ بمبئی تلاش روزگار میں آئے ہوئے ہیں اور اُس دن حضرت جوش ملیح آبادی انہیں حسین صاحب کے پاس اسی غرض سے لے گئے تھے لیکن بات شاید اس لئے نہیں بنی کہ وہاں پہلے سے علامہ آرزو لکھنوی گیتوں اور مکالموں کا شعبہ سنبھالے ہوئے تھے "مگر آپ تو مولانا ابوالکلام آزاد کی سفارش پر حکومت بہار کے محکمہ نشر و اشاعت میں ڈائرکٹر آف پبلسٹی مقرر ہوئے تھے.. پھر آپ کو بمبئی کیوں آنا پڑا؟" میں نے دریافت کیا ———

"قیصر صاحب ——— بات دراصل یہ ہے کہ جب ۱۲ اگست ۱۹۴۲ء کو جب گاندھی گرفتار کر لئے گئے تو میں نے اپنا استعفیٰ داخل کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شہیدوں کے خون کی روشنائی میں اپنا قلم ڈبو کر حکومت برطانیہ کی پبلسٹی کرتا رہوں ——— میں اس سلسلے میں گرفتار بھی کر لیا گیا تھا۔"

یہ سن کر دفعتاً میرے ذہن میں علامہ جمیل مظہری کا یہ شعر شور مچانے لگا: ؎

وہ لاکھ جھکوائے سر کو میرے مگر یہ دل اب نہیں جھکے گا
کہ کبریائی سے بھی زیادہ مزاج نازک ہے بندگی کا

پانچویں اور آخری ملاقات:

ایک تقریب میں شرکت کے لئے مجھے جب نومبر ۱۹۷۱ء میں گیا جانا پڑا تو حسب معمول میں پٹنہ بھی گیا۔ بمبئی سے جب یہ معلوم ہوا کہ علامہ جمیل مظہری پٹنہ ہی میں ہیں تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ اس سے قبل میں جب بھی اُن سے ملنے کے لئے پٹنہ گیا تو مجھے یہی اطلاع ملی کہ وہ کلکتہ میں ہیں جہاں اُن کے بھائی پروفیسر رضا مظہری صاحب رہتے ہیں۔ یہ اتفاق تھا کہ وہ اس مرتبہ پٹنہ ہی میں مقیم تھے۔ میں نے کسی سے اُن کا پتہ لیا اور مکان کی تلاش شروع کر دی۔ وہ اُن دنوں محلہ افضل پور میں رہتے تھے جہاں پہنچ کر میں نے ایک پان والے سے دریافت کیا تو اس کی ہدایات کے مطابق میں ——— مین روڈ سے دائیں طرف کو جانے والی ایک گلی میں داخل ہو گیا اور پھر تھوڑا سا راستہ طے کر کے ایک دوسری پتلی گلی میں گھس گیا جہاں ایک کہنہ و خستہ سی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا ——— یکایک

اُس دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آیا جس پر "شیعہ وقف کمیٹی" کی تختی لگی ہوئی تھی ——

میرے دل نے کہا علامہ جمیل مظہری ضرور یہیں رہتے ہوں گے اور میں نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دروازے کے دونوں پٹ کھلے تو دیکھا کہ علامہ جمیل مظہری خود بہ نفس نفیس ایک میلی سی روئی بھری صدری پہنے کھڑے ہیں۔

"ارے قیصر عثمانی صاحب، کب آئے بمبئی سے؟ —— اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر مجھے اسی گرم جوشی کے ساتھ اپنے سینے سے لگا لیا ——

"یا اللہ — یہ کیا؟" —— وہ علامہ جمیل مظہری جو سال دو سال کی قلیل مدت میں میری شکل بھول جایا کرتے تھے —— آج تقریباً چھبیس[26] ستائیس سال کے بعد مجھے دیکھتے ہی کیسے پہچان گئے؟

—— یہ اتنا بڑا انقلاب کیسے آیا؟ —— کیا یہ پیرانہ سالی میں حافظہ کمزور ہونے کی بجائے اتنا مضبوط ہو جاتا ہے؟ — میں اسی حیرت و استعجاب میں ڈوبا ہوا علامہ کے ساتھ ایک چھوٹا سا آنگن پار کر کے جب ایک تنگ و تاریک کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں پہلے سے ایک صاحب تشریف فرما ہیں۔ علامہ جمیل مظہری نے اُن سے میرا تعارف کرایا — وہ غالباً پٹنہ سٹی کے کوئی نواب تھے اور شاعر بھی — شاید غضنفر نام تھا اور تخلص دانش —— علامہ جمیل مظہری جو اب بہت ضعیف نظر آ رہے تھے ہم دونوں سے باتیں کرتے جا رہے تھے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ کاش وہ ہندوستان میں پیدا نہ ہوتے — یہ ملک کتنا عجیب ہے جہاں ایرے غیرے نتھو خیرے تو بڑے بڑے بنگلوں میں عیش و آرام کی زندگی گذارتے ہیں لیکن دنیا بھر میں علم و فضل کی روشنی بکھیرنے والا شاعر ایک ایسے کمرے میں رہنے پر مجبور ہوتا ہے جہاں تاریکی ہی تاریکی ہے۔

علامہ جمیل مظہری کی نظریں مجھ پر ایسے گڑی تھیں اور میں یہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ زبانِ حال سے مجھے اپنا ہی ایک شعر سنا رہے ہوں ——

کہو نہ یہ کہ محبت ہے تیرگی سے مجھے
ڈرا دیا ہے پتنگوں نے روشنی سے مجھے

جب میں نے چائے پیتے پیتے علامہ جمیل مظہری سے اُن کی کسی نئی تصنیف کے بارے میں دریافت کیا تو اُنھوں نے پلنگ کے ایک کونے سے ایک چھوٹی سی کتاب "مثنوی آب و سراب" اٹھائی۔ اس کے سادہ صفحے پر کچھ تحریر فرمایا اور بڑے پیار کے ساتھ میرے حوالے کر دی۔ اس کے بعد میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور جانے کی اجازت چاہی۔

جب علامہ جمیل مظہری مجھے دروازے تک چھوڑنے کے لئے پلنگ سے اٹھے تو مجھے یہ محسوس کر کے بے حد دکھ ہوا کہ اس مرتبہ وہ نہ صرف ضعیف و ناتواں بلکہ حد درجہ بجھے بجھے بھی نظر آ رہے تھے ——

دروازے کے باہر جب میں نے گلی میں قدم رکھا تو علامہ جمیل مظہری کا یہ شعر میرے کانوں میں گونج رہا تھا ——

ہر روح تاریکیوں میں حیراں بھٹکا ہوا ہے جیسے غبارِ منزل
کہیں سرِ راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا

علامہ جمیل مظہری نمبر

کیلئے

بصد خلوص

نیک خواہشات کیساتھ

سلیم انصاری

ڈاکٹر ق اعظم ہاشمی

جمیل مظہری اپنے دورِ آخر میں

جمیل مظہری دورِ جدید کے ان ممتاز شاعروں میں ہیں جن کی فکر و نظر کی انفرادیت اور امتیازی شعری آہنگ کی شناخت کے لئے قاری کو زیادہ دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ وہ بھی تشکیک و تردد اور بے عقیدگی کی گود کے پروردہ ہیں۔ چونکہ کسی مخصوص نقطۂ نظر کا سہارا انہوں نے نہیں لیا، اسی لئے فطری طور پر ان کے اندر یہ احساس موجزن رہا کہ "اپنے گھر کی راہ" تو گم ہوئی ہی تھی، "خدا کا گھر" بھی نہ مل سکا۔ اس احساس نے ان کی فکر کو جلا بھی بخشی اور اسے سوز و آرزو سے بھی بھر دیا۔ چنانچہ دردمندانہ احساسات اور لطیف معنویت کی جو روشنی کلامِ جمیل میں ملتی ہے، اس سے بیشتر ہمعصروں کا شعری دامن خالی ہے۔ اس کے باوجود جمیل مظہری کی شاعری اربابِ نظر کی بے اعتنائی کی شاکی ہے۔ Gerffrey Catterell نے ادیبوں کے سلسلے میں پائے جانے والے تاثرات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

In America only the successful writer is important, in France all writers are important, in England no writer is important, And in Australia you have to explain, what writer is?

ہندستان میں ادیبوں اور شاعروں کے سلسلہ میں جو تصورات عام ہوئے ان سے ہم سب واقف ہیں۔ "پدم شری" قسم کے شاعروں کی صف میں شامل ہونا ہمیں ظاہر ہے کہ کبھی منظور نہ تھا، ان ضیافتوں اور جھوٹی عزت افزائیوں سے بھی وہ محروم رہے جو شاعروں کے انتقاد سے پہلے تک دیکھنے میں آتی ہیں اور چونکہ کسی نقطۂ نظر کا لبادہ بھی انہوں نے نہیں اوڑھا اس لئے "حلقۂ احباب" کی تحسین و آفریں کے لطف سے بھی کنارہ کش رہے۔ وہ اپنے اردگرد سے تمام عمر ناراض بھی رہے اور خائف بھی۔ اور پناہ کی راہ شاعری میں تلاش کرتے رہے۔ انکی یہ جستجو ایسی ہی اضطراب آمیز تھی جیسی پنجرے میں کسی زخمی پرندے کی تڑپ۔ اس اضطرابِ فکر و نظر سے انکی نجات، انتقال کے بعد ہی ہو سکی۔ اور انتقال کے بعد بھی جمیل مظہری کی شاعری ناقابلِ توجہی بنی رہی۔ اسلاف سے اخلاف کی بے تعلقی کے خلا کو پُر کرنے کے لئے ہمارے پیشِ نظر رسمی نوعیت کے بس وہ چند تعزیتی جلسے ہیں جو بہار کے بعض علاقوں میں منعقد ہوئے ہیں

بڑے سلیقے سے ٹوٹا ہے ایک رند کا جام
کہ انجمن میں صدائے شکستگی بھی نہیں

جمیل مظہری نے شاعری کی مختلف صنفوں بالخصوص نظم، غزل اور مثنوی میں اپنی قادرالکلامی اور تخلیقی بصیرت کا کمال دکھلایا ہے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "نقشِ جمیل" ۱۹۵۳ء میں اور غزلوں کا مجموعہ "فکرِ جمیل" ۱۹۵۰ء میں طبع ہو سکے۔

مثنوی "آب و سراب" انہوں نے [illegible] میں تصنیف کی۔ چند برسوں کے بعد یہ کتاب چھپ کر منظر عام پر آگئی۔ اس کے بعد گذشتہ بیس برسوں میں انہوں نے جو تخلیقات پیش کیں، وہ یا تو رسائل میں ہیں یا ان کی بیاض میں جو جناب رضا مظہری کی تحویل میں ہے۔ شائع شدہ مجموعوں کے بعد کا کلام اس اعتبار سے زیادہ اہم اور لائق توجہ ہے کہ عمر کے اس آخری حصے میں ان کے انداز فکر اور طرز احساس میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ ابتدا سے [illegible] وہ ایسے متشکک حساس شاعر نظر آتے ہیں کہ "وجودِ خدا" کو بھی آذر صفت انسان کی صنم تراشی قرار دیتے ہیں اور "خدا" کے روایتی تصور سے بیزاری کا احساس کرتے ہیں۔ وہ اسے انسان کی اپنی "بے بسی اور بے چارگی کی خود ساختہ پناہ گاہ" سمجھتے ہیں ؎

وہیں تک خودی ہے، وہیں تک خدا ہے
جہاں بے کسی ڈھونڈتی ہو سہارا

آذری بھی حیراں ہے اس صنم تراشی پر
سو بتوں کو جوڑا ہے، اِک خدا بنایا ہے

تھی وہ شاید اپنی ہی بے چارگی کی اِک پکار
جس کو اپنی سادہ لوحی سے خدا سمجھا تھا میں

انتقال سے دو سال پہلے جب جمیل مظہری علیل ہوئے اور گویا بستر مرگ پر فراش تھے تو اس وقفے میں ان کے فکر و احساس نے جو کروٹ لی، اسے ملاحظہ فرمائیں ؎

پھاند کر زنداں سے اپنے تیز پا جاتا ہوں میں
چار دیوارِ عناصر پھاندتا جاتا ہوں میں
جھاڑ کر دامن سے ہر گرد و غبارِ زندگی
پھاڑ کر یہ جسم خاکی کی قبا جاتا ہوں میں
ٹوٹتے جاتے ہیں اوہام و عقائد کی طلسم
پردہ ہائے نور و ظلمت پھاڑتا جاتا ہوں میں
میرے ہی نغمات ہیں جو مجھ سے آگے جا چکے
ان کی لہروں کے تلاطم میں گھرا جاتا ہوں میں
اپنی آنکھوں پر تو ظاہر ہو رہا ہوں دوستو!
غم نہیں جو سب کی آنکھوں سے چھپا جاتا ہوں میں
دیدۂ اہلِ نظر اور اپنے فن کے درمیاں
میں تھا اِک بیرنگ پردہ سو اٹھا جاتا ہوں میں
ہر قدم اٹھتا ہے اِک احساسِ آزادی کے ساتھ
مسکراتا، گنگناتا، جھومتا جاتا ہوں میں

وہ جہنم ہو کہ جنت، دونوں ہی دارالشفا، دوسرے کیوں ہوں، سوئے دار الشفا جاتا ہوں میں، اپنی آنکھوں پر انکشاف کے اس عمل نے جمیل مظہری کی فکری تشکیک اور بے عقیدگی کو دور کر دیا۔ لب و لہجہ میں جو یقین و اعتماد یہاں موجود ہے، اس سے "اقرارِ خدا" کی وضاحت بھی ہوتی ہے اور اس کی مطلق قدرت کا اعتراف بھی سامنے آتا ہے۔ ان کے نزدیک "خدا" دنیاوی بادشاہوں سے بالکل الگ تھلگ ایک ایسی قوت ہے جو مرکزِ رحم و کرم اور منبعِ الطاف و عنایات ہے۔ شفقتوں اور محبتوں کا ایک بحرِ ذخار ہے حتیٰ کہ اس نے جنت و جہنم کی تخلیق بھی اپنے بندوں سے بے پناہ "جذبۂ محبت" کے زیرِ اثر کی ہے۔ یہ "مریض بندوں" کی شفا و صحت کے مراکز ہیں۔ ان کی یہ نظم جس کا عنوان ہے "میں خدا کے حضور میں" انتقال سے تین ماہ قبل کہی گئی۔ اس نظم میں انہوں نے روایتی اور رسمی مذاہب اور عقائد سے اپنے انحراف کی وضاحت خود کی ہے۔ انحراف کے اسباب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ نظم ملاحظہ فرمائیں ؎

حاضر ہوں ترے سامنے رنجور و پریشاں
ناکارہ ہوں، کیوں کر کہوں مجھ سا نہیں ہیں

لیکن مجھے تجھ سے نہیں اندیشۂ نقصاں
ترسیدہ و لرزیدہ و مرعوب نہیں ہوں
تو حاکمِ قہّار نہیں، تُو تو خدا ہے
واعظ جسے کہتا ہے سزا وہ بھی جزا ہے

یہ سچ ہے کہ میں منکرِ ادیان تھا لیکن
حق یہ ہے کہ انکار مرا تیرے لئے تھا
ہر شرع نے کچھ تجھ پہ کئے ظلم و کم و بیش
میں جملہ مذاہب سے خفا تیرے لئے تھا

ہر دیں تجھے انسان سمجھتا رہا مالک
ہر دیں سے مرا ذہن الجھتا رہا مالک

اے خالقِ کل تجھ کو میں سمجھا کیا خالق
ہم صورتِ مخلوق بنایا نہیں تجھ کو
بٹھلایا نہیں میں نے تجھے تختِ شہی پہ
میں نے کبھی معشوق بنایا نہیں تجھ کو

میں تجھ کو سمجھتا رہا اک باپ محض باپ
طاعتِ غلامانہ کو اک پاپ مہا پاپ

گو دل کے تقاضے سے جھکایا کبھی سر کو
ہمت نہ رکھی تجھ پہ عبادت طلبی کی
ہوتی رہی جو دیر و کلیسا و حرم میں
وہ تیری پرستش کہ پرستش تھی خودی کی

عقل ان کی تھی کچی کہ مرا ذہن تھا کچا
اقرار وہ سچا کہ یہ انکار تھا سچا

یہ "باپ"، "تثلیثی باپ" نہیں ہے، اسکے پس منظر میں ایک "خالقِ کل" کا مفہوم ہے جو محبت و مروت، رحم و کرم، جود و سخا، اور شفقت و عنایت کا ایک بے پایاں سمندر ہے اور جو قہر و جبر کے بمقابلہ امن و سکون کا وسیلہ ہے۔ ایسے وجود کا کھوکھلی پرستش شاعر کے نزدیک مستحسن نہیں ہے۔ مادی اور عارضی زندگی کی بے معنویت کا اظہار جمیل مظہری کی ایک اور نظم "گور رسیدہ" میں ہوا ہے۔ یہ نظم انتقال سے ۲/۱ ۲ ماہ قبل انہوں نے کہی تھی۔ [illegible] کے قریب تر آجانے کا احساس بے حد نمایاں ہے [illegible] ہو سے

کب سے ہے شوقِ سفر، ذہن پہ طاری اے دوست
چار کاندھوں کی کب آئیگی عماری اے دوست
کیا سوال اپنے جنازے کے سبک ہونے کا
زندگی میں ہی، مری لاش ہے بھاری اے دوست

یہ زحمتِ جانوش سے ان سے پوچھو
جو اٹھائے ہیں اسے دوش سے ان سے پوچھو
وہی بتلائیں گے کتنی ہے گرانی میری
ذہن طفلانہ، طبیعت خفقانی میری
مختصر یہ ہے کہ بچپن تو پلٹ کر آیا
اور پلٹی نہ گھڑی بھر کو جوانی میری

اپنی عادات سے دیدہ نہ شنیدہ ہوں میں
قبر ہے ہے مرا گور رسیدہ ہوں میں
وقت وہ ہے کہ عناصر کا گھروندا ٹوٹے
وقت وہ ہے کہ خدا کا یہ کھلونا ٹوٹے
وقت وہ ہے کہ بکھرے یہ طلسماتِ خودی
وقت اب وہ ہے کہ ہر خوابِ تمنا ٹوٹے

لیک ہر سلسلۂ بیم و رجا ختم ہوا
فطرتِ شعبدہ گر کھیل ترا ختم ہوا
اب کھلا یہ کہ تماشائے نظر کچھ بھی نہیں
رنگ و بو کچھ بھی نہیں برق و شرر کچھ بھی نہیں
ظلمت و نور کی ہر شعبدہ گری جھوٹی تھی
حلقۂ معتبرِ شام و سحر کچھ بھی نہیں

عرصۂ چند میں ٹھہرے تھے کہ جاگے تھے ہم
حرکتیں خواب کی تھیں خواب میں جاگے تھے ہم

کیوں ڈروں موت سے یہ سِرِّ نہاں کیا ہے جمیل
آگ دوزخ کی پئے سوختہ جاناں کیا ہے جمیل
جو بلندی کا مسافر ہو نظر میں اُس کی
اِک خیاباں ہے سرِ راہ جناں کیا ہے جمیل

چند کے گُل پھول نکل آئیں گے اس گلشن سے
کیا مسافر کو تعلق ہو کسی مسکن سے

دانشِ حاضر نے انسان کی مادی ترقی اور روحانی زوال کو ایک ایسے نقطے پر مرتکز کر دیا ہے جہاں کرب ناک سوالوں کا ڈھیر تو ہے، داخلی خلاؤں کو منوّر کرنے کا کوئی وسیلہ نہیں۔ زندگی کی عصری لہروں میں انسان کی اپنی معنویت گم ہو کر رہ گئی ہے۔ جمیل مظہری آخر عمر میں اسی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے کہ یہ گم شدہ معنویت خدا سے کنارہ کشی اختیار کر لینے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو ارتقا کی راہوں میں "بندگی" کو ایک ذلت تصور کیا تھا اور حق تعالیٰ کی ذات کو "ہوسِ اختیار" کا گڑھا ہوا معیار بتلایا تھا، لیکن دورِ آخر کی نظموں میں اپنی اس "فکری تشکیک" پر وہ "نادم" دکھائی دیتے ہیں۔ ہر چند کہ جمیل مظہری کہتے ہیں کہ:

● خوف سے کیوں تھرتھراؤں، ڈر سے کیوں کانپوں جمیل

اور —

● ترسیدہ و لرزیدہ و مرعوب نہیں ہیں

اور —

● کیوں ڈروں موت سے یہ سِرِّ نہاں کیا ہے جمیل

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حجاب دامن گیر ہے ؎

حاضر ہوں ترے سامنے رنجور و پشیماں
ناکارہ ہوں، کیوں کر کہوں محجوب نہیں ہیں

ان نظموں کے مطالعے اور جائزے سے جمیل مظہری کے تغیر پذیر اندازِ فکر کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ یقین کی اس روشنی تک ان کی رسائی ہو چکی تھی جو تشکیک کے اندھیروں کو دور کر دیتی ہے۔ خدا کے وجود کو انہوں نے صرف ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا بلکہ پوری شدت سے اسے محسوس کیا تھا۔ چنانچہ ان کے تصوّرات پر ان کے اس احساسِ نو کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ اور انہوں نے اپنے پورے وجود کو خود سپردگی کی کیفیت سے سرشار ہو کر خالقِ کائنات کے آگے ڈال دیا تھا۔

ختم شد

جمیل مظہری کی نظموں میں رنگِ تفکّر

ڈاکٹر فاروق صدیقی

جمیل مظہری کی شاعرانہ عظمت محتاجِ تعارف نہیں۔ مگر ان کی شاعری کے بہت سے گوشے اب بھی تشنۂ توجہ ہیں۔ جمیل کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان کی شخصیت پر کچھ اچھے مضامین لکھے جاتے ہیں مگر فن سے متعلق تنقیدی مضامین و مقالات ناکافی ہیں۔ اردو کے قدرِ اوّل کے ناقدین میں صرف خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم نے ان کے فن پر ایک جامع اور پُرمغز مقالہ تحریر کیا ہے اور نہایت اخلاص دیانت داری کے ساتھ ان کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ "سہیل" کے "جمیل نمبر" حصہ اوّل میں احتشام حسین صاحب کا مضمون جمیل مظہری کے فقط ایک پہلو پر وہ بھی ادھوری روشنی ڈالتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم جیسا سنجیدہ، وسیع النظر اور بالغ النظر نقاد بھی جب جدید غزل پر اظہارِ خیال کرتا ہے تو فراق و فیض پر کئی صفحات سیاہ کر ڈالتا ہے مگر جمیل کا ضمناً تذکرہ بھی گوارا نہیں کرتا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جمیل کے ہم عصر شعراء میں جوش، اختر شیرانی، جگر، حفیظ، ساغر، احسان دانش تو کجا فراق و فیض بھی خالص ادبی و فنی اعتبار سے ان کے مقام کو نہیں پہنچتے۔ یہ میرا حسنِ ظن یا جوشِ عقیدت یا نعرۂ مستانہ نہیں۔ نیاز و مجنوں جیسے اکابرینِ ادب کا بیان ہے کہ جمیل سے نیچے دوم درجہ کی چیز نہیں کہی۔ اس کے باوجود ہمارے معتبر ناقدین کا جمیل کے ساتھ ایک طرح کا معاندانہ رویہ افسوسناک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مفکر شاعر کی حیثیت سے

برصغیر ہند و پاک میں علامہ اقبال کے بعد سب سے قد آور شخصیت جمیل مظہری کی ہے ان کے ہم عصروں میں جوش، فیض اور فراق یہ تین نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک زمانہ میں جوش اعظم کی شاعروں کا بڑا شہرہ تھا۔ ان کی شاعرانہ بلند آہنگی اور شوکت و طنطنہ کی دھوم تھی۔ مگر وقت سب سے بڑا نقاد ہوتا ہے۔ آج ثابت ہو چکا ہے کہ ان کی شاعری ڈھول کا پول کے علاوہ کچھ نہیں۔ ریت محل کی طرح ان کی شاعری کا قصرِ بلند ان کی زندگی میں ہی زمین بوس ہو گیا۔ فیض کی شاعری میں یقیناً دم خم ہے اور وہ اپنے اندر لازوال محاسن رکھتی ہے۔ مگر انکی ادبی شہرت و مقبولیت بھی تمام تر ترقی پسند تحریک کی مرہونِ منت ہے۔ فراق کی شاعری بھی اس بلند آفاقی تصور سے محروم ہے جو کسی فن کار کو یگانۂ روزگار اور لافانی بناتا ہے۔ ہاں جسم و جمالیات کی دلکش مصوری کی حد تک وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

ان شعراء کے برعکس جمیل کے یہاں ایک مخصوص فلسفۂ حیات ہے اور یہ فلسفۂ حیات کہیں سے مستعار نہیں نہیں بلکہ ان کے اپنے ذاتی فکر و تدبر کا نتیجہ ہے۔ وہ حیات و کائنات کے متعلق اپنا ایک مخصوص اندازِ نظر رکھتے ہیں۔ ان کا کمالِ فن یہ ہے کہ فلسفیانہ افکار و خیالات کا اظہار کرتے وقت رعنائیِ خیالات، تغزل، لطافت اور شعریت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ فلسفیانہ خشکی اور سپاٹ پن کا انکے یہاں گزر نہیں ——— ان کے فکر و فلسفہ کی اساس

عظمتِ آدم اور تصوّرِ حرکت و عمل پر ہے ـــــــ اُردو شاعری کو سب سے پہلے علّامہ اقبال نے ان فلسفوں سے روشناس کرایا۔ جمیل نے اپنے مرشدِ فن کے تتبع میں عظمتِ آدم کے ترانے گائے ہیں مگر انہوں نے اقبال کی طرح اپنی فکر کو کسی مخصوص آئینِ مذہب و ملّت کا پابند بنانے کے بجائے اس کا سرا عام تصورِ اخلاق سے جوڑ دیا ہے اور یہی ان کی عظمت و انفرادیت کی دلیل ہے۔

جمیل نے اپنی جن نظموں میں فلسفۂ عمل پیش کیا ہے اور انسان کی ذات میں بے پایاں امکانات کا جائزہ لیا ہے ان میں پیام، آدمِ نَو کا ترانۂ سفر، فسانۂ آدم، شاعر کی تمنّا، ارتقا، میں اور تو، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان نظموں پر اقبال کی فکر کا گہرا پرتو نظر آتا ہے۔ مگر فن کارانہ سطح پر جمیل نے اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "پیام" ملاحظہ ہو۔ یہ حرکت و عمل کے موضوع پر ایک ایسی حسین تخلیق ہے اس میں فلسفہ اور شعریت کا دلکش امتزاج ان کی پختگیٔ سخن پر مہرِ توثیق ثبت کر رہا ہے۔ اس کا واعظانہ یا مصلحانہ انداز بھی نہیں اس کے باوجود یہ جوشِ عمل سے لبریز ہے، فقط دو بند ملاحظہ ہوں ؎

جُز سعیٔ دوام اور کیا ہے ــ شاعر کا پیام اور کیا ہے
یعنی اس میکدے کی رونق ــ جُز گردشِ جام اور کیا ہے
انسان کا کام اور کیا ہے

کوشش میں راز نظمِ ہستی ــ جنبش ہے دلیلِ زندگانی
... ننگِ وجودِ آدمی زاد ــ پانی میں اگر نہ ہو روانی
پانی کو کون کہے گا پانی

اور "آدمِ نَو کا ترانۂ سفر" ہے اس میں جمیل نے انسان کو طاقت و قوت کا سرچشمہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اس کی خود اعتمادی اور بلند نظری اس کو ایک جہانِ نو کی تعمیر و تشکیل کے لئے بے چین کرتی ہے۔ وہ جدید علوم و فنون سے بہرہ ور ہے وہ اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر تسخیرِ مہر و ماہ کے نت نئے طریقوں پر غور کرتا ہے اور اپنے وجود کی عظمت کو اجاگر کرنا چاہتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

فریب کھائے ہیں رنگ و بو کے سراب کو پوجتا رہا ہوں
مگر نتائج کی روشنی میں خود اپنی منزل پہ آ رہا ہوں
جو دل کی گہرائیوں میں صبحِ ظہورِ آدم سے سو رہی تھیں
میں اپنی فطرت کی ان خدا داد قوتوں کو جگا رہا ہوں
میں سانس لیتا ہوں ہر قدم پر کہ بوجھ بھاری ہے زندگی کا
ٹھہر ذرا گرمِ رَو زمانے کہ میں ترے ساتھ آ رہا ہوں!
طلسمِ فطرت کبھی مسکراتا ہے میری انسو طرازیوں پر
بہت سے جادو چکا ہوں بہت سے جادو جگا رہا ہوں
یہ مہرِ تاباں سے کوئی کہہ دے کہ اپنی کرنوں کو گن کے رکھ لے
میں اپنے صحرا کے ذرّے ذرّے کو خود چمکنا سکھا رہا ہوں

اسی طرح "فسانۂ آدم" میں انسان کی مادّی اکتسابات و فتوحات کو جمیل بڑی تفصیل کے ساتھ شاعرانہ اسلوب و آہنگ میں پیش کیا ہے ؎

مزاجِ آتشِ سوزاں کو کر دیا ٹھنڈا
مچا دی بزمِ عناصر میں کھلبلی میں نے
لیا شہنشہِ خاور سے روشنی کا چراغ
کیا اسیرِ طبیعت کو برق کی میں نے
یہ انقلابِ طبیعت مزاجِ آہن کو
ہوا کی گرمیٔ پرواز بخش دی میں نے
بلندیوں کا تصوّر بھی رہ گیا پیچھے
پہنچ کر اتنی بلندی پہ سانس لی میں نے
بڑھا تو وہ بھی پیچھے مرا زمانۂ حال
رُکا تو وقت کی رفتار روک لی میں نے

اس سلسلہ کی سب سے اہم نظم "ارتقا" ہے اس میں جمیل نے انسان کو قدرت کا شاہکار قرار دیا ہے۔ ایسا شاہکار

جو اپنی فطری صلاحیتوں اور جذبۂ عمل کی بدولت آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ اس جدوجہد کی راہ میں لغزش بھی رہنمائی کا کام کرتی ہے اور اس کی قوتِ ارادی اُسے صاحبِ کردار بناتی جاتی ہے۔ اس نظم کی شاعرانہ عظمت کا راز بقول نظیر صدیقی یہ ہے کہ اس میں انسان کے ارتقار کو اس کی مادی فتوحات کے بجائے اس کی ذہنی تبدیلیوں اور اخلاقی ترقیوں کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے اس سے اس میں اختصار بھی ہے اور گہرائی بھی۔ تین اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہر حال میں مشیت مجھ کو بنا رہی ہے
میں اس کی قدرتوں کا شہکار بن رہا ہوں

خود اپنی جنتوں کی تخلیق کر رہا ہوں
خود اپنی زندگی کا معمار بن رہا ہوں

یہ جبر و قدر کی اک منزل ہے درمیانی
مجبور تو ہوں لیکن مختار بن رہا ہوں

اس مزاج کی کئی اور بھی نظمیں ہیں۔ جن میں جمیل مظہری نے انسان کی ارضی اور مادی زندگی کی بہبود و بہتری کے سلسلہ میں اپنے خیالات کو افکار کو دردمندانہ احساسات سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے، ان نظموں کے مطالعہ سے اس حقیقت کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ جمیل مظہری نے شعری تجربوں پر فلسفیانہ تصوّرات کو اس طرح حاوی نہیں ہونے دیا ہے کہ جس سے شاعرانہ حسن ماند پڑ جائے۔ یعنی انہوں نے اپنے خیالات و افکار کو اندازِ بیان اور طرزِ کلام کے حُسن سے ہم آہنگ بھی کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گہرے تفکر کے باوجود ان کی شاعری میں خطیبانہ جوش و خروش نہیں ملتا اور نہ مقصدیت کے اظہار نے کہیں سطحی اسلوب اختیار کیا ہے۔ یہ حسنِ توازن دوسرے معاصر شاعروں میں بہت کم ملتا ہے۔ جمیل مظہری کی شاعرانہ انفرادیت و اہمیت کا ایک اہم سبب یہ خصوصیت رہی ہے ٭ ٭ ٭

علامہ جمیل مظہری نمبر

کی اشاعت پر

اراکین ماہنامہ سہیل گیا

کو

ہم گیا واسیوں کی طرف سے

دلی مبارکباد

نرمل کمار سنگھ

ریلوے گڈ شیڈ کے سامنے

آ ٹیشن روڈ گیا   فون [illegible]

ڈاکٹر عبدالقیوم ابدالی

خیالِ جمیل

"تشکیک" ہر بڑے دانشور کا مقدر ہے، کہ تشکیک ہی سے خیالات کے وہ سوتے پھوٹتے ہیں جن پر نئے دور کے اصول، نظریے اور عقائد کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ اپنے دور کے وہ حالات جن سے یہ دانش ور مطمئن نہیں ہوتے، وہ اصول، نظریہ ہائے حیات یا عقائد جو انھیں ادھورے نظر آتے ہیں، انھیں شک میں مبتلا کرتے رہتے ہیں۔ اور شک کا یہ سلسلہ معمولی عقائد اور نظریہ ہائے حیات سے ہو کر دُنیا کی پیدائش اور اس کے پیدا کرنے والے تک پھیل جاتا ہے۔ آدم سے لیکر حضور اکرمؐ تک کے سارے مذاہب، افلاطون سے لیکر مارکس، سارتر تک کے سارے فلسفے، مصری اور یونانی تہذیبوں سے لیکر جدید ترین تہذیبوں تک میں زندگی کرنے کے تمام ضابطۂ اخلاق اسی تشکیک کا نتیجہ تھیں۔ یہاں تک کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے تمام تجربے، ایجادات و مظاہر انہیں شکوک کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ پر شک ہی نے آدم کو گندم سے آشنا کرایا تھا اور شاید اسی کی پاداش میں ان کی اولاد آج تک ہر روز ایک نہ ایک اسرار کا پردہ چاک کر رہی ہے۔

زندگی کی طرح ادب میں بھی "تشکیک" ایک خاص مُتنازع میں جلوہ گر دیکھی جا سکتی ہے۔ جمیل مظہری اپنے شعر و فن

علامہ اقبال کی طرح اپنی "تشکیک" کو اُمتِ محمدیہ کی فلاح کے لئے قربان نہیں کر سکے کہ COMPROMISE سب کے بس کی بات نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے آخری دور کے مضامین "ایک خیال"، "میں مر گیا ہوں"، "ایک شاگرد کے نام"، "خیال کی رَو" میں نہ صرف یہ کہ تمام پرانے اور مروّجہ عقائد و نظریے کو شک کی نگاہ سے دیکھا ہے بلکہ ان کی جگہ ایک بالکل نئے خیال کو پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

اپنے پہلے مضمون "ایک خیال" میں خداوند قدوس سے متعلق انہوں نے جو خیالات بیان کئے ہیں کہ:

"تمہارا سب سے بڑا گناہ تمہارا یہی عقیدہ ہے کہ اس پیدا کرنے والے نے تمہیں اپنی پوجا کے لئے پیدا کیا ہے۔ نہیں اس نے تمہیں غلامی کے لئے نہیں اپنی نیابت کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ عادتِ قبیح تمہاری تم سے اس کی نیابت نہیں چاکری کروا رہی ہے، خالقیت نہیں مخلوقیت سکھا رہی ہے۔

تمہاری تربیت کے لئے مجھ سے پہلے جو لوگ آئے انہوں نے تمہیں ضرورتاً اس سے ڈرایا جیسے مائیں بچوں کو ڈراتی ہیں اور جھوٹے وعدوں سے اسی طرح بہلایا جیسے مائیں اپنے نادان بچوں کو بہلاتی ہیں۔ لیکن اب جبکہ تم عقلاً بالغ نہ سہی لیکن پھر بھی اپنے گہواروں سے باہر نکل آئے ہو، میں تم سے کہتا ہوں تم خدا سے نہ ڈرو، نہ تم خدا کی عبادت کر کے خدا کی توہین کرو۔ تمہاری نمازیں اور تمہاری پرستش خدا کی سب سے بڑی توہین ہیں، اس لئے سب سے بڑا گناہ اور سب سے گھناؤنا پاپ، مہاپاپ اور کھلا ہوا ظلم

اپنی ذات پر بھی اور اپنے خدا پر بھی تم سب
سے بڑا ظالم ہو اور ظالموں کی اس دنیا میں
خدا سب سے بڑا مظلوم ہے"

ممکن ہے کہ بعض مولوی حضرات کو اُن کے اِن خیالات میں اُن قرآنی آیات کا عکس نظر آجائے، جن میں فرشتوں کے ذریعہ خدا سے تخلیقِ آدم کی وجہ پوچھے جانے پر اور یہ کہے جانے پر کہ کیا تیری تسبیح و عبادت کے لئے ہم کافی نہ تھے کہ تجھے اس کی تخلیق کرنی پڑ رہی ہے؟ خدا نے جواب دیا تھا کہ "بے شک تم وہ نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں" یا پھر وہاں جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ زمین کے لئے خلیفہ پیدا کرنا چاہتا ہے" یا پھر اس جگہ جہاں انسانوں کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ وہ ان کی عبادتوں کا محتاج نہیں۔ یا پھر یہ کہ "میں نے تمہاری ضرورت کے لئے زمین بنائی تاکہ تم اس پر چل پھر سکو اور اپنے لئے کھانے کی چیزیں اس میں سے پیدا کرو (یعنی جہانِ نو کی تخلیق میں میرا ہاتھ بٹاؤ)۔ لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ علامہ، خداوندِ قدوس کے ان صفات اور اس کے تئیں بندوں کے ان فرائض سے قطعاً متفق نہیں ہیں جن کی تعلیم مختلف رسول، آئمہ، علما اور مشائخ دیتے آرہے تھے۔ خداوند کریم کی ذات سے انکار نہ کرنے کے باوجود وہ ان کی اس پرانی تصویر کے قائل نہیں ہیں جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی ہے۔

خدا کے بعد ہر مذہب میں سب سے اہم مسئلہ "شیطان" یا "ابلیس" کا ہے۔ یہ انسانوں کے ازلی دشمن، راندۂ درگاہ، یزداں اور برائی کی طرف راغب کرنیوالے کی صورت میں زمانۂ قدیم سے تصور کیا جاتا رہا ہے۔ اقبال نے اس کے تصور کو دنیا کی شریانوں میں بہنے والے خون سے تعبیر کرنے کے باوجود اس سے پناہ مانگی ہے۔ جمیل مظہری ان کے برعکس اسے "انسان کی ناخمی" نرمی اور احساسِ کمتری" سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں:

"تمہاری محرومیاں، تمہاری ناکامیاں، تمہاری
وہ ساری بربادیاں جن کا تم ہمیشہ ماتم کرتے
ہو، تمہارے اسی احساسِ کمتری کا نتیجہ ہیں۔
یہ نہ پہلے تم میں نہ بھوک ہو نہ نابرابری، نہ
دکھ ہوں نہ دکھوں کی نوحہ گری۔ اے میرے
کم عقل بھائیو اور بہنو! اپنے اندر برتری کا
ایک احساس پیدا کرو۔ تمہارے آسمانی باپ
نے تم میں جو توانیاں بھری ہیں، انھیں ابھارو۔
نظامِ قضا و قدر کے فرشتے اور دیوتا ان
پر قابض ہیں۔ اپنی امانتیں ان کے قبضہ سے
نکالو۔ ان دیوتاؤں کو ان کے سنگھاسن سے
اتارو۔ ان قدسیوں اور کروبیوں کو ان
کے مقامِ قدس سے گرا کر زمین پر لاؤ اور
ان سے کہو کہ تمہارا کام اقدر ہو، اقدر ہو کرنا
نہیں ہے، تمہارا کام اقدر کے بیٹوں کی
خدمت گذاری ہے"

جمیل صاحب کے شیطان کے بارے میں یہ تصور تو ان قرآنی آیات کی بھی نفی کرتا نظر آتا ہے کہ ابلیس جو فرشتوں کا استاد تھا اور آدم کو سجدہ نہ کرنے کے پاداش میں جسے سزا ملی تھی۔ جس نے آدم کو ورغلا کر اس ثمر کو چکھنے پر مجبور کردیا تھا جس سے ان پر اجسام خاکی کے رموز آشکار ہونے تھے، جس نے زندگی بھر خدا کے نیک بندوں کو بہکانے کا وعدہ کیا تھا، یعنی وہ ایک بیکرد کھتا تھا۔ اقبال بھی اس کی حقیقت سے انکار نہیں کرسکے تھے۔

"ایمان" جو ہر مذہب کی روح ہے اور جس پر تمام مذاہب کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں اور معجزات جو ہر رسول کا خاصہ رہے ہیں اور خود حضورِ اکرم جنہوں نے معجزات سے زیادہ اپنے کردار و عمل کے ذریعے اسلام کو فروغ دیا تھا، سے بھی کئی معجزات منسوب ہیں، جمیل صاحب کے خیال میں "معجزہ —

شبہ بازی ہے" اور "اس ایمان کی حقیقت
ہی کیا ہے جو ذہنوں کو کھوکھلا کر اور قوتِ
ادراک کو دم بخود کر کے حاصل ہو۔ سچا ایمان
وہی ہے جس کا اقرار ذہن کی حالتِ شعوری
اور حالتِ عقلی میں کیا جائے۔"

ظاہر ہے کہ جمیل صاحب کا ایمان کے متعلق یہ تصور ان صحابیوں اور بزرگوں سے بالکل مختلف ہی جو دعائیں کرتے تھے کہ، الہٰی مجھے جاہلوں سا ایمان عطا کر؛ یا پھر جو خدا کو بغیر کسی ثبوت کے ماننے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ حقیقتاً ان کا یہ عقیدہ یا خیال سرسید کے عقیدے سے آگے کا ایک قدم ہے۔ سرسید کی طرح جمیل صاحب بھی ایمان کو شعور و عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر اُسے اپنانے کے قائل تھے لیکن ان کے خیال میں آج انسانوں کے دل میں ایمان و یقین کی روشنی اس لئے نہیں ہے کیوں کہ" ان کے دل میں یقین کی شمع اور محبت کے چراغ بجھ گئے ہیں"۔ اور اس اندھیرے کو دور کرنے کے لئے [illegible] مسلط کر دیا ہے۔ خودی کی چنگاری کو جگانا ضروری ہے تاکہ یہ دُنیا جسے انسانوں نے اپنا بازی گاہ سمجھ لیا ہے اس کی دسترس میں ہو اور فطرت کے تمام اسرار و رموز اس پر آشکار ہو سکیں۔

ہندو مت کے مطابق بھی اوم' سارے جہان کا مالک ہے' اس نے اپنی توانائیوں کو مختلف دیوتاؤں یا چھوٹے چھوٹے بھگوانوں میں بانٹ دیا ہے۔ انسان اپنی پرارتھناؤں اور شردھا سے ان کو خوش کرتا ہے تو وہ ان توانائیوں سے اسے نوازتے ہیں اور اگر ناراض ہو جاتے ہیں تو ان کا پرکوپ دھرتی کے واسیوں کو مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ہمارے ملک میں دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کا استھاپن اور ان کی پوجا انہیں بھگوانوں کو سنتشٹ کرنے کے لئے کیا جاتا ہے یا ان کے [illegible]۔ جمیل صاحب کا خیال ہے کہ انسانوں کے مہا باپ نے ان دیوتاؤں کی سرشٹی اس لئے کی تھی کہ یہ انسانوں کی خدمت گذاری کریں۔ اس لئے نہیں کہ الٹے انہیں کی پوجا کی جائے۔ اگر بُت پرستی یا پوجا کی عادت ہو بھی گئی ہو تو سچے عقیدے اور لگن سے تم بُت بناؤ اور پوجا کرو، لیکن ان کے بُت بناؤ اور اُن کی پوجا کرو جو :

"تم میں تمہارے پرماتما کا عکس بن گئے تھے، جو تمہارے شکچھک تھے، جو تمہارے سدھارک تھے۔ میں تم سے کہتا ہوں تم لکچھمی کو نہ پوجو۔ لکچھمی کے ان اوتاروں کو پوجو جنھوں نے اس سنسار میں دھن حاصل کیا اور اس دھن کو اپنے بھائیوں میں بانٹ دیا جو نردھنے تھے، جو بھوکے تھے، جو اپاہج تھے۔ پوجنے کے قابل وہ تھے جو دھن رکھنے کے باوجود تمہارے لئے بھوکے رہے، جو بل رکھنے کے باوجود اپنا بل، اپنی شکتیاں تم پر لٹاتے رہے۔ پوجو ان بلوانوں کو، انھیں دھنوانوں کو، انھیں بھگوانوں کو پوجو، ان ودوانوں کو پوجو جو سرسوتی کو بہنیں، ان ودوانوں، کلاکاروں کو پوجو جنھوں نے تمہارے دلوں کو اُجالا، اور ذہنوں کو روشنی دی۔"

ہندوؤں کے دھرم سدھارکوں نے سناتن دھرم کے سچے اپاسکوں نے دھرم کے اندر پیدا ہو جانے والے غلط تصورات و رواجوں کو دُور کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس طرح کا کوئی جس میں شخصیت پرستی کے عناصر ہوں اب تک عام نہیں ہو سکا۔ شخصیت پرستی کا یہ تصور دراصل بیسویں صدی کی پیداوار ہے اور مرتی ہوئی جاگیرداری تہذیب اور عیار سرمایہ داری کی اپنی بقا کی ایک اور کوشش ہے۔ تاہم شخصیت پرستی کا یہ تصور جو جمیل صاحب نے پیش کیا ہے، اب تک کہیں نظر نہیں آتا۔ —— وہ تصوف کے "وحدت الوجود" کے عقیدے

کو ماننے والے ان صوفیوں کو کبھی نہیں بخشش پاتے جن کی رو سے
خدا کے دیوانے اپنا سب کچھ تیج کر اس کے جمالِ جہاں آرا
میں گم ہو جاتے ہیں۔" ان کا خیال ہے کہ "انکی جنسی گھٹن،
آپ کو معشوق سمجھتی رہی - پیار لینے اور اس کو پیار دینے
کے لئے اسے ڈھونڈتی رہی۔ حالاں کہ ان کے گرد و پیش
جتنے چہرے تھے خدا انھیں میں چھپا تھا۔ وہی ان کے پیار
کے مستحق تھے۔ خدا کو وہی پا سکتا ہے جو اس کی نشانیوں،
اس کی مخلوق، اس کے کنبے کو پیار کرتا ہے۔" جمیل صاحب کے
یہ تصورات 'وحدت الشہود' کو ماننے والے خانقاہوں کے
کے علاوہ 'وحدت الوجود' کے عقیدے پر گامزن وہ صوفیا
جو ترکِ دنیا اور ترکِ لذت کے قائل نہیں تھے۔ اور مولانا
رومی، سعدی، حافظ، خواجہ معین الدین چشتی اور اقبال
کے یہاں بھی اسی طرح موجود ہیں۔ انگریزی کی ایک نظم "ابو
بن ادھم" میں بھی اسی طرح کے خیالات بیان کئے گئے ہیں۔
بہر حال تصوف کے اس عقیدے سے جمیل صاحب اس
وسیع تر انسان دوستی کا جواز پیش کرتے ہیں جہاں انسانوں
کو مذاہب، ذات پات، رسوم و عقائد کے خانوں میں
بانٹا نہ جا سکے۔ صرف عیسیٰ ہی کو خدا کا بیٹا نہ سمجھ کر تمام
اولادِ آدم کو خدا کا بیٹا سمجھا جائے۔

جنت و جہنم، جزا و سزا، پر یقین ہر مذہب کے
ماننے والوں کے لئے ایک اہم فرض ہے۔ لیکن جمیل جنت و
جہنم کے اس پرانے تصور کو بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں
جو صدیوں سے مولوی یا مولوی نما حضرات نے ہمارے ذہنوں
پر لاد رکھے ہیں۔ ان کے مطابق ......

"دوزخ تو تم بنا ہی چکے اپنی اس دنیا کو،
اب رہی جنت تو اس کائنات میں، اس
آفاق میں اس کی چھتوں کے نیچے یا اوپر
جنت کہیں نہیں ہے اگر کہیں ہے تو
تمہارے ذہنوں میں۔ اس لئے تمہیں اس کی
تعمیر کر سکتے ہو، تمہیں اس کی تعمیر کرو۔"

غالب بھی جنت کی حقیقت، کو "دل کے بہلانے کا
خیال" اور اقبال نے بھی اسے State of mind ہی
کہا ہے۔ لیکن اس جنتِ ارضی کی تعمیر اور آدمِ نو کے ذریعہ
اس کی تعمیر کا یقین جمیل کی تمناؤں کا وہ سنہرا قدم ہے جو
جو [illegible] دانشور شاعروں کے تخیل سے آگے کی طرف
ان کی پرواز ہے۔

ان تصورات اور عقائد کے دوش بدوش جمیل
صاحب اس نظامِ حکومت پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں جو آج
ہمارے ملک میں رائج ہیں۔ منڈیاں، بازار، عدلیہ، بیوروکریسی، پارلیمنٹ، چناؤ، جمہوریت، تعلیم، تعلیمی ادارے،
شفا خانے، گویا کہ ہماری نام نہاد جمہوری اور سیکولر
حکومت میں ترقی و تبدیلی کے تمام مظاہر ایک ایک کر کے
ان کی تنقید کا نشانہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ 'جدلیاتی و تاریخی
مادیت کی ابجد' کے مصنفین نے لکھا ہے کہ:

"ہر طبقاتی معاشرے میں اور ہر عہد میں فرسودہ
طبقات کی مخالفت ـــ جنھیں فرسودہ نظام
کے ساتھ ہی میدان سے رخصت ہو جانا چاہیے
(جس کے ذریعے انھوں نے حکمرانی کی) ـــ
دوسرے طبقات کرتے ہیں جنھیں اپنے
نظام کو تباہ کرنا اور معاشرے میں ایک
بلند تر منزل تک لے جانے کی کوشش کرنا
ہے۔ رجعت پرست طبقات ماضی کی باتیں
سوچتے ہیں کیوں کہ وہ یہ نہیں چاہتے
کہ موجودہ نظام اپنے دن پورے کر چکا ہے
اور کسی طرح مفید نہیں ہے۔"

اس تاریخی سچائی کی روشنی میں جب ہم جمیل صاحب

کی اس جنتِ ارضی (جہانِ نو) کے تصور کا مطالعہ کرتے ہیں :

"یہ دنیا، یہ شیطانی دنیا جس میں شہزوری کمزوری کو اپنے لہو کی چند بوندیں دے کر توانا نہیں بناتی بلکہ اس کا خون چوس چوس کر اپنے کو طاقتور بناتی ہے، کیا اس قابل ہے کہ یہاں پر یزدانی روحیں سانسیں لے سکیں ....

اس خون سے پلی دنیا کو تمہیں ختم کر سکتے ہو، تمہیں ختم کرو گے۔ تمہاری تخریبی جدوجہد ہی اس دوزخ کو بھسم کریگی۔ اور تمہارا تعمیری شعور ہی اس میں اس سے بہتر دنیا تعمیر کریگا۔ یہ وہی دنیا ہوگی جسے تمہارے مذاہب کی زبان سورگ، جنت ... اور Paradise کے ناموں سے یاد کرتی ہے۔ جس دن یہ دنیا بنے گی وہ دن یزداں کی پہلی فتح اور شیطانِ تضاد قدر کے استاد اہرمن و ابلیس کی آخری شکست کا پہلا تاریخی دن ہوگا...

اے دوزخ کے کندو (اس شیطانی دنیا میں بسنے والو — ع ق ا) تم میں سے کچھ لوگ اس جنت میں جائیں گے۔ وہی جائیں گے جو سب کے حصے برابر بانٹنا چاہتے ہیں۔ جنھیں بانٹ کر کھانا آتا ہو، جنھیں خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا آتا ہو، جو پیاسے رہ کر تشنگی کا وجود اس کائنات سے ختم کر سکتے ہوں۔"

تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ جمیل صاحب اس طبقے کے ساتھ ہیں جو پرانے نظام کو تباہ کرنا اور معاشرے کو ایک بلندتر منزل تک لے جانے کے لیے کوشاں ہے۔ (وہ وطنیت) قومیت اور فرقہ بندیوں کی دیواریں گرا کے ایک عالم گیر حکومت کبریٰ کی بنیاد ڈال کر اپنی عورتوں کو منصفانہ جنسی و جذباتی حقوق دے کر اپنے بچوں پر اپنے ذہنی عقائد اور تصورات مسلط نہ کر کے، اپنے مذاہب کی گروہ بندیوں کو توڑ کے" اس جہانِ نو کی تعمیر کے خواب دیکھ رہے ہیں جس کی تعمیر میں، "اہرمن کے نمائندے جو حکمرانوں، دھنوانوں، بھگوانوں کے بھیس میں، مولویوں پادریوں اور پنڈتوں کے بھیس میں ہماری فکر و نظر کے رہنما بنے ہوئے ہیں" روڑے اٹکا رہے ہیں۔

اس طرح اس مضمون میں جمیل صاحب نے خداوندِ قدوس کی ذات کا اقرار کرنے کے باوجود تصورات، عقائد، ضابطۂ حیات اور موجودہ نظامِ حکومت کے تمام بتوں کو مسمار کر دینے کی کوشش کردی ہے۔ جو انسانی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکا رہی ہیں اور معاشرے میں ہونے والی نت نئی تبدیلیوں کی طرف سے لوگوں کو ناواقف رکھنے کے لئے شعبدہ بازیاں کرتے رہتے ہیں۔ جمیل صاحب کا انسان مکمل طور پر آزاد ہے اور اپنی قوتِ ارادی سے فطرت کے تمام مظاہر اور قوتوں کو زیر کرنے کی قوت رکھتا ہے

اس مضمون کو پڑھ کر میرے ایک دوست نے کہا کہ "اس مضمون میں اسکے سوائے کیا ہے کہ علامہ نے جو کچھ پڑھا، اسی کا تصادم ہے، اسی کی تکرار ہے اور اسی کا بیان ہے، اور یقیناً جمیل صاحب کا مطالعہ وسیع ہے"۔ میں اپنے اس دوست کو یہ کیسے بتاؤں کہ ہر نیا فلسفہ، ہر نیا تصور، ہر نیا خیال پرانے فلسفوں، پرانے تصورات اور پرانے خیالات کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ چیزیں جو آنے والے دور کے لئے قابلِ قبول ہوتی ہیں وہ قبول کر لی جاتی ہیں اور باقی تمام چیزیں رد کر دی جاتی ہیں۔ بہرحال حقیقتوں کا سامنا کرنے کی قوت کے ساتھ "اخلاقیات" کے گھیرے (تو ڑا ت کبھی...

ان کے مضمون میں دیکھے کون جاتے ہیں۔

دوسرا مضمون 'میں مرگیا ہوں' ہے جس میں اپنے عزیز دوست پرنسپل حیدر مہدی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ وہ مر گئے ہیں۔ اور اسی عالم میں محسوس کر رہے ہیں کہ "لمحہ لمحہ مرنے سے ایک مرتبہ مر جانا کہیں بہتر ہے"۔ "موت فی الحقیقت نجات ہو یا نہ ہو ایک احساسِ نجات ضرور ہے، مرنے والوں کے لئے مرنے والوں کے پس ماندگان کے لئے بھی جو اکثر بوڑھے باپ اور بوڑھے بھائی کی مسلسل تیمارداری اور نازبرداری سے اکتا سے جاتے ہیں"۔ لیکن "موت کی قید غنیمت سہی، زندگی باوجود اپنی تلخیوں اور بدمزگیوں کے بڑے مزے کی ایک چیز ہے"۔ انہیں خیالات میں غلطاں، مختلف شعرا کے اشعار کے حوالے موت اور موت کے بعد کے اسرار و رموز سے اُلجھتے، سفرِ جنازہ میں دوستوں، عزیزوں اور کرم فرماؤں کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے قبرستان کی طرف گامزن ہیں۔ شاد کے مصرعے "یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم" کے ساتھ آدم و حوا کی قبل از وقت مواصلت کے جرم میں ان کو اور ان کی اولاد کو ملنے والی سزاؤں کے توسط سے فرشتگانِ شر کا فرشتگانِ خیر پر غالب ہونے کا خیال اور اس کے ساتھ ہی خدا کی ملازمین قضا و قدر کے ہاتھوں بے بسی اور کارکنانِ قضا و قدر کی مطلق العنانی کو ثابت کرنے کے لئے کبھی اپنی بیماری، کمزوری اور موت سے تو کبھی اکبر و اورنگ زیب اور گاندھی و جناح کی موت کی مثالیں پیش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ، "موت ہم خدا کے بیٹوں سے اس کے باغی خدام کا ایک حاسدانہ انتقام ہے"۔ "پس ان حاسدانِ ازل سے کیا امید ہو سکتی ہے جب مار ہی ڈالا ہے تو جو ہونا ہو وہ بھی ہو جائے۔ اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ ایک دوزخ سے نکال کر دوسرے دوزخ میں ڈال دیا جاؤں"۔ پھر دوزخ و جنت کے تصورات کا مذاق اڑاتے ہوئے، دوستوں کی گریہ وزاری، آہ و بکا کی مناسبت سے غمِ حسین میں بہائے جانے والے آنسوؤں کا قضیہ چکاتے ہوئے مختلف مذاہب میں آخری رسوم کی ادائیگی کے طریقوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک خوبصورت اور دل کو چھو جانے والی سچائی کو بھی بیان کر دیا ہے:

"میں جس پیغمبر کی اُمت میں ہوں اس سے بڑھ کر فطرت کا مزاج داں کون ہو گا پھر اس نے جلانے کی جگہ مردے گاڑنے کی رسم کیوں جاری کی۔ مولویانہ ذہن مجھ سے یہ سوال کر سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انسانیت کا سب سے بڑا محسن مبعوث ہوا عرب کی سنگلاخ زمین میں، جہاں لکڑی اور کیا پانی کا فقدان تھا۔ اس لئے جلانے اور بھونکنے کا امکان نہیں تھا، مجبوراً تدفینِ ارضی کا طریقہ گوارا کر لیا گیا۔ لیکن زندگی کی ناگہانی مسائل کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ مگر ہر عہد کے مولوی اس دروازے پر قفل پر قفل ڈالتے رہے کبھی کھولا بھی تو اس وقت جب کسی خلیفہ یا بادشاہ کو سازش سے یا ذاتی تعیش کے سلسلے میں کوئی وقتی ضرورت لاحق ہوئی۔ دین و دُنیا، شریعت و حکومت میں دوستی کا رشتہ ابتدائے تمدن ہی سے قائم ہو چکا تھا۔ اسلام نے تہذیب کا مزاج اگرچہ بدل دیا تھا لیکن اس کے باوجود اس کے تاریکی ادوار میں اس دوستی کا رشتہ کسی طرح نہیں ٹوٹ سکا۔۔۔ اور دین

کا کام اہلِ دولت کے لئے سیم و زر اکٹھا
کرنے کی تدبیر بتانا اور ان رجحانات
سفلی و عیاشی کے لئے فتوائے تائید و
تصدیق گڑھنا رہ گیا "

اور غلاموں کے مسئلے کے حوالے سے جو عربوں کی کمزوری تھی اور جسے حضور اکرم کی تمام تر نیک خواہشات کے باوجود ختم نہ کیا جا سکا تھا اور انگریزوں کے ذریعے اس کارنامے کو انجام دیئے جانے پر جس دردانگیز اور حسرت ناک لہجہ میں یہ جملے ادا کئے گئے ہیں وہ ملاحظہ ہو ۔ "میرے دل کی گھٹی ہوئی حسرت مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ چاہتی تھی کہ یہ شرف کسی اسلامی ملک کو حاصل ہوتا لیکن اسلامی ممالک کی جہالتِ شریف یہ ہے کہ ساری دنیا سے انسان فروشی کا رواج ختم ہو گیا مگر ان کے بازاروں میں آج بھی انسان انسان کو خرید رہا ہے اور جس ملک میں انگریزوں کی وجہ سے ایسا ہونا ممکن نہیں وہاں اب انشاء اللہ نظامِ مصطفائی قائم ہونے کے بعد کچھ اور ہو یا نہ ہو لیکن ضرورتِ جنسی کے لئے پری نژاد عورتوں کی خریداری بہ سہولت عام ہو جائیگی۔ آخر یہ نظامِ مصطفائی و مرتضائی قائم کرنے والے دوسروں کے منہ پر تھوکنے کے بجائے تاریخ کے آئینہ میں اپنا عکس کیوں نہیں دیکھتے اور بے حیائی کا منہ کھول کر ڈنکا بجائے جاتے ہیں کہ نوعِ انسان کو غلامی سے چھڑایا ہم نے "

خیالات کا سلسلہ پھر قبر کی طرف واپس لوٹ آیا ہے۔ اور وہ اب یہ سوچ رہے ہیں کہ ان کا جسمِ خاکی جو زندگی بھر اپنا خون اور گوشت دوسروں کو کھلواتا رہا۔ مرنے کے بعد بھی کچھ کیڑے مکوڑوں کے کام آ جائے گا لیکن اس کفن چور کے گھر میں شاید چولہا بھی نہ جلے جسے ان کی قبر میں لیٹنے سے پہلے نئے کفن کی جگہ ان کا پرانا کرتا و پاجامہ ملے گا۔ اور کفن فروشی کے وسیلے سے دولت مند تاجروں، سرمایہ داروں

اور موقع پرور مولویوں کی قلعی کھولتے ہوئے قبر میں اتار دیئے گئے۔ دوستوں عزیز داروں نے ایک ایک مٹھی خاک ڈال کر اپنے فرائض سے سبکدوشی حاصل کی ہی تھی کہ نکیرین نازل ہو گئے۔ پھر سوالات و جوابات کا ایک سلسلہ ہے جس میں سالہا سال سے رائج عقیدوں کی بنیادیں متزلزل ہوتی نظر آنے لگتی ہیں۔ صرف ایک مثال :

تمہارے ذریاتِ ارضی نے ہمارے داغوں
میں یہ واہمہ ٹھونسا ہے کہ بقر عید کے دن
جو ہم قربانی کے بکرے ذبح کرتے ہیں وہ اپنی
پیٹھ پر لاد کر ہمیں پل صراط کے اس پار سے
اس پار لے جائیں گے۔ یہ تمہارے استاد
اور اس کے پٹھوں کا مسخرہ پن ہے۔ انسان
جو خدا کا شاہکار، وہ تو بال سے باریک
پل پر چل نہیں پائے گا اور چار ٹکے کے
قربانی کے بکرے اس پر چھلانگیں لگائیں گے۔
واہ جی واہ "

بہرحال جوابات سے گھبرا کر جب یہ مولوی نما مصیبتیں (فرشتے) بھاگنے کو ہوئیں تو انھوں نے ان کے استاد ابلیس کو اس طرح چیلنج کیا، :

"اب انسان فطرت کا بچہ نہیں ہے بلکہ پوری
طرح بالغ ہو رہا ہے بلکہ بالغ ہو گیا ہے۔
اب وہ اسے دیوتاؤں اور فرشتوں کے
بھیس میں، ملاؤں اور پنڈتوں کے بھیس
میں، پادریوں اور لیڈروں کے بھیس میں
آ کر بیوقوف نہیں بنا سکتے "

خیر تو فرشتے جا چکے تھے اور وہ بقول شبلیؔ "زندہ درگور ہوں مرحوم ہوں مغفور ہوں میں" اور خدا سے لو لگی ہے اس خدا سے جس سے وہ زندگی بھر نہیں ڈرے موت کے

بدکیوں ڈرو کہ اس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہی نہیں ۔ البتہ ایک خطرہ ہے اور وہ یہ کہ اگر اس نے یہ پوچھا کہ :

"بیٹے مجھے پہچانتے ہو، میں وہی تمہارا مفلس
عزیز ہوں جو ایک دن تمہارے دروازے
پر احتیاج لیکر گیا تھا اور تم نے مجھے
جھڑک کر نکال دیا تھا ۔ پہچانو میں تمہارا
وہی بے کس و بے سہارا دوست ہوں جو
بیمار ہوکر ایڑیاں رگڑ رہا تھا، تم اسکی
کی عیادت کو نہیں گئے اور گئے تو اس کی
اتنی بھی مالی امداد نہ کی کہ اس سے اپنی
ضروری دوا منگوا سکتا حالانکہ تمہاری
جیبیں بھری ہوئی تھیں ..... مجھے پہچانو
میں وہی ہوں جو ایک یتیم لڑکے کے بھیس میں
تمہارا ملازم تھا، تم اس کے سامنے طرح طرح
کی نعمتیں کھاتے تھے اور وہ حسرت بھری
نگاہوں سے ان سنہری روپہلی نعمتوں کو
دیکھتے رہتا تھا ۔ جب بھی میں محتاجوں،
ناداروں اور یتیموں، بیواؤں کا روپ
بھر کر تمہارے پاس گیا تو تم نے کچھ دیا تو
ضرور لیکن اتنا نہیں کہ ان کی ضرورت
پوری ہوسکے یا ان کا پیٹ بھر سکے۔" تو

وہ اس کا کیا جواب دیں گے ۔ کیا ان کی آنکھیں شرم سے جھک نہیں جائیں گی ؟

خیالات کا سلسلہ پوتی کی آواز سے ٹوٹ جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو قبر کی بجائے جھلنگی چرپائی پہ پاتے ہیں ۔ اس مضمون میں بھی بہت ساری حقیقتوں سے سامنا ہوتا ہے تاہم "اخلاقی قدروں" پر یہاں بھی کافی زور ہے ۔ دراصل جمیل صاحب کا تعلق بھی انہیں اگلے لوگوں

سے ہے جو ان اخلاق ہی انسانیت کی پہچان سمجھی جاتی ہے ۔ اخلاقیات کا یہ تصور دراصل سرمایہ داری نظام کی پیداوار ہے جس میں انھیں غریب، نادار اور مجبور لوگوں کی خون پسینے سے پیدا کی ہوئی دولت کا ایک نہایت ہی حقیر حصہ خیرات کی صورت میں اور بھیک کی شکل میں دیکر ایک طرف تو یہ سرمایہ دار اپنے کو فرشتہ ثابت کرتے ہیں اور دوسری طرف انسان کو انسان کا محتاج بناکر، اس عظیم جدوجہد کو یہ غریب اور محنت کش لوگ اپنی ضرورتوں کو حاصل کرنے کے لئے جاری رکھے ہوئے ہیں، کاٹے رکھتے ہیں ۔ انسانیت کے دشمنوں کی یہ جھوٹی حرکتیں، یہ دھوکا، یہ فریب، اس روتی سسکتی انسانیت کا مداوا ثابت نہیں ہوسکتیں ۔ اس سماجی عدم مساوات کو دور کرنے کا بس ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دولت کی مساویانہ تقسیم اور ایک ایسے نظام کی تشکیل جس میں ہر انسان کی بنیادی ضرورتیں بہ آسانی پوری ہوں، جہاں انسان انسان کا محتاج نہ ہو اور انسان انسان میں کسی طرح کا فرق نہ روا رکھا جائے ۔ شاید علامہ کو بھی اس کا احساس ہوگیا تھا کیوں کہ اگلے مضامین میں اخلاقیات کے مقابلے میں انسان دوستی اور مساوات پر زیادہ زور دیا گیا ہے ۔

اپنا تیسرا مضمون انہوں نے مجھے "ہم نوا" کے لئے بھیجا تھا اور جو ایک کاتب صاحب کی نظرِ کرم کا شکار ہوگیا ۔ اب ان چند سطروں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں بچا ہے ۔ یہ سطریں آپ کی نذر ہیں :

دوسرا فتنہ عظیم قومیت ہے ۔ اس کو بین
الاقوامیت تک پہنچا کر اس کی تنگی کم کی
جاسکتی تھی ۔ اسلام نے یہی چاہا تھا لیکن
بعض تاریخی مجبوریوں کی بنا پر کر نہ پایا ۔
موجودہ عہد میں اشتراکیت اس کام کو کرسکتی

تھی لیکن وہ غلط ہاتھوں میں پہنچ کر خود
ایک مستقل قومیت بن گئی۔ میں جو مذہب
کی شدتِ ضابطگی سے نالاں تھا،
اشتراکیت کے ضابطوں کی تنگی میں کیوں
کر سانس لے سکتا تھا۔ اس لئے میں اشتراکی
نہ بن سکا۔ لیکن ایک شدید قسم کا مساواتی
ضرور ہوں، اتنا شدید کہ لینن کے بعد
کی چلائی ہوئی اشتراکیت کو مساواتیت
کے حق میں ایک غداری سمجھتا ہوں۔
میں کارل مارکس اور لینن دونوں کا
عقیدت مند ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ
ہی یہ بھی سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ایک
خالص سیاسی اور اقتصادی پروگرام میں
مابعد الطبیعاتی مسائل کو شامل کر کے
ایک جذباتی غلطی کی۔ اگر ان کی تحریک
براہِ راست خدا کے تصور سے متصادم
نہ ہوتی تو آج ساری دُنیا اشتراکی ہوتی۔"

اشتراکیت سے جو اُمیدیں جمیل صاحب نے وابستہ کر رکھی تھیں، اسے شاید روسی اور چینی اشتراکیت کی غیبی سے ٹھیس پہونچی ہے۔ تاہم اشتراکیت کبھی بھی کسی بندھے ٹکے اصول کا نام نہیں رہی ہے۔ حالات اور زمانے میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کے مطابے بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ کارل مارکس اور اینگلس کا مادی فلسفہ، جس پر بعد میں روس، چین اور دوسرے اشتراکی ملکوں نے اپنے نظامِ حکومت کی بنیادیں استوار کیں اور ایک نئے طرز کی حکومت کے نمونے پیش کئے۔ اس زمانے کے مذہبی فلسفوں سے یقیناً متصادم تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی اشتراکی سماج میں مذہبی امور یا فرائض کی ادائیگی پر پابندی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیت ایک خالص سیاسی، سماجی اور اقتصادی پروگرام ہی ہے جس کا مقصد ساری دُنیا میں ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں ہر انسان کو انسان کی طرح زندہ رہنے کا حق حاصل ہو اور جہاں ہر انسان کی بُنیادی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ اس جدوجہد میں مذہب نہ تو کہیں آڑے آتا ہے اور نہ ہی مذہب سے اس کا کوئی واسطہ ہے۔ البتہ مذاہب کے پردے میں جو ننگا ناچ کروایا جاتا ہے اور خود علامہ نے بھی جس کی مذمت کی ہے، اشتراکیت اس کی مخالفت ضرور کرتی ہے۔ اور شاید اس کے بغیر جمیل صاحب کا "جہانِ نو" کی تعمیر کا خواب مکمل بھی نہیں ہو سکتا۔

چوتھا اور آخری مضمون "خیال کی رو" ہے۔ یہ "ابلاغ" کے پہلے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون متذکرہ مضامین سے اس طرح الگ ہے کہ طنز کے تیکھے تیروں نے اسے دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اس کا آغاز غالب کے ایک شعر ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
مٹایا مجھ کو ہونے نے نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

سے ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی خیالات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور وہ سوچنے لگتے ہیں کہ غالب اور ان کی طرح ہر آدمی اگر خدا ہوتا تو کیا ہوتا؟ پھر خداؤں کی جنگ، خالقِ ایزداں اور باغی مخلوق خدائے شر ابلیس کے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے کے منظر میں ڈھل جاتا ہے اور ان کا ذہن "خدا علیہ الرحمہ" کی مسلسل شکستوں اور مظلومیت کی طرف منتقل ہوتا ہے (ظاہر ہے کہ جہاں مظلومیت کی بات ہو حسینؑ اور خاندانِ یثرب کا ذکر کیوں کر نہ آئے) خیالات کا یہ سلسلہ تھوڑی دیر کے لئے ٹوٹتا ہے اور وہ یہ سوچتے ہیں کہ "دیکھئے خیال کی رو کہاں سے کہاں پہنچی!"

پھر خیالات کا سلسلہ آدم کے ماں باپ کی اُن خواہش

سے شروع ہوتا ہے کہ وہ آدم کو بھی اپنی طرح خدا بنا دے لیکن خدا بنانا تو درکنار وہ انسان بھی نہ بن سکا بلکہ حیوان بن گیا۔ پھر پستی کا خیال آتے ہی خیال کی رَو یگانہ، یگانہ کی غالب شکنی اور غالب پرستی سے ہوتے ہوئے داغ اور پھر نقادانِ فن تک پہنچتی ہے۔ اور ان کی مغرب پرستی پر طنز و تعرض کرتے ہوئے فارسی شعرا کے یہاں پائے جانے والے فلسفہ تصوف، وحدت الوجود کو سوپن ہار کے فلسفے۔ اس کارگاہِ آفاق میں یزداں کہیں نہیں اہرمن البتہ ہے (دوسرے لفظوں میں خدا کا وجود اگر ہے تو وہ ظالم اور شریر ہے) ——— کی موذب شکل کی صورت میں دیکھتے ہوئے، مختلف شعرا اور مختلف قومی اور بین الاقوامی خدا پرستوں کے ذریعے خدا کی درگت کی تفصیل پر ٹوٹتی ہے۔ اور پھر خیالات کا سلسلہ ایرانی شعرا کے اس خیال کے ساتھ شروع ہوتا ہے کہ سارے تغیرات اسی آسمانی کج رفتاری کے سبب ہیں اور پھر آسمان کے گھومنے، سورج کے گھومنے اور اخیر میں دماغ کے گھومنے (جھنجھلاہٹ ملاحظہ ہو) تک بات پہونچی ہی تھی کہ انہیں اُن لوگوں پر رشک آنے لگتا ہے جو تغیرات و انقلابات سے گھبراتے اور آسمان کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر اسے کوستے اور گالیاں دیتے ہیں اور پھر یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کیوں ہمارے وہ بزرگ اپنے حالات سے مطمئن تھے، تبدیلی سے گھبراتے تھے اور کیوں ہم اپنے حالات سے مطمئن نہیں اور تبدیلی کے متمنی ہیں۔ اور خود ان کا ذہن اس کا جواب دیتا ہے کہ، "وہ دربار شاہی میں جیتے تھے اور سانس لیتے تھے اور ہم عہد جمہوری میں نہ آسانی سے جیتے ہیں نہ آسانی سے سانس لے سکتے ہیں" اور پھر ہماری سرخرد حکومت کی مختلف مظاہر کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ "اس صورتحال کی ذمہ داری عہدِ حاضر کے زعامت سے زیادہ ان عظیم قائدوں پر ہے جو تمام ہندوستانی آبادی کو مساوی سطح پر لانے کا خواب دیکھ رہے ہیں اور جب انہیں قومی حکومت بنانے کا موقع ملا تو وہ اس نکتہ کو فراموش کر گئے"۔ اور پھر خیالات کی رَو جمہوریت کے نام نہاد ٹھیکہ داروں سے ہوتے ہوئے پھر روسی جدیدیوں تک پہنچتی ہے جنھیں افکار سے زیادہ بشریہ کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ پھر ترقی پسندوں تک پہنچتے پہنچتے لب و لہجہ میں ایک درد، ایک شکایت کے گھل جانے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ خواہش ان کے تخیل میں انگڑائیاں لینے لگتی ہے کہ :

"کاش یہ عمل دارانِ حریت اپنی آرام کرسیوں
پر بیٹھ کے اونچی اونچی لمبی لمبی گپیں ہانکنے
کے بجائے گاؤں گاؤں پھیل کر عوام کے
ذہن کی تربیت کرتے اور ان کے پیمانۂ فہم
کے مطابق انھیں اشتراکیت کا مفہوم سمجھاتے
تو ہندوستان کا جغرافیائی اور تاریخی چہرہ
وہ نہ ہوتا جو آج ہے"

خیالات کی رو پھر گھوم کر وہاں پہنچ جاتی ہے کہ دانشورانِ فرنگ جو کچھ آج سوچتے ہیں ہمارے شعرا و ادبا ان سے بہت پہلے سوچ چکے ہوتے ہیں۔ پھر ابلیس سے متعلق ایران کے فلسفی شاعر ابن یمین (ہم نے تمہیں بہکایا لیکن ہمیں کس نے بہکایا)، ریاض خیرآبادی (مجبور ہے فرشتہ بدی کا۔ پہلے ہی کچھ کہی بدی ہے)، علامہ اقبال (ابلیس تری تعلیم سے دانائے کار، نظم جبریل و ابلیس، یا "گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے : قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو") کے حوالے سے یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ابلیس کی مردودیت اور ملعونیت غلط بالکل غلط اور آشوب گاہ دنیا میں انسان کی محکومیت اور مظلومیت مسلم اور حشر و نشر سزا و جزا، بہشت و دوزخ کا سارا نظام بے معنی و

وہ آخر کار ان کے خیالات کی رو انسان کو اس بار بردار گدھے کے روپ میں دیکھنے لگتی ہے "جو روزِ ازل سے اپنی پیٹھ پر یزداں کی امانت کا بار ڈھوئے چلا جا رہا ہے اور گدھے پن کی انتہا یہ ہے کہ جب اللہ میاں کو ان کی مشقت بار برداری پر پیار آتا ہے تو یہ گدھے گردن جھٹک کر بوجھ اتارنے کی حق الوسع انکار کرتے ہیں اور جب ان کے انکار کے باوجود بوجھ اتار لیا جاتا ہے تو ان کے آس پاس کے ساتھی گدھے ۔۔۔ کرتے ہیں، خوشی نہیں مناتے اور اس خواہش پر خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے کہ کاش اس کائنات میں گاندھی جی سے بھی بڑا کوئی مہاتما ہوتا اور خدا جل شانہٗ کی گورنمنٹ کو ترکِ موالات کا الٹی میٹم دیتا کہ ہمیں بھی کچھ حق خود اختیاری دیجئے ورنہ ہم سب ایک ہی مرتبہ اس بار امانت کو پھینک کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ انقلاب زندہ باد!"

میں ـــ کہ ادب پاروں کی ہیئت میں سر کھپانے کی بجائے ان کے مواد و موضوع میں الجھتا رہ جاتا ہوں - اس بات کا تعین نہیں کر پایا ہوں کہ آیا انہیں افسانہ کہوں، انشائیہ کہوں، مضمون کہوں یا کچھ اور البتہ ان میں جو بات قدرِ مشترک ہے وہ ہے خیالات کا سلسلہ، ایک لامتناہی سلسلہ جو اکثر اس وقت ذہن و دل میں پیدا ہونے لگتے ہیں جب وہ زندگی کے آخری دنوں گذار رہا ہوتا ہے، اس کے ذمہ کرنے کے لئے جب کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا اور وہ اپنی آرام کرسی میں نیم دراز یا جھلنگی چارپائی میں لیٹ کر گذرے ہوئے دنوں کو ایک ایک کرکے واپس بلا رہا ہوتا ہے خصوصاً وہ آدمی جس نے مختلف فلسفوں، نظریوں اور اصولوں کو برتا ہو اور ذہن و شعور کی کسوٹی پر پرکھ کر جس فلسفہ کو جس پروگرام کو قبول کیا ہو، جس سے زندگی بھر عملی طور پر نہیں تو ذہنی طور پر وابستہ رہا ہو، وہ عقائد، وہ تصورات، وہ وضع داریاں جن میں اس کی پرورش ہوئی تھی ان کی شکست و ریخت کا تماشہ دیکھا ہو، اسکے لئے تو یہ مرحلہ بہت ہی سخت ہوتا ہے۔

جمیل صاحب کے یہ مضامین بھی ان کی زندگی کے آخری ایام کی چیزیں ہیں۔ جمیل صاحب کا تعلق اس دور سے ہے جس نے ایک ساتھ کئی اہم دانشوروں، کئی بڑے ادیبوں، شاعروں اور کئی بڑے انسانوں کو جنم دیا تھا۔ جمیل صاحب نے اپنے بعد کئی نسلوں کو پروان چڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ بدقسمتی سے یہ تمام نسلیں ان کے دور کے ادیبوں، فن کاروں اور دانش وروں کے مقابلے میں پست قد ثابت ہوئیں۔ جمیل صاحب اور ان کی نسل کے دانشوروں نے جو خواب دیکھے تھے، جس سماج، جس نظامِ حیات کے لئے کوشش کی تھیں یہ نئی نسل ان کو پورا تو کیا کرتی خود لہو لعب میں شامل ہو گئی۔ مذہب، مسلک، ذات پات، اونچ نیچ، بائیں بازو اور دائیں بازو، حکومت کی پٹھو، سرمایہ داری کے پٹھو، مطلب پرستی، خود غرضی، اور نہ جانیں کن کن خانوں میں بٹ کر ان لوگوں نے اپنے کو مردوں میں شامل کر لیا۔ اس صورتِ حال نے ان کو بددل و بدظن ہی نہیں کیا ہوگا ایک ذہنی کرب و قلبی ہیجان میں مبتلا کر دیا ہوگا۔ نہ جانے کتنے خیالات آ اور جا رہے ہوں گے۔

حالات کا یہ سلسلہ واقعتاً ان دانشوروں کا مقدر ہے جنھیں ساری انسانیت کے روشن مستقبل کی فکر ہوتی ہے، یہ ان قدروں کے سمجھنے کی چیز نہیں ہے جن کے حصے میں فقط اللہ ہو، اللہ ہو کی رٹ لکھی ہے۔ (مولوی عبدالمغنی صاحب سے معذرت کے ساتھ)

بہرحال! میری تسلی کے لئے تو یہی کافی ہے کہ میرے اور مجھ جیسے دوسرے نوجوان قارئین کو ان کی انہیں پریشان خیالیوں میں وہ روشنی نظر آ رہی ہے جس سے اس جہانِ نو کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس جنتِ ارضی کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں جہاں سب برابر ہوں گے۔ کوئی کسی کا محتاج نہ ہوگا۔ رہی یہ بات کہ ان ادب پاروں کی ادبی حیثیت کیا ہے؟ ہم اسے اردو کے نثری ادب کا اختراع قائم کہیں یا نہ کہیں؟ تو اس کا فیصلہ آنے والا قاری خود کرلے گا کہ ان کے یہ ادب پارے اپنے اندر زندہ رہنے کی قوت رکھتے ہیں یا نہیں ـــــ !!

ماہنامہ سہیل گیا

کی

دستاویزی پیش کش

علامہ جمیل مظہری نمبر

کیلئے نیک تمناؤں کیساتھ!

دی سنٹرل بورڈ آف داؤدی بوہرہ کمیونٹی

بمبئی

اپنی کمی کا احساس، دُنیا میں کم لوگوں کو ودیعت ہوا ہے۔ کمزوری کا احساس، عظمت کی دلیل ہے۔ لیکن یہ عظمت کم لوگوں کو منظور ہے۔ وہ دُنیا کو فریب دیکر عظیم بنا رہنا چاہتے ہیں۔ اور سیاہی کو عمر بھر سپیدی ثابت کرنے میں مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ برعکس اس کے اگر آپ کو کوئی ایسا فن کار ملے جو اپنی کمی کا اعتراف کرلے تو وہ آپ کی نظر میں کیسی شخصیت کا حامل ہوگا؟ کیا وہ مردِ کردار نہ ہوگا؟ کیا آپ اسے صاحبِ ظرف نہ کہیں گے؟ اور کیا اسے آپ قلندروں کی فہرست میں نہ رکھیں گے؟

علامہ جمیل مظہری ایسے ہی فن کار ہیں، جنھوں نے اپنی کمی کا اور داغ کا احساس کیا ہے جب کہ در اصل انکا حسنِ فن بے داغ ہے۔ اگر انہوں نے اپنی کمی کا احساس کیا ہے تو یہ انکی ظرف نگاہی کا ثبوت ہے جب کہ حقیقت میں وہ جس شے کو داغ بتاتے ہیں، وہ در اصل حسن کا مظہر ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میں جس وقت نظم لکھ لیتا ہوں تو مجھے اپنی
ہر نظم اچھی اور پچھلی سے بہتر معلوم ہوتی ہے
مگر وقت کا ایک دَور گذر جانے کے بعد
جب میں اس کو پھر پڑھتا ہوں تو اس نظم
ہی سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے بھی مایوس
ہو جاتا ہوں۔" (آہنگ، ستمبر ۱۹۸۰ء)

ہوسکتا ہے ماہرِ نفسیات اس قول کو پڑھ کر کوئی حیرت ظاہر نہ کریں لیکن چھوٹ بھیئے جو اپنی تخلیق کو وحیِ الٰہی سے موسوم کرتے ہیں اور کبھی بھی تک تک کی بات نہیں کہتے، اپنے کو مظہری سے بڑا فن کار تصور کریں گے، کیوں کہ ان کے ادبی کاسے میں ٹھیکرے ہی ٹھیکرے ہیں، وہ چاندی کے سکوں کی وقعت کیا جانیں! لہٰذا اُن کے یہاں اعلیٰ ظرفی کا وہ تصور کہاں سے پیدا ہوسکتا ہے جو فن کار کو مادیت

طارقؔ سعید

"ڈرو ۔۔۔ خدا سے ڈرو"

کی زمین سے اُٹھا کر اخلاق کے آسمانوں کی سیر کراتا ہے۔ جو لوگ اپنے کو تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں، اُن کے پاس اخلاقی جرأت کا وہ پیمانہ نہیں جس نے آدم کو ملائک پر افضل کر دیا۔ غلطی بشر کے نفس میں موجود ہے اور کوئی بشر تنقید سے بالاتر نہیں، یہاں تک کہ پیغمبروں کے سوا سبھی چھوٹے بڑے انسان ہدفِ تنقید بنے ہیں اور انہوں نے اعترافِ لغزش بھی کیا ہے اور یہی اعتراف ان حضرات کو عامیت سے اٹھا کر ہمہ گیر بنا دیتی ہے۔ لیکن ایسے کتنے لوگ ہیں جنھوں نے اخلاقی قوت کا وہ ثبوت فراہم کیا ہے جو ان کے مورثین پیش کر چکے ہیں؟ جواب ملے گا، ایسے لوگ گنتی کے ہیں۔ الحادی مادیت یا سرمایہ دارانہ الحاد اس امر کے ذمہ دار ہیں۔ جس شے کو میں اتنا طول دے رہا ہوں، وہی شے جمیل مظہری کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ ظرف و اخلاق ان کا خاصہ ہے۔ ان کی تڑپ نگاہیں اخلاق کے چشمے سے اپنی پیاس بجھانا چاہتی ہیں: ؎

ہر جذبۂ ناصبور پیاسا
دانش پیاسی، شعور پیاسا
مزدوری و بندگی بھی پیاسی
دارائی و خواجگی بھی پیاسی
پیاسا ہے جنوں بھی، خرد بھی
پیاسا ہے غرور بھی حسد بھی
حق یہ ہے کہ دوستی بھی پیاسی

حد یہ ہے کہ تشنگی بھی پیاسی
جلوے پیاسے، نگاہ پیاسی
حیرت بالائے چاہ پیاسی
کچھ شوقِ کنارِ جو بھی پیاسے
کچھ لب بہ لبِ سبو بھی پیاسے
ہر موجِ حیات کی زبانی
اِک تشنہ لبی کا مرثیہ ہے
ہر ساز میں ایک تپشِ نہانی
موسیقی اس کی نوحہ خوانی ۔
فریاد یہی ہے بانسری کی ۔ آواز یہی ہے شاعری کی

اور اس پیاس کے ذمہ دار :

[illegible]
ریگ اور سراب کی ہے ہستی

ہی ہے۔ اس پیاس کی سیری اخلاقیات سے ہی ممکن ہے اور مظہری کا کلام اخلاق، سچائی، سرشاری اور تزکیہ سے عبارت ہے۔ ان کے کلام میں خونِ جگر قطرہ قطرہ کرکے ٹپکا ہے جو "دُردِ تہِ ساغرِ غفلت" نہ ہوکر "صہبائے شعور و اخلاق" ہے۔

؎ میری ہے میرے ہی دل کا ہے نچوڑا ہوا خون
میری ہے چشمِ بتاں کی سے گلفام نہیں
اس کی اِک بوند ہی کافی ہے بہکنے کے لئے
گو مرے جام میں جز دُردِ تہِ جام نہیں

بات سیدھی ہے "کنایہ نہیں، ابہام نہیں" اخلاقیات مظہری کا جوہر ہے جو جذبہ و احساس کے بے محابا فنکارانہ پیکر میں ڈھل کر شاعری کی لاج کا مصداق ہے۔

[illegible] ہزار چیزیں آتی ہیں [illegible]
اس امر کا شاہد ہے کہ ایسی خوبصورت لڑکی جس کا دہکتا شباب کند غار کے آغوش میں شمع کی طرح [illegible] پگھل رہا ہو، اس کی فریاد کون سنے گا! ظاہر ہے کہ ادیب و شاعر نے ہی اسے دلاسا دیا ہے اور اس کی فریاد کو کون دُنیا کے کونے کونے میں پہونچا دیا ہے :

She dwelt among the untroden ways
Beside the spring of the dove.
A maid, Whome there were none to praise,
And very few to love.

— WILLIAM WORDS WORTHS

سازشیں کرتے ہیں آپس میں
کھینچے ہیں مجھے بنارس میں (مرزا شوق)

"جہاں محبت نہیں ہے بچے! وہاں کوئی عورت نہیں رہ سکتی۔ عورت کھالی روٹی کپڑا تو نہیں چاہتی، کچھ محبت بھی چاہتی ہے۔" (معصوم بچہ، پریم چند)

ع کچھ سہارے تو ضروری ہیں محبت کے لئے (جمیل مظہری)

پلا ساقیا ساغرِ بے نظیر
پھنسی دامِ ہجراں میں بدرِ منیر
وہ حسن و جوانی اور اس پر یہ غم
ستم ہے ستم ہے ستم ہے ستم
جہاں بیٹھنا، آہ کرنا اسے
بہانہ نزاکت پہ دھرنا اسے (میر حسن)

—— اور سب سے بڑھ کر بارہ ماسہ صنفِ سخن جو عورت برہا کے لئے وقف ہے، اس وقت مجھے شاد عظیم آبادی کا ذیل کا شعر [illegible] یاد آگیا ہے ؎

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آجاؤ جو تم کو آنا ہے ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

یہ شعر جملہ معترضہ کے طور پر آگیا لیکن تمام شعرا خصوصاً غزل کے شعرا ایسے حالات جس میں فریاد [illegible]

کو پرے رکھ کے دھول دھپے کو ہی موضوعِ سخن بنایا ہے۔ یہاں میر حسن، مرزا شوق، جوش کی ہی تخصیص نہیں، نثر میں بھی نفسیات کے نام پر ایسے سینکڑوں افسانے بلکہ مشہور افسانہ نگاروں کی بھیڑ موجود ہے، جنھوں نے نوجوان لڑکی کے دل سے کھلواڑ کیا ہے۔ یہ مظہری کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ انھوں نے اپنی نظم "ڈرو — خدا سے ڈرو" کو "رومانی" کہدیا ہے ورنہ یہ نظم اخلاق کے اعلیٰ اصولوں پر پوری اترتی ہے۔ اور نوجوان دل کی جانسوز فریاد ہے، جو دل میں اترتی جاتی ہے۔ اس نظم میں واحد تاثر یہ ہے کہ ایک باکردار دوشیزہ ایک ضعیف مرد کی باہنوں میں ڈال دی جاتی ہے۔ یہ حادثہ سماج میں اکثر ہوا کرتا ہے۔ بیشتر شعرا و ادیب ایسی وارداتوں کا نقطۂ عروج لڑکی کے بھاگ جانے پر ختم کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ پریم چند جیسے ادیب نے بھی اپنی کہانی "نئی بیوی" میں عورت کے جذبے کو بے قابو بتاتے ہوئے آخر میں اس کو اسکے نوکر سے متعلق کر دیتے ہیں، جو سستی سنسنی پیدا کرتے ہیں کسی عمر کے نوجوان دل کو مشتعل بھی کرسکتی ہے لیکن مظہری نے یہاں بڑی چابکدستی کا ثبوت دیا ہے کہ دل کے نہاں خانوں میں پوشیدہ اسرار بھی ظاہر ہو جائیں اور عورت کی آبرو و عصمت کی قسم بھی کھائی جا سکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب نظم اخلاقی پیرائے میں ڈھلی ہو اور جذبات کو مشتعل کرنے کے بجائے صبر و تلقین اور استقامت کی راہ دکھائے۔ شاعری کا کام جذبات کو برانگیختہ اور مشتعل کرنا بھی نہیں ہے بلکہ مشتعل جذبات کی تطہیر و تزکیہ شاعری کا نتیجہ ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب کہ نظم میں تزکیہ اور علویت کا سامان مہیا کیا گیا ہو۔ مظہری نے اپنی نظم "ڈرو — خدا سے ڈرو" میں فریادِ نسواں ایسے علویت (DECORUM) کے پیرائے میں کیا ہے کہ پرسوز فریاد، ترانۂ شیریں کی غمازی کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ حیا، حجاب، اور پاکیزگی کے

ساتھ، اللہ کے حضور، نمازوں میں بھی غیر کا تصور آسکتا ہے۔ اگر اپنا رفیق آگ پر آگ رکھنے کے بجائے برف رکھنے کا عادی ہو۔

گھٹا کی طرح زندگی یہ خواب جھومتے رہے
ہوا میں نیند کتھی گھلی، شباب جھومتے رہے
دل اپنی آگ سے نئے شرر نکالتے رہے
ہم اس پہ اپنے فلسفوں کی راکھ ڈالتے رہے
جوانی ایک چھاؤں تھی، گذر گئی، نکل گئی۔ ہمارا

انتظار کر کے دوپہر بھی ڈھل گئی — گویا ایک کم عمر دوشیزہ کو ایک ڈھلی دوپہر ملی تو فن کار کو چاہیئے تھا کہ سخت جھنجھلاہٹ، کرختی، ہیجان اور کلبیت کے عالم میں اپنی بات کہتا مگر مظہری نے اسی بات کو اپنی نظم "ڈرو — خدا سے ڈرو" میں نہایت درد انگیز، مترنم، پرسوز اور دل و دماغ کو پگھلا دینے والے انداز میں کہا ہے۔ یہاں فنکار جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر پیش کر رہا ہے اور اس درجۂ کمال کے ساتھ کہ تطہیر و شائستگی اور شگفتگی کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ اس امر کے ذمہ دار عناصر فنکار کی شخصیت میں پوشیدہ ہے۔ جیسا فن کار ہوگا، جیسی اس کی شخصیت ہوگی، ویسی ہی اس کی شاعری بھی ہوگی۔ مظہری میں ہر جگہ شگفتگی، علویت، شائستگی اپنے اوجِ کمال پر موجود ہے۔ ان میں زندگی ہے، زندگی کی حقیقتوں کا عرفان ہے۔ اور اسے برتنے کا سلیقہ اور عزم موجود ہے۔ زندگی اپنی دشوار ترین صورت میں بھی، تھوڑی دیر اور نا قابلِ برداشت نہ مظہری کے ہاتھوں کسی مقام پر ناگزیر ہو جائے۔ برعکس اس کے، پریم چند سے لیکر منٹو تک اور غالب سے لیکر جوش تک اور ان حضرات کے بعد بھی ایسے بیشمار فن کار میسر ہیں جنھوں نے زندگی کو نہایت سخت اور دشوار بنا دیا ہے اور اس کو بغاوت، گمرہی اور تاریک کھنڈروں سے

والے راستوں کی طرف موڑ دیا ہے۔ ادیب یا شاعر کو چاہیے کہ اقدارِ حیات کو قائم رکھتے ہوئے اپنے قاری میں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے دو چار ہونے' اس سے نبرد آزما ہونے اور اس کی آزمائشوں سے گذر جانے کی صلاحیت پیدا کر دیں۔ ان کو یہ قطعی زیب نہیں دیتا کہ وہ زندگی کو مزید تلخ بنا دیں اور قاری کی بچی کھچی حرارت کو بھی چھین لیں۔ ادب کا کام حرارت و قوت پہونچانے کے ساتھ ایک ایسی مسرت بخش فضا کی بازآفرینی ہے جس میں قاری' زندگی کی محرومیوں' حبس اور گھٹن کو تھوڑی دیر کے لئے بھول کر کے ایک نئے حوصلے کے ساتھ زندگی کے فاسد مادے کو شرر انبساط سے پھونک دے۔ اس عمل میں جو فن کار استحکام پیدا کر دیتا ہے' وہ قاری کو ہی نہیں' ادب کو بھی زندگی بخشتا ہے۔ مظہری کی نظم " ڈرو — خدا سے ڈرو" ایسی ہی توانائی اور زندگی کی عکاسی ہے جس میں حسن و شباب زوال کے تاریک قفس میں عروج و تابانی کو دیکھ کر [illegible] ہے لیکن مایوس و خودکش نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ [illegible] یہاں زندگی بھوگنے کا نشہ اتنا تیز ہے کہ اگر اس کی آنکھیں [illegible] باقی ہیں یا اس کا کاجل پھیلتا ہے تو اس میں کوئی [illegible] حرفِ معتبر کے حکم کی طرح اپنی تیز [illegible] اور بتول [illegible] اس کو پیش کرتی ہے ؎

نشیلی نگاہوں کا جادو سلامت
یہ صدقے ترے آنکھیں ہیں گویں ڈبڈبائی
طراوت ہو اور آئینہ تیرے [illegible] ہو

اسی طرح جب [illegible] کا جل پھیلا ہو
ادا و ناز [illegible] محبت میں [illegible] حسن کی [illegible]
مگر [illegible] کی [illegible] ہو گی کہ
[illegible] اس حسن [illegible] کے دلوں میں آگ لگاتا ہے
اگر شعلہ [illegible] تو زندگی کو جینے کا [illegible]
[illegible] زندگی کی توانائی و

ترنم اگر چوڑیوں کے ساز میں موجود ہے تو ان چوڑیوں کی ساز کی مضراب پہلے ہوئے کاجلوں میں محفوظ ہے۔ [illegible] میں سے اگر کوئی ہنگامہ ہستی کا اشکار ہو کر غم [illegible] ہو جانے کی سازش میں اگر مصروف ہو تو بھی دیوانگی ان کے قریب نہیں آتی۔ اور نہ ہی شعلہ اپنی تیرگی [illegible] کی تہہ سے اٹھا کے شعلہ بار ہے جس میں الاؤ نے شعلہ جب گر رہی ہو

نہ ڈالا جاتا ہے تم سے پانی نہ ناپی جاتی ہے آگ تم سے

جمیل اس کو وہی سنے گا ہے زندگی جس کی خود فسانہ
ہے کاجلوں میں بھی ایک کہانی ' ہے چوڑیوں میں بھی ایک ترانہ
نہ تیرے آنچل پہ داغ کوئی' نہ اس گریباں میں چاک کوئی
خرد کے مارے ہوئے ہیں دونوں' نہ تو دِوانی نہ میں دِوانہ

زندگی کی آزمائشوں سے پوری شان سے سلامتی کے ساتھ گذر جانے کی اپیل نظم " ڈرو — خدا سے ڈرو " کا مرکزی نقطہ ہے جو فریاد کی پگھلی چاندنی بن کر [illegible] ہے۔ اس پگھلی چاندنی کے چند ترشے [illegible] ہیں ؎

مجھے نہ یاد کرو
سنو جمیل! تم سے یہ گذارش ہے
یہ آرزو نہیں دل بے نظر کی سازش ہے
سمجھ لو یہ کہ محبت بھی ایک خواہش ہے
اے جنون نہ بناؤ ڈرو خدا سے ڈرو [illegible]

اِدھر اُدھر نظر رکھا تو سامنے تم ہو
[illegible] ہوا ہے جو پردے تو سامنے تم ہو
کروں خدا کے جو سجدے تو سامنے تم ہو
[illegible]

جو پاس چاہے کہ ان کے [illegible]
تو خود بھی [illegible] ہوں [illegible]
تک [illegible] کے شکر ڈال میں [illegible]
نہ [illegible] بناؤ ڈرو خدا سے [illegible]

کہاں رکھوں دلِ خانہ خراب کی میت
کنوارے پن کے تمام ارمان خواب کی میت
میں خود اٹھا رہی ہوں اپنے شباب کی میت
نہ ہاتھ اپنے لگاؤ، دور خدا سے دور، مجھے نہ یاد کرو

میں دل میں رنجِ محبت کا بو نہیں سکتی
حیا کا نام ڈبو دوں، ڈبو نہیں سکتی
کسی طرح بھی تمہاری میں ہو نہیں سکتی
میں صدقے، جی نہ کڑھاؤ، دور خدا سے دور، مجھے نہ یاد کرو

میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں تمہیں خدا کی قسم
شکستہ جانیٔ عذرائے بے وفا کی قسم
جو جل رہی ہوں [illegible] اس چتا کی قسم
میرے قریب نہ آؤ، دور خدا سے دور، مجھے نہ یاد کرو

یہ فریاد کی چیخ جو عہد و حیا کے نام وقف ہے، قاری کو ایک طرف تو تزکیہ و استقامت کی طرح لے جاتی ہے تو دوسری طرف ایک جانکاہ کرب میں مبتلا کرتی ہے جو داغِ مرگ کا مصداق ہے۔ یہی داغ، اس نظم کا داغ ہے جس سے قاری کبھی کبھی مذہب اور اخلاقیات کو کالے دھبے کے مانند دیکھنے لگتا ہے، جو فن کار کی ناکامی ہے۔ فن کار کی ناکامی اس کے مطالعے کی کمی یا اس کے تیز جذبات کی سیلانی کے سبب ہے۔ اس کے سامنے "مسلمان گھرانے" کی ایک ایسی دوشیزہ ہے جس کی شادی نامساعد حالات کی بنا پر اس کے والدین نے ایک بوڑھے سیٹھ سے کر دی جس کے شباب کی شمع گل ہو چکی ہے۔ اس طرح کے واقعات مسلم معاشرے میں آئے دن ہوا کرتے ہیں، فن کار کے دل کا دھارا ایسے واقعات پر دو طرف بہہ سکتا ہے۔ پہلا رخ وہی ہے جسے مظہری کا تخیل پسند ملا بوڑھی نیری پر شباب کی چتا کو بتدریج جلا کر خاکستر کر دینا چاہتا ہے تاکہ شباب تپ کر تو حیا کی تصویر بن جائے اور اس کا اعتبار بھی دنیا تک قائم رہے۔ دوسرا رخ بظاہر جرأت مندانہ کا فیصلہ معلوم ہوتا ہے لیکن بہرحال

یہ بڑا قدم ہی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ شباب کو چاہیے کہ بنجر اور بوڑھی زمین کو ترک کر کے زرخیز، جوان زمین، رنگین محل سرا اور دیوان خانوں میں بسیرا لے۔ اس ترک سے اخلاقی دیواریں منہدم ہوتی ہیں لیکن فن کار کو اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے، وہ شباب کو اس کا حق دلوانا چاہتا ہے چاہے یہ کوٹھے سے ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ راستہ فرار کوتاہ دستی اور اپنی ذات پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ پہلا راستہ جو مظہری نے اپنایا ہے، اس میں مظلومیت کے ساتھ خود سپردگی کے جذبات موجود ہیں۔ دوسرا راستہ جو دیگر فن کار اپناتے ہیں، اس میں بے منزل رندی کے ساتھ فرار ہے۔ آخر مسلمان دوشیزہ ان دو راستوں کے سوا تیسرا راستہ بھی اختیار کر سکتی ہے، جو خودکشی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مظہری ہی نہیں منکرِ اخلاق فن کار بھی اس کو فرار سے گردانتا ہے۔ لہٰذا مظہری جیسا روایت پسند اس موضوع پر لکھی گئی نظم میں نہ تو بے منزل رندی کی فراریت کو منظور کرے گا اور نہ ہی خودکشی جیسی بزدلی کو، بلکہ ایسی سپردگی اور عاجزی کو ترجیح دے گا جو مایوس نہ ہو کر پوری حوصلگی کے ساتھ زندگی کی چتا میں جل جل کر شباب کی آبرو کو بچا سکے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں نظم میں جذبات و احساسات کا طوفانِ بلاخیز موجزن ہونا ضروری ہے، لیکن شاعر خدا جانے وجدان و ادراک کے ذریعہ انھی کی مجبوری بسری یادوں میں سے کسی ایسی دبتی کی بازیافت کر لیتا ہے، جس کا حاصل نہ تو فراریت ہوتا نہ سپردگی تو اس نظم کا حسن کہیں سے کہیں پہنچ جاتا۔ اور نظم کلاسیکی فن کے زمرے میں سرِ فہرست گنی جاتی۔ یہ کام تیز جذبات کی رو میں زیادہ ممکن ہے۔ فن کار جذبات کی برق رفتاری سے فائدہ اٹھا کر انھی کے بیدار تجزیاتی آسانی سے داخل ہو سکتا ہے۔ یہاں زندگی گزارنے کی بیش بہا قیمتیں موجود ہیں، اپنی کام کی چیزیں

کرکے، واپسی پر اگر وہ چاہے تو اس کو اس کی جگہ بکھیر دے وہ خوبی ٹانک سکتا ہے، جیسے کہ اس نے حال و مستقبل کی چند اور موتیوں کو ٹانکی ہیں۔ مظہری تاریخ کا دور دراز، سخت و سنگلاخ سفر کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کے جذبات کو اتنی فرصت نہیں کہ بچھڑے دنوں کی یاد دوبارہ تازہ کر سکیں۔ جب کہ ماضی کے سنہرے صفحات میں تاریخ نے ایسے بیشمار حسن و شباب کے نقشے چھوڑے ہیں جو کسی بھی فن کار کے لئے خاصے کی چیز ہیں۔ کیا تاریخ ایسی مسلمان دوشیزہ کو پیش کرنے سے قاصر ہے جس نے خودسپردگی، خودکشی اور خودشکنی کے راستوں کو چھوڑ کر ناساعد حالات میں کوئی چوتھا راستہ اختیار کیا ہو۔ فن کار کا تجربہ تو بہرحال عاجز ہے لیکن تاریخ کا تجربہ عاجز نہیں۔ تاریخ میں ایسی بے شمار شمع و شیریں و بلبل موجود ہیں۔ جنھوں نے بوڑھے پتنگے سے نجات حاصل کرکے شباب کی راتیں جوان پتنگے کی آغوش میں گذاری ہیں، اس میں ہوتا یہ ہے کہ شمع بوڑھے پتنگے کی غیرت کو چیلنج کرتی ہے اور کہتی ہے تیرے ساتھ میری جوانی راتیں گذرنے والی نہیں ہے۔ تو مجھے ناپسند ہے اور تیرے پروں میں وہ حرارت و حرکت نہیں ہے جو شباب کی راتوں میں سوز و ساز پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اگر اس پر بھی بوڑھا پتنگا ٹس سے مس نہیں ہوتا اور لمبی لمبی سانسیں کھینچتا، کھانستا اپنے ریشہ دار پیروں سے شمع کے گرد چکر لگا کر اس کی آبرو کی حفاظت کے عہدِ وفا پر پوری ہٹ دھرمی کے ساتھ جما ہوا ہے تو شمع اپنے دل کی فریادی بن کے سماج کے [illegible] ہے۔ اپنی برادری کے اجتماعی احوال سے فریاد کی چیخ بن کر افراد کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ شمع و پروانہ کا چودھری ان کی فریاد سنتا ہے۔ اور پروانے کو حکم ہوتا ہے کہ وہ بھڑکتی شمع کا پیچھا چھوڑ دے، وہ اس کے لائق نہیں ہے اور شمع کی اپیل منظور کرتے ہوئے اسے نئے دوسرے پروانے سے رجوع کرنے کو کہا جاتا ہے تاکہ اس کی جوان راتیں شعلوں کے شباب میں گذر سکیں۔ اس پورے عمل کو مسلمانوں کی تہذیب میں "خلع" سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ طریقہ اس بدترین سماج اور زندگی کی سخت ترین، دشوار گذار حالات میں بھی موجود ہے۔ افسوس ہے کہ بیشتر فنکار اسلام کو نہلزم، فاشزم، سیکولرزم، کمیونزم، سوشلزم نیشنلزم اور نہ جانے کتنی قسم کے ازم سے جوڑ دیتا ہے لیکن اسلامی حمیت و اخلاق کا کہیں تذکرہ بھی نہیں کرتا۔ یہاں فن کار کے مطالعے کی وسعتوں کا امتحان ہوتا ہے۔ "خلع" کے اصول کو دہرا کر اگر مظہری چاہتے تو نظم کی سپردگی اور عاجزی کی فضا کو ختم کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا، یا انہیں یہ یاد نہ رہا، یا وہ اس مسئلے کو جذبے کی جس طغیانی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا چاہتے تھے، وہ طغیانی یک رخی تھی۔ اس میں اتنی سکت ہی نہ تھی کہ دماغی موجوں پر تھوڑا سا قابو پاکر ماضی کے راندہ و ماندہ واقعات کی تہوں میں غوطہ زنی کر سکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہوتا جب فن پارہ، علم و ادب، مطالعہ و فن اور فکر و لطافت کی باہم آمیزش تیار ہوتا۔ فن کار اگر محض ادیب ہی، عالم، اسکالر اور مفکر نہیں ہے تو اس کا ادب فنی، لطیف اور دلی جذبات کا تو اظہار ہوگا مگر کلاسکی ادب میں داخل نہ ہو سکے گا کیونکہ یہاں علم کی کسوٹی، وسعت مطالعہ کی باریکی اور فکر کی تہذیب کی آزمائش ہوتی ہے۔ لہٰذا علامہ جمیل مظہری کی نظم "دو خدا سے ڈرو" اپنی شاعرانہ لطافتوں سے مالا مال ہوتے ہوئے کلاسیکی خوبیوں سے عاری ہے اور یقیناً یہ چیز کسی بڑے شاعر کی ناکامی بتائی جائے گی، جو مظہری مرحوم کو کبھی قطعی منظور نہ ہوتی۔ وہ زندہ ہوتے تو اس نظم کو یقیناً نئے نہج سے اور اس میں بیکراں فنی صلاحیتوں سے سپردگی کی فضا کو ختم کر دیتے اور تبدیلی جرأت اور چیلنج کی تصویر سامنے پیش کرتے اور اس نظم کو کلاسیکی درجہ نواز دیتے۔ اور اس طرح ان کے

ماہنامہ **سہیل** گیا

کی

علامہ جمیل مظہری نمبر

نکالنے پر

جو اردو ادب میں تاریخی

سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

مبارکباد

سکریٹری بوہرہ یوتھ ایسوسی ایشن اودے پور

پوسٹ بکس ۲۶

اودے پور (راجستھان)

شاہین بدر

جمیل مظہری اور اُن کی شاعری

علامہ جمیل مظہری کا نام دُنیائے اُردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ جمیل مظہری اُردو اَدب کی ایک باوقار اور بلند و بالا شخصیت تھے۔ نظمیں ہوں یا غزلیں، افسانے ہوں یا مضامین، مثنوی ہو یا مرثیہ —— یا قصیدہ، انہوں نے ہر صنفِ ادب پر طبع آزمائی کی اور اپنے افکار و خیالات کے نقوش چھوڑے۔ جمیل مظہری تنگ نظر سمندر کے بجائے ایک ایسے وسیع القلب قطرے کی صفت رکھتے تھے جس سے تشنہ لب سیپ کی پیاس بجھتی ہے۔ دبستانِ بہار میں شاؔد اور یگاؔنہ کے بعد اگر کسی شاعر کو ہمہ گیر شہرت نصیب ہوئی تو وہ علامہ جمیل مظہری ہیں۔ جمیل مظہری کی شاعری کا زمانہ نصف صدی پر محیط ہے۔ انہوں نے قدیم استعارے، قدیم علامتیں اور تشبیہیں بڑے ہی حسین اور دلکش انداز میں استعمال کیں اور بیشتر گھسے پٹے الفاظ میں نئی روح ڈالدی۔

جمیل مظہری کا اپنا ایک فلسفہ ہے جسے شاعری کے ذریعے انہوں نے دوسروں تک پہونچانے کی کوشش کی۔ شاعری کو انہوں نے اپنے اظہارِ غم کا ذریعہ بنایا اور اپنے فکر و نظر کی کربناکی کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ ایک شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

حدود میں وہ خس و خاشاک کے وہ آنہ سکی
بہت لطیف تھی تخئیل آشیانے کی

سب سے پہلے جمیل مظہری ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے اُبھرے۔ اُن کی ایک رومانی نظم —— "شاما کی یاد میں" ۱۹۲۳ء میں رسالہ "چمنستان" کلکتہ میں شائع ہوئی اور کافی پسند کی گئی۔ چند بند ملاحظہ فرمایئے ؎

سرکتی ہے چہرے سے زلفیں کسی کی
ہوئی جاتی ہے چاندنی پھیکی پھیکی
کہیں دل نے چھیڑا ہے سازِ محبت
سنو آرہی ہے صدا بانسری کی

جو بُو تیری زلفوں کی آتی نہیں ہے
چمن میں کلی مسکراتی نہیں ہے
تری جستجو میں ہیں گنگا کی موجیں
کہ تو اَب نہانے کو جاتی نہیں ہے

ترے جلوے پنہاں ہیں اب تک نظر میں
پریشاں ہیں آہیں تلاشِ اثر میں
اس اُجڑے ہوئے دل میں تیرا تصوّر
کہ چھٹکی ہوئی چاندنی ہے کھنڈر میں

زبان شاداب و شگفتہ، بحر رواں دواں، تخئیل میں نزاکت و لطافت اور جذبۂ اظہار کا متوازن انداز —— یہ اللہ کی بخشش کا نادر تحفہ تھا لیکن جمیل مظہری اپنے کلام کے چند نمونے دکھانے کے بعد فضل اُستاد حضرت [illegible] نے فرمایا تھا "آپ کو اصلاح کی ضرورت نہیں" —— جمیل مظہری خوش فکر شاعر تھے۔ اُن کی ایک [illegible]

میں ندیم گیا کے نہار نمبر میں شائع ہوئی تو اُردو شاعری کی دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اس ایک غزل نے انہیں شہرت کی بلندی پر پہونچا دیا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا
خدا کی رحمت پہ بھول بیٹھوں یہی تو معنی ہیں اسکے وعظ
وہ ابر کا منتظر کھڑا ہو مکان جلتا ہو جب کسی کا
ہے روح تاریکیوں میں حیراں بجھا ہوا ہے چراغِ منزل
کہیں سرِ راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا

مندرجہ بالا اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا ہی سے جمیل مظہری کی زبان میں سلاست و فصاحت اور اسلوب میں روانی و برجستگی تھی۔ علامہ کا یہ شعر تو معرکہ آرا ثابت ہوا ؎

سیاہیاں بُن رہی ہیں راتیں، تجلیاں گڑھ رہی ہیں سورج
خدا اور ابلیس کی شراکت میں چل رہا ہے یہ کارخانہ

مذہبی تعصب سے دور، اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو علامہ جمیل مظہری کا یہ نظریہ موجودہ صدی میں بالکل درست ثابت ہوگا۔ اور اب ذرا خدا کے تصوّر کو سمجھنے کی کوشش کے مظاہر دیکھئے ؎

شعور بدلا نگاہ بدلی، بدل گیا شوق کا تصور
مگر تلاشِ سکوں وہی ہے، وہی نتیجہ ہے جستجو کا

صفات بخشے، مکان بخشا، جگہ جگہ اک حرم بنایا
ہماری صورت گری نے آخر خدا کو بھی اک صنم بنایا

اور آگے بڑھئے تو ایسے اشعار بھی ملیں گے ؎

جو سجدۂ شکر میں جھکا ہے، ہنسو نہ اس فاقہ کش گدا پر
خدا نہ کردہ یہ وقت آئے کہ بندگی طنز ہو خدا پر
نہ اپنے دل کی لگی بجھاؤ، نہ کر جہنم کا تذکرہ یوں
سنبھال اپنے بیاں کو واعظ کہ آنچ آنے لگی خدا پر

صنم گری جسے کہئے وہ مشغلہ تو رہا
خداگری جسے کہئے وہ خود گری نہ رہی

میں خدا کو پوجتا ہوں، میں خدا سے روٹھتا ہوں
یہ وہ نازِ بندگی ہے جسے پوچھئے خدا سے

ایک طرف تو جمیل مظہری کہتے ہیں ؎

کلاہ داروں سے کوئی کہہ دے کہ یہ وہ منزل ہے ارتقا کی
جہاں خدا کے صفات پر بھی نظر ہے [illegible] کی ناقدانہ

ہے تیرے صحرائے آفرینش میں کوئی جائے پناہ ایسی
لگائے بستر جہاں مسافر لٹا ہوا شہرِ آرزو کا

کچھ ایسا اُجڑا جمیل کا دل کہ ہر طرف اک مقام ہُو ہے
بتوں کا کیا تذکرہ ہے ہمدم، خدا کا بھی اب گذر نہیں ہے

اور دوسری طرف خدائے ذوالجلال والاکرام سے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ التجا کرتے ہیں ؎

اے میرے خدا جس مٹی سے جباروں کے دل بنتے ہیں
اُس مٹی میں مجبوروں کے کچھ آنسو بھی شامل کر دے
اے میرے خدا ان تنکوں کو کشتی کی طرح بہنے جو نہ دے
کشکول نہ بھر اس دریا کا، اس دریا کو ساحل کر دے
اے میرے خدا جو صدیوں سے تخلیق کے دل کی دھڑکن ہیں
بہتر ہے کہ اب ان رازوں کو سرمایۂ آب و گل کر دے

کلام کی اس روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ جمیل مظہری کو تصوف سے کوئی سروکار نہیں۔ کبھی خدا سے تصادم کبھی طنز اور

نوٹ: ۱؎ نو جمیل "میا مین" کی جگہ ہے "تحریب" جو یقینا کتابت کی غلطی ہے۔ علامہ سے ایسی غلطی کی توقع نہیں۔" (ش۔ پ)

کبھی (انتہا)   اور کبھی قہر و جبر کا احساس ؎

ہم ہیں شاعر، ہمیں اس بحث سے مطلب، ہم تو
اپنی خواہش کو سمجھتے ہیں مشیت اس کی

ابتدائی دور میں جمیل مظہری کی شاعری پر کبھی اختر شیرانی اور اقبال کا اثر غالب رہا ہے تو کبھی مجاز اور جوش کا رنگ ـــ ان کی نظم "فلسفۂ اخلاق" "بعد المشرقین" "نوائے جرس" وغیرہ پر جوش کا رنگ غالب ہے اور "پیام" "اے مرد جوان ایمان" وغیرہ پر علامہ اقبال کا اثر نمایاں ہے۔ نظم "شاہا کی یاد میں" کا یہ بند ملاحظہ ہو ؎

ترے جلوے یہاں ہیں اب تک نظر میں
پریشاں ہیں آہیں تلاشِ اثر میں
اس اجڑے ہوئے دل میں تیرا تصور
کہ چھٹکی ہوئی چاندنی ہے کھنڈر میں

تقریباً اسی خیال کو علامہ اقبال فارسی میں یوں کہہ گئے ہیں ؎

اگر کاوی در و تم را خیالِ خویش را یابی
پریشاں جلوہ چوں ماہتاب اندر بیابانے (زبور عجم)

اسی طرح جمیل مظہری کی نظم "مثلث" پر بھی اقبال کا رنگ مسلط ہے۔ جمیل مظہری کہتے ہیں ؎

سن میرے دل کی دھڑکنیں میری خودی کے رازداں
میرا مذاقِ شاعری ہے میری روح کی فغاں
دامِ تخیلات میں طائرِ عرش پر فشاں

علامہ اقبال کو سنئے ؎

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

جمیل مظہری کی اکثر غزلیں اقبال کی زمین میں اور انہیں کے رنگ میں ہیں، اگرچہ خیالات جدا ہیں۔ اقبال کے یہاں خودی کا جو تصور ہے وہ جمیل کے یہاں نہیں۔ جمیل مظہری کا ایک شعر ہے ؎

جو ٹھوکر کہ میرے دل پر پڑی وہ یاد کہاں ہے بیلیوں پر
اے بہلی والے تیز نہ چل اس میں رکھا کبھی میرا ہے

اس شعر پر حضرت شیخ سعدیؒ کا شعر یاد آتا ہے جب وہ کہتے ہیں ؎

ساربان آہستہ رو کآرام جانم در محل است
اشتراں را بار بر پشت است و ما را بر دل است

رفتہ رفتہ جمیل مظہری اس دائرے سے باہر نکل آئے جہاں کسی کا کلام ان پر اثر انداز ہو۔ انہوں نے اپنا رنگ قائم کیا۔

۱۹۳۵ء سے ہندوستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک میں تو بیشتر شعراء و ادباء اس کے جلسے میں شریک ہوتے چلے گئے۔ جمیل مظہری اس گروپ میں شامل تو نہیں ہوئے لیکن اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مندرج ذیل کلام سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ ترقی پسند خیالات سے کتنا متاثر تھے

غبارِ کارواں ہم ہیں، نہ پوچھو اضطراب اپنا
کبھی آگے کبھی چلتے ہیں کبھی پیچھے کبھی چلتے ہیں

آگہی کی یہ دکانیں کب تلک بیچیں گی زہر
ہوگا آخر یہ دیارِ عقل ویراں کب تلک
ان کے پھولوں سے کریگی کب تلک دنیا سنگار
اپنے انگاروں پہ لوٹے گا گلستاں کب تلک
تیرگی کے سرمگیں آنسو پییں یہ دھندلے نجوم
ان سے مانگے اپنی چاندنی کا شبستاں کب تلک

نوٹ: یہ لینن بہت پہلے کہہ چکا ہے :

ONE STEP, BACKWORD!

TWO STEPS, FORWORD!!

اک وہ روشنی جس کی پردہ دار ہو ظلمت
اک وہ تیرگی جس کا پردہ پوش اُجالا ہو
کیا کہیں نظر والے جب تمہاری دُنیا میں
تیرگی بھی دھوکا ہو، روشنی بھی دھوکا ہو

قافلہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتے رہتا ہے لیکن معاشرے میں پھیلے ہوئے ظلم و استبداد اور ... افسردگی کے غبار سے فضا گندہ ہی رہتی ہے۔ جمیل مظہری کو اس کا احساس ہوتا ہے تو کہتے ہیں ؎

یہی رہے گی فضا میں گھٹن تو کارواں سارا سو نہ جائے
جرس سے کہہ دو کہ اور چیخے جمیل کو نیند آرہی ہے

اور اس کے بعد وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوتے ہیں تو ذرہ ذرہ ان کا ہم نوا نظر آتا ہے۔ روشنی اندھیرے سے برسرِ پیکار دکھائی دیتی ہے۔ غبارِ راہ منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔ موجیں دھارے سے سرکشی کرتی نظر آتی ہیں۔ رات کی سیاہی نئی صبح کے حسین سورج کا پیغام دیتی ہے۔

چنانچہ جمیل مظہری کہتے ہیں ؎

غبارِ اٹھ اٹھ کے سست ذروں کو انکی منزل دکھا رہا ہے
بہار آ آ کے ہر حقیقت کو اک تبسم سکھا رہی ہے

اے شوق سلامت رہیں یہ وقت کے دھارے
تنکوں کا سفر ہے انہیں موجوں کے سہارے

نقشِ رنگ و بُو بھی بدلا، طبیعتِ آب و گل بھی بدلی
فسانے بنتے گئے حقیقت، حقیقتیں بن گئیں فسانے

جو راہ کے ڈھیر رہ گئے ہیں، وہ اب اُٹھیں گردِ راہ بن کر
ہوا کی رفتار کہہ رہی ہے کہ قافلہ ہو چکا روانہ

اُن ستاروں کی اُجالے میں ضرورت کیا ہے
جو اندھیرے میں چراغِ رہِ فردا نہ بنے

بدل جاتے ہیں دل، حالات جب کروٹ بدلتے ہیں
محبت کے تصور بھی نئے سانچوں میں ڈھلتے ہیں

اُجالے کے پجاری مضمحل کیوں ہیں اندھیرے سے
کہ یہ تارے نکلتے ہیں تو سورج بھی اُبھرتے ہیں
گئے وہ دن کہ جب زخمِ تمنا گل کھلاتا تھا
کہ اب تو زندگی کے کھیت انگارے اُگلتے ہیں
انہیں حسرت زدہ آنکھوں کو دیکھے ہیں وہ آنسو بھی
جو اکثر دھوپ میں محنت کی پیشانی سے ڈھلتے ہیں

اے مسافر قدم بڑھا جلدی
بجھ رہا ہے چراغ منزل کا

وقت اب وہ ہے کہ مظلوموں کے نالوں سے جمیل
ایک مدت پہ سکوتِ لبِ قدرت ٹوٹے

"مزدور کی بانسری" "دعوتِ عزم" اور "صدائے جرس" جیسی نظمیں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ جمیل مظہری کے احساسات و خیالات کا یہ عالم ہو گیا کہ بقول فیض ؎

"اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا"

چنانچہ وہ اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

وہاں تیری شبِ غم کی درازی کون ناپے گا
جہاں فاقہ کشوں کے دن بڑی مشکل سے ڈھلتے ہیں
بہلتا ہے ترا دیوانہ زنجیروں سے زنداں کی
تری پازیب کی جھنکار ہے شورِ سلاسل میں

جمیل مظہری کا رشتہ زمین سے بہت گہرا ہے۔ اکثر شعراء کی طرح انہوں نے زمین پر رہ کر آسمان کی باتیں نہیں کیں۔ وہ اسی دھرتی کے سپوت ہیں۔ ان کے خیالات و افکار میں زمین کی دلکشی، اس کی رنگینی اور رعنائیاں رچی بسی ہوئی ہیں۔ انہوں نے اپنے وطنِ عزیز کو غلامی کی زنجیر میں جکڑا ہوا دیکھا تو مردِ مجاہد کی طرح میدانِ عمل میں آئے اور اپنے قلم سے رائفل کا کام لیا۔ "نوائے جرس" اور "اے مردِ جواں چل" جیسی نظمیں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ دوسرے فرزندانِ وطن کی طرح جمیل مظہری بھی انگریزوں کی نظروں میں کھٹکنے لگے اور بالآخر انہیں بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

انقلابِ عالم کی چکی چلتی رہی اور آخر سرزمینِ ہند نے بھی رجعت پسند قوتوں سے نجات حاصل کی۔ آزادیٔ ہند کے بعد جمیل مظہری نے بھی "جشنِ آزادی" اور "یومِ آزادی" جیسی نظمیں کہیں اور اپنے پاکیزہ اور پُرخلوص جذبے کا اظہار کیا ـــــ زمین پر رہ کر لوگ آسمان کی پوجا شروع کر دیتے ہیں اور زمین کو آسمان کے مقابلے میں کمتر اور حقیر سمجھتے ہیں۔ لیکن جمیل مظہری کو زمین کی قدر و قیمت کا اندازہ ہے۔ وہ آسمان کی بلندیوں کی طرف پرواز نہیں کرتے بلکہ آسمان کی بلندیوں کی خواہش رکھنے والوں سے کہتے ہیں ؎

یہ اک سوال ہے میرا بلندیوں سے جمیل
کہ یہ زمین نہ ہوتی تو آسماں ہوتا؟

انہیں استعارے میں مشورہ دیتے ہیں ؎

موتی بننے سے کیا حاصل جب اپنی حقیقت ہی کھو دی
قطرے کے لئے بہتر تھا یہی قلزم نہ سہی دریا ہوتا

زمین اور آسمان کے رشتے کا پتہ اس شعر سے بھی لگایا جا سکتا ہے ؎

اے فلک کے سینے کے داغ ہیں یہ جو تیرے تارے چمک رہے ہیں
زمیں [illegible] جو ارضِ چمن کے چھا رہا ہے

جمیل مظہری خود اپنی محبوبۂ دل نواز سے، جو اس دھرتی کی بیٹی ہے، کہتے ہیں ؎

اسی مٹی سے فطرت کتنے نازک دل بنا لیتی
جو میری خاکِ تربت میں ترے آنسو ملے ہوتے

جمیل مظہری کا اصل میدان ان کی رومانی شاعری ہے۔ قوسِ قزح کے رنگین لہرے ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ جمیل اپنے اسی رنگ میں چمکے اور آسمانِ ادب کے درخشاں ستارہ بنے۔ جمیل مظہری کی شاعری میں رومان رچا بسا ہوا ہے۔ اختر شیرانی نے اردو کی رومانی شاعری کو "سلمیٰ" اور "عذرا" جیسے کردار عطا کئے۔ جمیل مظہری نے اپنے تصوراتی رومان کے ذریعہ شاما، عذرا اور رادھا کو اردو ادب میں پیش کیا۔ اختر کی سلمیٰ اور عذرا کی طرح جمیل کی شاما، عذرا یا رادھا مقبول تو نہیں ہوئی لیکن شاعر نے ہر ہر قدم پر ان تینوں کی قربت محسوس کی اور اسے بصد خلوص اپنے اشعار میں سمو دیا۔ جمیل مظہری اپنی محبت میں آزادی چاہتے ہیں اور سماج کی بندشوں اور پابندیوں کے سامنے سرِ خم نہیں کرتے۔

اردو شاعری میں آج جہاں جوش اور فراق ادبِ عالیہ کی آبرو سمجھے جاتے ہیں، وہاں جمیل مظہری بھی ان کے شانہ بہ شانہ نظر آتے ہیں۔ جمیل مظہری کے طرزِ بیان کی شگفتگی، حسن و عشق کی دلکش داستان سرائی، جذبات کی شدت، احساسات کی نزاکت، خیالات کی نفاست، زبان کی لطافت، لہجے کی شیرینی اور ترنم کی پرکیف فضا انہیں موجودہ دور کا باوقار شاعر قرار دیتی ہے۔ جمیل اپنی انہیں خصوصیات کی بدولت اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

جمیل مظہری کی رومانی نظم "شاما کی یاد میں" رسالہ "چندن" کلکتہ میں ۱۹۳۲ء میں شائع ہو کر بے حد مقبول ہوئی۔ اور جمیل بھی اس نظم کے ساتھ ساتھ مقبول ہوتے چلے گئے۔ یہی نظم "تارِ سحر" کے عنوان سے "نقشِ جمیل" میں شامل ہے۔

سہ ماہی "چندن" حضرت سہیل عظیم آبادی کی ادارت میں نکلا کرتا تھا۔ سہیل اس وقت خود سہیل جمیلی لکھا کرتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سہیل مرحوم کو علامہ سے کتنی عقیدت تھی۔ بہر کیف! جمیل مظہری کو اپنی جادوگری کا اندازہ تھا۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں ؎

جمیل اپنی سخن وری بھی فسوں گری ہے، مصوری ہے
بنا کے تصویر مہ جبینوں کی رنگ بھرتا ہوں آرزو کا

میں چلتا رہا مظہری اپنی دھن میں
بتوں نے بلایا، خدا نے پکارا!

جمیل مظہری اپنی منزل کی طرف تیزی سے بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ ؎

زندگی کے دام لاکھوں تھے مگر ہر دام کو
تیری زلفِ خم بہ خم کا سلسلہ سمجھا تھا میں

اب جمیل مظہری کے کچھ رومانی اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

سمو رکھی تھیں جن میں مظہری نے دھڑکنیں دل کی
تم ان غزلوں کو بھی شاعر کا اندازِ بیاں سمجھیں

ہمارا سورج تمہیں ہو عذرا، تمہیں سے یہ سوزِ شاعری ہے
تمہارے شاعر کی زندگی بھی، غریب ذرّوں کی زندگی ہے
نگاہ کا بھید پا لیا ہے، حسین مکھڑا چھپا لیا ہے!
کسی نے گھونگھٹ بڑھا لیا ہے کہ دھوپ سائے میں کھو گئی ہے

ادا و ناز و حیا و شوخی، بہت سی ہیں حسن کی زبانیں
مگر وہی بات معتبر ہے، جو آنسوؤں سے کہی ہوئی ہے

عرق جبیں پہ لٹیں پریشاں، جھکی ہیں نظریں کھلا ہے دیوان
وہ زیرِ لب مسکرا رہی ہیں، جمیل کو داد مل رہی ہے

اٹھا کے شعلے ہمارے دل میں الاؤ سے دور چپ کھڑی ہو
نہ ڈالا جاتا ہے تم سے پانی، نہ تاپی جاتی ہے آگ تم سے

بوجھی نہ جمیل آپ نے چتون کی کہانی
سمجھے نہ جمیل آپ نے آنکھوں کے اشارے

کوندتی ہے یوں ظالم بجلی آج برستے بادل میں!!
جیسے ہماری سانولی رادھا روتے میں ہنس دیتی ہے

نہا نکھر کر ہماری رادھا نے آج پہنی ہے دھانی ساری
لٹیں ہیں شانوں پہ بھیگی بھیگی کہ کھیت پر ابر جھومتا ہے

جمیل اسکو ہی سنے گا، ہے زندگی جس کی خود فسانہ
ہے کاجلوں میں بھی اک کہانی، ہے چوڑیوں میں بھی اک ترانہ
یہ کس نے چھیڑا ستار اپنا، کہ تھم گیا کاروانِ انجم
رکی ہے فطرت کہ دل کی دھڑکن، کھڑا ہی سکتے میں اک زمانہ

مت پوچھ جمیل اس کی باتیں جب نام تیرا لیتا ہے کوئی
جھک جاتی ہیں پلکیں عذرا کی، ماتھے سے پسینہ آتا ہے

پلکیں ہیں بھیگی بھیگی اور بھیڑ رکھی رہے ہیں
شبنم کے چند قطرے کانٹوں میں تل رہے ہیں
تم رو رہی ہو رادھا، اور صبح ہو رہی ہے
میرے گلابی سپنے کاجل میں گھل رہے ہیں

مرے آنسو مری نظروں ہی کو دھوتے نہیں عذرا
کبھی اُن سے ترے دل کی کدورت بھی تو دھلتی ہے

ساون کا مہینہ ہے ہوا جھوم رہی ہے
رادھا تری پلکوں پہ گھٹا جھوم رہی ہے

جمیل مظہری کی شاعری کی دلکشی ان کی گنگا جمنی

ہے۔ اُردو اور ہندی کے امتزاج سے ان کی شاعری کا رنگ جیسے ساون کی دھنک کی طرح نکھر آیا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

کیجئے نہ جمیلؔ اُردو کا سنگار اب ایرانی تلمیحوں سے
پہنے گی بدیسی گہنے کیوں یہ بیٹی بھارت ماتا کی

میر حسنؔ کی مثنوی "سحر البیان" پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کی "گلزارِ نسیم" اور نواب مرزا شوقؔ لکھنوی کی مثنوی "زہرِ عشق" اپنی مثال آپ ہیں اور اُردو ادب میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ جمیل مظہری نے بھی مثنوی "آب و سراب" کہی جو یقیناً بیسویں صدی میں اردو ادب کے لئے ایک حسین تحفہ ہے۔ جمیل مظہری نے یہ مثنوی ۱۹۶۰ء میں تصنیف کی جو "اُردو ادب" علیگڑھ کے شمارہ ۶۴-۱۹۶۳ء میں قسط وار شائع ہوئی پھر ۱۹۷۰ء میں کتابی صورت میں منظر عام پر آئی۔ جمیل مظہری کی یہ مثنوی پنڈت دیا نسیم کے نام معنون ہے۔ دیا شنکر نسیم کی عظمتِ شاعرانہ سے کوئی کافرِ ادب ہی انکار کر سکتا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ مثنوی "آب و سراب" میں کہیں بھی "گلزارِ نسیم" کا رنگ نظر نہیں آتا بلکہ جمیل مظہری تحت الشعوری طور پر منشی احمد علی شوقؔ قدوائی لکھنوی کی مثنوی "ترانۂ شوق" سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ مثلاً شوق قدوائی کہتے ہیں ؎

گردوں کو قمر، قمر کو ہالہ   پہلو کو جگر، جگر کو نالہ
کھانے کو دہن، دہن کو کھانا   دانے کو شجر، شجر کو دانا
پانی کو بھنور، بھنور کو چکر   دریا کو صدف، صدف کو گوہر
شب کو کیا روز، روز کو شب   لب کو دیے حرف، حرف کو لب

اب ذرا جمیل مظہری کو سُنئے ؎

جوہر کو عرض، عرض کو جوہر   گوہر کو صدف، صدف کو گوہر
ابرو کو کجی، کجی کو ابرو   جادو کو نظر، نظر کو جادو

جب اپنے کلام کا جائزہ لیا تو بہت سے اشعار میں خود ترمیم کر ڈالی۔ میرے خیال میں اس "ترمیم" کے نتیجے میں جہاں بہت سے شعروں نے بہتر شکل اختیار کی ہو گی وہاں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ بہتر اشعار اس ترمیم کی زد میں آکر کہیں کم درجہ اور کہیں زبان و انشا کے معیار پر غلط ٹھہرتے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک مشہور شعر جو میں نے دو مرتبہ کی زبانی سنا وہ یوں تھا ؎

پہلے ہی کہا تھا ساقی نے اس جام میں ہے تلخی غم
پیمانہ کے واپس کرنے کا موقع ہی نہ تھا پینا ہی پڑا

لیکن یہی شعر "فکر جمیل" کے صفحہ ۷۱ پر اس طرح درج ہے ؎

کچھ ترشی تھی کچھ تلخی تھی لیکن جب خود ہی مانگی تھی
تو مانگ کے واپس کرنے کا موقع ہی نہ تھا پینا ہی پڑا

اہلِ ذوق موازنہ کر لیں کہ خود شاعر نے اپنے بلند شعر کو کتنا پست کر دیا۔ کیوں کہ ادب زبان کے لحاظ سے مثل آخر کو تانیث (پڑی) ہونا چاہیئے تھا نہ کہ فعل تذکیر (پڑا)۔
اسی دیوان کے صفحہ ۱۳۹ پر ایک شعر یوں موجود ہے

؎ بن جاتی ہے دُنیا کے لئے گیت سُہانا
اس دل کی صدائیں جو کسی دل کو پکارے

اسم جمع "صدائیں" کے لئے مصرعۂ اولیٰ میں فعل "ہیں" ہونا چاہیئے تھا جب کہ لفظ "ہے" سے کام لیا گیا ہے جو فعل واحد ہے۔ ایسی کوتاہیاں متعدد جگہوں پر اور بھی نظر آتی ہیں جو میرے خیال میں کتابت کی غلطیاں ہیں۔ علامہ جمیل جیسے شاعر سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ✤✤✤

"فکر جمیل" کے دیباچے میں جناب رضا مظہری کا ارشاد ہے کہ علامہ جمیل مظہری نے اس مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں

ماہنامہ **سُہَیل** گیا

کو

ہندوستان میں دوسری بار

علاّمہ جمیل مظہری نمبر

پیش کرنے پر دلی مبارکباد

برادران حاجی زین الدین احمد ابن حاجی بوعلی مرحوم

پروپرائیٹر حاجی بوعلی میاں عارف لنگڑو میاں مغیبیجوا

تمباکو مرچنٹ کے پی روڈ، گیا

جمیل مظہری ــــ اور نظم "فریاد"

فرحت قادری

جمیل مظہری کے پہلے مجموعۂ کلام "نقشِ جمیل" (مطبوعہ ۱۹۵۳ء) کے پیش لفظ میں ان کے بھائی رضا مظہری رقم طراز ہیں:
"جمیل صاحب کو شاد، اقبال، جوش، نیاز اور مجنوں نے بہت متاثر کیا۔"

نیاز اور مجنوں تو ان کے عقائد پر اثر انداز ہوئے ہوں گے۔ لیکن جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، جمیل پر اقبال، جوش، اور شاد کے اثرات آسانی سے محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ وہ اقبال کے فلسفۂ عشق اور انسان کی ذات میں بے پایاں امکانات کے عقیدے سے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ جمیل مظہری کی نظم "فریاد" کے مطالعے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ اقبال کی شاعری اور خیالات سے کس حد تک متاثر تھے۔

"فریاد" اور اقبال کی مشہور نظم "شکوہ" کو سامنے رکھیں تو آپ دیکھیں گے کہ دونوں نظمیں ایک ہی بحر میں ہیں، دونوں مسدس کی شکل میں ہیں اور دونوں ہی میں خدا سے تخاطب ہے، "شکوہ" روزگار ہے اور سفاک لمحات کی کربناکیوں کا اظہار ہے۔ فرق محض اتنا ہے کہ اقبال نے خدا سے جو شکوہ کیا ہے وہ صرف ہندی مسلمانوں کی جانب سے ہے۔ ملاحظہ ہو "شکوہ" کے آخری بند کا آخری شعر ؎

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

اس طرح "شکوہ" کا کینوس محدود ہو کر رہ گیا ہے لیکن جمیل مظہری کی "فریاد" پوری دنیائے انسانیت کی فریاد ہے اس لئے اس کا تاثر بھی لامحدود ہے۔ جہاں تک شوکتِ الفاظ، زورِ بیان، بندش، چستی اور سلاست و روانی کا تعلق ہے، جمیل کی "فریاد" اقبال کے "شکوہ" سے کسی طرح کم تر نہیں۔ بعض بند کے اشعار، چستی، روانی اور زورِ بیان میں "شکوہ" کے اشعار سے دو قدم آگے نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو

جذبۂ منفعل آدم و حوا کی قسم
تپشِ مشتعلِ سینۂ یحییٰ کی قسم
یونس و نوح و خلیل و ذکریا کی قسم
نالۂ گوتم و زردشت و مسیحا کی قسم
قسم ان کی جو چلے دل کے اشارے کے خلاف
قسم ان کی جو [illegible] دھارے کے خلاف
بوذر و سلمان کی قسم فقر ابوذر کی قسم
پیر جیلاں کی قسم مرشد سنجر کی قسم
خون سے بھیگے ہوئے عمامۂ حیدر کی قسم
لاش آلودۂ خونِ علی اصغر کی قسم

قسم اُن کی جو نہ سمجھے تیری قدرت کا مزاج
قسم ان کی جو بدلتے رہے فطرت کا مزاج

کاکلِ خم بہ خمِ ساحرِ بندرا کی قسم — بارشِ پیہم بہ پیم رحمتِ بطحا کی قسم
سوزِ موسےٰ و فسونِ لبِ عیسیٰ کی قسم — اور قسمیں یہ سبک ہوں تو یہودی کی قسم

وسعتِ وحشتِ چشمِ ستم گر کی قسم
شدتِ عزمِ ہلاکو و سکندر کی قسم

"فریاد" کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظم جمیل مظہری نے اقبال کے "شکوہ" سے متاثر ہو کر لکھی ہوگی کیونکہ جب ۱۹۱۱ء کے آس پاس جمیل نے لکھنا شروع کیا تو وہی زمانہ اقبال کا بھی تھا۔ میرے خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جمیل مظہری نے اپنی نظم "فریاد" کی ابتدا اس جملے سے کی ہے :

"اپنے مرشدِ فن علامہ اقبال کو ایک سجدۂ عقیدت کے ساتھ"

یہاں فطری طور پر قاری کے ذہن میں ایک سوال ابھر سکتا ہے کہ اقبال کے "شکوہ" کی طرح جمیل کی فریاد کو شہرت کی منزل کیوں نہ مل سکی؟ جمیل مظہری کو اُس زمانے میں شہرت نہ ملنے کی بنیادی وجہ اشاعتِ کلام سے گریز تھی۔ اور یہ گریز اس لئے تھی کہ جمیل کی طبیعت میں اعتکاف کا انداز کارفرما تھا۔ گوتم کی طرح انھوں نے دکھ کا راستہ اختیار کیا مگر نروان نصیب نہ ہو سکا۔ ترک و طلب کی یہ کشمکش عظیم آباد اسکول کی روایت رہی ہے۔

جمیل مظہری کی زندگی کا تمام کرب، تمام روح فرسا ہیجان اور تمام حسرت آگیں گداز اس ایک نظم میں سمٹ گیا ہے جس کا عنوان "فریاد" ہے۔ آیئے! ہم اس نظم کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے اس کی محرکات اور پس منظر کا بھرپور جائزہ لیں۔ بیسویں صدی کا ہندوستان، زبوں حالی، پستی، غلامی اور خواب آفرینی کے حصار سے باہر نکلنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ حساس اور درد مند شاعر کی نگاہوں کے سامنے غیر ملکی ریشہ دوانیاں، جاگیردارانہ نظام کی سفاکیاں، انسانی اقدار کی پامالی، بے بس انسانوں کا استحصال، جبر اور بربریت کی گرم بازاری تھی۔ ایسے حبس اور گھٹن کے عالم میں کسی حساس شاعر کا بلبلا اٹھنا اور بلبلا کر لب فریاد وا کرنا ناگزیر تھا۔ ؎

عشق اور عقل میں پھر جنگ کا ساماں ہے آج — کہ عقائد سے جنوں دست و گریباں ہے آج
خاکِ افسردہ میں پھر شورشِ طوفاں ہے آج — ذہن تشکیک کا شیرازۂ پریشاں ہے آج

دلِ شاعر میں سوالوں کے حباب اُٹھتے ہیں
آندھیاں تیز ہیں، ذراتِ سراب اٹھتے ہیں

کس سے پوچھوں کہ یہ ہنگامۂ ہستی کیا ہے — یہ فسوں کیا ہے، جنوں کیا ہے، یہ مستی کیا ہے
برق یہ ابر کی ہر چیخ پہ ہنستی کیا ہے — جب بلندی کی یہ فطرت ہے تو پستی کیا ہے

چہرۂ نور پہ یہ پردۂ ظلمت کیوں ہے
یہ اجالے کو اندھیرے کی ضرورت کیوں ہے

نطق حیراں ہے کہ یہ عالمِ آواز ہے کیا — جنبشِ مضطربِ سلسلۂ راز ہے کیا
عقل کیا جانے بھلا سوز ہے کیا ساز ہے کیا — عشق خود سر بگریباں ہے کہ یہ ناز ہے کیا
یہ تجسس ہے کہ کشش ہے یہ تماشا کیا ہے
جب تمنا نہیں کوئی تو تقاضا کیا ہے

آنکھیں مجبورِ تماشا ہیں، نظارے مجبور — بحرِ افلاک کے تاریک کنارے مجبور
کشتیاں وقت کی مجبور ہیں دھارے مجبور — جھپکی جھپکی نہ پلک یوں ہیں ستارے مجبور
سلسلے قید کے ہیں، ارض و سما کچھ بھی نہیں
دو جہاں جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

فریاد کی لے جب تیز ہوتی ہے تو تشکیک کی سرحد چھونے لگتی ہے۔ لیکن ایسی تشکیک مشیتِ کامل سے انکار نہیں بلکہ اپنی نافہمی اور ذہن کی نارسائی کا اظہار ہوتی ہے۔ تخلیق کی گتھیوں کو سمجھنے اور خالقِ کل کے ادراک و عرفان کے لئے ایک فن کار کے ذہن میں تشکیک کی موجوں کا ٹھاٹھیں مارنا لابدی ہے ——— جمیل مظہری کی شاعری میں بھی ان کے ذہن کی فلسفیانہ کاوش اور کرید کا عنصر غالب ہے۔ تلاش و تجسس کا یہ عنصر کبھی تشکیک کی شکل میں، کبھی صوفیانہ اور مابعد الطبیعاتی اشارات کی صورت میں، کبھی فلسفیانہ سوال بن کر اور کبھی قلندرانہ آگہی کے روپ میں اس قدر نمایاں ہے کہ وہی سب سے زیادہ متوجہ کرتا ہے ——— تشکیک کا یہ عنصر غالب کے یہاں بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

فن کار کی بدقسمتی ہے کہ کچھ ناقدین ایسی تشکیک کا ڈانڈا دہریت اور لامذہبیت سے جوڑ دیتے ہیں اور کچھ اسے فلسفہ کے نام سے منسوب کرتے ہیں ——— افلاطون کے عہد سے آج تک اس موضوع پر خیال آرائی جاری ہے کہ فلسفہ اور شاعری میں کوئی واسطہ ہے یا نہیں۔ مولانا شبلی اور علامہ اقبال اس بات پر متفق ہیں کہ شاعری کو فلسفہ کا ہم پلہ قرار دیا جائے ——— لیکن میرے خیال میں فلسفیانہ خیالات کا اظہار اور مسائلِ حیات و کائنات سے متعلق فلسفیانہ غور و خوض کسی طرح شاعری کے دائرہ اختیار سے باہر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس اندازِ نظر کو شاعری کا فکری عنصر کہا جائے گا، فلسفہ نہیں! میں ایلیٹ کے اس قول سے اتفاق نہیں کر سکتا جو اس نے ڈانٹے اور شیکسپیئر کی فلسفہ دانی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ ان کے ہاں فلسفیوں کے چبائے ہوئے نوالوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے ——— شاعرانہ فلسفہ یا فلسفیانہ شاعری افلاطون، ارسطو، بوعلی سینا وغیرہ کے منظم و منضبط فلسفہ سے قطعی الگ چیز ہے۔ اقبال کے [illegible] سامنے

جب شاعری کے ساتھ فلسفہ کا ذکر آتا ہے تو وہ ایلیٹ کی طرح سنجیدگی کا شکار ہو جاتے ہیں اور کسی شاعر کے ساتھ کما حقہ انصاف نہیں کر پاتے۔

دراصل ہوتا یہ ہے کہ ایک ذہین اور حساس شاعر فکر کی مدد سے اپنی انفرادیت کا رشتہ عمومی حقائق سے جوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے اس کی انفرادیت مجروح نہیں ہوتی بلکہ توانائی حاصل کرتی ہے اور یہی کوشش کبھی کبھی فکر و نظام وابستہ ہونے کی خواہش پیدا کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک شاعر فلسفی نہ ہوتے ہوئے بھی حکمت و فلسفہ کی راہوں پر گامزن ہو جاتا ہے۔

جمیل مظہری کے یہاں بھی کوئی منضبط فلسفیانہ نظام نہیں ہے۔ لیکن خدا اور کائنات، تخلیق آدم، انسانی مستقبل، فکر و عمل، جبر و اختیار وغیرہ کے متعلق بلیغ اشارات برائے فلسفیانہ انداز میں ملتے ہیں۔ ان کے غور و خوض کی تہ میں ایک خیال افروز تشکیک کی کارفرمائی ہے۔ یہ تشکیک انسان کی تخیلی اور عملی زندگی میں بڑا تخلیقی اور ارتقائی مقام رکھتی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جمیل کی تشکیک تخلیقی ہے جو انھیں خدا اور کائنات کے تخلیقی تصور تک پہنچا تشکیک بذات خود کوئی بنیادی تصور نہیں، لیکن ایک فلسفیانہ میلان ضرور ہے۔ اس سے کسی قطعی نتیجہ تک رسائی نہ ہو۔ لیکن غور و فکر کے دروازے ضرور کھلتے ہیں ـــــــ انسان کی عملی زندگی میں جب جذبہ اور عقل کی کشمکش شروع ہوتی ہے تو تشکیک سر ابھارنے لگتی ہے۔ ذہن جب حالات سے مطابقت پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے، جذبات کی شوریدہ سری جب عقلی دلائل کی دیواریں توڑ دیتی ہے اور جب انسان فطرت کی سفاک اور بے پناہ طاقت کے سامنے بے بس نظر آتا ہے تو اُس وقت اپنے اور کائنات کے سارے رشتوں کے متعلق شک پیدا ہونے لگتا تشکیک کی اس دیوار کے ایک طرف امید، ارتقا، عمل، اختیار، زندگی کا حسن اور یقین ہیں اور دوسری طرف مایوسی، جبر، بے دلی اور بے یقینی۔ یہ تشکیک خالص فلسفیانہ نہیں ہے جو اچھائیوں میں بھی خرابیوں کے پہلو ڈھونڈ نکالتی ہے اور یقین کو بے یقینی میں تبدیل کر دیتی ہے، بلکہ یہ ساری باتیں عملی زندگی کے مشاہدے کا نتیجہ ہیں جن سے ایک حساس ذہن بری طرح متاثر ہوتا ہے اور فلسفیانہ طرز اظہار پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مندرجہ بالا سطور کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ جمیل مظہری کی تشکیک کو دہریت یا لا مذہبیت پر محمول کرتے ہیں وہ جمیل صاحب کے افکار و خیالات کے سلسلے میں انصاف سے کام نہیں لیتے۔ ایک خدا کے ساتھ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُس کی حق گوئی اور بے باکی کو شک کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ میں ذیل میں نظم "فریاد" کے چند آخری بند پیش کرتا ہوں اور منقیان ادب سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ شاعر کی دہریت اور لا مذہبیت کی نشاندہی فرمائیں۔

اب تو مظلوموں کی آہوں میں اثر دے یا رب ۔۔۔ اب تو حکام کو شاعر کا جگر دے یا رب
چشم شاعر کو بصیرت کی نظر دے یا رب ۔۔۔ قلب منعم کو محبت کا شرر دے یا رب

جن کے خالی ہیں دماغ ان کو خیالات بھی دے
جو ہیں افکار کے مالک انھیں جذبات بھی دے

عشق اک قطرۂ ناچیز ہے دریا کر دے ۔۔۔ کوہ کو کاہ بنا ذرہ کو صحرا کر دے
اک تبسم سے یہ دنیا تہ و بالا کر دے ۔۔۔ دیر آتی ہے تو کوئی ایک اشارا کر دے

پھر تو یہ وقت کی رفتار بدل جائے ابھی
پھر کوئی آتا ہوا انسان سنبھل جائے ابھی

آگ فاراں کے سینے میں لگائی تو نے | بزمِ بدر میں بچھا دی دانائی تو نے
بانسری فتح کی صحرا میں بجائی تو نے | نیل میں میتِ فرعون بہائی تو نے

کیوں اسی طرح نہ باطل کی ہزیمت ہو آج
کل کا وعدہ ہے مگر کیوں نہ قیامت ہو آج

سیکھا ہے ہر محنت کا ثمر بھی تجھ سے | چشمِ بے تاب کا یہ ذوقِ نظر بھی تجھ سے
پھوٹنے حق میں یہ دردِ جگر بھی تجھ سے | گریۂ فریاد میں مجھ سے ہے اثر بھی تجھ سے

کلفتِ شاعرِ ژولیدہ بیاں بھی تیری
نطق بھی تیرا عطیہ یہ زباں بھی تیری

اس کے برعکس نظم کے آخری بند میں شاعر اپنے خالق سے لرزاں و ترساں نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی اپنی تکنیک کا راز بھی کھول دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ایک فن کار کی سچائی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

کیوں نہ بہکوں کہ تخیل ہے پریشاں میرا | عشق کیا؟ عقل نے پھاڑا ہے گریباں میرا
کفرِ تازہ ہے خرد، ہے دلِ ناداں میرا | ابھی تکنیک کی منزل میں ہے ایماں میرا

ہوشیار اس کا بھی مالک! مری نادانی میں
میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں

ساتھ بندکی یہ طویل نظم میرے نزدیک اردو نظموں کی تاریخ میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے، کیونکہ ایک کامیاب نظم کا سارا حسن بھرپور طور پر اس میں موجود ہے۔ بقول احتشام حسین:

"جس شاعر کو فن پر عبور حاصل ہو اور زبان و بیان کی سحر کاری سے واقفیت ہو وہ فلسفیانہ موضوعات کو بھی دلکش اور رنگین بنا کر پیش کر سکتا ہے۔"

جمیل مظہری کی حقیقت پسندی میں تصوریت کی خوشگوار آمیزش ہے جو کہیں توانا و مثبت عناصر سے ترتیب پاتی ہے۔ ان کی نظم "فرہاد" میں بھی انسان دوستی، عقیدۂ عظمتِ انسانی، حرکت و عمل کی ضرورت، ارتقا پر یقین، قربانی کی قیمت اور عزم و حکمت میں توازن کا احساس جیسے توانا و مثبت عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں اور بھی طرح کے حقائق پر مبنی تصورات، خیالات اور تجربات شامل ہیں جو طرزِ اظہار کی دلکشی سے جاندار اور روح پرور بن گئے ہیں۔

گیا شہر!

ہندوستان میں دوسری بار

علامہ جمیل مظہری نمبر نکالنے پر

ماہنامہ سہیل گیا کا

خیر مقدم کرتا ہے

ڈاکٹر بی ایچ خان

جی بی روڈ، گیا۔ فون، ۲۲۳

جمیل مظہری کی شاعری میں عورت کا تصور

ـــــــ رحی انعام

اردو ادب میں عورت کا تصور بہت ہی تاخیر سے ابھرا۔ قصہ کہانیوں میں عورت 'پریوں' کے روپ میں سامنے بھی آئی تو صرف حسن و جمال لے کر۔ عورت کے پیکر تراشے بھی گئے تو ظاہری طور پر۔ اس کی داخلیت سے کسی کو سروکار نہ تھا۔ عورت صرف حسن اور جسم کی آماجگاہ تھی۔ صنف مخالف نے اس کی ظاہری کشش سے لطف اندوزی کے علاوہ اس کا دوسرا مصرف مناسب ہی نہیں سمجھا تو پھر 'عورت' کے دل و دماغ اور روح کو سمجھنے کی ضرورت کیا تھی اور اس طرح ایک عرصہ تک اردو ادب عورت کے جذبات اور محسوسات سے نا آشنا رہا۔

اردو شاعری نے بھی 'عورت' سے اس طرح دامن بچایا کہ محبوب کی جنس بھی مشکوک رہی۔ بیسویں صدی میں اردو کے افق پر 'عورت' قدرے واضح روپ لے کر نمودار ہوئی اور 'عورت' کا بے تکلف ذکر ہونے لگا۔ عورت سامنے لائی بھی گئی تو شہزادی اور امیر زادی کے روپ میں۔ شاعروں نے 'عورت' کو اس کی پہچان کے ساتھ پیش بھی کیا تو اپنی رومان کی تسکین کے لئے۔ غزلوں میں عورت کا تصور ابھرا بھی تو بغیر کمر کے۔ شاعروں نے عورت کی پیش کشی شروع کی تو اپنی تسکین طبع کے لئے جس بنا پر اقبال نے فن شاعری کے اس طور سے اکتا کر کہا کہ اردو شاعری کے اعصاب پر عورت سوار ہے

پہلے عورت کے جامع تصور کو پیش کرنا تو درکنار اس کی ہلکی سی تصویر ابھارنے سے بھی اردو شاعری کی دنیا ڈرتی تھی اور گھبراتی تھی یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر شاعروں نے محبوبہ کو 'محبوبہ' کہنے سے پرہیز کیا اور معشوق کے بت تراشے تو مذکر کی صورت میں۔ ذہنی و شعوری اس پردہ پوشی نے اقبال جیسے روایت شکن شاعر کو بھی عورت کے جیتے جاگتے اور صحیح تصور کو پیش کرنے سے قاصر رکھا اسے آزاد فضا میں سانس لینے کے لئے چاردیواری سے نکالنے کی سعی نہیں کی۔ اور علم و عمل کی دعوت سے محروم رکھا۔ اردو ادب میں رومانی انقلاب فروغ پذیر ہوا تو اردو شاعری نے بھی اس کا بھرپور اثر قبول کیا اور اقرار محبت کے لئے محبوبہ سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ جاگ پڑا پھر تو 'عورت' اپنی مکمل شخصیت کے ساتھ رومانی ناز و ادا لئے ہوئے اردو شاعری میں نمودار ہوئی۔ اختر شیرانی اور جوش ملیح آبادی نے روایت اور قیود کے تمام بند توڑ دیئے اور جرأت مندانہ فعل کا ارتکاب کرتے ہوئے 'عورت' کے صحیح تصور کو اردو شاعری میں پیش کر دیا اور اس طرح اردو شاعری اور عورت میں یگانگی ہو گئی۔ اس یگانگت کے جذبات کو حسن و خوبی سے فروغ دینے والوں میں جگر مرادآبادی

(ان کے یہاں [illegible]) مظہری کا تمام خصوصیت کا حامل ہے مظہری کی شاعری میں عورت کا تصور جو ابھرا ہے وہ نفس اور مشفق ہونے کے ساتھ ساتھ دلکش بھی ہے۔ انھوں نے 'عورت' کو اس کی دلکشی اور اس کی تمام تر خوبیوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ 'عورت' کے لئے عزت و احترام جو ہندوستانی تہذیب کی میراث ہے۔ اس روایت کے ساتھ انھوں نے عورت کے تصور کو ابھارا ہے۔ بالخصوص جمیل مظہری نے عورت کو گھریلو بنا کر جس طرح پیش کیا ہے اس سے متوسط طبقے کی عورت کا جیتا جاگتا پیکر سامنے آجاتا ہے۔ 'عورت' کے حقیقی روپ اور گھریلو پن کو پیش کرنے میں جمیل مظہری نے فن کارانہ کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔

علامہ جمیل مظہری کے یہاں رومانی رجحان موجود ہے جو جذب و شوق اور رومانی حقیقت سے لبریز ہے۔ دوسرے شاعروں کی طرح جمیل مظہری کی رومانیت حقیقت میں جذب نہیں ہوتی بلکہ حقیقت میں رومانیت گھولتی ہے۔ اوروں کی طرح مظہری اپنی محبت کے ساتھ راہ فرار اختیار نہیں کرنا چاہتے بلکہ ان کی محبت حقائق سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے اور حالات سے سمجھوتہ کرنے کے لئے زندگی کی تلخ حقیقتوں کے گھونٹ صبر و تحمل سے پینے کے لئے تیار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا محبوبہ ایک ایسی عورت ہے جو محبت تو کرتی ہے لیکن سماج اور اس کے اصول سے بغاوت نہیں کرتی۔ اپنے روح و جسم کو روایت کی صلیب پر چڑھا دیتی ہے۔ کہتی ہے :-

میں دل میں محبت کا بیج بو نہیں سکتی
حیا کا نام ڈبو نہیں سکتی ———!

کسی طرح بھی میں تمہاری ہو نہیں سکتی
..... یہیں صدقے ہو نہ کر جاؤ
ڈرو خدا سے ڈرو ....

جمیل مظہری نے 'عورت' کو محبوبہ کی روایتی خصوصیت (ناز و ادا۔ قتل کا سامان) سے قطعی مختلف بنا کر پیش کیا ہے۔ جو محبت میں قربانی کی قائل ہے۔ اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ لیتی ہے لیکن اف تک نہیں کرتی۔ 'عورت' کو محبوبہ کے کردار میں جمیل مظہری نے اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کی ذات سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ مظہری اپنی محبوبہ کی مجبوریوں کو سمجھتے ہیں اس لئے دوسروں کی طرح اپنی محبوبہ کو بے وفا یا ہرجائی نہیں کہتے بلکہ اس کے دکھ درد کو گہرے حس کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ اپنی محبوبہ کو ناکامی محبت کی وجہ سمجھنے کی بجائے حالات کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں :-

ان آنکھوں میں دل خود دار اب نہیں آتا
لبوں پہ خندہ انکار اب نہیں آتا
مرے جنوں پہ ہمیں پیار اب نہیں آتا
یہ کس نے پیکر سنگیں بنا دیا تم کو
.... یہ کیا ہوا تم کو ...!

مظہری کی محبوبہ ظالم نہیں بلکہ مظلوم ہے۔ جس نے اپنے عاشق پر جور و ستم نہیں ڈھایا ہے بلکہ وہ خود سماج کے ہاتھوں ستائی ہوئی عورت ہے جو اپنی زندگی کے مطالبات کو بھی سمجھتی ہے لیکن دل کے کہنے پر چلنے سے مجبور ہے۔ وہ اپنے محبوب کے درد محبت کو شدت سے محسوس تو کرتی ہے لیکن صبر و تحمل کے دامن کو تھامے رہنے کی تلقین کرتی ہے۔ اور لغزشوں سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے فریاد کرتی ہے :-

کہاں رکھوں دل خانہ خراب کی میت

کنوارے سپنوں کے پر ارمان خواب کی میت
میں خود اٹھاؤں گی اپنے شباب کی میت
نہ اپنے ہاتھ لگاؤ ڈرو خدا سے ڈھو...!
میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں تمہیں خدا کی قسم
شکست حال عذرائے بے وفا کی قسم
جو جل رہا ہو بدن تک اس چتا کی قسم
ہوس کی آگ بجھاؤ ڈرو خدا سے ڈھو

جمیل مظہری نے ہندوستانی سماج کی زنجیروں میں مقید مظلوم و مجبور 'عورت' کو اس کے عریاں زخموں کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے جو لافانی یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے قبل کسی اہلِ قلم نے عورت کے پیکر کے اس زخمی رخ کو اس قدر حقیقت شعاری سے نہیں ابھارا۔ اب تک ہماری اردو شاعری میں 'عورت' محبوبہ کے روپ میں ظالم اور جفاکار بن کر ابھرتی رہی تھی لیکن جمیل مظہری کے مخلص دل نے 'عورت' کو اس کی مظلومیت اور بے بسی کے ساتھ پیش کیا ہے جو فرض و محبت کی کشاکش میں گھر کر اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیتی ہے اور فرض کی سولی پر لٹک جاتی ہے اور اس بے بسی کو مظہری نے سمجھا اور 'عورت' کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کیا ـــــ ان کی ہمدردی اور یگانگی اس طرح سامنے آتی ہے:

(۱)

یہ کیا ہوا میری عذرا یہ کیا ہوا تم کو
نظر بچاؤ خدارا یہ کیا ہوا تم کو
یہ کیوں بدل گئی دنیا یہ کیا ہوا تم کو
مری نظر سے اب آنے لگی حیا تم کو
تمہاری آنکھ سے بیگانگی ٹپکتی ہے
نیاز و ناز سے اک بے دلی جھلکتی ہے
رخ اس طرف ہے مگر بے رخی جھلکتی ہے
وہ کیا کرے جو پا کر نہ پا سکا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو .....

جمیل مظہری نے 'عورت' کی مظلومیت کو پیش کرتے ہوئے انفرادی اہمیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے زندگی کی چھوٹی بڑی حقیقتوں کا کامیاب مظاہرہ کیا ہے۔ متوسط طبقے کی گھریلو عورت جو محبت کی ماری ہے اس کا حقیقی نقشہ جمیل مظہری سے پہلے کسی شاعر نے نہیں کھینچا۔

(۲)

جو پاس چولھے کے اماں کے ڈر سے جاتی ہوں
تو خود بھی جلتی ہوں سالن کو بھی جلاتی ہوں
نمک سمجھ کے شکر دال میں ملاتی ہوں....

(۳)

کسی قمیص کے ادھڑے ہوئے گریباں پر
تمہارے ہاتھ کے ٹانکے سلام کہتے ہیں

جمیل نے اپنی محبوبہ کے روپ میں ایسی عورت کو پیش کیا ہے جو خالصاً ہندوستانی ہے جو دل سے زیادہ دماغ کے کہنے پر چلتی ہے اور اپنے محبوب کو بھی رات اور دن کے فرق کو سمجھاتی ہے۔ عقل و خرد نے جمیل کی محبوبہ کو منفرد کر دکھایا اور اس طرح جمیل حسرت و یاس میں ڈوب کے کہنے لگے:

براہو عقل کا کہ عشق کے مزے نہ آسکے
نہ تم فریب کھا سکیں نہ ہم فریب کھا سکے

گرم محبت کا فلسفہ ہے:
"طلب بھی ہو اور تسکین بھی یہ تو ہوا اندھیر یا جیسی چیزیں بھی طالب و مطلوب کے بیچ نہیں آسکتیں"

اور یہ قول تو زبان زد ہے کہ "محبت قید و بند کو نہیں مانتی" پھر جمیل کی محبوبہ سماج کے قید و بند کو کیوں نہیں توڑ سکی! اس لئے کہ وہ عقل و خرد کا دامن تھامے ہوئی تھی یا اس لئے کہ وہ عشق کے سچے جذبات سے ناآشنا تھی کیونکہ :-

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اور مظہری کی محبوبہ محبت کے دستور کو نبھانے سے کیوں قاصر رہی....؟ جمیل مظہری بجائے اس کے کہ وہ اپنی محبوبہ کے جذبۂ شوق کو مورد الزام ٹھہرائیں وہ اپنے عشق کو ہی قصور وار سمجھتے ہوئے کہتے ہیں :-

یہ وہ سوز ہی نہیں ہے یہ وہ لاگ ہی نہیں ہے
جو رسا نہ ہو محبت کی وہ آگ ہی نہیں ہے
تری بانسری کے سینے میں وہ راگ ہی نہیں ہے
جو کسی کے دل کی سوئی ہوئی راگنی جگا دے
...... اسے بھول جا بھلا دے

جمیل مظہری نے اپنی "عاشقی" کو ناکامی محبت کا سبب ثابت کرکے اپنے عشق کو معراج پر پہنچا دیا ہے اور محبوبہ یا عورت کے وقار کو بلند کیا ہے۔ اس طرح اپنی کمی کا احساس کسی شاعر کو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اپنے عیب کو ڈھونڈنا جرأت مندانہ فعل ہے اور جمیل مظہری نے جرأت مندی کا ثبوت دیا ہے۔

عریانیت کو وہ نسوانیت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ نسائیت، شرم اور پاکیزگی 'عورت' کے لئے وہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ بازار یعنی بازار حسن میں جو 'عورت' کا میلا سماج اور سماج کے ٹھیکہ دار لگاتے ہیں جمیل صاحب اسے عورت کی تذلیل سمجھتے ہیں۔ اُن کی نظر میں 'عورت' عزت، احترام اور پیار کرنے کی ہستی ہے عورت کی تجارت پر وہ دکھی نظر آتے ہیں۔ عورت کا تصور بازاری کھلونے کی حیثیت سے انہیں ازحد پژمردہ کر دیتا ہے۔ وہ سماج کو بہت حد تک اس کا ذمہ دار سمجھتے ہیں اور کسی قدر وہ انفرادی گراوٹ، انسانیت اور محبت کے قتل کو اس کا سبب مانتے ہیں۔ وہ انسان کو غلطیوں کا احساس دلانا بھی چاہتے ہیں۔ عورت کی خرید و فروخت کو انسانیت کی پیشانی پر داغ اور عورت کی تقدیس کی بے حرمتی تصور کرتے ہیں۔

عورت کو محبوبہ کے علاوہ دوست، رفیق اور ہمدم کے روپ میں بھی انھوں نے دیکھا ہے۔

بحیثیت مجموعی جمیل مظہری کی شاعری میں عورت کا مقام غیر معمولی ہے اور یہ غیر معمولی پن اُن کے اعلیٰ پایہ کا فنکار ہونے اور انمول شخصیت کا ثبوت ہے۔

جمیل مظہری روایت ساز اور روایت شکن دونوں ہیں۔ ایک عظیم فنکار کی طرح انھوں نے دوسروں کی راہ نہیں اپنائی ہے بلکہ اردو شاعری میں اپنی روایت آپ قائم کی ہے۔ عورت کی نفسیات اور مظلومیت کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے انفرادیت کا مظاہرہ کیا ہے عورت کے کردار کو ہمدردی کا مستحق بنا کر انھوں نے ایک لازوال کارنامہ انجام دیا ہے۔ بہرحال یہ کارنامہ اردو شاعری میں نئی روایت ہے۔

تنخواہوں میں سے مناسب ٹیکس

کاٹنا نہ بھولئے

انکم ٹیکس قانون تنخواہ ادا کرنے کے ذمہ دار ہر فرد سے مانگ کرتا ہے کہ وہ ماخذ پہ ہی مقررہ شرح پر ٹیکس کاٹ لے اور سرکاری ملازمین کی حالت میں فوری طور پر اور دیگر ملازمین کی حالت میں سات یوم کے اندر اندر اسے سرکار کے کھاتے میں جمع کرا دے۔

آجر کے غفلت کرنے پر

(۱) ٹیکس کی کل رقم اس سے وصول کی جائے گی

(۲) اس پر سود اور جرمانہ لگے گا اور

(۳) قانونی کارروائی بھی ہو سکے گی جس کے نتیجے میں قید بامشقت اور جرمانے کی سزا بھی ہو سکتی ہے

سزا سے بچئے

خیال رہے تنخواہ میں سے کاٹے جانے لائق ٹیکس صحیح صحیح کاٹا گیا ہے۔ اور اسے مقررہ مدت کے اندر اندر سرکاری کھاتے میں جمع کرا دیا گیا ہے۔

کاٹے گئے ٹیکس میں اگر کوئی کمی بیشی رہ گئی ہو، تو اسے ماہ فروری / مارچ ۱۹۸۲ء میں ادا کی جانے والی تنخواہوں میں سے پوری کر لیجئے۔

ڈائریکٹوریٹ آف انسپکشن
(ریسرچ اسٹیٹسٹکس اینڈ پبلک ریلیشنز)
محکمہ انکم ٹیکس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

DAVP 81/325

جمیل مظہری کی شاعری

قومی یکجہتی کے آئینے میں

سید غلام مرتضیٰ، بہار شریف

قومی یکجہتی کا خیال و نظریہ اپنے اندر بیکراں وسعت و گہرائی رکھتا ہے۔ قومی یکجہتی کا پودہ قومی شعور و جذبہ، قومی اتحاد و اتفاق اور مشترکہ فکر و عمل کی ایک ہم آہنگ فضا میں پروان چڑھتا ہے۔ قومی یکجہتی ویگانگت سے متحدہ قومیت کا تصوّر بالیدہ، پختہ اور مستحکم ہوتا ہے۔ اس خیال و نظریہ سے جمہوری خیالات، وطنی محبت، مساوات اور عدل و انصاف کا چمن شاداب ہوتا ہے، اس سے مشترکہ تہذیب کی آبیاری ہوتی ہے، اخوت و بھائی چارگی کی فضا قائم ہوتی ہے اور اخلاقی قدریں بحال ہوتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس نیک جذبہ اور عملی کردار سے قومی کردار و قومی وقار بلند ہوتا ہے اور بین الاقوامی سربلندی و رفعت حاصل ہوتی ہے۔

ہندوستان ایک ایسا ملک واقع ہوا ہے جہاں کثرت میں وحدت اور تنوع میں یک رنگی و یکتائی کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی ہندوستان مختلف قوموں، مذہبوں، فرقوں، تہذیبوں اور زبانوں کا ایک حسین و جمیل سنگم رہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہاں کی تاریخ و تہذیب، ثقافت و کلچر اور ادب و فن کی تعمیر اور ترویج و ترقی میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں نے بلا امتیاز مذہب و ملت مل جل کر کام کیا ہے۔ یہاں کی قومیت اور وطنیت کے چمن کو دونوں قوموں نے مشترکہ طور پر خلوص و محبت، ایثار و قربانی اور خونِ جگر سے سینچا اور آراستہ کیا ہے۔ یہاں کی تہذیب صدیوں سے مشترکہ تہذیب اور مشترکہ فکر و عمل کا ایک بے مثال نمونہ رہی ہے۔

آپس میں پھوٹ اور منافرت کی فضا انگریزی حکومت کی دو پہلو پالیسی کی دین ہے۔ سنہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب تاریخ ہند میں ایک یادگاری حیثیت رکھتا ہے۔ جس نے گنگا جمنا کی اس مقدس سرزمین پر انگریزوں کی بدکردار حکومت کو مسلط کر دیا۔ نتیجتاً ہندوستان غلامی اور ظلم و تشدد کی مسموم فضا میں سانس لینے لگا۔ لیکن جذبۂ آزادی اور جذبۂ بیداری کی چنگاری وطن کے جاں نثاروں کے دلوں میں سلگتی رہی اور کبھی کبھی انتقام کے شعلے بھی بھڑکتے رہے۔ رفتہ رفتہ ہر شعبۂ فکر و خیال میں قومی جذبہ اور جذبۂ حب الوطنی کو ہوا دی گئی اور بیداری کا صور پھونکا گیا۔ اس وقت کے فنکاروں اور ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں جوش و جذبہ اور وطنیت و حریت کے شعلے اگلنے شروع کر دیئے۔

یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ شاعروں میں اثر و تاثیر اور سحر آفرینی کی کیفیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ شاعری ترسیل خیالات کا ایک عمدہ آلہ اور مقصد رسانی کا بہترین وسیلہ ہے۔ ہر بیدار مغز شاعر اور باشعور فنکار اپنے تعمیری تخیلات اور احساسات سے قوم و سماج کو بیدار کرتا ہے اور جنگ آزادی کی فضا استوار کرتا ہے جس کے زیر اثر عوام وطن اور جان

نثاران وطن میدان جنگ میں کود پڑتے ہیں اور غلامی کی زنجیریں کاٹ ڈالتے ہیں۔ جمیل مظہری نے بھی وقت کے تقاضے کو پورا کرنا اپنا قومی فریضہ سمجھا اور نغمے جوش پیش کیا۔

سلام ہو کہ جنگ لو بجا بانِ حریت | ہیں گونجتی بہشت سے نفیرانِ حریت

کھلا ہے مورچہ جہاں بڑھے چلو بڑھے چلو

برادرانِ نوجوان بڑھے چلو بڑھے چلو

جمیل مظہری کی شخصیت و شاعری اسی مذکورہ غلامی کی مسموم فضا میں پلی اور پروان چڑھی۔ جمیل مظہری کی شاعری کا پس منظر یہ ہے کہ اس وقت اقبال، جوش، چکبست، سیماب، اسمٰعیل، اختر اور حفیظ وغیرہ کی وطنی شاعری کی ایک فضا قائم ہو چکی تھی۔ تحریک آزادی چل پڑی تھی۔ ہر شاعر و ادیب فطری طور پر اپنے عہد و ماحول سے تاثرات قبول کرتا ہے اور اپنے فن پارے کو آب و تاب عطا کرتا ہے۔ جمیل مظہری نے بھی خصوصی طور پر اپنے عہد و ماحول، شاعرانہ فضا اور شعری رنگ و آہنگ سے گہرے تاثرات قبول کئے اور اپنی شاعری کو توانائی، حدت اور تابندگی عطا کی۔ دوسری طرف اس وقت شعر و ادب کی فضا رومانوی اور جذباتی رنگ و روغن سے بھی معمور تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جمیل مظہری کی شاعری میں رومانیت اور انقلابیت دونوں طرح کے خیالات و افکار کا امتزاج نظر آتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی نظمیں قوم و ملک اور سماج و معاشرے کے حالات و کیفیات کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔

ہوتے دھواں دھار محلوں میں جشن کیا ہم کو اگر دیوالی ہے | مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم، مزدور کی دنیا کالی ہے

مزدور کے بچے تکتے ہیں عجب حسرت سے دکانوں کو | مزدور کا دل دیتا ہے دعا، دولت والوں کو جھگڑالوؤں کو

جمیل مظہری نے قوم و ملک کی جنگِ آزادی میں نہ صرف قلمی اور فکری حصہ لیا ہے بلکہ عملی حصہ بھی لیا ہے۔ انھوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت، وطنی محبت اور قومی فریضے سے سرشار ہو کر اس جنگ آزادی میں حصہ لیا اور ایثار و قربانی کے لئے ہمہ تن تیار ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء کی "بھارت چھوڑو" کی قومی تحریک میں انھوں نے گاندھی جی کی بھرپور حمایت کی اور جیل خانے کی صعوبتیں اور اذیتیں بھی برداشت کیں۔ شاعر ایک نغمہ دل، حساس اور ایک خاص طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ مشاہدات و تجربات سے اس کے تصورات میں گرمی و توانائی پیدا ہوتی ہے اور وہ خصوصیت اور وجدانی کیفیات سے سرشار ہو کر منظوم قرطاس پر اپنے فکر و خیال کی گہر افشانیاں فرمانا کر دیتا ہے جس کی حدت اور ضبط تو پروں سے متاثر ہو کر حریت اور جاں نثارانِ وطن سربکف میدانِ جنگِ آزادی میں کود پڑتے ہیں اور تیغ و تفنگ سے مسلح ہو کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ اس طرح جمیل مظہری نے نہایت ہی پُرجوش اسلوب اور ایک سنجیدہ و متفکرانہ انداز میں کہا ہے۔ جمیل مظہری کی ایک طویل نظم "بھارت ماتا" ہے جس میں تاریخ و تہذیب، عہد و ماحول، قومی وحدت و یکتا، حب الوطنی، سیاسی و سماجی، اقتصادی و معاشرتی حالات و زندگی کی مرقع نگاری کی گئی ہے اور دردِ دل، وطن اور پھر ان قوم کو شیر و شکر ہو کر اور ہم آہنگی کے جذبے میں پیدا کرنے اور قومی جذبات کو جگانے و بھارنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ یہ نظم جمالیت اور صداقت کے رنگ و آہنگ سے پُر ہے۔ یہ نظم مشترکہ فکر و عمل اور مشترکہ تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ ذرا دیکھئے، وہ کیا کہتے ہیں، ایک رنگ ملاحظہ فرمائیے۔

ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی　　تیری گود میں بھائی بھائی
چپسینوں میں تیرے بادل کے　　سایہ میں تیرے آنچل کے
مسجد گرجا اور شوالا　　لنکا سے تا کوہ ہمالہ
گنگا اور جمنا کی روانی　　کہتی ہے ماتا تیری کہانی

جمیل مظہری کی شاعری میں وہ جوش و خروش اور جذباتی نعرہ بازی نہیں جو جوش، سیماب، علی سردار جعفری کی شاعری میں ہے۔ بلکہ جمیل کے یہاں ایک نرم و نازک لب و لہجہ اور لوری و گیت کا رنگ و آہنگ ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت میں صبر و استقلال، ضبط و تحمل اور اعتدال پسندی کا مادہ حد درجہ کارفرما تھا۔ ان کے دل و دماغ میں سنجیدگی و متانت اور خلوص و ہمدردی کی خصوصیات موجود تھیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں دریا کی روانی نہیں بلکہ سمندر کی گہرائی اور سکوت نظر آتی ہے۔

بجھے چراغوں میں روشنی ہے، نشیلی آنکھوں کی نیند اڑی ہے　　جمیل کی بانسری نے چھیڑا ہے شام سے صبح کا ترانہ

نظم "بھارت ماتا" میں ماضی کی تاریخ و تہذیب کی کہانی اور اسلاف کے کارناموں کو دہرا کر ہندو مسلم ایکتا اور قومی وحدت کو مضبوط و مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ رمز و ایما کے پردے میں جذبۂ وطنیت اور مشترکہ جدوجہد کو نمایاں کیا گیا ہے۔

او ماتا گوتم کی ماتا　　ارجن اور بھیشم کی ماتا
ٹیپو کی ماں، اکبر کی ماں　　ستونتی ماں، بلونتی ماں

ٹیپو اور پورس پیدا کر　　ایک مٹے تو دس پیدا کر
دیش کا ہر سیوک ہو آندھی　　ہر بچہ آزاد اور گاندھی

جمیل مظہری کی انقلابی نظموں میں جہاں ایک طرف سنجیدگی و متانت پائی جاتی ہے اور دھیمی دھیمی آنچ کی گرمی محسوس ہوتی ہے وہاں دوسری طرف شدتِ جذبات اور شعلہ فشانی کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ ان کی نظم "نوائے جرس" انقلابی خیالات خون کو گرما دینے والی صدا، بلند حوصلگی اور اولوالعزمی کی کیفیات سے لبریز ہے۔ یہ نظم یقین محکم اور عمل پیہم کا درس دیتی ہے۔ اس نظم میں جمیل مظہری ایک ہمہ گیر و ہمہ جہت اور مشترکہ فکر و عمل کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔ یہاں وہ ایک انقلابی کارواں کے قائد اور فوجی کمانڈر معلوم ہوتے ہیں۔

بڑھے ہوئے ہوں حوصلے چڑھی ہوئی ہو آستیں　　بدل دو صورت جہاں الٹ دو ضعف زمیں
پلٹ دو دور آسماں بڑھے چلو بڑھے چلو
برادران نوجوان بڑھے چلو بڑھے چلو

قسم تمہارے عزم کی، خدا تمہاری شان کے　　بڑھا کے ہاتھ توڑ لو ستارے آسمان سے
جھکا دو شاخ کہکشاں بڑھے چلو بڑھے چلو

برادرانِ نوجوان بڑھے چلو بڑھے چلو

اسی قبیل کی دوسری نظمیں بھی ہیں۔ مثلاً "دعوتِ عزم"۔ "تغیرات"۔ "وقت کا دھارا پھیرنے والے"۔ "صدائے جرس" وغیرہ۔ ان نظموں میں جمیل مظہری نے قومی جذبات، حب الوطنی، انسانی خلوص و ہمدردی اور عزم و ارادہ کی قلمی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔

بقول میتھو آرنلڈ "شاعری تنقید حیات ہے۔ یعنی شاعری زندگی اور زندگی کے حقائق و مسائل کی ترجمانی بھی کرتی ہے اور ان پر تنقیدی نظر بھی ڈالتی ہے۔ شاعر سماج و معاشرے کے حالات بے نقاب بھی کرتا ہے۔ اس خیال کے پیش نظر جمیل مظہری نے نہ صرف آزادی سے پہلے کے حالات کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے بلکہ آزادی کے بعد کے حالات و کیفیات پر بھی بڑی دیدہ ریزی اور گہرائی سے غور و فکر کیا ہے اور شاعری کو زیب و زینت عطا کی ہے۔ انھوں نے قوم و سماج کے رہبروں اور رہنماؤں کو سماجی و سیاسی حالت سدھارنے اور قوم و سماج کو سنوارنے کی ترغیب دی ہے جس سے اُن کے جمہوری خیالات، انسانی مساوات اور اجتماعی شعور و ادراک کا پتہ چلتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں "جشنِ آزادی"۔ "یوم آزادی"۔ "کوی کی پرارتھنا"۔ "زمزمہ"۔ "دھارے"۔ "موسم کے اشارے"۔ اور "تعزیت" وغیرہ پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان نظموں میں شاعر نے قوم و ملک اور سماج و معاشرے کے حالات و اقدار کی مکمل طور پر نباضی اور نشتر زنی کی ہے۔ شاعر اپنے جذبات و تصورات کی رَو میں بہتا چلا جاتا ہے اور قوم و سماج کو جگاتا اور جھنجھوڑتا چلا جاتا ہے۔ ایک عظیم قومی شاعر اور سچا محب وطن وہی ہے جو قوم و ملک کی تعمیر و ترقی میں بھرپور قلمی و فکری مدد کرے۔ جمیل مظہری کی نظموں میں یہ تمام محاسن بدرجہ احسن موجود ہیں۔ مذکورہ خیالات کی صداقت میں تین شعر پیش کرتا ہوں۔ ے

جشنِ آزادیٔ جمہور مبارک ہو تمہیں   رونقِ خانۂ مزدور مبارک ہو تمہیں

اہلِ بینش کو مبارک ہو یہ سامانِ نشاط   خونِ مفلس سے یہ گلکاریٔ دامانِ نشاط

ہوئے آزاد تو کیا گردشِ دوراں ہے وہی   حسرت اے صبحِ وطن شامِ غریباں ہے وہی

جمیل مظہری نے ہندو مسلم ایکتا اور اتحاد کے پیش نظر بہت سے غزلیہ اشعار بھی کہے ہیں جن میں قومی وحدت اور وطن دوستی کی گہری نقش گری کی گئی ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں ہندی الفاظ اور ہندوستانی فضا کی بکھرا بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں مقامیت کی گہری رنگ آمیزی نظر آتی ہے اور یہی طریقۂ عمل قومی وحدت اور مشترکہ فکر و عمل کا بین ثبوت ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ ے

اے داتا سنسار کے داتا سب سے اونچا نام ترا   مسجد مندر گھٹ گھٹ تری درشن لیکن عام ترا
بنسی والے جوگی نرے کملی والے جوگی تم سے   جگ جھکتا دینے والے روگ بھی ہے انعام ترا
پریم کی لہریں پریم کی نیا تو ہی گھاٹ اور تو ہی کھویا   پار لگا دے بڑا بھیا، پار لگانا کام ترا

جب سے جمیل آیا ہے یہاں گانے دیپ پجاری گانے ہے   یہ اپنے فن کا روگی ہے لیکن گمنام کا جوگی ہے

ان اشعار میں کس قدر مقامی رنگ و آہنگ، قومی یگانگت کی فضا اور آپسی پیار و محبت کی شیرینی و لطافت ہے۔ جمیل مظہری کی غزلوں پر ہندوستانیت اور مقامیت کا بڑا گہرا رنگ نظر آتا ہے۔ جمیل مظہری نے اپنی غزلوں میں ہندی تلمیحات اور محاورے کثرت سے استعمال کئے ہیں۔ مثلاً بندرابن، رادھا، بنسی والا، چوپال، پنگھٹ، چتا، گگن، جپا، گمبھیر، پیتم، ساون کی گھٹا، گلابی سپنے، ناگن، پریم، سجنی، سپیرا، روپ بازار، پیاسی آتما، وغیرہ۔ جمیل مظہری نے اپنی شاعری میں ہندی تلمیحات اور محاورے کو بڑی چابکدستی اور فنکارانہ انداز میں گویا اور نبھایا ہے۔ ہندی کے جمالیاتی و رومانی الفاظ و محاورے سے جمیل مظہری نے مینا کاری اور نگینہ سازی کا کام لیا ہے جس سے ان کی شاعری میں شیرینی، لطافت، موسیقیت اور نغمگی کی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ شعری رنگ و آہنگ اور فنی تجربہ نہ صرف جمیل مظہری کی قومی یگانگت و ایکتا کو منوانے کے لئے کافی ہے۔ اس ہندوستانی اردو کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

سیکھے نہ جمیل اردو کا سنگار اب ایرانی تلمیحوں سے
پہنے گی بدیسی گہنے کیوں، یہ بیٹی بھارت ماتا کی

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ جمیل مظہری کی شاعری قومی شعور، قومی یگانگت اور قومی رنگ و آہنگ میں پوری طرح پیوست ہے اور اس نقطۂ نظر سے جمیل مظہری کی انفرادی عظمت مسلم ہے۔



بہار میں فصل بیمہ پروگرام لاگو

بہار میں پہلی بار اس سال فصل بیمہ پروگرام لاگو کر کے چھوٹے اور سیمانت کسانوں کو قدرتی دشواریوں جیسے باڑھ، سوکھا، راحت دینے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ یہ پروگرام امتحان کی شکل میں اس سال سے لاگو کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس پروگرام کو امداد باہمی ڈیپارٹمنٹ کے ذریعہ سانکھیکی اور مولیانکن ڈائرکٹوریٹ اور فائنانس ڈائرکٹوریٹ کی مدد سے کی جائے گا۔ ہر ایک فصل و علاقے کے لئے الگ فصل بیمہ ہوگا۔ علاقے کا انتخاب انڈین سنٹرل انشورنس کارپوریشن کے ذریعہ صوبائی حکومت سے مشورہ کر کے کیا جائے گا۔ جنرل انشورنس کارپوریشن کے فصل بیمہ یوجنا کے تحت صوبائی حکومت ایک حصہ دار کی شکل میں حصہ لے گی۔ اور پریمیم و عوض میں ۲۵ فیصد تک اپنی مدد دے گی

اس پروگرام کا فائدہ صرف انہیں چھوٹے اور سیمانت کسانوں کو حاصل ہوگا جنہیں سنٹرل کوآپریٹو بینک اور دیگر بینکوں سے فصل پر قرض ملے گا۔

सू० ज० स० नि० - 459 - स (सू० 196) 81-82

جمیل مظہری اور اُن کی غزلیہ روایت

ولی احمد ولی

بہار کی زمین شروع ہی سے بڑی زرخیز رہی ہے۔ اس نے اردو شعرو ادب کی ترویج و ترقی اور تعمیر و تشکیل میں کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ اس کی یہ خدمات تاریخ ساز اہمیت کی حامل ہیں۔ اشرف علی خاں فغاں اور غلام یحیٰ سے راسخ و فدوی، صفیر و شاد اور شہباز و آزاد تک کے عہد میں شعراء نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور اپنی شاعرانہ بصیرت اور فنی کمالات کا مظاہرہ کیا ہے۔ مرثیہ، مثنوی، غزل، رباعی، قطعہ، شہر آشوب اور عام موضوعاتی نظمیں کثرت سے لکھی جاتی رہیں۔ دورِ قدیم میں آیت اللہ جوہری نے مثنوی "گوہر جوہری" تصنیف کی اور شاعرانہ کمال کا مظاہرہ کیا تو دورِ جدید میں عبد المجید شمس نے مثنوی "حیات و کائنات" تخلیق کی ـــ کلاسیکی دور میں راسخ عظیم آبادی جیسا منفرد غزل نگار گذرا تو دورِ جدید میں شاد عظیم آبادی جیسا صاحب طرز اور قادر الکلام شاعر آسمان ادب و شعر کی تابناکی اور تابندگی بخش گیا۔ مختصر یہ کہ بہار کی ادبی و شعری تاریخ بہ نظر غائر مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ہر دور میں بہار نے ذوق ادب اور شوق شعر کی ... پرورش کی۔

دورِ حاضر میں علامہ جمیل مظہری کی شاعرانہ شخصیت و عظمت ابھر کر سامنے آئی۔ جنھوں نے اپنی نظموں، غزلوں، مثنویوں اور مرثیوں کے وسیلے سے بہار کی شعری روایات کو فروغ دیا۔ وہ ایک کامیاب غزل نگار بھی ہیں اور کامیاب نظم نگار بھی۔ انھوں نے مراثی کے بھی بہت نمونے پیش کئے اور ساتھ ساتھ شاداب اسلوب نحو میں مثنوی بھی تخلیق کی ہے۔ جمیل مظہری کے فکر و فن محاسبہ و محاکمہ کرنے سے قبل ان کی مختصر سوانح حیات اور ان کے طرز زندگی کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

علامہ جمیل مظہری نے شمالی بہار کے ضلع ... کے قصبہ حسن پورہ میں ۱۹۰۱ء میں چشم وجود کھولی۔ عہد طفلی مظفر پور اور عظیم آباد میں بسر ہوا۔ تعلیم و تدریس کے مراحل میں پٹنہ، موتی ہاری، مظفر پور اور کلکتہ سے وابستگی رہی۔ ۱۹۳۱ء میں انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی اور تاریخ اسلام میں ایم۔اے کی سند حاصل کی۔ تکمیل تعلیم کے بعد اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سیاسی سرگرمیاں معراج کمال پر تھیں اور تحریک آزادی اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ جمیل مظہری پر بھی اس عہد کی سیاسی سرگرمیوں کے اثرات مرتسم ہوئے اور انھوں نے اس میں نمایاں حصہ لیا۔ مولانا ابو الکلام آزاد، عبد الرزاق ملیح آبادی اور پروفیسر عبد الباری وغیرہ مسلم رہنماؤں کی مخلصانہ کاوشوں کی وجہ سے محکمۂ نشر و اشاعت میں

پبلسٹی آفیسر کے باوقار عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں جب وزارتوں نے استعفے دیا تو اس کا ایک خاص رد عمل جمیل مظہری کے ذہن و دل پر بھی ہوا۔ لیکن انھوں نے نہایت صبر و استقامت اور ضبط و تحمل سے کام لیا۔ ۱۹۴۲ء میں عدم تعاون کی تحریک نے زور پکڑا۔ اسی اثنا میں مہاتما گاندھی کی گرفتاری عمل میں آئی تو جمیل مظہری بھی اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ لیکن مستعفی ہونے کے بعد بھی ان کے ذہن و دل کو سکون و ثبات حاصل نہ ہو سکا۔ خاندان کی کفالت کا بار انہیں کے دوش پر تھا۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۴۲ء میں بمبئی کی فلمی دنیا میں قدم رکھا جہاں تقریباً چار سال تک اقامت پذیر رہے اور فلموں کے لئے نظم اور گیت لکھتے رہے۔ لیکن وہاں بھی انہیں سکون و قرار نصیب نہ ہوا۔ ہمیشہ گھٹن محسوس کرتے رہے۔ اسی لئے ۱۹۴۶ء میں اس ماحول سے تنگ آکر لوٹ آئے۔ اسی سال انہیں ڈپٹی ڈائرکٹر آف پبلسٹی کا عہدہ پیش کیا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں ان کی ملازمت منتقل ہو کر شعبہ اردو پٹنہ کالج سے منسلک ہو گئی۔ جہاں سے وہ ۱۹۶۴ء میں سبکدوش ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد کی زندگی انھوں نے اپنے برادر خورد رضا علی مظہری کے ساتھ کلکتہ اور بھیکن پور (مظفر پور) میں بسر کی اور بھیکن پور ہی میں انھوں نے ۱۳ جولائی ۱۹۸۰ء کو اس دنیائے آب و گل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔

ان کے اندر ذوق شعر گوئی بچپن ہی سے تھا۔ طبیعت کی فطری موزونیت کی بنا پر چھ سات سال ہی کی عمر سے موزوں اشعار کہنے لگے تھے۔ پھر انہوں نے باضابطہ رضا علی وحشت کلکتوی کی شاگردی اختیار کر لی اور ان سے کسب فیض کیا اور اپنی شاعری کو جلا بخشی۔ موصوف آغا حشر کشمیری، آرزو لکھنوی، نواب نصیر حسین خیال اور مولانا ابوالکلام آزاد سے بے حد متاثر ہوئے۔ یہ مذکورہ حضرات آسمان ادب و شعر کے روشن ستارے ہیں۔ انھوں نے شعر گوئی کے ایک خاص دور میں ترقی پسند تحریک کا اثر قبول کیا اور اس سے اپنی شاعری میں استفادہ بھی کیا۔ لیکن ان کی شاعری میں ترقی پسند تحریک سے زیادہ علامہ اقبال کے فکر و فن کے اثرات موجود ہیں۔

شعر و ادب میں زندگی کی آئینہ داری ہوتی ہے مشہور مغربی نقاد میتھو آرنلڈ کا قول ہے کہ 'ادب تنقید حیات ہے' لہذا بڑا شاعر یا ادیب وہی ہے جس کے تخلیقی نمونوں میں زندگی کا گرم خون دوڑتا ہے اور ساتھ ہی رودِ عصر کی شعلہ سامانی ہے۔ اعلیٰ شاعری یا اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لئے شاعر و ادیب کو دلکش نظریات اور پاکیزہ احساسات کو اپنی شاعری کے ذریعہ پیش کرنا چاہئے۔ لیکن اس کی غرض و غایت ہرگز یہ نہیں کہ شاعر مبلغ بن کر رہ جائے۔ اردو شاعری کا بہ نظر غور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اردو کے بیشتر شعرا اس دام میں گرفتار ہیں اور سستی جذباتیت اور سطحی خیالات کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ جدید شعرا میں چند ہی شعراء ایسے ہیں جو اس سے مبرا نظر آتے ہیں۔ ان میں فراق، فیض اور اختر الایمان وغیرہ قابل ذکر ہیں ___ جوش اور مجاز جیسے شاعر اپنے نظریات کی تبلیغ اور انقلاب کی کھوکھلی نعرہ بازی میں ڈھنڈورچی بنکر رہ گئے ہیں اور جذبات کی قے کرتے نظر آتے ہیں۔

صنف غزل، خالص واردات قلبیہ اور داخلی کیفیات کی ترجمانی کرتی ہے۔ غزل کے اشعار بشری نفسیات کی نہایت خوش سلیقگی اور فنی سلیقہ مندی سے عکاسی کرتے ہیں۔ غزل نگار شاعر خارجی کائنات کو بھی اپنی داخلی کائنات میں جذب کر لیتا ہے اور اس

ملتا ہے اور جہاں تک غزل کا معشوق زندہ جسمانی وجود رکھتا
ہے اس میں خاصیت و صداقت اور وابستگی رکھتا ہے
وہ شعر میں غزل کے حصہ میں جمیل مظہری ایک
اہم منصب کے حامل ہو گئے ہیں کہ انھوں نے غزل
میں سلیقہ مندی سے مزاج پرکھا بھی ہے اور برتا بھی ہے
جمیل نے اس میں شعوری طور پر انفرادیت کا اظہار شاعرانہ طور
اور شاعرانہ تجربہ سے ہی آبادی نے بھی اپنے مخصوص
انداز میں کیا ہے۔ ع

"جمیل مظہری سا قدرداں بخشا گیا مجھ کو"

جمیل مظہری نے اپنے عنفوان شباب میں بھی
سستی جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کیا اور فن کے
حدود اس کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اس عہد رنگین
میں بھی انھوں نے فنکارانہ بصیرت کے تقاضوں کی
تکمیل کی۔ یہ درست ہے کہ اس عہد میں ان کے فن
میں وسعت و تنوع گہرائی و گیرائی کم ملتی ہے لیکن شیرینی
زبان، سادگی بیان، تازگی احساس اور نغمگی و
موسیقیت کی فراوانی اس دور کی غزلوں میں بھی ہے۔
چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

جیسے کہ مہ وشوں برسوں دلوں کی تمنا کھیل ہے
ہم ادھاد کر رہے ہیں جو دیر سے سنگی ہے

پڑا تھا سرنا شناس کا ہر کی یہ اچانک یہ جاگ تم سے
جو زندگی تھک چکی تھی وہ پا گئی آہ آگ تم سے

اٹھا کے شعلے ہاتھ سے دل میں الاؤ سے دور جب نظر سے ہو
نہ ڈوبا تا ہوا ہے پانی نہ تاپی جاتی ہو آگ تم سے

گھٹا ساون کی گھر آ کے گل پر آ کے کہتی ہے
کہ آ کہ بسنت [illegible] ہم بند [illegible] ہے

قربان ہو جائے کہ اس سے تو جھپٹ کے اس کے
آنکھوں میں بادل آتے تھا آنچل میں چھپائے ہوتی ہو

تو اور تری چھپکلیاں جب پانی بھرنے جاتی ہیں
تب چلنے والے ہوتے ہیں تب حسن گلابی ہوتی ہے

جو جاتی ہے دنیا کے نئے گیت سہانا
اس دل کی صدائیں جو کسی کو پکارے

اشکوں سے مرے بھیگ چلا رات کا آنچل
آ چاند مرے ڈوبنے جاتے ہیں ستارے

اس عہد میں جمیل مظہری نے رنگین خواب دیکھے
ہیں، کاجلوں کی حکایت، چوڑیوں کی کھنک اور پازیبوں
کی جھنک سب ہیں مگر خواب ہائے رنگین کی تعبیر، خلوص
اور اس کی بخشش کشش فنکارانہ ہیں۔ اس مرحلے میں بھی
بیدار مغز شاعر نے مقامی رنگ کے وسیلے سے اپنے فن
کو غازۂ ندرت اور جدت و لطافت بخشی ہے ؎

اندیشہ ہائے فردا شاعر کی زندگی میں
بادل کے چند ٹکڑے بکھرے ہیں چاندنی میں

کل رات نبض فطرت کچھ تیز چل رہی تھی
دو دل دھڑک رہے تھے جنگل کی خامشی میں

کومل دو ذیک کوئل بولا نہ ایک پپیہا
کوئی ہوا نہ ساتھی راہ صبا کی جستجو میں

جمیل اس دل کی بانسری میں بہت سے نغمے چھپے ہوئے ہیں
جسے سننے کا تمہاری تمنا ہے اب تک سنا نہیں ہے

جمیل مظہری کی ذہنی و فکری تربیت ایک ایسے عہد میں ہوئی جو تضادات، کشمکش اور بحران سے دوچار تھا، جس میں معاشرتی زندگی طرح طرح کی مشکلات و تکالیف الجھن اور پیچیدگی میں مبتلا تھا۔ اور عالمگیر پیمانے پر الم انگیز تجربے و مشاہدے وجود پذیر ہو رہے تھے۔ اقدار حیات میں تیز رفتار تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ علامہ جمیل مظہری نے اقدار زندگی کے ان تغیرات کو بہت قریب سے دیکھا اور مشاہدہ و تجربہ کے وسیلے سے اس پر گرفت کی اور اس عہد کے تمام سنگین حقائق کو اپنے شاعرانہ شعور کا حصہ بنایا۔ لیکن سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت ان کی شاعرانہ شخصیت کی یہ ہے کہ انھوں نے کسی نقطہ نگاہ یا مکتبہ فکر سے وفادارانہ یا جانبدارانہ وابستگی نہیں رکھی ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر ہوئے۔ اور اس کی طرف متوجہ بھی ہوئے لیکن ترقی پسند تحریک سے اس انداز میں وابستہ ہوئے کہ جس سے ان کی آزادی فکر کی کو متاثر ہوئی۔ انھوں نے فنی سلیقہ کے ساتھ جدید اور ترقی پسندانہ میلانات اور رجحانات کو اپنی شاعری کے ذریعے پیش کیا۔ لیکن اس کے اظہار میں کہیں سطحیت یا نامیانہ پن کا مظاہرہ نہیں ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ؎

خلاف رسم تغزل سرا ہوں میں
رباب وقت کی بکھری ہوئی صدا ہوں میں

عام شاعروں کے یہاں اس قسم اور رنگ کی شعریت اور فنی چاشنی کا فقدان مناسب ... کہ ادب ... جو ابھر جا بجا مل جاتے ... اور کھوکھلی نعرہ بازی ... جمیل مظہری کا کمال فن ... زندگی کے گوناگوں معاملات و مسائل

پر گہری نگاہ ڈالی اور تجربے و مشاہدے کو دلکش اسلوب سخن میں پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے جمیل مظہری کے محسوسات کی دنیا بہت متنوع اور وسیع ہے اور اس کی نفسیاتی ژرف نگاہی اور دلچسپی اپنی مثال آپ ہے۔ انہیں احساس ہے کہ غزل کے صنفی تقاضوں کو ملحوظ رکھے بغیر غزل گوئی کے اعلیٰ فنی معیار تک رسائی مشکل ہے۔ اس ضمن میں ایک شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

جمیل اپنی سخنوری بھی فسوں گری ہے، مصوری ہے
بنا کے تصویر مہ جبینوں کی رنگ بھرتا ہوں آرزو کا

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی آرزو مندی اور تمناؤں کا اظہار لطیف پیرائے بیان میں کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

محبت میں آئی اک ایسی بھی منزل
کہ ڈھونڈا خرد نے جنوں کا سہارا

وہ جگر کو زخم نہ دے سکے، میں جبیں پہ داغ نہ لے سکا
نہ نگاہ ناز اٹھی نہیں - یہ سر نیاز جھکا نہیں

دنیا ہے محبت سے خالی ... ہے محبت جو یہاں
صحرا میں سا غر پیاسا ... کیا کیجیے

شکستہ رنگ رخ تو ... ہے
حکایتیں ہیں اور بھی ... کتاب کا

کبھو نہ یہ کہ محبت ہے ... سے مجھے
ڈرا دیا ہے پتنگوں ... نے مجھے

سوال یہ ہے کہ اب اور ... کیا ہے
مرے اندھیرے ... سے ... جانے

بچت کی شاندار یوجنا سے زیادہ اچھا سود اور آسانیاں۔

(۱) ۶ سالہ راشٹریہ بچت پتر (VI نرگم)۔ (۲) ۷ سالہ راشٹریہ بچت پتر VII

۱۲ فیصد چکرورِدھی گنا ہر ایک چھ ماہ پر لگایا جاتا ہے۔

-/۱۰۰ قیمت کے VI نرگم بچت پتر کی اصل قیمت وقفہ ختم ہونے پر ۲۰۱٫۵۰ روپئے VII نرگم بچت پتر پر سود ہر ایک چھ ماہ پر نکالا جا سکتا ہے۔

قیمت

VI نرگم بچت پتر ۱۰ روپے، ۵۰ روپے، ۱۰۰ روپے، ۵۰۰ روپے، ۱۰۰۰ روپئے اور ۵۰۰۰ روپئے، اور کا فراہم ہے VII نرگم بچت پتر ۱۰۰ روپئے، ۵۰۰ روپئے، ۱۰۰۰ ہزار اور ۵۰۰۰ روپئے کا فراہم ہے۔ بچت پتروں کو خریدنے کی کوئی زیادہ سیما متعین نہیں ہے۔

سود کی سہولتیں

انکم ٹیکس قانون ۱۹۶۱ کے تحت سود پر انکم ٹیکس لگتا ہے۔ لیکن اس کی کٹوتی نہیں کی جاتی ہے۔ انکم ٹیکس قانون کی دھارا ۸۰ ایل کے تحت انکم ٹیکس کی چھوٹ ان بچت پتروں کے دھارکوں کو دینا ہے۔

دوسری آسانیاں

(۱) نابالغ کے ساتھ کوئی آدمی یا دو بالغ جوائنٹ شکل میں ان بچت پتروں کو خرید سکتا ہے

(۲) جوائنٹ اکاونٹ میں بھی داخلہ کی آسانی،

(۳) گروی رکھنے کی آسانی،

(۴) بچت پتر کے ساتھ پہچان پتر حاصل کرنے پر ہندوستان کے کسی بھی ڈاک گھر سے ادائیگی کیا جا سکتا ہے۔

(۵) ایک ڈاک گھر سے دوسرے ڈاک گھر اور ایک دھارک کو دوسرے دھارک کو بچت پتر تبدیل کئے جا سکتے ہیں

(۶) کھو جانے، چوری ہو جانے، اور خراب ہو جانے پر ڈپلی کیٹ پتر نرگت کئے جا سکتے ہیں۔

یقیناً یہی یوجنا آپ کی ضرورتوں کے مطابق ہے۔ دوسرے خاص معلومات کے لئے ضلعوں میں نیشنل سیونگ کے آفیسران اور ڈاک گھر آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔

ڈائریکٹر

نیشنل سیونگ فنانس ڈیپارٹمنٹ۔

सू० ज० स० नि० 550 स-42 (वित-26) 81-82

ڈاکٹر نسیم شہنوی

جمیل مظہری ــ چند پہلو

عہدِ حاضر میں اُردو شاعری کی چند منفرد آوازوں میں ایک آواز علامہ جمیل مظہری کی بھی تھی۔ انھیں شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری سے بھی لگاؤ تھا اور ان کی نثری تخلیقات پر بھی شاعرانہ نثر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس کے باوجود ان کی پہچان بحیثیت شاعر ہوتی ہے۔ اگرچہ انہیں نثر نگاری پر کافی عبور حاصل تھا اور ان کی نثر میں بڑی کشش نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس میدان میں بھی وہ بہت کامیاب رہے لیکن انھوں نے نثر نگاری کی جگہ شاعری کو ہی ترجیح دی مگر نثر نگاری سے کبھی منھ نہیں موڑا۔ اب تک انکے کئی شعری اور نثری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں "نقشِ جمیل"، "فکرِ جمیل"، "عرفانِ جمیل"، "آب و سراب"، "[illegible]" اور "افسانوی یکجا" وغیرہ اہم ہیں۔

شاعری میں انھوں نے نظموں اور غزلوں پر خصوصی توجہ دی [illegible] قصائد، مرثیے اور مثنوی جیسی قدیم اصناف کو بھی [illegible] کی کوشش کی۔ حالاں کہ وہ اپنی نظموں اور غزلوں کی وجہ سے ہی ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ جب ہم کسی فن کار کی شخصیت اور اس کی شاعرانہ عظمت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان مختلف عناصر پر بھی نظر ڈالنی چاہیے جن سے وہ متاثر ہوا ہے کیوں کہ فن کار اپنے بچپن سے آخری وقت تک زندگی کے مختلف مسائل سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ اس کے دل و دماغ کو سماجی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل متاثر کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کے غور و فکر کا انداز بھی بدلتا رہتا ہے کیوں کہ فن کار عام آدمی کے مقابلے میں زیادہ حساس اور بیدار ہوتا ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ علامہ جمیل مظہری پر کون سے ایسے عناصر ذمہ دار تھے کہ انہیں شعر و شاعری کی طرف راغب کیا۔

ابتدائی حالات اور شعر و شاعری سے دلچسپی

جمیل مظہری کا گھریلو نام سید کاظم علی تھا۔ شعر و شاعری سے دلچسپی ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد مولانا سید خورشید حسین اچھا شعری ذوق رکھتے تھے اور خورشید تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے علامہ جمیل مظہری کے شعری رجحان کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اس لئے بچپن سے ہی رہنمائی کرنے لگے تھے۔ جمیل مظہری بچپن میں اکثر محرم کی مجلسوں میں خود ساختہ مرثیہ کے بند پڑھ دیا کرتے تھے۔ جب انھوں نے باقاعدہ شعر کہنا شروع کیا تو اس پر اپنے والد کے علاوہ مولانا [illegible] سے اصلاح لینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اپنی شاعرانہ زندگی کا آغاز ۱۹۲۲ء کے ایک مشاعرے میں مختصری غزل پڑھ کر کیا۔ اس غزل کا مصرعہ انھیں آخری عمر تک یاد رہا۔ اس غزل کا مصرعہ تھا:

میں اُٹھ کے بیٹھ گیا گردِ کارواں کی طرح

ابتدا ہی میں انھیں بہت پسند کیا گیا [illegible] ان کے حوصلے اور بلند ہوئے اور انکی پہلی نظم [illegible] میں "مالن کی بیٹی" سے

عنوان سے کلکتہ سے شائع ہونے والے رسالہ "نشتر" میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد تو یہ سلسلہ تیزی سے بڑھتا ہی گیا۔

جمیل مظہری ـــــ نظر نظر میں

جمیل مظہری سنجیدہ اور سلجھی ہوئی شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ہمیشہ نام و نمود، شان و شوکت، مال و دولت سے بے نیاز ہو کر سادہ مگر پُروقار زندگی گذارنے کی کوشش کی۔ ان کی شخصیت کا خاکہ سید رضی الدین صاحب نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ جمیل مظہری ان کی نظر میں اس طرح تھے:

"گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، موزوں قد و قامت، اُلجھے ہوئے بال، سادہ کپڑوں میں ملبوس، خوددار ذہن، چہرہ لاپرواہ، وضع قطع بے نیاز، حرکات و سکنات کی آمیزش سے جو شخصیت ابھرتی ہے اس کو علامہ مظہری کہتے ہیں۔"

ڈاکٹر عبدالخالق نے جمیل مظہری کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ چنانچہ انھوں نے جمیل مظہری کی شخصیت کی عکاسی اس انداز میں کی ہے:

"جمیل صاحب کی شخصیت متنوع ہے۔ اسکے بے شمار جلوے اور مختلف ادائیں ہیں۔ وہ احساس کی دولت سے مالامال ہیں، آبلے کی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہی والی طبیعت پائی ہے۔ ان کی شفقت اور اخلاق و اخلاص کا ہر شخص معترف ہے، جو ایکبار بھی ان سے مل چکا ہے۔ اس خلوص اور خوش خلقی کے لئے وہ مشہور بھی ہیں اور بدنام بھی۔"

ان کی بے نیازی کی ایک اور تصویرکشی ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے بڑے ہی موثر انداز میں کی ہے۔ جمیل مظہری، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظر میں کچھ اس طرح تھے:

"وہ ایک سنجیدہ، متین اور فلسفیانہ شخصیت کے مالک تھے۔ جلسے جلوس، کانفرنسیں، مشاعرے بازی اور سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے ہمیشہ الگ تھلگ، ایک درویشانہ زندگی بسر کرنا اور خاموشی سے علمی مشاغل میں مصروف رہنا ان کی افتادِ طبع میں داخل ہے۔" ۵۵

ہر شخص میں کچھ نہ کچھ انفرادیت ہوتی ہے۔ اس کی انفرادی خوبیاں ہی اسے دوسروں سے الگ کرتی ہیں۔ چنانچہ انسان اپنے مزاج کے مطابق ہی برتاؤ کرتا ہے، اور اسی مناسبت سے اچھے و برے، کھرے اور کھوٹے پہچان کرتا ہے۔ حالات کے مطابق اس میں مختلف قسم کی تبدیلیاں بھی آتی ہیں۔ اس طرح شخصیت کی تعمیر میں عمل اور ردِعمل بھی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی کے انفرادی عمل سے لوگ سبق حاصل کریں یا پھر اس سے بیزار ہو جائیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انفرادی عمل ہی کسی کی پسند اور ناپسند، اچھائی اور برائی کا پتہ دیتے ہیں۔

اہم شخصیات سے تعلقات اور دوستانہ مراسم

جمیل مظہری ایک مخلص انسان تھے۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ ان کے ملنے والوں میں شاعر اور ادیب ہی نہ تھے، بلکہ ان کے تعلقات سیاستدانوں، صحافیوں اور دیگر شعبہ سے متعلق افراد سے بھی بہت قریبی تھے۔ جمیل مظہری ایک مدت تک صحافت کی دُنیا سے بھی وابستہ رہے تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے قریب آئے۔ پہلی بار ۱۹۳۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کا موقع ملا۔ دوبارہ ملاقات

۱۹۲۵ء میں کلکتہ میں اُردو کانفرنس کے موقع پر ہوئی۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اکثر مولانا ابوالکلام آزاد سے مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے رہے ہیں۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے ان کے بے حد مخلصانہ تعلقات تھے اور انھیں کے توسط سے مولانا ابوالکلام آزاد تک رسائی ہوئی۔

مشہور ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری سے بھی انکی قربت رہی ہے۔ ۱۹۲۸ء میں جب آغا حشر کاشمیری مظفر پور میں اپنا ڈرامہ کو لے کر آئے تھے وہاں ان سے پہلی بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ پھر یہ رشتہ دوستی میں تبدیل ہو گیا۔ اسی طرح ان کے اردو کے اہم ادیبوں، شاعروں اور نقادوں سے بھی دوستانہ اور برادرانہ رشتے رہے ہیں۔ جوش ان کے عزیز دوستوں میں تھے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی سے برادرانہ تعلقات تھے۔

تحریک آزادی سے دلچسپی، ملازمت سے استعفیٰ اور فلمی دُنیا سے وابستگی

جمیل مظہری حساس دل اور بیدار ذہن انسان تھے۔ وہ غلامی کی ذلت کو محسوس کر رہے تھے۔ اور جلد ہندوستان آزاد ہوجانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ کانگریس کے سیاسی نظریے کے حامی تھے، خصوصاً مولانا ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی اور شبلی کے سیاسی، قومی اور ملی نظریات کے معترف تھے۔ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے اور انگریزوں سے نفرت کے جذبے نے انہیں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے پر مجبور کر دیا۔

۱۹۴۲ء میں نوکری سے استعفیٰ دیدیا اور ۱۹۴۳ء میں جوش ملیح آبادی کے کہنے پر فلموں میں چلے گئے اور تقریباً تین سال یعنی ۱۹۴۶ء تک مکالمے، گیت اور کہانیاں لکھتے رہے۔ لیکن ان کی تحریر کی ہوئی ایک بھی فلم مکمل نہیں ہوئی۔

دوسری طرف فلموں کا ماحول انھیں قطعی پسند نہ تھا۔ [illegible] ماحول میں اُن کے اندر کا فنکار گھٹن محسوس کرنے لگا۔

نتیجۃً پریم چند، کرشن چندر، جوش، شعری بھوپالی، تاج بھوپالی اور کیف بھوپالی کی طرح "بھاگ رے شاعر بھاگ" کہتے ہوئے واپس چلے آئے۔

ایک مخلص اور ہمدرد انسان کی حیثیت سے

جمیل مظہری ایک دردمند انسان تھے۔ ہر شخص سے انھیں ہمدردی تھی۔ ضرورت مندوں کی مدد کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ ان کے پاس جو بھی آیا کبھی مایوس نہیں ہوئی۔ ان کا یہ رویہ صرف اپنے کے ساتھ ہی محدود نہ تھا بلکہ ہر آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے ملتے تھے۔ بقول ڈاکٹر عبدالخالق:

> "پہلی ملاقات میں کسی با اثر و رسوخ آدمی کے نام سفارشی خط لکھوا لیجئے، بہ رضا و رغبت لکھ دیں۔ سفارش کے لئے کہیں لے جائیں، تیار ہو جائیں گے، اور رکشے کا کرایہ اپنی جیب سے ادا کریں گے، کیا مجال کہ کوئی ان کی موجودگی میں کرایہ ادا کر سکے۔"

علمی و ادبی مطالعہ کے سلسلہ میں انکساری

جمیل مظہری کے اندر انکساری کوٹ کوٹ کر بھری تھی مگر خودداری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انھوں نے ادب کے ساتھ ساتھ فلسفہ، تاریخ، سیاسیات اور سماجیات کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ لیکن تاریخ اور فلسفہ سے انھیں خاصی دلچسپی تھی پھر بھی اپنے بارے میں رواداری سے کام لیتے ہوئے محتاط لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں:

> "نہ بحیثیت شاعر میری کوئی شخصیت بنی اور نہ بحیثیت مفکر۔ میں نے تاریخ کے مطالعہ میں عمر کا ایک حصہ گذارا اور مورخ نہ بن سکا۔ عمر بھر فکر کا سوچ وچار مجھے فلسفی نہ بنا سکا۔

میں نے کانگریس تحریک میں حصہ لیا، نوکری چھوڑی
اور جیل گیا، لیکن ایک سیاسی آدمی بننے کی
ہمت مجھ میں نہ ہوئی۔ میری پیٹھ تجربات کے
بوجھ سے ٹوٹ رہی ہے جسے کہیں پھینک دینا
چاہتا ہوں۔" [۲۳]

چنانچہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کے اس بیان کو مایوسانہ قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ "اپنے آرٹ سے کچھ بیزاری ... ان کا خاصہ ہے۔" ہمارا خیال ہے کہ ایک سچا فنکار کبھی بھی اپنے فن سے مطمئن نہیں ہوتا اور اگر فن کار کو تسکین ہو گئی تو وہیں سے اس کا ارتقائی سفر رک جاتا ہے۔

ہر دور کے فن کار مختلف قسم کی تحریکات، نظریات اور رجحانات سے اثرات قبول کرتے ہیں۔ اپنے سے بڑے اور مقبول فن کاروں کی تقلید کرتے ہوئے اسی رنگ میں اپنی بھی تخلیقات پیش کرتے ہیں۔ جمیل مظہری نے بھی یقیناً اپنے ہم عصر کے علاوہ اکابرین سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ساتھ ہی مغربی فلسفیوں اور ادیبوں کے نقطۂ نظر کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے جن لوگوں سے فیض حاصل کیا ہے اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"اگرچہ میری شاعری غالب، اقبال، انیس و
شاد کی مشترکہ مخلوق ہے۔ لیکن اس تخلیق
میں غالب کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ میری
مخصوص ذہنیت کی تعمیر کے سلسلہ میں نیو غالب
نے کھودی، اس پر کچھ اینٹیں اقبال نے کچھ رومی
نے اور کچھ کبیر داس ورڈسورتھ نے رکھیں۔ شعرا
کے علاوہ مغربی مفکروں نے روسو، نطشے،
شوپن ہار اور شبلی نے دیواریں اٹھائیں۔
شبلی کے سماجی و سیاسی افکار نے بڑی حد
تک میرے سیاسی ذہن کو بنایا اور مولانا آزاد

سے اسلوب بیان کا آہنگ میرے گوش سماعت میں
حرانڈیلتا رہا۔" [۲۴]

ان کی ان تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ادبیات اور فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور ان کی شاعری میں جگہ جگہ ان مفکرین اور فن کاروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اکابرین کو گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ہم پلہ بننے کی دانستہ اور ناکام کوشش نہیں کی۔ یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

جمیل مظہری اور چند ناقدین

اردو ناقدین کے رویے سے کبھی کبھی بڑی تکلیف پہنچتی ہے کیوں کہ بارہا دیکھنے کو ملتا ہے کہ کئی اہم فن کاروں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، یا پھر بہت کم لوگوں نے ان کے فن پر قلم اٹھائے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ جمیل مظہری پر بھی اردو ناقدین نے بہت کم توجہ دی ہے۔ سب سے پہلے ان کے کلام پر مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ان دونوں کی نظر میں "جمیل مظہری ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے کبھی دوم درجے کی چیز نہیں لکھی۔" اخبارات اور رسائل میں اشاعت سے وہ اکثر گریز کرتے رہے ہیں۔ ایک سچے فن کار کی طرح وہ کبھی اپنے فن کے بارے میں کسی نوع کے پندار کا شکار نہیں رہے ہیں۔"

اس کے بعد ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کے کلام کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اعظمی صاحب نے اپنا یہ مضمون تقریباً پچیس [۲۵] سال پہلے لکھا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں بھی خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید کو ادبی حلقوں میں وقعت دی جاتی تھی کیونکہ انھوں نے جوش، حسرت اور آتش پر جس انداز سے تنقید کی تھی وہ خاص طور پر پسند کی جاتی تھی۔ اعظمی صاحب کی نظر میں مظہری کی شاعری میں رومانی رنگ

ختر شیرانی اور فلسفیانہ فکر اقبال اور رومی کے یہاں سے آیا ہے
ں ان کا سیاسی اور انقلابی لب و لہجہ حسرت اور جوش سے
بداگانہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جمیل مظہری کے یہاں انقلاب
ں وہ شدت، وہ ابال نہیں ہے جو جوش کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔
لیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید سے وہ بہت مطمئن ہوئے تھے اور اپنی
شی کا اظہار ان کے نام لکھے گئے ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

برادرِ عزیز و مکرم! سلام و نیاز کیساتھ بہت سی دعائیں،
کتاب ملی۔ آپ نے زمین کی خاک کو نہیں بلکہ
چولھے کی راکھ کو اپنے ہاتھوں سے اُٹھا کر آسمان
پر اچھالنے کی کوشش کی ہے، لیکن زمین کی کشش
اور پستی کی محبت اگر اسے اب بھی کھینچے رہے
تو ذمہ داری آپ کی نہیں۔ غرور کا وہ دیا جو
زندگی کی دلیل ہے، میرے ضمیر میں کب کا بجھ
چکا ہے، آپ نے اس میں کافی سے زیادہ روغن
دے دیا۔ اب بھی روشنی نہ ہو تو آپ کا کیا
قصور۔ یہ میرا بجھ کیے، داستان لمبی ہے،
مجملاً میرے اس شعر کی زبانی سن لیجئے ؎

یہ میری آگ یوں کجلا نہ جاتی میرے سینے میں
اگر اس آگ کو کبھی تاپنے والے ملے ہوتے

آپ کی محبت کا شکریہ ادا کرنے کیلئے الفاظ
کہاں سے لاؤں۔ آپ کی قدرتِ قلمکاری کا ایک
ثمر مجھے بھی مل جائے تو شاید قرض ادا ہو سکے۔
ورنہ خاموشی ہی بہتر ہے۔ یوں آنسوؤں کی زبان
نے آپ کی اس محبت کا اعتراف جس طرح کیا ہے
جس کی گواہی آپ کے مقالے کے اوراق دینگے۔
جنھیں میرے آنسوؤں نے جگہ جگہ سے داغدار
بنا دیا ہے۔ میں آپ کے اس غائبانہ خلوص کا
شکریہ کیا کروں کہ میرا ایک چھوٹا بھائی بھی
ہے میری ادبی زندگی کو کسی نہ کسی طرح باقی رکھا۔
اب یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میرا ایک چھوٹا بھائی
اور بھی ہے۔ ...

آخر میں مجھے اتنا کہنے کی اجازت دیجئے
کہ اپنے اس مضمون میں آپ نے ٹیلے کو پہاڑ سے
نہ ٹکرایا ہوتا تو بہتر تھا پہاڑ کو میں بہر حال
پہاڑ سمجھتا ہوں، یہ اور بات ہے کہ اس کے
شکم میں جواہرات ہی نہ ہوں کوئلے ہی کی
کانیں کھلی ہوں۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی
کے رسالے "سوغات" میں میری ایک طویل نظم
"فریاد" شائع ہوئی ہے۔ یہ میری ان معدودے
چند نظموں میں سے ہے جو مجھے بھی پسند ہیں۔
کیا آپ کی نظر سے گذری ہے؟ ...
؎ دعائیں ان کو شوق کی، سلام ان کو شوق کا،

بہر حال میں آپکا بندۂ احسان
جمیل مظہری

یہاں جمیل مظہری کے اس طویل خط کی نقل کرنے کی میری مراد یہ ہے کہ وہ اعظمی صاحب کی تنقید سے مطمئن تھے۔ بلکہ بڑی انکساری سے کہتے ہیں کہ "آپ نے ٹیلے کو پہاڑ سے نہ ٹکرایا ہوتا تو بہتر تھا۔ پہاڑ کو میں بہر حال پہاڑ سمجھتا ہوں"۔ اس جملے میں ان کا اشارہ یقیناً جوش ملیح آبادی وغیرہ کی طرف ہے۔ کیونکہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے انھیں اختر شیرانی، حسرت موہانی اور جوش سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اعظمی صاحب کے نقطۂ نظر سے اختلاف کی گنجائش ہے، پھر بھی اس میں کسی حد تک صداقت ہے کہ جمیل مظہری کا رومانی، انقلابی اور فلسفیانہ فکر اپنے ہم عصر کے مقابلے میں زیادہ واضح اور مؤثر ہے۔ ان کے یہاں انقلاب کا لب و لہجہ جوشیلا نہ ہو کر نرم و شیریں ہے۔

سیاسی نظریہ میں انتہاپسندی کے بجائے اعتدال پسندی ہے حالانکہ وہ حسرت کی طرح سیاسی سرگرمیوں اور تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصے لیتے رہے ہیں، اور جمیل کی ... ہیں۔ لیکن جمیل کے یہاں حسرت کے مقابلے میں کئی اچھی سیاسی نظمیں ملتی ہیں۔ رومانی شاعری میں ان کے یہاں ہندوستانی تہذیب و معاشرے کا خیال کرتے ہوئے محبوبہ کو بے وفا کہنے کے بجائے اس کی مجبوریوں اور پابندیوں کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے ان کی عذرا اور شیاما سیدھی سادھی ہندوستانی عورت ہیں۔ ان کے اندر بیباکی کی جگہ شرم، حیا و حجاب پایا جاتا ہے۔ یقیناً جمیل مظہری نے اختر شیرانی کی طرح آسمانی حور اور پری جمال کا تصور نہیں کیا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین نے بھی انکی فنی خوبیوں کو یوں بیان کیا ہے:

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے غور و فکر کی تہہ میں ایک خیال افروز تشکیک کی کارفرمائی ہے۔ تشکیک انسان کی تخیلی اور علمی زندگی میں بڑا تخلیقی اور ارتقائی مقام رکھتی ہے۔ بشرطیکہ اس کی نوعیت محض انتشارِ ذہنی اور منفیانہ کریدکی نہ ہو۔ ایسی تشکیک کہیں نہیں لے جاتی بلکہ قنوطی اور کلبیت پسند بنا دیتی ہے۔ جمیل کی تشکیک تخلیقی ہے اور وہی ان کو خدا اور کائنات کے ایک تخلیقی تصور تک پہونچاتی ہے۔"

متضاد شخصیت

دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس کے یہاں زندگی کے زندگی کے ہر شعبے میں یکسانیت ہی پائی جاتی ہے۔ انسان میں تضاد کا ہونا ایک فطری عمل ہے۔ روشن، ذہن اور آدرش وادی شخص میں بھی تضاد کی مثالیں مل جاتی ہیں مثلاً ڈاکٹر عبد الخالق جمیل مظہری کی روپیہ پیسہ سے دلچسپی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

جہاں کہیں رقم ملنے کی گنجائش نکلی وہاں وہ ہر قیمت پر آمادہ لیکن ایسا بھی ہوا ہے اور اس وقت میری حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا کہ بڑی سے بڑی رقم کو بھی انھوں نے یوں ٹھکرا دیا جیسے وہ سانپ بچھو ہوں۔"

علامہ جمیل مظہری نماز وغیرہ کے زیادہ پابند نہیں تھے۔ بقول ڈاکٹر عبد الخالق:

میں نے ان کو نماز پڑھتے کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن ہاتھ میں تسبیح لئے دانوں پر انگلیاں پھیرتے اور آہستہ آہستہ کچھ بدبداتے اکثر دیکھا —— کسی چیز پر ان کا ایمان ہو نہ ہو لیکن استخارہ پر انھیں کامل یقین ہے اور اس یقین کامل کو آپ جزو ایمان بھی کہہ سکتے ہیں۔"

ہمارا خیال ہے کہ جمیل مظہری کے شعری و فکری آہنگ کو سمجھنے کے لئے ان چند پہلوؤں پر نظر ڈالنا ضروری ہے

تحریر: ممتاز شبنم

جمیل مظہری کی عورت

اُردو شاعری میں "عورت" کو ایک منفرد اور انوکھا مقام حاصل ہے۔ اور اس کے ذکرِ رنگین سے اُردو شاعری میں دلکشی و رعنائی پائی جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے بھی وجودِ زن کو 'تصویرِ کائنات' میں رنگ و بو ہونے کا سبب قرار دیا ہے اور یہ رنگ دراصل وہ جذبۂ محبت ہے جس کے بغیر نہ اُردو شاعری میں جان پڑ سکتی ہے اور نہ اشیار کائنات میں باہمی کشش ممکن ہے۔ عورت کی قوتِ کشش ہی مردوں کے دل میں جذبۂ محبت بیدار کرتی ہے۔ عورت کا ہر پہلو ایک داستان ہے اور جذبۂ عشق عورت کی ہر ہر ادا کو، ہر ہر انداز کو دیکھتا پرکھتا اور آہوں سے نکلتے دھوئیں کو الفاظ کے بوتل میں قید کر کے اسے شعر کے پیکر میں ڈھال دیتا ہے۔ جس طرح حیات و کائنات کے سربستہ رموز کی عقدہ کشائی شاعروں، مفکروں اور فلسفیوں کے لئے ناممکن بن کر رہ گئی ہے۔ شاعر شعر کہنے کی تحریک فطرت سے پاتا ہے اور عورت حسنِ فطرت کا شاہکار ہے۔ اسلئے اس سے عشق کا ہونا لازمۂ فطرت ہے۔

یوں تو عورت ہر آرٹسٹ کی توجہ کا مرکز ہے مگر بقول اقبال 'شاعر و صورت گر و' افسانہ نویس کے اعصاب پر خاص طور سے عورت سوار ہے۔ اور یہی عشق کبھی میر کو قولِ قسم پہ اعتبار کر کے خیالِ خام کرنے پر مجبور کر دیتا ہے اور کبھی غالب کو حیات و موت کے گورکھ دھندوں میں مقید کر دیتا ہے ـــــ

اگر جیتا تو مرنا کس کو کہتے ہیں
[illegible]

اُردو شاعری کا بیشتر سرمایہ اگر ایک طرف عورت جو ایک معمّہ ہے، اس کی عقدہ کشائی پر مشتمل ہے تو دوسری طرف شاعروں نے اسے اپنی نگاہِ ہوس، نگاہِ کرم اور نگاہِ تغافل کی دیگچی میں رکھ کر جذبات کے چولھے پر چڑھایا اور تصورات کے بت کے گرد لپیٹا ہے۔ عورت کے حسن و ادا کی تعریف میں دفتر کے دفتر بھرے ہوئے ہیں۔

چنانچہ اُردو کے دیگر شعرا کے مانند جمیل مظہری نے عورت کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ جمیل مظہری نے جن کھرے جذبات کا تجزیہ اپنے اشعار میں کیا ہے ان پر تنقید کرنے کے بجائے ہم اپنے دل کی دھڑکنیں سُننے لگتے ہیں۔ جمیل مظہری ضلع سارن، بہار کے ایک بلند و بانگ شاعر ہیں۔ زندگی میں گذرنے والے حادثات ان کے اشعار میں سمٹ کر عوام کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔

وہ مشرقی ہندوستان کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کے تخیل کی جولانگاہ میں عورت ایک باوقار حسن لیکر داخل ہوتی ہے، جناب خلیل الرحمٰن اعظمی کا بیان ہے کہ :

(جمیل مظہری کی شاعری میں عورت) .... کوئی آسمانی خواب یا صحرائے عرب کی حور نہیں بلکہ ہندوستان کی سانولی سلونی مٹی کی مورت ہے "ـــــ یہی وجہ ہے کہ جمیل عورت کی فطرت کا تجزیہ کرتے ہوئے کہیں بھی سرو قد اور پستہ دہان حسیناؤں کے پیچھے نہیں بھاگتے ہیں۔ اُردو شاعری کا طرۂ امتیاز یہ رہا ہے کہ محبوب ظالم، مبہم کمر،

ین شراب کے پیالے ہیں۔ غور فرمائیے کہ اُردو شاعری کے
وب کی مجموعی شبیہہ کیا ہوگی ؟ "فکروفن" کے مصنف کا خیال
رکھنؤ کے شعراء محبوب کی خارجی تصویر بنانی چاہی تو
نتیجہ یہ کہ کیف واثر سے دُور جا پڑی بلکہ محبوب
ب کارٹون بن کر رہ گیا جس سے بجائے احساسِ جمال
تسکین کے ہنسی آتی ہے۔ لہ

جمیل مظہری نے عورت کو ہندوستانی چوکھٹے میں
فٹ کیا ہے اس کی ہر ادا میں سادگی اور انکساری
یاں ہے۔ جمیل سیتا و ساوتری اور مریم کے تقدس کو
ش کرتے ہوئے اپنے ہی معاشرہ میں گم ہوجاتے ہیں۔

عشق خوابیدہ ترے جلوۂ بیدار میں ہے
سادگی شوق میں معصومیت افکار میں ہے

معنٔی لفظ سکوں، رازِ محبت ہے تو
بے مجمل تری تعریف کہ عورت ہے تو

حسنِ کردار نہاں حسنِ طبیعت میں ترے
سرجوشِ وفا شیشۂ عصمت میں ترے

غازۂ فطرت کو آنچل میں چھپاتی ہے
بے حجاب اداؤں کو تہذیب سکھاتی ہے

حسرت کی "وہ ترے کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے"
کہانی ادھوری رہ گئی تھی اس کی تکمیل جمیل مظہری
کی نظمیں کرتی ہیں۔ حسرت کے یہاں حسن پرستی، شوخی
چھیڑ چھاڑ اور اس طرح کی نشاطیہ کیفیت ہے ....

..... جمیل مظہری کا عاشق چونک گیا ہوا ہے اُسے
ہماری معاشرت کی تنگ دامانی کا ... سے ٹکرانا پڑتا
ہے۔ (۱)

اُف ترا پھولوں میں تُلنا وہ سُہاگن بن کر
میرے گلزارِ تخیل کا وہ صحرا ہونا

میری بے تابیاں صدقے تری بدنامی پہ
میرے جذبے کی کہ لذت ...

جمیل عورت کو ایک کانچ کی پیالی سمجھتے ہیں جو کہ ذرا
سی ٹھیس سے چکنا چور ہو سکتی ہے۔ گو کہ جہاں وہ عورت کو
ایثار و قربانی کی دیوی اور شرم و حیا کا مجسمہ سمجھتے ہیں وہیں
درد و غم کا حامل بھی گردانتے ہیں۔ وہ عورت کا فطری حسن
یعنی اس کی حیا کو کسی صورت میں ختم ہوتے نہیں دیکھ سکتے ہیں۔
اور جگہ جگہ سمجھاتے ہیں :

اے جادوئے بنگالہ جلووں کو نہ ارزاں کر
شوخی کو دبائے رکھ انداز کو پنہاں کر

جمیل مظہری کے اشعار میں جادو جگاتی ہوئی یہ حسینائیں
جنھیں کبھی جمیل عذرا، "سلمیٰ"، دوشیزۂ بنگال کے نام سے
پکارتے ہیں اپنی چند خصلتوں کی وجہ سے اختر شیرانی کی
سلمیٰ کی بہن اور سہیلی نظر آنے لگتی ہے اور کبھی کبھی جمیل
کی عذرا جب شرما کر آنچل میں منہ چھپا لیتی ہے یا پھر سالن
جلا ڈالتی ہے تو وہ مجاز کی دوشیزہ کا ہاتھ تھام لیتی ہے جو:

اِک مجمعِ رنگین میں گھبرائی ہوئی سی
بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی

(جاری ہے)

لہ ... مظہری از خلیل الرحمٰن اعظمی "فکروفن"

روٹھی روٹھی ادا میں شوخی
شوخی میں حیا حیا میں شوخی
معصوم نظر میں اک شرارت
کہتے ہیں اسی کو کیا محبت

(جمیل مظہری)

مگر مجاز کی راہیں جمیل سے وہاں الگ ہو جاتی ہیں جہاں مجاز اپنی محبوب کے آنچل کو پرچم بنا دینے پر آمادہ نظر آنے لگتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جمیل نے سرِ بام عورت کا تصور ہی نہیں کیا ہے۔ انقلابِ نسواں تو دُور کی بات انکی عورت تو بس اماں کے پاس رہتی ہے ؎

جو پاس چولھے کے اماں کے ڈر سے جاتی ہوں
تو خود بھی جلتی ہوں سالن کو بھی جلاتی ہوں
نمک سمجھ کے شکر دال میں ملاتی ہوں

عورت کا کردار جمیل کی شاعری میں اچھوتا اور مثالی نہیں ہے بلکہ ہیں ان کی سلمیٰ اور عذرا اپنے اردگرد گھومتی اور ناز کے پردے میں منھ چھپاتی نظر آتی ہیں۔ خاکِ مشرق سے جنم لینے والی اِن وفا کی مورتوں نے اپنے خدایانِ مجازی کو ہر لمحہ اپنا قبلہ جانا ہے اور ان کی خدمت اپنا فرض سمجھا ہے۔ جمیل عورت کے اس جذبہ پہ مسکرا پڑتے ہیں ؎

کسی قمیص کے اُدھڑے ہوئے گریباں پر
تمہارے ہاتھ کے ٹانکے سلام کہتے ہیں
اُبھر گئے تھے جو تکیوں پہ بیلے نقش و نگار
تمہارے دل کے وہ جذبے سلام کہتے ہیں

جمیل نے عورت کو وجود کو، جو ایک ساز ہے اپنے نوکِ قلم کے مضراب سے چھیڑا ہے اور حسنِ دل آویز کے تمام سروں کو گنگنایا ہے۔ جمیل نے زندگی کے تقاضوں سے کبھی چشم پوشی نہیں کی ہے۔ انہوں نے محبت سے آنکھ مچولی بھی کھیلی ہے اس کی ناکامیاں، تلخیاں، کسک و جلن کے مفاہیم سے آشنا ہوئے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ اس کی عظمت سے انکار نہیں کرتے بلکہ انھوں نے عورت کی عظمت کو سدرۃ المنتہا تک پہونچا دیا ہے۔ جمیل مظہری کی عورت نئی نسل کے شعرا کے لئے مشعلِ راہ ہے کہ توجہ کا مرکز 'شمعِ انجمن' کے بجائے 'ہوا خانہ' بھی ہو سکتے ہیں جو کہ شاعری میں مادرائی دھندلکوں کے بجائے جیتی جاگتی دُنیا آباد کریگی۔

یقینِ کامل ہے کہ جمیل کی یہ عورت ان کے اشعار کے پردوں میں ہر زمانہ میں قارئین کو متاثر کرتی رہے گی ٭٭٭

اوراقِ پارینہ

علامہ سے ایک گفتگو

کلام حیدری

سہیل، کا خاص نمبر نکلنا چاہئے اور یہ نمبر جمیل مظہری کے فن اور شخصیت سے متعلق ہو مگر ——— میرے سامنے علامہ کی پوری شبیہ آگئی۔ وہ شان فقیری، انکسار اور صوفیانہ رکھ رکھاؤ۔ یا اللہ مشکل میری آسان کر، میں ان کا شاگرد بھی تو ہوں۔ کبھی بلا کر ڈانٹ دیا تو عمر بھر کا خیال پل بھر میں خواب بن جائے گا۔ اس لئے صرف خاص نمبر ہی کا اعلان کیا۔ یہ نہ کہا کہ یہ علامہ سے متعلق ہوگا۔ اور خطوط لکھنے شروع کئے کہ علامہ سے متعلق نمبر نکالنے کا خیال ہے۔ اختر اورینوی صاحب نے مدد کا وعدہ کیا۔ وفا ملک پوری نے ڈھارس بندھائی۔ رضا نقوی صاحب نے اپنے مختصر شگفتہ انداز میں بیٹھ ٹھونکی ——— جیسے کہہ رہے ہوں بس اب ٹھانی ہے تو جمیل مظہری نمبر نکال ہی دیجئے۔ اپنے حامیوں کی تعداد میں روز افزوں ترقی دیکھ کر مجھ میں ہمت بڑھی ——— اب علامہ ڈانٹ بھی دیں گے تو نہیں مانوں گا ——— مگر کبھی کبھی استاد وہ بھی جمیل مظہری سے استاد کا رعب غالب آ ہی جاتا۔ اور علامہ سے ملاقات کرنے کی جسارت نہ ہوئی۔

چنانچہ نمبر کے مضامین کے لئے خطوط لکھا گیا۔ جواب آتے گئے۔ مضامین لکھے جانے لگے۔ مگر میں علامہ سے ملاقات کا risk لینے کو تیار نہ ہوا۔ ایک ماہ گذر گیا۔ آخر جی کڑا کر کے میں نے فیصلہ کیا علامہ سے مل ہی لوں۔ گیا سے پٹنہ تین گھنٹے کا سفر ہے۔ مگر یہ تو پتہ بھی نہ چلا کہ کب گیا سے چلا اور پٹنہ پہونچا۔ وفا ملک پوری کے یہاں میرا بستر لگ گیا۔ ان سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

علامہ کا ایک انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔

علامہ کا؟ وفا صاحب نے یوں پوچھا جیسے میں کوئی بڑا جرم کرنے جا رہا ہوں۔ یا کوئی عقل کو حیران کرنے والا کرشمہ دکھاؤں گا۔

خاص نمبر میں ان کا ایک انٹرویو چھاپوں گا ——— ایک سوال نامہ تیار کیا ہے۔ میں نے ظاہری سکون سے کہا۔ حالانکہ قلب کی رفتار بڑھی ہوئی تھی۔ کہ پتہ نہیں وفا صاحب اب کیا کہیں گے۔

مگر آج کل علامہ پر اختلاج قلب کا دورہ پڑا ہوا ہے۔ ملتے بہت کم ہیں۔ بولتے بھی کم ہیں اور ——— کچھ علیل ہیں۔

لیجئے سب کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔ یوں کون زیادہ بولتے ہیں۔ اور کب ان کو اختلاج نہیں رہتا ہے۔ کہ آجکل باقاعدہ اعلانیہ ان کو اختلاج ہے میرا ہارٹ فیل کرنے لگا۔

میں نے سوچا تھا ان کی زندگی کے متعلق کچھ سوالات کے جوابات ان ہی سے مل جائے تو کام کی چیز ہوتی۔

میں تو لوں کا ضرور اور آپ کو بھی چلنا ہوگا۔

پھر چلئے چلوں گا۔ وفا صاحب ایسے بولے جیسے وہ میری شہادت پر یقین رکھتے ہوں۔ اور ایسے میں پیچھا چھوڑنے پر تیار نہ ہوں۔ وہاں سے میں بھاگا بھاگا بہار اسمبلی پہونچا۔ آفس کے برآمدے میں رضا نقوی کرسی نکال کر بیٹھے قیلولہ فرما رہے تھے۔ ابھی ابھی انہوں نے کھانا کھایا تھا۔ یہ ان کی ہر حرکت سے ظاہر تھا۔ کرسی پر یوں گرے ہوئے تھے جیسے انہوں نے معمول سے زیادہ ہی سیر ہو کر کھایا ہو۔

نمبر کے متعلق بہت سی باتیں ہوئیں، اور پھر میں نے ایک انٹرویو کا ذکر کیا۔ کہنے لگے ٹھیک ہے۔

ٹھیک کیسے ہے؟ علامہ مانیں جب نا؟ پھر ان کو اختلاج بھی ہے ——— ہو جائے گا۔

پھر میں نے ان سے گذارش کی کہ قبل اس کے کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوؤں یہ خبر ان تک پہونچا دیں کہ میں آ گیا ہوں انٹرویو کے لئے۔ بغیر اس کے پتہ نہیں علامہ کیا کہہ دیں۔

چار بجے شام کو انہوں نے ڈھارس بندھائی کہ علامہ کو راضی کر لیا ہے۔ جان میں جان آئی کہ امید کچھ بندھی ہے۔ دوسرے دن صبح میں آٹھ بجے علامہ کے گھر پر وفا صاحب کے ساتھ یوں پہونچا کہ وفا صاحب آگے اور میں پیچھے ——— ارادہ تھا کہ یوں غائب ہو جاؤں گا۔ موسم خراب دیکھ کر وفا صاحب ہی کام آ جائیں۔

کمرے میں بیٹھنے کے بعد علامہ آئے، بال منتشر اور بلے اور پریشان سے۔

اس اختلاج قلب نے نہیں کہیں کا نہ رکھا۔ ——— اور پوچھئے تو شاعری میں نے اس لئے شروع کی کہ سب سے آسان کام یہی تھا۔ اس اختلاج نے مجھے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ——— پھر علامہ نظر نیچی کر کے کسی گہری سوچ میں اتر گئے۔ وفا صاحب نے مجھے دیکھا، میں نے وفا صاحب کو۔

میرا معدہ بھی بہت خراب ہو گیا ہے۔ رات کو نیند نہیں [illegible] ہو تھا تو معدہ خراب نہیں ہوتا تھا۔ مگر اس مرتبہ ——— سال دو سال میں اختلاج کا دورہ پڑتا ہے۔ اور میں بیکار ہو جاتا ہوں۔ پھر علامہ اندر چلے گئے۔

میں نے اپنا سوالنامہ نکالا اور تیار ہونے لگا کہ علامہ آئیں تو کام شروع ہو،

علامہ آئے اور کہنے لگے،

مجھ سے رضا نقوی نے کہا تھا آپ آئے ہیں اور کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔

میں نے اپنے کاغذات ٹھیک کئے،

مگر آج نہیں ہو سکے گا دیکھئے میں بہت پریشان ہوں۔

کوئی بات نہیں جب آپ فرمائیں گے حاضر ہو جاؤں گا۔

علامہ کسی گہری سوچ میں ابھر کر بولے۔

جولائی میں ۵۵ سال کا ہو جاؤں گا آپ لوگ میرا نمبر نکال رہے ہیں۔ کچھ روایت کے مطابق تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نئی روایت قائم ہوگی حضور امردہ پرستی کے خلاف یہ روایت تو قائم ہو ہی جائے گی۔ میں نے لرزتے ہوئے کہا کہ کہیں پورا پروگرام ہی علامہ نہ گڑبڑ کر دیں۔

آپ جائیں!

تو پھر کب حاضر ہوؤں؟ کل آ جاؤں؟

ٹھیک ہے کل آ جائیے۔

پھر کافی دیر تک علامہ سے کالج یونیورسٹی اور دیگر تعلیمی حالات اور مسائل پہ باتیں ہوتی رہیں۔

ان سے رخصت ہو کر نکلا تو پٹنہ کالج چلا گیا۔ اسٹاف روم میں ڈاکٹر سید ضمیر علی اکبر نقوی شعبہ انگریزی سے ملاقات کی۔ آپ نے ایک مضمون علامہ کے افکار و عقائد پہ لکھا تھا جسے نیاز فتحپوری صاحب نے نگار میں نقل اور بہت کافی بحث و مباحثہ کا موضوع بن گیا۔ ان سے مضمون کی فرمائش کی، یہ بڑی خوش قسمتی ہوگی اردو ادب کی اگر علی اکبر نقوی توجہ کریں۔ زمانۂ تعلیم علم ہی سے منفرد قسم کے اسکالر رہے ہیں۔ اور ادب پر بڑی گہری اور وسیع نظر ہے۔

علی اکبر نقوی اس وقت بی اے آنرز کے طالب علم تھے۔ جب میں، منظر شہاب، ابوالعظیم وغیرہ ایم اے کیا ہے تھے۔ اسی وقت سے میں ان کو جانتا ہوں۔ بے حد خلوص اور تپاک سے ملے اور انہوں نے وعدہ کیا کہ علامہ پر لکھیں گے۔

وہاں سے یونیورسٹی گیا۔ اختر اورینوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اختر صاحب نے اپنی مخصوص شفقت اور محبت سے خیر مقدم کیا۔ نمبر کے سلسلے میں ہمت افزائی کی، اور فرمایا کہ وہ مضمون لکھنا شروع کر چکے تھے۔ پھر میں نے اپنی اور مشکلات کا ذکر کیا۔ اور وہ بڑی محبت سے ان کا حل بتلاتے رہے۔

اس ملاقات کا ذکر ادھورا رہ جائے گا اگر میں اس کا ذکر نہ کروں کہ بڑے اصرار کے ساتھ انہوں نے مجھے اپنی چائے میں شریک کر لیا۔

اس دن شام کو ایک ادبی نشست میں سب تھے۔ یہاں تک کہ علامہ بھی تشریف لائے تھے۔ میں احتیاطاً ان سے پھر عرض کر دیا کہ صبح حاضر ہونے والا ہوں۔

رضا نقوی صاحب نے کہا کہ وہ بھی رہیں گے۔

رات میں سویا تو رات بھر علامہ سے باتیں ہوتی رہیں۔

دوسرے دن صبح میں رضا ملک لہری کے ساتھ علامہ کے مکان پہ ٹھیک آٹھ بجے حاضر ہو گیا۔

رضا نقوی صاحب میری خدمات بند ہونے کو پہلے ہی سے موجود تھے۔ ناشتے کے بعد میں نے اصل کام شروع کیا۔

میں ایک سوال کرتا تو علامہ اس کا جواب اتنا مختصر دیتے کہ مجھے پھر اس سوال کو کچھ بدل کر کرنا پڑتا۔ بعض اوقات مجھے فرمائش کرنی پڑتی کہ وضاحت کر دیں۔ دوران میں ہر دو چار منٹ پر علامہ اٹھ جاتے اور اندر چلے جاتے۔ اس طرح کا انٹرویو تین گھنٹے میں ختم ہوا۔ ایک بجا تو رخصت پایا۔

حالاتِ زندگی

سوال:- آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی؟

جواب:- ہمارے والد کا نام مولوی محمد رشید حسین تھا۔

سوال:- آبائی وطن؟

جواب:- دادا ہمارے غازی پور ضلع کے رہنے والے تھے۔ لیکن نانا کا وطن حسن پورہ ضلع سارن تھا۔ نانا کا نام مولانا سید مظہر حسین صاحب تھا۔ آپ دبیر کے شاگرد تھے۔ اسی سبب سے مظہری لکھتا ہوں۔ دادا نے حسن پورہ ہی کو وطن بنا لیا۔ اسی لئے میں بہاری ہوں۔

سوال:- آپ کا بچپن کہاں اور کیسے گزرا، کچھ اپنی یادداشت اور کچھ بزرگوں سے سنی ہوئی باتیں بتائیں۔؟

جواب:- میں ۲ نومبر ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوا، بچپن نعیم آباد مظفرپور میں گزرا۔ بچپن ہی سے کچھ عجیب طبیعت رہی، لڑکوں سے زیادہ بڑوں میں طبیعت لگتی تھی۔ اس کے لئے بڑوں سے اکثر ڈانٹ بھی سنی۔ والد صاحب سے میرے تعلقات بالکل دوستانہ تھے، بڑی بے تکلفی سے باتیں ہوتی تھیں۔ اور اکثر گرما گرمی بھی ہو جاتی تھیں۔

تین بہنیں تھیں، دو صغر سنی ہی میں انتقال کر گئیں۔ ایک میں اور ایک بھائی رضا مظہری ہیں۔

سوال:- آپ نے تعلیم کہاں پائی؟

ابتدائی تعلیم والد کے پاس گھر پر ہوئی، ۱۹۱۶ء میں [illegible] ضلع اسکول میں نام لکھا دیا گیا، دو برس وہاں رہا، پھر مظفرپور آ گیا۔ اور ۱۹۲۳ء میں کلکتہ چلا گیا مدرسہ عالیہ میں نام لکھایا۔ اور وہیں سے میٹرک پاس کیا۔ آئی اے سینٹ زیویرس کالج کلکتہ سے پاس کیا

بی اے کی تعلیم [illegible] اسلامیہ کالج میں پائی۔ اور [illegible] سے [illegible] پاس کیا

سنہ [illegible] میں بی اے پاس کیا۔

سوال:- آپ کی شادی والدین کی مرضی سے ہوئی، یا آپ نے پسند کی تھی؟

جواب:- شادی [illegible] کی ہی نہیں۔

بات یوں ہے کہ [illegible] میں میری بہن بیوہ ہو گئی اس کے دو بیٹے تھے، مجھ پر اس کی بیوگی اور بچوں کی یتیمی کا بڑا ہی جذباتی اثر ہوا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ شادی نہیں کروں گا، ورنہ بہن اور بچوں کو تکلیف ہوگی، میں چاہتا تھا بہن کو بے چارگی کا احساس نہ ہونے دوں۔ مگر والدہ کا اصرار روز بروز شدت اختیار کرتا گیا۔ اور میں ٹالتا گیا۔ والدہ کا اصرار اور میرے ٹالنے کا سلسلہ کافی لمبا تھا تیرہ سال تک میں نے شادی نہیں کی، ایسی شرطیں رکھیں کہ نہ شرطیں پوری ہو سکیں اور نہ میں شادی کر سکا، ایک شرط تو یہی تھی کہ بے اولاد بیوہ عورت سے شادی کروں گا۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں شادی ہوئی۔

سوال:- ایم اے کے بعد آپ نے کون سی ملازمت کی؟

جواب:- ایم اے کے بعد صحافتی زندگی شروع ہوئی، ملیح آباد کے "الہند" کی ایک ماہ تک ادارت کی، اس وقت جوان تھا، طبیعت گرم تھی، اس لئے سرکار برطانیہ الہند کے اداریوں کو ایک ماہ سے زیادہ برداشت نہ کر سکی۔ اور مجھے الہند کی ادارت چھوڑنی پڑی۔ شائق احمد عثمانی "عصر جدید" میں لے گئے، وہاں سے میرے شدید اختلافات

لیکن وہ مسلم گزٹ تھے۔ اس لئے ایک اخبار میں ہم دونوں کی گنجائش ناممکن تھی۔ چنانچہ طے پایا کہ میں نکالی صاحب کا لکھا کروں، مگر بالکل غیر سیاسی، چنانچہ یہ چلتا رہا۔

ایک ہفتہ وار نکالا مگر زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔

مختلف اوقات میں زمانہ، ہمدرد، شفاعت اللہ خاں نے جاری کیا ان میں جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ صدیق انصاری نے نہج اخبار جاری کیا اور وہیں سے مزاحیہ شاعری کی ابتدا ہوئی۔ یہ سب پرچے تقریباً ایک ہی زمانہ میں نکلتے رہے۔ بند ہوگئے۔ یہ مستقلاً عصر جدید کی نکالی کالم لکھتا رہا۔ چار بجے شام سے آٹھ بجے تک شائق احمد عثمانی کے ساتھ کچھ گرد کے علم سے نکا ہیات لکھاتا رہا۔ ان کو ڈاکٹر نے تاڑی پینے کو کہا تھا۔ ان لئے وہ تاڑی باز مشہور ہوگئے لیکن تاڑی شائق صاحب کی تھی اور بہاری کوچہ گردی میری تھی۔ شائق احمد عثمانی سے شدید سیاسی اختلاف ہونے کے باوجود یہ بندھن کچھ عجیب سا تھا۔ چنانچہ اجتماع ضدین کے نام سے ایک مضمون مزاحیہ رنگ میں ان ہی تعلقات کے متعلق لکھا تھا جو عصر جدید کے سالنامے میں شائع ہوا۔

۱۹۲۳ء میں خلافت کمیٹی والوں نے مسلم کانفرنس کے ساتھ ایک اردو تحریری کانفرنس کی داغ بیل ڈالی۔ اور باوجود سیاسی اختلافات کے شہید سہروردی، مولانا محمد علی نے جہاد شہید کا طرز پر مجلس استقبالیہ کی صدارت نبھا دی۔

اس کانفرنس میں میں نے جو خطبہ پڑھا وہ بہت ہی مقبول ثابت ہوا۔ اس خطبہ میں ہمارا ادب اور زمانہ الحال میں ادب برائے ادب کے مدعا کی تحریک سے انحراف کیا گیا تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اردو ادب کی ترقی اگر ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے کام میں نہیں آسکتی تو یہ اپنا فرض پورا نہیں کر سکتی۔ اس تحریک آزادی کو آگے بڑھانے کا مقدس تاریخی فرض انجام دینا ہے۔

مولانا حسرت موہانی نے اس خطبہ پر اپنی تقریر میں سخت تنقید کی۔ لیکن اس کا جواب خواجہ حسن نظامی نے دیا اور خطبہ کی بے حد تعریف کی۔ جس وقت میں اسٹیج سے اترا تو مولانا شوکت علی نے مجھے بازوؤں سے اٹھا لیا۔

یوں تو مولانا رزاق ملیح آبادی اور عبدالباری کے ساتھ مولانا آزاد سے رسمی ملاقات ہو چکی تھی مگر ۱۹۲۶ء میں اس کانفرنس میں دعوت دینے کی غرض سے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس وقت اردو کے سلسلے میں جو گفتگو ان سے ہوئی اس نے مولانا سے صحیح تعارف کرایا۔ پھر کرجینا صاحب کے ساتھ مولانا کی خدمت میں جانا ہوا بعد یہ سلسلہ تیس سال جاری رہا۔

۱۹۳۸ء میں بہار کے محکمہ نشر و اشاعت کے لئے ایک پبلسٹی افسر کی ضرورت ہوئی، پروفیسر عبدالباری مرحوم نے کلکتے سے بلا کر وزیروں کے سامنے مجھے پیش کیا۔ اور اس زمانہ میں مولانا آزاد بھی آئے انہوں نے بھی سفارش کی، اور میں نومبر ۱۹۳۸ء میں بہار کی ملازم کی حیثیت سے پبلسٹی کا کام کرنے لگا۔

۱۹۳۹ء میں جب وزارت نے استعفیٰ دی تو میں پھر مولانا سے ملا انہوں نے کہا کہ ابھی قرآن کا تفسیر

اس لئے آپ ابھی تک مجرد ہیں اور کہیں کیا ہو سکتا ہے
ہو گیا [illegible] گرفتار کر لئے گئے۔ تو میں
نے اپنا استعفیٰ داخل کر دیا۔ اس میں لکھا کہ شہیدوں
کے خون کی بو شامل ہے [illegible] ہر حکومت
کی ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ کچھ دنوں کے بعد اس شہر پر
کر [illegible] کام کر رہا ہوں ایک مدت تک سکون بھی
نصیب رہا۔ جب [illegible] کلکتہ چلا گیا۔
خاندان کا بوجھ تھا۔ بے کار نہیں رہ سکتا تھا۔ کلکتہ میں
بھائی [illegible] اور بمبئی جا کر ساحر ہی لے گئے اور
مجھے [illegible] تک فلمی دنیا سے منسلک رہنا پڑا۔
فلموں میں گانے اور مکالمے لکھے۔ زیادہ تر [illegible]
ڈائریکٹر سے وابستہ رہا۔ فلم آرزو کے [illegible]
کے مکالمے لکھے۔ وارث شاہ کی زندگی سے متعلق
ایک ڈرامہ لکھا۔ [illegible] فلم بننے کے بعد کارکنان [illegible]
ہو گیا۔ [illegible] بات [illegible] اور پھر پتہ نہیں اس
فلم کا کیا بنا۔
فلمی دنیا کے تاثرات میں نے "[illegible] سے شاہجہاں"
اور "تول اپنے کو تول" والی نظموں میں ظاہر کیا ہے
مجموعی طور پر فلمی دنیا مجھے پسند نہیں آئی۔ اس کی چمک
دمک آنکھوں کو خیرہ کر سکتی ہے۔ مگر طمانیت نہیں دے
سکتی۔ ظاہر داری، تصنع کے علاوہ، مجھے پورا ماحول
بڑا عامیانہ معلوم پڑا۔
[illegible] میں [illegible] نامی [illegible] نے [illegible] کا عہدہ
آفر کیا، اور فلم سکشن کا انچارج بنا دیا۔ کچھ دنوں کے
بعد بعض حالات کی بنا پر فلم سکشن بند کر دیا گیا، اور [illegible]
جنوری [illegible] میں پٹنہ کالج میں میری سروس ٹرانسفر کر دی۔
اس وقت سے پٹنہ کالج میں پروفیسر ہوں۔

سوال :- کیا کالج میں کام کرنا آپ کو پسند ہے، یا [illegible] کا
معاملہ ہے؟
جواب :- پہلے پروفیسری بڑے چاؤ سے کی تھی۔ اور خیال
تھا کہ یہ کام میری طبیعت سے میل کھائے گا ـــــــ
اور اس میں شک نہیں کہ مجھے یہاں سکون ملا، مگر محکمہ نشر
و اشاعت میں جو داؤ پیچ تھے، وہ یہاں محکمہ تعلیم میں بھی
ہیں۔ اور یہاں کچھ کم نہیں۔ اس لئے طبیعت [illegible]
رہتی ہے [illegible]
سوال :- کالج کے شاگردوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جن سے آپ متاثر
ہوئے ہوں؟
جواب :- مجھے چند بہت اچھے طلباء ملے، جن میں مظفر شہاب،
کلام حیدری، غلام سرور، کلیم عاجز، شکیل الرحمٰن، اور
حسن آرزو وغیرہ ہیں۔ جن کے نام میں [illegible]
طالبات میں، رومی، آصفہ، جبیں [illegible]
نے زمانہ طالب علمی میں متاثر کیا۔
میری پوری خواہش اور کوشش رہی کہ میں ان کو کچھ
دے سکوں، مگر پتہ نہیں میں کتنا کچھ ان کو دے سکا۔
سوال :- کچھ اپنے ساتھی پروفیسروں کے متعلق آپ بتائیں گے؟
جواب :- میں اپنی زندگی میں کسی کو خراش اور کسی کو رنج دینا نہیں
چاہتا۔ اس پر اصرار مت کیجئے۔

ادبی مشاغل

شاعری

سوال :- آپ کا ادبی سرمایہ کیا ہے اور شاعری آپ نے کب
شروع کی؟

جواب: والد صاحب سے سنا تھا اور کچھ کچھ مجھے بھی یاد ہے کہ چار پانچ برس کی عمر میں بھی اتفاقاً کبھی کبھی مصرعے موزوں ہو جایا کرتے تھے۔ والد مرحوم انیس کے مرثیوں کو پڑھتے میں ان کی نقلیں اتارا کرتا اور نقلیں اتارتے ہوئے کچھ مصرعے میں اپنے جوڑ لیتا۔ والد مرحوم کہتے تھے کہ بعض جملے میری زبان سے ایسے نکل جاتے جو موزوں ہوتے۔

محرم کے موقع پر سلام وغیرہ میں نے ۳۲ء میں کہے۔ ۳۳ء میں والد مرحوم نے ایک غزل کہہ کر مشاعرے میں پڑھنے کو دیا جس میں دو اشعار میرے تھے، ایک مصرعہ مجھے یاد ہے ؎

ہم اٹھ کے بیٹھ گئے گرد کارواں کی طرح

اس کے بعد ۳۳ء میں دفتر عصر جدید سے ایک رسالہ شائع ہوا "نشتر" اس میں سب سے پہلی نظم میری "بادل کی بیٹی" شائع ہوئی۔ اس رسالے میں میں نے گلی ورس ٹریول کا ترجمہ، "خوردک آباد کی سیر" کے عنوان سے کیا۔

میرے ایک رشتہ دار بابو مولوی نور اللہ ندوی مرحوم تھے، جو عہد کے ایڈیٹر تھے، آپ یونیورسٹی میں فلسفہ کے طالب علم تھے۔ انہوں نے میری مضمون نگاری کی رہنمائی کی۔

والد مرحوم نے ہماری شاعری ہماری گھٹی میں اس طرح ڈالی جیسے کبوتر اپنے بچے کو دانہ دیتا ہے۔ انہوں نے بچپن ہی سے شاعری کا ذوق دلایا۔ اس ذوق کی پرورش کی، اس کی تربیت کی۔ ۴۰ء میں بی اے میں پڑھتا تھا۔ تو استاد محترم جناب رضا علی مرحوم کی خدمت میں ایک قطعہ لکھا اور ان کی شاگردی قبول کی۔

مختلف اوقات میں آغا شاعر، ثاقب لکھنوی، محشر لکھنوی، نواب مظفر حسین خیال، اور ابوالکلام سے متاثر رہا، اور خصوصاً آزاد کے علمی اسلوب سے براہ راست استفادہ کیا۔

سرمایہ شاعری میں مختلف نظمیں ہیں۔ جو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت نقش محفل میں شامل ہیں۔

(۱) تفکرات، و تاثرات،
(۲) سماجیات، و عمرانیات،
(۳) رومانیات، شبابیات،
(۴) متفرقات،
(۵) باقیات،

ان مطبوعہ نظموں کے علاوہ دوسری اصناف شاعری کے نمونے بھی ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔

مولانا محمد مصطفیٰ صاحب کی صحبت میں قصیدہ نگاری شروع کی۔ بعض نعتیہ قصیدے اور دو حضرات کی منقبت میں ایک کتاب کے مقابل میں قصیدے کہے ہیں۔ جو شائع نہیں ہوئے ہیں۔

مرثیے بھی کہے ہیں ۳۶ء میں جب شیعان ترقی پسندانہ تحریک سے متاثر ہو کر لکھا جس پر مولانا آزاد کی گرفت ہوئی تھی ہے معاف کر لیا کیونکہ آزاد کی تحریروں سے متاثر ہو کر لکھا

عشق کیا ہے غم ہستی سے رہا ہو جانا

مرثیے اس وقت سے آج تک مجلسوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ مختلف مقامات پر مجلسوں میں یہ مرثیے پڑھے جاتے ہیں۔ شائع اب تک نہیں ہوئے ہیں۔

سوال: آپ کی شاہکار نظم کون سی ہے؟

جواب: سیاسی نظموں میں بلا دو رجحان مجھے پسند ہے

شاہکار نظم ہے ——— رومانی نظموں میں زرد
فضا کے شہر کو میں سب سے اچھی نظم سمجھتا ہوں۔
سماجی نظموں میں ہلال عید شاہکار ہے
زرد فضا کے ڈرد میں بندش اچھی ہے اور جلیبے
کی تشبیہ تو پوری طرح پر پھبی ہے۔ جوانی سے بڑھاپے
تک محبت کا نقشہ کیسے گہرا نہیں ہوتا؟

وہ ایک بیماری تحریر تھی ہم نے مٹا ڈالی۔

مگر اس نظم میں جذبہ کی گہرائی سا اتر آیا ہے۔ گلشن فرہاد
بن گئی ہے۔

ناشر:-

ابتدا میں چھوٹے چھوٹے افسانے مختلف رسالوں میں لکھے۔ انشائیے بھی لکھے۔ حسن شاعری نگاہ میں ندیم گیا میں شائع ہوا تھا۔

فکاہی مضامین عصر جدید کلکتہ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوئے، جس میں "آل طوائف کانفرنس" بہت مشہور ہوا۔ پنچ کے سالنامے میں ایک مزاحیہ مضمون راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی ناکامی پر ——— "جبرئیل بابات اور رضائی قدرت" کے نام سے لکھا جو ہندوستان کے بہت سے رسائل میں نقل کیا گیا۔ اور بے حد مقبول ہوا۔

مزاحیہ مضامین غیر کلکتہ کے رسالوں میں ہی چھپے، جو کلکتہ سے باہر کم ہی جاتے ہیں۔ اس لئے باہر کے لوگوں کو کم واقفیت ہے۔

ہمیشہ احساس کمتری (احساس کمتری ہی کہئے) مارے رہا اور کسی تخلیق سے مطمئن نہ ہوا۔ شکست و فتح کے نام سے ایک افسانہ شائع ہو چکا ہے۔

ادبی مسائل:-

سوال:- چونکہ آپ نے غزلیں کافی کہی ہیں اور آج بھی کہہ رہے ہیں۔ اس لئے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ غزل کے امکانات دیکھ پاتے ہیں۔

جواب:- غزل کے معاملہ میں رائے یہ ہے کہ غزل ہی ایک صنف شاعری نہیں ہے کہ جس میں سلسلہ زندہ رکھا جائے، اس میں غزل کو اپنا ذریعہ اظہار سمجھتا ہوں جو تحت الشعور کی باتوں کو شعور میں لے آتا ہے۔ ہم دنیا میں طرح طرح کے تجربات سے گزرتے ہیں۔ تاثرات شدید بھی ہوتے ہیں۔ اور معمولی بھی۔ کچھ ایسے ہیں جو یاد رہ جاتے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی جو ہمارے تحت الشعور میں دب جاتے ہیں۔ بہت سے خیالات جو تحت الشعور میں چلے جاتے ہیں۔ وہ غزل میں آجاتے ہیں۔ یہ غزل کی خوبی ہے۔

جواب:- کیا یہ صفت دوسری صنف میں نہیں ہے؟

جواب:- ہے مگر غزل میں نسبتاً زیادہ صلاحیت ہے چونکہ قافیہ، ردیف، گنگناتے ہوئے تحت الشعور کی باتیں شعور میں ابھر آتی ہیں۔ شاید اپنی غزلوں کو بہترین غزل نہیں سمجھتا۔ غزل کہنے کی وجہ یہ ہے کہ کام ہی محسوس کرتا ہوں۔ اور اس لئے تنظیم و نحو کی پابندی کئے بغیر کر کے غزل کہتا ہوں۔ جہاں تک امکانات کا تعلق ہے غزل میں اس کی کافی گنجائش ہے کہ نئی علامتیں نئے استعارے نئے کنائے استعمال کئے جائیں۔

غزل کسی وقت بھی زوال پذیر نہیں ہو سکتی ہے۔ منتشر خیالات کو ایک پیکر مل جاتا ہے۔

سوال: انتشار ہوتا ہے تو پھر تکمیل کہاں ہوئی غلط ہے۔

جواب: نہیں۔ ایک وقت میں ایک جذبہ جو شاعر پر طاری ہوتا ہے اس کا مکمل اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے ہر شعر مکمل ہے۔ پورا تجزیہ اور وقت کی زنجیروں میں جکڑا ہوتا ہے۔

سوال: غزل کلیم الدین احمد کی زد پر ہو چکی ہے۔ اور کلیم صاحب کا غزل پر نیم وحشی۔ والا چوٹ غزل کے پرستاروں کو چبھ گئی ہے اس افراط و تفریط کے متعلق آپ کیا سوچتے ہیں۔؟

جواب: میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔ کہ یہ سب افراط و تفریط ہے۔ کلیم صاحب کی رائے بجا ہے بالصفات ہے۔ اور غزل کے پرستاروں کا ردعمل بھی۔

دنیا کی شاعری نے اپنا بہت سا وقت برباد کیا ہے صرف اس جذبہ کی ترجمانی میں جو جنسی ہوتا ہے۔ مگر غزل کیں بہت قسم کے جذبات اور خیالات مختلف اور جنسی پیرایہ میں اظہار کر کے ابھر آئے ہیں۔

فارسی اور اردو میں غزل کا پیرایہ اختیار کر کے صنفی، اور جنسی جذبات ابھر آئے ہیں۔ محبت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ غزل صنفی اور جنسی جذبات کے پردے میں دوسری محبتیں بھی آجاتی ہیں۔

سوال: اگر غزل سے آپ کو تنگیٔ داماں کی شکایت نہیں ہے تو آپ نظمیں کیوں کہتے ہیں۔؟

جواب: بیانیہ شاعری کے لئے غزل ناموزوں ہے۔ اس لئے میں نظمیں کہتا ہوں۔ یہاں لوگوں میں بھی جو افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ میں غزل کو مخصوص حالات میں موزوں ترین سمجھتا ہوں۔

سوال: کون سا دور اردو کا زندہ دور کہلایا جا سکتا ہے؟

جواب: میں میر کے دور کو شاعری کا زندہ دور کہنا چاہتا ہوں اس لئے کہ اس میں اردو شاعری نے نئے تجربات کئے۔

غزل میں بھی نئے تجربات کئے گئے۔ اساتذہ نے مختلف صنفوں کی ایجاد کی، قصیدہ کا ایک بیانیہ حصہ سودا نے کیا۔ مرثیہ کا بھی تجربہ ہوا۔ سودا نے سوقیانہ شاعری کو عروج پر پہنچایا۔ میر اثر نے بیانیہ مثنوی کہی۔ میر تقی نے سب سے پہلے تجربہ کیا کہ پرستانی قصے بالکل ترک کر دیئے۔ اور سوسائٹی میں روزانہ چلنے والے عشق و عاشقی کی تصویر کشی کی، یہ جرأت انقلابی قدم انہوں نے اٹھایا۔ لسانی اعتبار سے بھی یہ دور بہت اہم ہے زبان کافی منجھی ہے۔

غالب کو آنے والے فلسفیانہ دور کی پیش رو کی حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مگر خالص شاعر کی حیثیت سے میر زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ فلسفہ کی ثقالت سے غزل کو صاف بچا لے گئے ہیں۔ انہوں نے فلسفہ کو غزل کے مزاج میں گھلا دیا ہے۔ گویا بالکل ہلکی پھلکی چیز ہو گئی۔

سوال: کیا آپ اردو شاعری کی موجودہ رفتار اور سمت سے مطمئن ہیں۔؟

جواب: جدید شاعری پر ملے جلے رجحانات ملتے ہیں۔ مگر مجموعی اعتبار سے اردو شاعری کے مستقبل سے مایوسی نہیں ہونا [illegible] اردو شاعری ترقی سے [illegible] ہو گیا ہے۔

موجودہ دور [illegible] سمجھا جائے گا اقبال نے [illegible] جدید اردو شاعری کے تمام راستے کھول [illegible] جو انہوں نے ٹیگور کے اثر کو اردو میں لایا ہے۔ اقبال کا اسلوب غالب کا اسلوب تھا۔ اچھا

عزیز، مومن، شوق اور اصغر لکھنوی کو اس رنگ میں لایا ہے جس حد تک اردو اس کی متحمل ہو سکتی ہے۔
سیماب کا اعتبار ہے اقبال ترنم کا لحاظ کر کے چلا گیا ہے۔
جگر نے شاعری کو ایک خاص اسلوب دیا ہے۔
اختر شیرانی، احسان دانش جوش کے اسلوب کے پیروکار ہیں۔ جوش کے اسلوب اقبال اور ٹیگور کا امتزاج کا نام ہے۔ ساحر بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔
حسرت کا کوئی خاص CONTRIBUTION نہیں ہے۔ مومن کے رنگ کے اچھے پیروکار ہیں۔
اعلی درجہ کے غزل گو، میر، انگلی کوئی بالکل نئی چیز انہوں نے نہیں دی ہے۔
اردو کے شعرا اقبال کے بعد جوش سے متاثر ہوئے ہیں۔ لیکن کے لئے اور پھر نوجوانوں پر فیض کا اثر پڑا ہے۔
جاں نثار اختر، سردار، مجاز، سب جوش سے متاثر ہیں۔ افکار ضرور مختلف ہیں۔ فیض آرائش حسن نہیں کرتے، بندش وغیرہ پر توجہ نہیں کرتے۔ ان کے یہاں محنت اور ریاض کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ کاش فیض ریاض فن کی اہمیت سمجھ لیتے۔
میراجی اور راشد کا کلام میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لئے میں دادا نہیں دے سکتا۔ اتنی عقل میرے پاس نہیں ہے۔ کہ میں ان سب کو کچھ دے سکوں۔
میراجی کی شاعری، قرۃ العین کے افسانے میری سمجھ سے باہر ہیں۔
سوال۔ ترقی پسند شاعروں کے یہاں جو انتہا پسندی آگئی تھی۔ اس کا رد عمل اب دیکھنے میں آرہا ہے۔ کہ ہر شاعر میر کی طرف رجوع ہو گیا ہے۔ آپ اس کے متعلق کیا سوچتے ہیں؟

جواب۔ انتہا پسندانہ راستہ مجھے پسند نہیں ہے۔ یہ رد عمل کہ ہر شخص میر کے پیچھے بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یقیناً صحت مند نہیں کہا جا سکتا۔ ماضی اور حال پر ایک نظر ہونی چاہئے۔
اردو زبان کی بدقسمتی ہے کہ اس کی بنیاد ہی تتبع پر ہے۔ فارسی اور عربی کی تقلید ہی نہیں بلکہ اس نے نقالی کی ہے۔ "اردو مزاج" بنانے کی ضرورت ہے
اقبال مقلد تھا۔ ذہنی غلام نہ تھا۔ اجتہادی کام نہیں ہوا ہے۔
دو شاعر ہمارے اپنے ہیں۔ انیس اور نظیر، نظیر کی نظمیں اور انیس کے مرثیے، تقلیدی نہیں ہیں۔ انیس کے رنگ میں فارسی میں اب مرثیے کہے جا رہے ہیں
سوال :۔ اقبال کے بعد کون اردو شاعر ہے جسے دیو قامت کہہ سکیں۔
جواب :۔ اقبال کے بعد جوش کو دیو قامت شاعر سمجھتا ہوں۔ اگر جوش نہ ہوتا تو ہم عرفی کی تقلید کرتے رہ جاتے۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال کی طرح جوش کے یہاں افکار نہیں ملتے۔ جوش فکری شاعر نہیں ہے اور اس میں یقیناً دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

بے روزگاروں کیلئے ایک مددگار ہاتھ

بہار میں روزگار گارنٹی یوجنا

یہ یوجنا اس صوبے کے ۱۱ پرکھنڈوں میں شروع کی گئی ہے۔ ایک سال میں [illegible] روزگار دیا جائے گا۔ ہر ایک دن پانچ روپے روزانہ کے در سے ہر ایک مزدور کو مزدوری دی جائیگی۔ ایک یوجنا میں صرف بالغ (۱۸ سال) سے زیادہ مرد اور عورتوں کو کام دینے کی کوشش کی جائے گی کہ ایک پرکھنڈ کے درخواست دہندہ کو اسی پرکھنڈ میں اور درخواست دہندہ کو گاؤں کے نزدیک کام دیا جائے گا۔ اس کام کے لئے ٹھیکیدار ایجنٹ نہیں رکھے جائیں گے۔ ان کاموں کا نپٹارا سیدھے کرمچاریوں کے دیکھ ریکھ میں ہوگا

نہروں کی تعمیر، مدھیم سینچائی یوجنائیں، لگھو سینچائی، بھومی وکاس اور سبھی موسم جنگل روپن کا سڑک تعمیر، اور تالابوں کی کھدائی وغیرہ کا کام دیا جائے گا۔

موجودہ مالی سال میں ۲۰ کروڑ روپے کا پربندھ ہے۔ روزگار کے خواہش مند آدمیوں کو رجسٹرڈ کیا جائے گا۔ اور انہیں پہچان پتر دیئے جائیں گے۔

ضلعوں اور ۱۷ پرکھنڈوں کے نام

پٹنہ ضلع، منیر اور فتوحہ۔ نالندہ ضلع راجگیر اور بہار شریف، گیا ضلع ٹکاری اور وزیر گنج۔ نوادہ، گوند پور اور سرودلا۔ اورنگ آباد نبی نگر اور کٹومبا، بھوجپور بندلیں اور آرہ، روہتاس بھبھوا اور سہسرام۔ مظفر پور، سکرا اور سہری، ویشالی لال گنج اور مہوا، سیتامڑھی، پپراہی اور سید پور، سارن بنیا پور اور گڑکھا، میروا اور بریا، گوپال گنج اور منیلی، اور کوچائے کوٹ، پوربی چمپارن، ترکولیا، اور سیرہی، پچھمی چمپارن بگہا، اور نرکٹیا گنج۔ دربھنگہ کیوٹی اور گھنشیام پور، سمستی پور کلیان پور اور روسڑا، بیگوسرائے بکھری اور بچھواڑا، سہرسہ، سپیری اور بختیار پور، اور چھتر پور، مدھے پور، کشن گنج اور مرلی گنج، پورنیہ اور ربن سیکھی، اور رانی گنج، کٹیہار، براری، اور کوڈھا، مونگیر ابر بیگھا اور شیخ پورہ، بھاگلپور، کہلگاؤں اور جگدیش پور، کھگڑیا، الولی اور چوتھم، سنتھال پرگنہ، بہٹ پوریا، اور دیوگھر، پاکوڑ، ناسکم، آوارا، سنگھ بھوم، بہراگوڑا، کوڈرما اور چکولیا۔ پلاموں، چین پور مہوا تنڑ، اور گڑھوا، ہزاری باغ، چترا اور ہزاری باغ، اور ہنٹر گنج، گریڈیہہ، گریڈیہہ اور بیرتو دھنباد، باگھمارا، اور چندن کیاری، مدھوبنی بینی پٹی اور رام تاڑی، اور مدھو پور۔

सू० ज० सं०वि० 459 (सू०-196) 81-82

جمیل مظہری میں فکری عنصر

سید احتشام حسین

[illegible] جوش [illegible] دور [illegible]

[illegible] شاعری [illegible]

میں کبھی اور اپنی ضرورت کا احساس [illegible]
اس نے اتنی ترمیم کی [illegible] شاعر [illegible]
[illegible] نہیں چھوڑتا، کوئی ایسی چیز
ہر قسم جو جذبات سے [illegible] اور ادا کی جا سکتی ہے۔ [illegible]
کا احساس اور ادراک سے وہ زبردست الجھن شروع
ہوتی ہے جو شعور اور ان کے [illegible] کے لئے
دور شروع ہوتی ہے۔ اگر شاعری [illegible] شخصی جذبات اور جبلی
تجربات کا اظہار ہے تو اس میں افکار اور خیالات کی آمیزش
کیسے ہو جاتی ہے۔ اور اگر ہوتی ہے تو شاعری میں اسے کوئی
مقام ملنا چاہیے یا نہیں۔ اردو شعرا میں میر، غالب، آتش،
اقبال، جوش، فراق، [illegible]، جمیل مظہری وغیرہ اہم ہوتے ہوئے
ذہن [illegible] ایسے [illegible] جنہیں [illegible] انفرادیت کو
[illegible] اس کے اظہار میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ بعض
اسے فلسفہ کہیں گے، بعض فکر، بعض شعور کا نام دیں گے، بعض [illegible]
کا شاعری میں بھی عناصر [illegible] ہو سکتے ہیں یا نہیں اس کی بحث تو
طویل ہے کیونکہ مشرق و مغرب کے نقاد شعر کے پہلو [illegible]
[illegible] ہے۔ ہاں یہ بحث کی جا سکتی ہے کہ انہیں ہونا چاہیے یا

[illegible] ضرورت اور گنجائش بھی ہے
[illegible] بنیاد پر شاعر کے مرتبہ کا تعین کرنا
[illegible] ہے یا نہیں؟

افلاطون کے عہد سے آج تک اس موضوع پر بحث
آرائی جاری ہے کہ فلسفہ اور شاعری میں کوئی واسطہ ہے یا
نہیں۔ کچھ لوگ تو سرے ہی سے اس بات کے منکر ہیں کہ
شاعری میں منظم تصورات کی گنجائش ہے۔ کچھ اس سے
بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شعر کو صرف شعر ہونا
چاہیے۔ اس کو موضوع کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ انیسویں
صدی کے فرانس میں اس تحریک نے خاص نشو و نما پائی اور
بعض حیثیتوں سے اس کے اثرات آج بھی [illegible]
افلاطون نے شاعری اور فلسفہ کو ایک ہی [illegible]
ہمارے یہاں مولانا شبلی نے شاعری کو فلسفہ کا ہم پلہ قرار
دیا ہے۔ اقبال نے بھی بعض مقامات پر یہی خیال ظاہر کیا ہے
البتہ اس کا یہ مطلب نہیں لینا کہ شاعری اور فلسفہ کو ایک
[illegible] قرار دیا جا سکتا ہے۔ [illegible]
یہ سمجھنا کہ فلسفیانہ خیالات کا اظہار [illegible]
کے متعلق ایک رویہ [illegible] نظریہ [illegible]
کے [illegible] شاعر [illegible]

... درست نہیں ہو سکتا۔ مشہور انگریزی نقاد اور تنقید نگار ایلیٹ نے ایک موقع پر دانتے اور شیکسپیر کی نظم نگاری کا تقابل کیا ہے۔ کہ ان کے اس فلسفوں کے [illegible] کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ فلسفہ کی بلندی سے دیکھا جائے تو ان کے یہاں ہمیں چند ما بعد الطبیعاتی [illegible] کے علاوہ اور کچھ نہیں مل سکتا۔ ایلیٹ نے اپنی بات کا رد میں [illegible] سے کام نہیں لیا۔ ڈانٹے اور شیکسپیر نے اپنے اپنے انداز سے زندگی کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ شاعر تھے۔ افلاطون، ارسطو [illegible] نہیں تھے۔ اس لیے ان کا مقصد کوئی منظم فلسفہ پیش کرنا نہ تھا۔ بلکہ [illegible] حیات و کائنات کے بعض پہلوؤں اور پیچیدگیوں کی طرف اہل دنیا اور دوسروں کو متوجہ کرنا تھا۔ اس کو شاعری کا فکری عنصر کہا جاتا ہے۔ اسے اصطلاحی مفہوم میں فلسفہ نہیں کہا جا سکتا لیکن اس سے ذہن کی فلسفیانہ کاوش اور کرید کا ایک میلان ظاہر ہوتا ہے۔ اسے نظر انداز کر دینا شاعر کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے۔ جمیل مظہری کی شاعری میں یہ عنصر کبھی تشکیک کی شکل میں کبھی صوفیانہ، اور مابعد الطبیعاتی تفکرات کی صورت میں کبھی فلسفیانہ سوال بن کر کبھی [illegible] آگہی کے روپ میں اس قدر نمایاں ہے کہ وہ سب سے پہلے [illegible] سب سے زیادہ متوجہ کرتا ہے [illegible] اور بیان کے پردے میں شاعر نے جن حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن کی حیثیت اگرچہ ذاتی تجربوں کی ہے لیکن انہیں عمومی فلسفے کے پس منظر میں بھی سمجھا جا سکتا ہے خود جمیل مظہری کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ محض اعصاب کی پکار اور جذبات کا ہیجان نہیں ہے۔ وہ

جمیل ساز آگہی پر اپنی نہ فغاں دل [illegible] کے پردے

نکا و لگتی ہی منفصل ہو [illegible] ماحول پیمانہ

یہ بحران پیدا ہو رہا ہے جو ذاتی تجربات اور بہت سے جذبات کو کسی عالمگیر سچائی [illegible] سے منسلک کرتے ہیں۔ کسی اچھے شاعر کے یہاں اس کی جستجو بے سود نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کے وسیلے شاعر اپنے فن کی محدود دنیا سے نکل کر اس دنیا میں قدم رکھتا ہے جہاں اس کے ادراک [illegible] چیزیں ہیں۔ شاعر [illegible] اپنی انفرادیت کا رشتہ کونی حقائق سے ملاتا ہے۔ اس سے اس کی انفرادیت جو وسعت [illegible] ہوتی ہے [illegible] اس کے جذبات [illegible] سی پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ کسی وقتی رقت پسندی یا ماحول کا شکار نہیں ہے بلکہ ان جذبات اور تجربات کا مرکز ہے جن میں دوسرے بھی اس کے شریک ہیں۔ یہی کوشش کبھی کبھی کسی فکری نظام سے وابستہ ہونے کی خواہش پیدا کرتی ہے۔ اور کبھی [illegible] نظام کی جستجو کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔ دونوں حالتوں میں نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ شاعر فلسفہ تعلیم نہ ہوتے ہوئے بھی حکمت و فلسفہ کی راہوں سے گذر سکتا ہے۔

یہاں اس حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ فلسفہ جو صرف کتابوں سے پڑھ کر حاصل کیا جاتا ہے جب شاعری کا موضوع بنتا ہے تو [illegible] اختیار کر لیتا ہے اس میں [illegible] تجربات کی کیفیت اور شعریت کی واضح طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن وہ فلسفہ جو زندگی کی کشمکش میں شریک ہو کر یا اس کے احساس کا نتیجہ ہوتا ہے جذبات کے [illegible] سے گذر کر شاعری بن سکتا ہے [illegible] اس میں پیدا ہو سکتی ہے۔ اس منزل سے گذرنے میں ایک شاعر کو یہ بھی

[illegible] مختلف نظاماتِ فکر میں سے کسی ایک کو یا اس
کے پہلوؤں کو قبول کر لے۔ یہ بات اتنی فطری ہے کہ فلسفیانہ
[illegible] رجحانات، فلسفیوں اور مفکروں کے مختلف
[illegible] پر صادق آ سکتی ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ اگر کسی
نے کسی نظام فکر کو اپنی شاعری میں سمو دیا یا اس کی
بنیاد اپنے خیالات پر رکھ دی تو وہ شاعر فلسفی بن گیا
[illegible] یہ سراسر غلط خیال ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں
یا اس کسی فلسفیانہ نقطۂ نظر کسی مخصوص نظام حیات یا اصول
زندگی کو قبول یا رد کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے شاعرانہ اظہار
و پیش کرنے کا ہے۔ یہ تنقید شعر کا سب سے اہم مسئلہ ہے
ایسا شاعر جو [illegible] سطح پر لکھتا ہے۔ اپنے پڑھنے والے اور
[illegible] کے علاوہ کچھ اور مطالبہ بھی کرتا ہے
[illegible] ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ اسے محض لطف سخن
کے لئے پڑھنا چاہیں انہیں اس کا حق حاصل ہے لیکن جن
[illegible] میں اس کی شاعری [illegible] پیدا کرتی ہو وہ اس میں اپنی
واقفیت علم اور [illegible] کے لئے بھی کچھ تلاش کر سکتے ہیں
کھلی ہوئی بات ہے کہ ایسے [illegible] پر پڑھنے والا یا ناقد اسے
محض شاعر کا جذبات سمجھ کر نہیں پڑھے گا۔ بلکہ ایسے خیالات
تصورات سمجھ کر دیکھے گا جن کی صحت اور جانچ کے کچھ
[illegible] بھی ہو سکتے ہیں۔ جمیل مظہری اگر صرف غنائی شاعر
[illegible] اور محض غزل اور گیت لکھتے تو وہ بہت ممکن تھا کہ ان
کا شاعرانہ [illegible] پر [illegible] لیکن شعوری یا غیر شعوری طور
[illegible] اپنے باہر کی کائنات کو بھی دیکھتے اور اس کے
مسائل پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ مسلسل نظموں میں ان کا تعمیر
[illegible] کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔
[illegible] تجربات [illegible] اعتراف

کرتے ہیں کہ [illegible] کی [illegible] میں الفاظ
کی الجھن بنتی رہی اور لوگ اسے اپنی [illegible] سے فلسفہ
کہتے رہے۔ پھر ایک شعر میں یہ بات یوں ظاہر ہوئی
ہے

ہمارا کیا ہے [illegible] کو کہاں [illegible]
بہ فلسفہ ہی اور شاعری نہ رہی

اور ایک جگہ ایک دوسری شکل میں اس طرح ہے

مظہری ہم نے [illegible] الجھنوں کو [illegible] سمجھ
تم نے تو [illegible] کو فلسفہ بنایا ہے

مقصود یہ ہے کہ افکار و خیالات جن کی نوعیت
کہیں کہیں فلسفیانہ سی ہوتی ہے۔ [illegible] کے دائرہ شاعری میں
برابر جگہ پاتے رہتے ہیں۔ اس لئے چاہے ہم یہ تسلیم نہ کریں
کہ خالص بحیثیت فلسفہ کے ان کی شاعری کا موضوع ہے
لیکن اس بات سے اکثر [illegible] نہیں کر سکتے کہ ان کا [illegible]
شاعری فلسفیانہ ہے۔ جن لوگوں نے نظریہ کا [illegible]
"ایک سوال" یا "نامکمل ناول" "تعمیر و شکست" [illegible] کا مطالعہ کیا
ان کی افتاد کا اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہو سکتی۔
اس بات کا دوبارہ یاد دلا دینا بے محل نہ ہوگا کہ فلسفہ
اور شاعری کے طریق کار مختلف ہوتے ہیں [illegible]
کا بدل نہیں ہے اس لئے حکمت [illegible]
اور [illegible] مقابل نہیں۔ جن شعرا کے یہاں فلسفیانہ [illegible]
نظر آتی ہیں ان پر اس حیثیت سے نظر ڈالنا [illegible]
جمیل مظہری کے یہاں بھی کوئی [illegible]
فلسفیانہ نظام نہیں ہے کہ [illegible]
اس کی [illegible] کی جا سکتی [illegible]
[illegible] انسان [illegible]

"انتقال" متعلق ہیں اشارے ملتے ہیں [illegible]
گئی ہے وہ متوجہ ہوتے ہیں ان کا اظہار [illegible] چند مصرعوں
کی ذاتی کاوش کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے جس میں انسانی منصوبہ آمیز
کیا سیاست ہوگئی ہے کہ اسے محض جذباتی انفرادی. یہ عمل کے
معیار پر بھی نہیں رکھا جاسکتا. مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان
کی خود فکر کی تہہ میں ایک خیال افروز تشکیک کی کارفرمائی
ہے تشکیک انسان کی تخلیقی اور عملی زندگی میں نیا تخلیقی
اور نیا مقام رکھتی ہے. بشرطیکہ اس کی نوعیت محض
انتشار [illegible] جذباتی کرب کی نہ ہو. ایسی تشکیک کہیں نہیں
ملتی. بلکہ تو طبعی اور صحت مند بنیاد رکھتی ہے جمیل کی
تشکیک تخلیقی ہے. اور وہ ان کو خدا اور کائنات کے
ایک تخلیقی تصور تک پہنچاتی ہے. "نقش جمیل" کی پہلی ہی نظم
"حقیقت" ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتی ہے. تشکیک
کی کشمکش ان کے "مذہب شاعرانہ" سے انہیں باہر
لاتی ہے ؎

ہم ہیں شاعر ہمیں اس بحث سے مطلب ہم تو
اپنی خواہش کو سمجھتے ہیں مشیت اس کی!
اپنا مذہب ہے مگر اک غم ابد [illegible] جمیل
ہم اسی طرح سے کرتے ہیں عبادت اس کی

معلوم نہیں اہلِ مذہب اور ارباب حکمت
کس نظر سے دیکھیں گے. لیکن شاعر نے "اپنی خواہش" اور
"اس کی مشیت" میں ایک ربط قائم کرکے ایک ایسے مذہب
کی صورت پیدا کی. جو انسان ارتقا کے منزل پر ہر
شعور کو موقع دے سکے کہ وہ اپنی خواہش کی روشنی میں مشیت
سمجھ سکے ؎

سامنے میرے جھلک ہے جمیل لیکن خدا سے

حکم ربی است کہ نہ حکم ہے نہ کہ !

شاعری میں الجھنے کا سبب یہی تشکیک ہے کیونکہ خدا کا
انکار کرکے تشکیک نہ سکون پاتا ہے اور ماننے والا اقرار
کرکے کیسے لطف حاصل کرلیتا ہے. لیکن جمیل کے یہاں یہ بات
نہیں ہے. کبھی وہ سرِ ملتجی انکار کرتا ہے کبھی مامون کا کبھی
کبھی حجابِ چشم بینا ہے. کبھی نیرنگ تصور و تماشا. کبھی
طاقت کا آخری تصور ہے. کبھی محبوب کی خواہش کا آئینہ
وہ ہے بھی اور نہیں بھی. اس کا وجود خود [illegible] بھی ہے اور
نہیں بھی. بہرحال جمیل خدا کے معاملے میں وہیں ہیں
جہاں جوش اور بہت سے دوسرے شعرا اقرار و انکار
کی کشمکش میں گرفتار نظر آتے ہیں. اگر وہ ہے تو پھر اشعار
کیوں ؎

کیسا پردہ جمیل کیسا جلوہ
دیکھا ہے تیرگی کو بھی کا جلوہ
گھیرے ہوئے ہے گھٹا کا آفتاب
پہلو میں ہے نظر کر جلوہ

ایک طاقت تھی جو مجھے لے رہی تھی اپنا ہم
تنہا کر اس کے اپنا تنہا سب کچھ تھا میں
تھے وہ شاید اپنی ہی بے چارگی کی اک جھلک
جس کو اپنی سادہ لوحی سے خدا سمجھا تھا میں
اور اگر نہیں ہے تو پھر التجا کس سے ہے؟
میں نہیں کہتا کہ سویرا کر دے
ظلمت میں اک کام ذرا کر دے
یا [illegible] پر کہ کچھ دیکھ سکیں
یا اور بھی گھنگھور اندھیرا کر دے

اس طرح … موت اور … اختیار کے مسئلہ … بھی نسبتاً سنجیدہ … رجحان رکھتے ہیں۔ تشکیک کا … نہیں ہے لیکن لا ادریت نما رجحان ضرور ہے اس سے کہ … نتیجہ تک رسائی تو ہو لیکن غور و فکر کے دروازے مسدود … ہیں۔ زندگی کے عملی انفرادی تجربے بڑھتا ہے … کی دھڑکن کی رفتار … تیز کرتے رہتے ہیں۔ اور انسان توازن کی جستجو میں عمل کرتا ہوتا ہے ایک معمولی مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جمیل میں صدائے شکست کے عنوان سے جو رباعیاں شامل ہیں وہ توازن کے … جذباتی بے چینی کے ساتھ ساتھ فکری ہیجان اور انسان مقدرت کے … پرستش کا بہت اچھا آئینہ ہیں۔ … انفرادی … حقیقت … مجبوری انسان … وغیرہ کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا ہے … اور … نے بھی ان مسائل سے آنکھیں ملائی تھیں۔ اس لئے انفرادی تجربے عمرانی خصوصیت ڈھلنے کی کوشش کرنے لگے۔ شاعر جب … کی موت … صدمے کے اندر ایک انفرادی حادثہ ہے لیکن ایک سطح پر شاعر اسے محض وقتی حادثہ سے الگ کر کے دیکھتا ہے۔ یہ انفرادی واقعہ کی فکری نوعیت ہے جو … سے ظاہر ہو گا ؎

وہ مر گئی ہائے اور میں مر نہ سکا
ماتم کا جو حق ہے وہ ادا کر نہ سکا
… تو ضرور ساز آنکھوں … تھیل
پیمانہ زندگی کا مگر بھر نہ سکا

بچہ … نزع میں سسکتا ہوتا
کیوں اس نے ایک ماں کے لئے … ہوتا
اس وقت غرور کبریائی کیسا
تخلیق کی لذتوں کو سمجھا ہوتا

مضراب ہے تیری خالقِ سازِ ہستی
شیشے ہے صدائے سنگ اندازِ ہستی
ٹوٹا جو … ساغر …
میں نے ایک قہقہے کی آواز سنی

اس پر بے ساختہ وہ رباعی یاد آتی ہے جو خیام سے منسوب ہے

ابریق مے مرا شکستی ربّی!
بر من در عیش را ببستی ربّی
بر خاک بریختی مے ناب مرا
خاکم بدہن مگر کہ مستی ربّی

اور وہ شعر بھی جو اس سے بھی زیادہ واضح طور پر … حقیقت کا ترجمان ہے ؎

کہہ کے … بھی کی
جب میں روتا ہوں تو ہنسنے کی صدا آتی ہے

یہ ساری باتیں عملی زندگی میں جذبات و عقل کی کشمکش سے پیدا ہوتی ہیں۔ ذہن جب حالات سے مطابقت پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ جذبات کی شدت … سر … جب عقلی دلائل کی دیوار میں … ہے اور جب انسان فطرت کی سفاک اور بے پناہ طاقت کے سامنے بے بس نظر آتا ہے اس وقت ایسے ہی خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ اور … اور کائنات کے سارے … کے متعلق شک ہونے لگتا ہے۔ تشکیک کا … ایک طرف امید … عمل … زندگی کا حسن

[illegible]

... یقین پر ٹھیک خالص فلسفیانہ ... یوں پر بھی غور ... کے پہلو کو شدت ... یقین بے یقینی میں تبدیل کر دیتی ہے ... زندگی کے مشاہدے کا نتیجہ ... تشکیک ... کہ آدم کے ... سے اس ... تک انسان ... بہت سے مراحل کا ر چھوڑ گیا ... کی راہ گذر ... قوت حاصل کر رہا ہے ... عمل سے ... اختیار میں تبدیلی کر رہا ہے ... کی شاعری کا ... وہ فکری پہلو ہے جو دریائی جوش و خروش کے ساتھ ساتھ تعمیر حیات میں یقین رکھتا ہے۔ اس سلسلے ... کی نظمیں پیام، آدم نو کا ترانۂ سفر، فسانۂ آدم و ارتقاء، وقت کا دھارا بہنے والے مطالعہ خاص طور سے میرے خیالات کی تائید کرے گا۔ پیام ایک خوب صورت پر کیف اور وجد آور نظم ہے۔ تبلیغی دھن سے خالی لیکن اس کے باوجود عمل کوشش اور طوفان خیز، اس نظم میں انسان اپنی جد وجہد کی اس منزل میں نظر آتا ہے جہاں وہ فطرت سے ہم آہنگی پیدا کر کے اس پر فتح حاصل کرنا سیکھ رہا ہے۔ یہاں انسان بے بس، کمزور اور شکست خوردہ نہیں ہے۔ بلکہ محشر انقلاب بپا کر دینے کی صلاحیت اور عزم رکھتا ہے، اور شاعر کی بات کے خیال ... ہونے کے بجائے تیار تھا۔ دینے والا پیامبر بنا چاہتا ہے۔

بیسویں صدی کا ہندوستان زبوں حالی، پستی غلامی، اور خواب آفرینی کے حصار سے باہر نکلنے کی جد ... تھا۔ اس کی رفتار ترقی تیز نہیں تھی۔ لیکن اسے اپنی ... پر یقین اور اپنی قوت پر اعتماد ہو رہا تھا۔ جاذب اور شاعر محض خیالوں کی دنیا میں گم نہیں تھے۔ وہ بھی زندگی کے افق پر آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کی دھوپ چھاؤں دیکھ رہے تھے۔ کاروان ارتقا کی رفتار تیز تر ہوتی جا رہی تھی اور محسوس ہو رہا تھا کہ اس شب تار کی سحر بھی ہوگی جمیل مظہری اپنے وطن دوستانہ اور قوم پرستانہ میلان اور آزادی و ارتقار کے جذبات سے سرشار ہونے کی وجہ سے اس کش مکش کو محض سیاسی ہی نہیں فکری انداز میں بھی دیکھ رہے تھے۔ آدم نو کا ترانۂ سفر اس کا ثبوت ہے

فریب کھائے ہیں ... بتے سراب کو پوچھ رہا ہوں۔
مگر نتائج کی روشنی میں خود اپنی منزل بنا رہا ہوں
جو دل کی گہرائیوں میں صبح ظہور آدم سے سو رہی تھیں
میں اپنی فطرت کی ان خداداد قوتوں کو جگا رہا ہوں
میں سانس لیتا ہوں ہر قدم پر کہ بوجھ بھاری ہے زندگی کا
ٹھہر ذرا گرم رو زمانے کہ میں ترے ساتھ آ رہا ہوں

یہ آدم ... تب ... نیا تجزیہ ... ہے اس کے ہاتھ میں علوم و فنون کی باگ ڈور ہے جس کی مدد سے وہ فطرت کے سامنے اپنی افسوں طرازیوں کے طلسم کھڑے کرتا اور جادو جگاتا ہے۔ وہ تخلیق کا عظیم ترین مظہر ہے اور اس کی کہانی کی ارتقا کی مسلسل کہانی ہے فسانۂ آدم میں جمیل مظہری نے اپنے فن کو حسین ترین روپ میں جلوہ گر کیا ہے۔ پیدائش آدم کے مذہبی پس منظر میں جدید تصور ارتقاء کی آمیزش نے نظم کو ایک بے مثال غنائیہ بنا دیا ہے۔ دوسرے شعرا نے تو نے آدم کی پیدائش، ترک اولی، ترک بہشت اور ہبوط کے عام خیالات میں نئی وسعتیں پیدا کر دی ہیں جدید تصور

بیان کا وہ نمونہ پیش کیا ہے جو اچھے اچھے شاعروں کو بھی عمر بھی کبھی ہاتھ آتا ہے۔ ایسی ہی عظمت اور ایسی ہی حسن کاری ان کی دوسری مختصر نظم "ارتقا" میں ملتی ہے۔ یہاں بھی شعر و حکمت کے امتزاج سے ایک سحر کن فن پارہ وجود میں آگیا ہے۔ جو شاعر کی طرز آگہی اور آشفتہ مزاجی دونوں کا مظہر ہے فکری گہرائی کے ساتھ روحانی حوصلہ مندی کا وہ وفور ہے جو شاعری کو محض میکانکیت سے بچاتا ہے اس نظم میں نمایاں طور پر موجود ہے ؎

ہر حال میں مشیت مجھکو بنا رہی ہے
میں اس کی قدرتوں کا شہکار بن رہا ہوں
خود اپنی جنتوں کی تخلیق کر رہا ہوں
خود اپنی زندگی کا معمار بن رہا ہوں
یہ جبر و قدر کی ایک منزل ہے درمیانی
مجبور تو ہوں لیکن مختار بن رہا ہوں
میرا راہ وہ ہے جس میں ہر سانس اک سفر ہے
منزل بھی راستہ ہے خضر بھی راہبر ہے
حکمت کی رہبری میں پرواز کی کشش
امکاں کے دائرے کو پھیلائے بڑھ رہی ہے
وہ قوتیں جو اب تک تحت شعور میں تھیں
گہوارۂ خودی میں پروان چڑھ رہی ہیں
انجام کی بصیرت خواہش پہ حکمراں ہے
آزادیاں خود اپنی زنجیر گڑھ رہی ہیں
کچھ ٹوٹے ہوئے ہیں دامن گو پر شرر ہمارا
پابندیوں میں بھی ہے جاری سفر ہمارا
جذبات رفتہ رفتہ افکار بن رہے ہیں
افکار کا تغیر کردار بن رہا ہے
پابندیوں کی شدت اضافہ بند ہی
پروردگی کا جذبہ ایثار بن رہا ہے
لغزش سے تجربہ ہے تجربے سے حکمت
تحقیق ہو رہی ہے، معیار بن رہا ہے
گمراہیوں سے ہو کے ہے راستہ ہمارا
تاریخ بن رہا ہے ہر نقش پا ہمارا

بارہ اشعار کی اس مختصر نظم کا ہر لفظ غور طلب ہے بڑی پیچیدہ اور گہری باتیں بڑے شاعرانہ انداز میں کہی گئی ہیں شاعر کی نگاہ میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں ہیں کبھی انسان فطرت کی قوتوں کے آگے بے دست و پا تھا۔ پھر اس کے ہوش نے انگڑائیاں لیں اور وہ فطرت پر تسخیر حاصل کرنے کی تدبیریں کرنے لگا اور اب اسے یقین ہے کہ مستقبل اس کی خواہشات کے سانچے میں ڈھلے گا انسان پر یہ عقیدہ اس محبت سے پیدا ہوتا ہے جو انسان اپنی نوع سے کرتا ہے اور مظہری کے یہاں اس کی فراوانی ہے۔ شاعری میں یہ محبت ایک ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے سوتے کی طرح پھوٹ رہی ہے جو انسان سے محبت کرے گا اس کا یہ عقیدہ نہیں ہو سکتا کہ انسان ہمیشہ مظلوم و مقہور رہے گا۔ اسی وجہ سے جمیل مظہری کا یہ نعرہ بہت ہی معنی خیز بن جاتا ہے ؎

ڈھل سکتا ہے ہر سانچے میں انسان کا عمل
فطرت یہ ہے قدرت وہ جھٹک دے کہ نکل
فطرت کیا ہے فطرت کیا ہے فطرت کو کر زیر
وقت کا دھارا پھر جائے وقت کا دھارا بدل

اس طرح انسان اپنے عمل سے جبر کے اندر اختیار کی راہیں پیدا کرتا ہے حالانکہ جمیل مظہری نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ کوئی آزادی مطلق اور بے حد و حساب نہیں ہے۔ یہ تصور محض ذہنی انتشار کی پیداوار ہے آزادی تو

اور اضطہار کی منصفانہ اور متوازن تنظیم ہے محض عدم پابندی نہیں ہے۔

میں نے اس مختصر مضمون میں جمیل مظہری کی شاعری کے بہت سے پہلوؤں سے بحث نہیں کی ہے۔ بلکہ صرف ان چند مسائل کا جائزہ لیا ہے۔ جن سے ان کے خیالات و افکار کی بنیادوں کا پتہ چلتا ہے۔ اور تنقیدی نقطۂ نظر سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس شاعر کو فن پر عبور حاصل ہے۔ اور زبان و بیان کی سحرکاریوں سے واقف ہے۔ وہ فلسفیانہ موضوعات کو دلکش اور رنگین بنا کر پیش کر سکتا ہے۔ جمیل کی حقیقت پسندی میں تغزل کی خوشگوار آمیزش ہے۔ جو کئی عناصر سے ترکیب پاتی ہے اس میں انسان دوستی، عظمت انسانی، حرکت و عمل کی ضرورت، ارتقاء پہ یقین، قربانی کی قیمت، جنون و حکمت میں توازن کا احساس سبھی طرح کے تصورات خیالات اور تجربات شامل ہیں۔ جو طرز اظہار کی دلکشی سے جاندار اور روح پرور بن گئے ہیں۔ جس شعلۂ عارض نے ان کی رومانی اور عاشقانہ نظموں کو گرمی بخشی ہے۔ وہ تو نہ جانے کون ہے۔ لیکن جس سوز دروں نے ان کی فکری دنیا کو روشنی عطا کی ہے اس سے انسانی ارتقا پہ یقین کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔

— .... —

جمیل مظہری کی غزل نگاری

اختر اورینوی

عرض یہ ہے کہ میں اپنے ہم عصر شعرا کی فن کاری کے متعلق کچھ دنوں سے لکھ رہا ہوں۔ میں نے اختر شیرانی، فیض اور پرویز شاہدی کی شاعری کے متعلق لکھا ہے۔ جمیل مظہری کے فن کے متعلق لکھنے لگا ہوں۔ اور احسان دانش، ساغر، مجاز، علی سردار، اجتبیٰ رضوی، اور رضا نقوی کے بارے میں لکھنے کی نیت بخیر ہے۔ ظاہر ہے کہ زیر قلم مضمون ایک زریں زنجیر کی کڑی ہے۔ اس سلسلہ کا سنہرا پن موضوعات کے حسن کا رہین منت ہے۔ اور اس کا ان گڑھ پن میرا قصور۔

جمیل مظہری عصر حاضر کے جدید شاعروں کی صف میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کی ایک واضح شخصیت ہے اور اس شخصیت میں نمایاں انفرادیت کی جھلک ملتی ہے۔ یہ امر خود جمیل مظہری کے فن کے بڑے پن کی دلیل ہے ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب

بہرکیف! تنقید فن تخلیق فن کی طرح عموماً حسن کے ساتھ ذاتی زاویۂ نگاہ سے بھی وابستہ ہے۔ فن حسن آفرینی ہے بشرطیکہ وہ "[illegible]" ہو۔ ورنہ ہر قوس کی فن کاری سعی حسن آفرینی تو ضرور ہے۔ انتقاد فن جلوہ ہائے حسن کا مشاہدہ و تمیز ہے۔ حسن کامل کے بغیر حد کامل ناممکن ہے۔ لیکن حد کامل کا مقام قرب حسن کا انتہائی مقام ہے۔ اس قرب خاص کے بغیر نظارۂ جمال تشنہ رہتا ہے۔ ناقد کا مجاہدہ یہ ہے کہ وہ حسن کے قریب پہونچنے کی سعی پیہم میں لگا رہے فن کار اپنے انداز سے زائر حسن ہے اور ناقد اپنے طور پر بہر حال آرٹ کا عالم ایک شہادت گاہ توفیق و سعی ہے۔

جمیل مظہری نظم نگار بھی ہیں اور غزل نگار بھی۔ انہیں دونوں صنفوں میں اہلیت ملتی ہے۔

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

فی الحال میرا دائرہ نظر مظہری کی دنیائے تغزل ہے۔ اردو میں غزل کی تین قسمیں مانتا ہوں۔ ایسی غزلیں جن میں انتشار خیال ہو، ایسی جن میں تکرار خیال ہو، اور ایسی جن میں ایک کیف، ایک تجربہ جاری و ساری ہو۔ جمیل مظہری کی غزلوں میں یہ تینوں قسمیں مل سکتی ہیں۔ میرے نزدیک تیسری قسم سب پر فائق ہے۔ میں اس نوع کی غزلوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔ ہر شعر میں ایک نیا پہلو ہوتا ہے لیکن مرکز خیال وحدانی رہتا ہے مقصد میں کثرت کی جلوہ گری، مگر بغیر تنظیم [illegible]

کہ ایسی غزل میں تھوڑی سی ہیئت رکھتی گئی تجربے کی لطیف وارفتگی کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ میں جمیل مظہری کی غزلوں کو اس لئے بھی پسند کرتا ہوں کہ وہ میرے ذوق صنعت گری کی تسکین کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ ان میں صنائع باتکرار کی قباحتیں کمیاب ہیں۔

جمیل کے رنگ تغزل کا روایتی سلسلہ بھی ملتا ہے لیکن انہوں نے شعری ورثہ سے معرف لیتے ہوئے اسے اپنے ڈھنگ سے سنوارا اور نکھارا ہے۔ موضوعی اعتبار سے جمیل کے تغزل کا بالیدہ حصہ درد دہلوی، شاد عظیم آبادی، اصغر گونڈوی، اور اقبال کے دبستان سے وابستہ ہے۔ اسلوب کے لحاظ سے جمیل پر غالب، اقبال، انیس، شاد، اور وحشت کے اثرات پڑے ہیں۔ جمیل نے تتبع کسی کا نہیں کیا۔ اپنے ذوق کے سہارے انہوں نے ہر معدن سے اپنی قسمت کے جواہر چن لئے ہیں۔ مظہری خود کہتے ہیں کہ:

"میں دبستان غالب کا ایک طالب علم
ہوتے ہوئے بھی نکتہ چند ز پیچیدہ بیانی
سخن آرائی کا کبھی قائل نہ رہا"

وہ غالب کی شاعری کی کائناتی وسعت اور اس کے تخیل کے مابعد الطبیعیاتی حصے سے متاثر ہیں۔ اور اس سے ترکیبوں کی حسن کاری بھی سیکھی ہے۔ مگر اس کے فن کے تمثیلی حصہ سے بچے نکلے ہیں۔ جمیل کے دل کی دھڑکنیں بال جبریل کے ارتعاش پرواز کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ انہوں نے ان دھڑکنوں کو اپنے فن کے روپ میں ڈھالا ہے۔ خون دل و جگر جمیل کا اپنا ہے اور اسی خون کی لالہ کاری ان کے فن میں ملتی ہے۔ مظہری کبھی بھی دوسرے کے پھیپھڑوں سے سانس نہیں لیتے۔ وہ تازہ کار و تازہ خیال ہیں۔

مظہری اپنی غزلوں کے موضوعات غزل ہی سے اخذ کرتے ہیں۔ ع

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے

آرٹ میں ایمان سے اخلاص اور جاں نثاری پیدا ہوتی ہے۔ غزل کے باب میں جمیل غالب سے زیادہ استوار ہیں۔ غالب مابعد الطبیعیاتی عالم سے دھول دھپے تک اتر آتے ہیں۔ جمیل اپنے منتخب عالم سے باہر نہیں جاتے۔ ان کا سراپا ناز ہمیشہ بلند و بام ہے۔ جمیل کے شعری تجربوں اور تعبیروں میں ہمیں سترہویں صدی کے انگلستانی شاعروں کے فن کی جذباتی گرمیاں اور فکری تجلیاں بھی ملتی ہیں۔ مگر جمیل سوز و تابانی مغرب سے بھی مستعار نہیں۔

اردو غزل میں صوفیانہ اور باطنی مابعد الطبیعیاتی تجربے ہمیشہ کیف ساماں رہے ہیں۔ رسمی صوفیانہ شاعری کو اصغر گونڈوی نے نیا گداز بخشا۔ اور اقبال نے نیا مزاج اور نئی اجتماعی وسعت عطا کی۔ جمیل نے اسے نیا رنگ اور نئی لطیف لچک دی ہے۔ لیکن یہ مقام جمیل کو تدریجی طور پر حاصل ہوا ہے۔

صاحب انتقاد تجزیہ کا تلخ فرض بھی انجام دیتا ہے۔ مگر یہ تلخی اس لئے گوارا کی جاتی ہے تا کہ عرفان فن کی شیرینی بھرپور حاصل ہو۔ علم تشریح الاعضاء اور فن جراحی مقصد نہیں۔ مقصد تو صحت مندی کا ہے۔ فن کی صحت مندی کے لئے فن شناسی تجزیہ ضروری ہے۔ مگر مقصود کل کا تصور ہمیشہ سامنے رکھنا چاہئے۔ تجزیہ انتقاد کا مطلع فن کا براہ راست فوری مطالعہ

فکر جمیل کو سامنے رکھتے ہوئے میری معروضات کا مطالعہ فرمائیں۔ تاکہ آپ فن کار اور ناقد دونوں کے ہم دوش ذہنی سفر طے کر سکیں۔

مطربی کے عالم سوز و گداز اور دنیائے کیف و رنگ کا کائنات وجد و حال کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور پھر اس کے آفاق فن کی کارگہ شیشہ گری کے نازک کام کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے۔ فن کار ایک جام جمشید بناتا ہے جس میں ان کے تصورات اور تخیلات کی کائنات جھلکتی ہے۔ غزل کے جام رنگین میں عکس رخ یار نظر آتا ہے۔ اور غزل کے فن کار کے شرب دوام کی حقیقی وجہ یہی ہوتی ہے۔ لیکن بادۂ سخن دوست کے گرد ایک دنیا رقص کرتی ہے یہ تو غزل نگار کے ذوق و بصیرت پر منحصر ہے کہ آپ کو وہ اپنے پیالے سے کس نوع کی لذت بخشتا ہے۔

بنیادی طور پر غزل کا فن شعر مفرد کا فن ہے۔ تجربہ کی مرکزیت، ارتقا اور تکمیل سب کچھ دو مصرعوں سے وابستہ و پیوستہ ہوتا ہے۔ یہ ایجاز کا ہنر ہے۔ اور اعجاز۔ بلاشک یہ نگینہ سازی کا نفیس و نازک کام ہے۔ آرٹ کی قدریں توازن و تجمل، شعر مفرد کے عالم صغیر میں مل جاتی ہیں۔ میں قافیہ و ردیف کے التزام میں مفرد اشعار کو ایک سمجھتے ہوئے ڈور کی مدد سے منسلک کرنے کی کوشش سمجھتا ہوں۔ یوں تو یہ محض میکانکی کام ہے لیکن قافیہ و ردیف کی ہم آہنگی سے مفرد اشعار کے اتصال میں ایک حسن تقریب پیدا ہو جاتی ہے۔ اور مسلسل یا مربوط غزلوں میں کبھی ردیف و قوافی اور خیال و تجربات کے باعث بھی ہوتے ہیں۔ ہر غزل کا ایک وحدت تصور کرنا یا اس کی توقع رکھنا صحیح طرز فکر نہیں۔ جیسی نظموں کے امکانات ہوتے ہیں۔ اوسط درجے کی نظموں کے اور مختصر نظموں کے کم اور۔ اسی طرح شعر مفرد کے کم اور غزل کا ایک مکمل شعر دنیائے شاعری میں مختصر ترین نظم کی مثال ہے۔ ان اشعار کے مجموعہ کو بہ انتشار خیال کا الزام کیوں دیں۔ کیا چھوٹی اور اوسط قماش کی نظموں کے مجموعہ کو ہم انتشار خیال اور نامرکزیت کا طعنہ دے سکتے ہیں۔ ہاں یہ بھی صحیح ہے کہ ایک منظومہ یا نظم یا ایک منظوم المیہ یا طربیہ، یا ایپک شاعری کے امکانات فن اور حسن تخلیق کا مقابلہ غزل کا ایک شعر نہیں کرسکتا۔ ہلال سے بدر کامل کا موازنہ فضول ہے۔ لیکن ہلال میں جو حسن، لطافت، نزاکت اور تاثیر ہے۔ وہ ماہ کامل میں نہیں۔ دونوں کے کمال کی نوعیت جدا جدا ہے دونوں کے حسن کی ادائیں الگ الگ ہیں۔ کامیاب شعر مفرد کے ارتکاز، وحدانیت، ہمہ گیری، تکمیل، و تاثیر کا دوسرے اصناف شاعری میں جواب ملنا مشکل ہے۔ شعر مفرد کی فنی تجلی لالہ، زہرہ، مشتری اور قطب تارے کی طرح جلوہ بار ہوتی ہے۔ ان ستاروں کا حسن کیا نظام شمسی کا مرہون منت ہے۔ آسمان کے ہر ستارے کا حسن منفرد ہے۔ تاروں بھری رات میں ستاروں کے انتشار سے بدنمائی تو پیدا نہیں ہوتی، کہکشاں کے حسین بکھراؤ میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ لیکن انتشار کیفیت بد صورتی اور تاثیر کی ابتری بھی پیدا کرتی ہے یہ ہنرمندی پر منحصر ہے کہ انتشار وحشت ہے۔ یا سنجیدہ یا فنکارانہ۔

تاروں بھری رات کا مجموعی حسن بھی ہوتا ہے۔ اور اس کے جادو کی تاثیر بھی ہوتی ہے۔ تاروں بھرا آسمان ستاروں کا سرگم سناتا ہے۔ لیکن ہر ستارہ

منفرد حسن رکھتا ہے۔ کم از کم سطحی دنیا سے شاعر ان کے کچھ جمال افروزی میں تنظیمی یا ارتقائی حسن نہیں محسوس ہوتا۔ تاریخ بھی ساسان کی جہانبانی کا شیرازہ نہیں۔ ہر کلی تاثیر مربوط نہیں ہوتی۔ اچھی غزل میں بکھرے ہوئے اشعار حسین انسے کہہ کسان بنا دیتے ہیں۔ غزل کے فن کار کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اشعار کے موضوعات بہ صورت انتشار پیدا کرنے کا باعث تو نہیں ہوتے۔ کامیابی کا انحصار، کاریگری، صناعت اور ذوق پر منحصر ہے۔ غزل کا آرٹ لفظ کے آرٹ سے مختلف ہے۔ دونوں کا برتاؤ کامیاب یا ناکامیاب ہو سکتا ہے۔

جمیل مظہری ایک فنکار کا ذوق و احساس رکھتے ہیں انہوں نے صنف غزل کو بڑی صناعی سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے جمیل کی غزل نگاری کو تین دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ ان دوروں کو تین مختلف میلانات بھی کہا جا سکتا ہے۔ جمیل کے ذوق جمال اور شعور فن میں تدریجی ترقی ہوئی ہے۔ بڑا فنکار ہمیشہ تلاش حسن کی تلاش میں بڑھتا رہتا ہے۔ اسے اکثر درد ناتمامی کی خلش ہوتی رہتی ہے۔ وہ نت نئے تجربے کرتا اور تکمیل تجلی کی منزل کی جانب سفر کرتا رہتا ہے بظاہر اور بحیثیت مجموعی ترقی ہے۔ ادنیٰ درجے کے فنکاروں کے فن میں ارتقا کی منزلیں نظر نہیں آتیں۔ جمیل کی غزل سراپا ارتقا ہے۔

جمیل کے پہلے دور کے کلام سے چند نمونے پیش کرتا ہوں میں نے ارادتاً ایسے اشعار چنے ہیں جن کے چھلکے چھلکے پات ہیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

حال محمل نشیں ترے دل کا
کہتا جاتا ہے پردہ محمل کا

اس شعر کی صاف و سادہ زبان، تجاہل تصویریت، اور جذبۂ بیقرار و متحمل انداز، تخیل کی لطافت و ندرت، اور ایک خاص نظریۂ محبت کی انوکھی پیشکش قابل تحسین ہیں۔

ایک شعر ہے ؎

اس کو کیا حق ہے کہ قطرے سے سمندر مانگے
جس نے قطرے کو سکھایا نہیں دریا ہونا

فکر جمیل کے اس حصہ کی ایک غزل کا یہ شعر ہے جو ۱۹۳۰ء کے پہلے کی کاوشوں کا مجموعہ ہے یہی آفاقی موضوع جمیل کے ترقی یافتہ دور کا خاص موضوع ہے۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

فنکار کا مستقبل ماضی میں بھی دکھتا ہے۔ اس دور کی ابتدائی میں کمزور اور رسمی غزلیں بھی ملتی ہیں مثلاً:

چلمن کبھی کبھی تو اٹھایا کرے کوئی
کچھ احترام دیدہ بینا کرے کوئی
بڑھتی ہے اور حسن سے ذوق نظر یہاں
کب تک مذاق عشق کو رسوا کرے کوئی
شرط وفا یہ ہے تو وفا کو مرا سلام
دل اس لئے نہیں ہے کہ کھیلا کرے کوئی

اس دور کو میں مشق فن کا دور کہوں گا اس رسمی غزل خیال اور تجربے کے پرانے سانچوں اور روایتی اسالیب کا رنگ نمایاں ہے۔ کبھی کبھی کاریگری اور قادر الکلامی کے ہاتھ بھی دکھلائے گئے ہیں ؎

گرچہ ہے قید کڑی اور سلاسل بھاری
ہم چلے آئیں گے جلدی نہ کرو دل بھاری
رات بھیگی ہے جدائی کی خدا خیر کرے

ہے مسافر ترے آنے کی منزل ہماری
نگہ شوق تیرے پردۂ محمل پہ گراں
نگہ شوق یہ ہے پردۂ محمل ہماری

سائل ہماری اور غزل ہماری چند پر تکلف غزلیں بحر
تمام آورد کے ساتھ پیش ہوئی ہیں ؎

تیرے جلووں سے ہے یہ محفل آب و گل آئینہ
دماغ آئینہ خانہ، چشم آئینہ، دل آئینہ
ہے دریا تند خو ٹکرا رہی ہیں حسن کی موجیں
بہ یک شان جگرداری بنا ہے ساحل آئینہ
تجلی مائل پستی ہوئی آہستہ آہستہ
نزول حسن خود بیں کی ہے پہلی منزل آئینہ

ہے کس کے ذوق خود بیں کا یہ سارا عالم آئینہ
خدائی آئینہ خانہ، تم آئینہ، ہم آئینہ

اس چھلکتے ہوئے مطلع کا صیقل تو دیکھئے قافیہ بدل
اسی ردیف کے ساتھ دوسری غزل کہی گئی ہے۔
حکم ہے کہ اگر دل میں جذبہ نہ بھی ہو تو اپنے چہرہ
پر کیفیت جذبہ طاری کرو۔ ایمان کی اولی منزل یہی تصنع
اگر اس پر مداومت ہو تو صفائی قلب پیدا ہو جاتی
ہے۔ فن بھی ایک ایمان ہے۔ تصنع سے صناعت تک کا
ارتقا خلوص نیت، اور استقلال و ریاضت چاہتا
اسی غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو آورد میں آمد
طرز نظر آتے ہیں ؎

عرق آلود رخ کا شبستان تجلی تھا!
اب اسکے عکس سے ایک جہان شبنم آئینہ
حسن عکس ہے مگر ندرت کے ساتھ۔

جمیل کی غزل نگاری کے دور اولی میں تصنع ہمیشہ صناعت
کا مقام حاصل نہیں کرتا۔ رعایتی شاعری ملاحظہ ہو ؎

وہ زلف خم بہ خم لہرا کے کہتی ہے سر سجدہ
کہ پیچ عمامۂ واعظ کا بل رکھے گا کیا ہم سے
ذرا صوفی سمجھ نہ کیوں اس بت کا ابروئے ہلالی کا
محبت کا وہ قبلہ ہے اسی محراب کے خم سے
سمجھ لیجئے انہیں کو بس نچوڑ اپنی محبت کا
جو دو آنسو ٹپک جاتے ہیں انکی چشم پرنم سے

لیکن اس دور میں بھی غزل کے دعوے ملتے ہیں ؎

تمہارا ناز بھی رسوا ہمارا راز بھی رسوا،
بلا سے منفعل تم سے، تجلی مضطرب ہم سے

بعد میں جمیل نظیری نادرہ لطیف خیالات کو شعریت
بخشنے والی نفیس فنکاری تک پہونچتے ہیں مگر آرٹ
کی چوٹی سے نیچے بھی ان کی نظر وہاں سے پہلے پہونچتی ہے
جہاں تک ان دست ہنر ابھی تک نہیں پہونچا۔ اور ان
کے قدم بلندیوں پر چڑھتے معلوم ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو

نظر کو پاک کیا، فکر کو بلند کیا!
دلوں کو تیری محبت نے درد مند کیا

پا کے تجھکو تبسم وہ میری جرأت شوق
دفعتاً وہ تری شوخی کا حیا ہو جانا

خشمگیں حیا انکی، شرمگیں عتاب انکا
حسن اور پھر اس حسن اجتناب ان کا

ہے تیرے ناوک تشنہ سے مجھکو ہمدردی

... کا دل بھلا نہیں ملتا!

جوشِ وحشت میں جو مجنوں نے اٹھایا تھا غبار
خود وہ اُٹھ اُٹھ کر حبابِ محملِ لیلیٰ ہوا

اس حسنِ تماشا کی قسم کھاتے ہیں جلوے
صحرا میں محبت کو گلستاں نظر آیا!

دُعا کرے جو شاعروں کے جال تیرے لئے
کہاں سے لاؤں تصور کی وہ جمالی رات

ایک وہ جن کو قفس میں بھی دماغِ پرواز
ایک وہ جو کہ چمن میں بھی ہیں ناکامِ بہار

جمیل مظہری نے بیشک قدیم میں بھی نئی شوخیاں پیدا کر دیے ہیں اسے روایت کا تخلیقی استعمال کہئے۔ ؎

رقصِ خاموش میں تارے ہیں صدا کچھ بھی نہیں
اس خلا میں مرے نالوں کے سوا کچھ بھی نہیں
تم سے عاشق کی خودی مانگ رہی ہے تم سے
عشق کو حسن تقاضا ہے وفا کچھ بھی نہیں
اس تغافل پہ محبت کو ہنسی آتی ہے
ہے جفا نام اسی کا تو جفا کچھ بھی نہیں
سادگی یہ جلوہ گری تیری حجابات سے ہے
بے حجابی میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
حسن بے باک نگاہوں سے پریشاں نکلی
ایک بھی ہوئی شوخی ہے حیا کچھ بھی نہیں

اشعار میں کیسے کیسے نفسیاتی نکتوں کو حسین انداز میں پیش کیا گیا ہے کیسی نادر تمثیلی ترکیبیں ہیں کیسے نازک کنائے ہیں۔ کتنی بصیرت و معنویت ہے۔ مطلع کیسی عجیب دل آویز تاثیر ہے اور سادگی جلوہ گری والے شعر کا تاثرات وجمالیات کے ایک رازِ سربستہ کو کس نزاکت سے کھولا ہے راز کھل کر بھی راز ہی رہا۔

بے حجابی میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

اسلوب کی صناعی بھی خیالات کے اظہار کے نئے نئے امکانات پیدا کر دیتی ہے یہ ۱۹۳۳ء کی غزل ہے۔ لیکن اسے جمیل کی پختہ دور کی غزلوں سے بڑی مشابہت حاصل ہے۔

دورِ آخر کی غزلوں میں رنگِ تغزل بہت نمایاں ہے۔ زبان میں سلاست و فصاحت بھی موجود ہے اسلوب میں روانی، برجستگی و شائستگی پائی جاتی ہے۔ جمیل صاحب ہیں جن اشعار میں معنوی حسن کی آفرینش نہیں بھی ہو پاتی۔ تو کم از کم ان میں حسنِ ادا و حسنِ بیان ضرور مربوط ہو جاتا۔ معنی آفرینی کا آغاز بھی اسی دور سے ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو طرز و اسلوب کا حسن ؎

کچھ ایسا رنگ مری زندگی نے بکھرا تھا
کہ ابتدا ہی سے ترکیب تھی فسانے کی

قدم رکھتے ہیں اور رکھ پیار ہے ہیں!
قیامت آ رہی ہے، آ رہے ہیں!

میں صدقے تجھ پہ ادا تیرے مسکرانے کی
دیکھئے کہاں ہے جھومتا شباب ان کا

میں صدقے تجھ پہ ادا تیرے مسکرانے کی
سمیٹے لیتی ہے رنگینیاں زمانے کی

جمیل صرف زبان داں ہی نہیں وہ نکتہ داں بھی ہیں نفسیات محبت اور معنویت حیات سے ابتدا سے ہی آگاہی حاصل ہونے لگی تھی ؎

تیری وفا نے کیا ذوقِ عشق کو برباد
جگر کے درد میں اب وہ مزا نہیں ملتا

کہیں نہیں ہے بجز بے نیازی و جفا
بتوں کا شکوہ کریں کیا خدا نہیں ملتا

مسلّم ہوگئی بے اختیاری جذبۂ باطن کی
محبت اس سے کرنا جس سے نفرت اس قدر کرنا

ادیبوں میں ڈی ایچ لارنس اور حکما میں فرائڈ نے جذبہ ہائے انسانی کی تنویت اور متضاد اور متقدم کیفیات پر بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے۔ جمیل نے فرائڈ اور لارنس کی طرح محبت و نفرت کی غیر شعوری لہروں کو ہم آغوش ہوتے ہوئے اپنے دیدۂ بینا سے دیکھ لیا ہے۔ بے اختیاری اور جذب باطن کی ترکیبیں [illegible] نفس تحت الشعور کی کار فرمائیوں کا حیرت افزا اظہار برملا کرتے ہیں۔ ایک اور لطیف شعر سنئے ؎

اگر بہار نہ ہوتی تو میرا فردِ دل
ہلاک بے سروسامانیٔ خزاں ہوتا

کرم نہیں تو ستم پر ہی مرمٹنے کو جی چاہتا ہے۔ رنگ نہیں تو بے رنگی پہ ہی قربان ہوجائے۔ ذوق خدائیت ایک بنیادی جبلت انسانی ہے۔ جمیل نے اس نازک نکتہ کو کتنا خوب صورت، سہل، رواں، شگفتہ اور عام فہم زبان میں پیش کیا ہے۔ یہ حکمت اور شعریت کا سنجوگ ہے۔ حکمت کی حدت سے شعریت کا خون نہیں ہوتی۔ بلکہ چاندنی کی طرح اجلی فضا میں کھل پڑتی ہے۔ شعریت نے حکمت کو دلنشیں بنا دیا ہے۔ جمیل ملک [illegible] شاعر ہیں جنہوں نے [illegible] بے حد نہ کیا [illegible] کی بھی انکو گنجائش ہی اپنا شکل استعارے کتابت میں [illegible]

سکوں کیا اُس سے آشفتگی ہنگامہ آرائی
وہ حاصل ہو نہیں سکتا جو [illegible] ابھی دریائی

غصے کو بنائے ہیں متانت
شوخی کو حیا بنائے والے

جمیل میری خموشی جو ناگوار ہوئی
تو خود بخود متوجہ نگاہِ یار ہوئی

کاش! ایسی کوئی پلا جائے
زندگی ایک مزاج پا جائے

کتنا سادہ، کتنا گہرا، کتنا پرکیف و حسین شعر ہے۔ سہلِ ممتنع، سحرِ حلال! ایک اور جادوئے سامری مگر حکیمانہ عمق کے ساتھ ؎

نظر بھی میری طرف ہے انہی نظر میں اک اعتراف بھی ہو
مگر جب آنکھوں میں دل کا آئینہ کوئی معتبر نہیں ہو

دیگر ؎

سحر کے جو انتظار میں ہیں پکار کر کوئی ان سے کہہ دے
کہ صرف ظلمت کی سینہ چاکی کا نام دلیل صبح نہیں ہو

حیا کنیز ہو جس کی وہ منفعل پندار
بہانہ جو ہو تو پھر اس ادا کا کیا کہئے

جمیل نے ۱۹۲۰ء سے پہلے بھی بڑے نادر خیالات میں شعریت کی روح پھونکی ہے ؎

اس مٹی سے فطرت کیسے نازک دل بنا لیتی
جو میری خاک تربت سے تمہارے سانچے لیے ہوتے
یہ میری آگ یوں کجلا نہ جاتی میرے سینے میں
اگر اس آگ کو بھی تاپنے والے ملے ہوتے

کتنا سوز و گداز اور درد و غم ہے اس شعر میں۔ اس کی معانی تصویری، جذبی و تخیلی، حسن کاری، دردمندی ہے۔ اس کی دردمندی، معصومیت اور حسرت زدہ بھولا پن کتنا دل گیر ہے۔

جمیل نے اپنی شاعری میں ہئیت سازی کے تجربے بھی خوب کئے ہیں۔ اس تراش بندی کی ابتدا بھی دور اول سے ہی ہوتی ہے ؎

وہ تجلی تری جس کی پہلی کرن، مری صبح ازل بن کے پھر ہو جلوہ نما!
حسن ہو مضمحل، عشق ہو منفعل، ظلمتیں ہوں مخل، پھر ذرا مسکرا

شاعر نے بحر متدارک کے ارکان کو دوگنا کر دیا ہے۔ یعنی آٹھ کے بجائے سولہ، پہلے مصرعے میں فاعلن آٹھ بار اور پھر دوسرے مصرعے میں بھی آٹھ بار۔ اب یہ سولہ رکنی بحر ہو گئی۔ شاید بحر متدارک کی اس صورت کو بحر غریب کہنا زیادہ مناسب ہو۔ جمیل نے اردو اور ہندی اوزان کو ایک سانچے میں ڈھالنے کی کوشش بھی کی ہے۔ موسیقی کی رعایت سے بھی وزن کی وہ ترکیب نہیں رکھی گئی جو اردو بحر میں رکھی جاتی ہے۔ مثلاً

بنسی والے جوگی تیرے گلی والے جوگی تیرے
جوگ کی بھکشا دینے والے روک بھی لے انجام ترا

بحر متدارک مخبون مسکن ہی میں چند در چند زمانی تجربے کئے گئے ہیں۔ ۱۹۳۳ء کے بعد بھی فنکار نے کئی ہیئتی تجربے کئے ہیں۔ ان کا تذکرہ بعد میں آئے گا۔

اب میں پریم گیتا کے باب کی غزلوں پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس دور کا کلام تقریباً سب کا سب ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۳ء کا ہے۔ یہ عہد رنگین ہی عشقیہ تجربوں کا عہد تھا۔ شاعری میں تجربہ کی نوعیت آپ بیتی کی بھی ہو سکتی ہے اور جگ بیتی کی بھی۔ لیکن فن کی کامیابی تجربہ کی جذبی و تخیلی حیثیت پر منحصر ہے۔ تخلیقی محاسن جذبہ و تخیل کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتے ہیں۔ غزل کے عشقیہ تجربے یا تو سچے ہوں۔ یا زور تخیل سے سچے بن گئے ہوں۔ اور سچے تجربے فن کی حسن کاری سے آفاقی و ابدی حیثیت اختیار کر چکے ہوں۔ تو شاعرانہ کمال کا مقام حاصل ہوتا ہے۔

جمیل مظہری اپنے عہد رنگین میں بھی جذبات کا شکار نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ فن کار ہی رہتے ہیں۔ ہاں یہ ہے کہ اس دور میں فن کی بلندیاں کم ملتی ہیں۔ لیکن زبان کی گھلاوٹ، اسلوب کی تازگی، شیرینی اور نرمی تجربوں کی مخلصانہ سادگی، غنائیت اور نئی فضا آفرینی اس دور کی خصوصیات ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

بچپن کے گھروندے میں برسوں وہ لونی تمنا کھیلی ہے
ہم تم تو ادھارہ لکڑی ہیں جو دھیرے دھیرے سلگتی ہے

گھٹا ساون کی متھرا کے محل پر آ کے کہتی ہے
کہ آنسو کے سندیسے لائے ہیں ہم بندرابن سے

کسی کی یاد اس طرح سے آئی ہے آج میرے سانس بھرے دل میں
کہ اجڑی سرا میں آ کر دیا مسافر جلا رہا ہو!!

قربان یہ دل کی آگ اس کے، تم ہی نے جگائے بھاگ اسکے

آنکھوں میں تمہارے آنسو تھے آنچل میں تمہارے موتی ہے
تو اور تیری چنچل سکھیاں جب پانی بھرنے جاتی ہیں۔
تب سائے دھانی ہوتے ہیں تب دھوپ گلابی ہوتی ہے

ادا و ناز و حیا و شوخی بہت سی ہیں حسن کی زبانیں
مگر وہی بات معتبر ہے جو آنسوؤں کی کہی ہوئی ہے

پڑا تھا سونا سا دل کا ہوئی اچانک یہ جاگ تم سے
جو زندگی روگ بن چکی تھی وہ زندگی آج راگ تم سے
اٹھا کے شعلے ہمارے دل میں الاؤ سے دور جب کھڑی ہو
نہ ڈالا جاتا ہے تم سے پانی نہ تاپی جاتی ہے آگ تم سے

بن جاتی ہیں دنیا کے لئے گیت سہانا
اس دل کی صدائیں جو کسی کو پکارے
اشکوں سے میرے بھیگ چلا رات کا آنچل
آ چاند میرے ڈوبتے جاتے ہیں ستارے

اس دور میں جمیل نے خواب سیمیں دیکھے ہیں۔
بتوں کی کہانی اور چڑیوں کے ترانے سنے ہیں مگر
خواب ہائے رنگین کی تعبیریں شاعرانہ ہیں اور پیش کش
صناعانہ۔ اس عہد عشق میں شاعر نے مقامی رنگ و آہنگ
میں بڑی لطافت و ندرت سے روح فن پھونکی ہے ۔

دو دل برگد کے سائے میں ایک پریم کا بندھن باندھے تھے
کچھ اپنی زباں میں کہتی تھی گمبھیر خموشی صحرا کی
مت تاکو ادھر سے جاؤ تو ابھی اس گھاٹ کو میں پہچانتا ہوں
پھونکی تھی وہیں تو ہم نے چتا اپنے مرحوم تمنا کی!

اندیشہ ہائے فردا شاعر کی زندگی میں
بادل کے چند ٹکڑے بکھرے ہیں چاندنی میں
کل رات نبض فطرت کچھ تیز چل رہی تھی
دو دل دھڑک رہے تھے جنگل کی خامشی میں
کوئی نہ ایک کوئل بولا، نہ اک پپیہا!
کوئی ہوا نہ ساتھی اولادِ حوا کا بے کسی میں
کچھ ڈھیر راکھ کے ہیں کچھ ادھ جلی سی لکڑی
آیا تھا ایک مسافر صحرا سے زندگی میں

جمیل جذباتی کبھی نہیں ہوتے جذباتی کیفیات سے سرشار ضرور ہوتے ہیں۔ شاعری جذبات کی شعلہ فشانی نہیں تحسین جذبات ہے۔ اور جمیل شاعر ہیں۔ آپ آتش نمرود نہیں گلزار ابراہیم ہے۔ جمیل نے ہر دور میں لالہ کاری و گل فشانی کی ہے

جمیل نے جدید ترقی پسند رجحانات کے ماتحت بھی غزلیں لکھی ہیں۔ مگر انہیں یہ احساس ہے کہ:

خلاف رسم تغزل غزل سرا ہوں میں۔

اس رنگ کی غزل میں عام طور پر شعریت نہیں ملتی ادبیت کے کچھ عنصر مل جاتے ہیں۔ ان میں جوش ملیح آبادی کے عزم کا بھی اثر پایا جاتا ہے ؎

سوچتا کیا ہے کدال اپنی اٹھا لے گورکن
میت تہذیب بار دوش امکاں کب تلک
کب تلک ہوگا بیاباں میں بگولوں کا یہ کھیل
پینگ لے گا وقت کے جھولے میں طوفاں کب تلک

یہ رباب وقت کی بگڑی ہوئی صدا چاہے نہ ہو پر لطف شاعری کی لذت تو ہرگز نہیں۔ صرف بلند الفاظ کے مجموعے کو شاعری نہیں کہتے۔ محض بلند آہنگ ترکیبوں کو شعریت کا

نام نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن آہنگِ نو کے باب میں کبھی کبھی شاعری کی بانسری بھی سنائی دیتی ہے ؎

تبسم جب کسی روح میں تحلیل ہوتا ہے
تو دل کی بانسری سے نت نئے نغمے نکلتے ہیں
محبت حسن کے دل کی دھڑکنوں کو تیز رکھتی ہے
وہ اکثر وقت کی رفتار سے آگے بھی چلتے ہیں
سبب تو طلب کی راہ میں اک ایسی ٹھوکر ہو
کہ جس سے زندگی کی ریت میں زم زم نکلتے ہیں

اب میں جمیل مظہری کی شاعرانہ پختگی اور صناعانہ انفرادیت کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے میں جمیل کے نظریۂ شاعری کو پیش کروں گا۔ ؎

جمیل کا سوزِ ناتمامی۔ لطیف جذبات کی تشنہ کامی!!
یہی تو وہ خونِ آرزو ہے جو رنگ بنتا ہے شاعری میں

شاعر ہمیشہ عالمِ مثال کی طرف سفر کرتا ہے۔ لیکن اس کے تصوراتِ حسین کی منزل کبھی نہیں ملتی۔ سوزِ ناتمامی کی آنچ اور خونِ آرزو کا رنگ حسن کاری فن کے عناصرِ ترکیبی ہیں آرٹ صرف زندگی کی عکاسی یا ترجمانی نہیں۔ فن تخلیق بھی ہے ؎

میری فنکاری نے خارِ حسن کی دنیا میں
اپنی بہاروں کو آشنا بنایا ہے

جمیل نے صرف اپنا نظریہ پیش نہیں کیا بلکہ اسے شعریت کی نزاکتوں اور لطافتوں سے آشنا بھی کر دیا ہے۔ "اپنی بہاروں" کی ترکیب کتنی نادر ہے۔ فن کار کے خواب ہی تو جہاں آفریں ہیں ؎

ہم وقت کے پیچھے تھے مگر خواب ہمارا
آگے ہی رہا تا نہ شام و سحر سے

جمیل اکثر و بیشتر عریاں خیالات کو لباسِ حریر و خلعتِ زر

کار فرما کہتے ہیں ؎

حقیقتیں بنائی ہوں تو جمیل سے مانگو!
اک لطیف فکر انگیز اک حسین خواب ان کا

کہتے ہیں ؎

شاعری نام ہے پروازِ تخیل کا جمیل

اور ؎

یہ میرا فن زندگی کے صحرا میں وہ درختوں کا سلسلہ ہے!
یہ جو لو کے جھلسے ہوئے مسافر کو دور ہی سے بلا رہا ہو
میں ہوں وہ سایہ کہ اس اجالے میں جس کی کوئی جگہ نہیں ہے
میں ہوں وہ سایہ جو اپنے آپ کو جھاڑیوں میں چھپا رہا ہو

جمیل کو خود احساس ہے کہ ان کا آرٹ نازک لطیف میں اما سکون بخش ہے۔ مگر اس میں سوز و گداز کی دھیمی آنچ اور میٹھے میٹھے درد کی نرم ٹیس بھی ہے کہتے ہیں اور کیسے سبک سہل، لطف اور کومل انداز میں کہتے ہیں ؎

جاگ اٹھتی ہے راگنی دل میں۔ سوتے ہیں بھاگ
ٹوٹی آس کے اس جھوٹے سپنے بن جاتے ہیں اگ
پیت کو اپنے گیت بنانا اس دنیا کی ریت

جمیل نے کیسے نادر طریقوں اور ترکیبوں سے شاعری کے استعارے پیش کیے ہیں ؎

سن میرے دل کی دھڑکنیں میری خودی کی رازداں
میرا مذاقِ شاعری ہے میری روح کی فغاں
وام تخیلات ہے طائرِ عرش پر فشاں

جمیل غزل کے آرٹ کی کتنی صحیح جاندار اور حسین تعریف کرتے ہیں ؎

جمیل اپنی سخنوری بھی فسوں گری ہے مصوری
بنا کے تصویر بہتے ہیوں کی رنگ بھرتا ہوں آرزو

اور ؎

نگاہِ شوق افسوں مانگتی ہے تیری آنکھوں سے
کہ افسانہ محبت کا ابھی مشکل سے کہنا ہے

جمیل اپنی غزل دل کی زباں میں ہو تو بہتر ہے
کہ دل کا راز ہے اور صاحبانِ دل سے کہنا ہے

جمیل واقعی "خالقِ دلبری" ہے "ادا نگارِ حسن" ہے۔ اور اس نے "زلفِ درازِ خم بر خم" سے "شوخی انتشار" اور "چشمِ محبوب" سے "نگہ ناز کی زبان" سیکھی ہے یہی اس کا عالمِ صناعت ہے۔ ؎

مظہری مظہری، خالقِ دلبری، تیری افسوں گری، جادوئے ساحری عاشقانہ بھی ہے، عارفانہ بھی ہے، تیرا رنگِ غزل، تیری ادا

فنکار اپنے فن کی تجلیوں سے خود سرشارِ نغمہ بار و رقص کناں ہے۔ ذرا ترنم کیف و آہنگ جمیل اوزان کے دھبر، الفاظ و تراکیب کے رقص اور اثر کی سرمستی کا لطف اٹھائیے۔

جمیل ایک مثال پرست رومانی شاعر ہیں ان کی غزل کی اڑان بہت دور تک پہونچی ہے ؎

کاش ان ماہ وش حسینوں میں
آنکھ جو ڈھونڈتی ہے پا جائے

شاعر اپنے آدرش اپنے آئیڈیل کو یوں بیان کرتا ہے ؎

میں وہ پروانۂ نادان ہوں ارمانوں کی دنیا میں
کہ جس نے لو لگائی ہو چراغِ ماہِ کامل سے

جمیل کی شاعری کا عروج صوفیانہ اور ائیت سے ہمکنار ہے۔ شاعر کا ایک مخصوص عالمِ تخیل و تصور ہے۔ اس کی ایمائی فضا ہے۔ اس کے تجربات انوکھے ہیں۔ اور ان کے پیش کرنے کے طور طریقے بھی منفرد۔ جمیل کے واردات بہت ہی نازک لطیف اور پروانہ کی طرح مرتعش ہے ان میں شمع کی لو کی مانند ہلکی تھرتھراہٹ اور احساس کی ضیا کی سی نرم تابانی ہے اس کے جذبی و تخیلی علامات میں نکہتِ گل کا کیف اور برگِ لالہ کی خوں فشانی ہے۔ وہ خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر مصوری کرتے ہیں۔ وہ پجاری بھی ہیں اور صنم ساز بھی۔ ان کی غزلوں کی نغمگی میں کوئل کی کوک، پپیہا کی کوک اور بلبل کی گداز غنائیت ہے۔ جمیل کے اظہار کا لب و لہجہ شگفتہ، متوازن، متین اور صوتیت سے لبریز ہے۔ وہ اپنے نادر تخیلات، سرشار جذبات، اور پُرکیف واردات کی ترجمانی کے لئے تشبیہ و استعارات، طرز و محاکات، مصوری، بت گری، نغمگی اور لب و لہجہ کی ایمائیت و اشاریت کو ساحرانہ طور پر بروئے کار لاتے ہیں۔ یہ سب حسن کی جھلکیاں ہیں۔ نہ جانے ذہنِ مظہری میں کیسے کیسے عالمِ معنی و کیف رقص کرتے ہوں گے۔ ہم تک ہر کیف ایک علامت ہے۔ ایک اشارہ ہے۔ لیکن اظہار و بیان کے ان ادھورے اشاروں اور مبہم کنایوں کے ذریعہ ہی ہم فن کار کے عالمِ معنی و حال تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ حسین، دلچسپ، پُرتاثیر، بلیغ و دلکش، فکر انگیز و دل نشیں علامتیں یہ راز افشا کرتی ہیں کہ دیوارِ گلستاں کے اندر بہاریں ہجوم رہتی ہیں۔ شاعری کے رموز بہت گہرے ہوتے ہیں۔ اور ان کے اظہارات نقش بر دیوار۔ لیکن یہ نقوش نہایت اہم ہیں۔ اگر ان سے ہمارے احساسات جذبات و تخیلات کا سنجوگ ہو جائے تو طلسمِ فن کھل جاتا ہے۔ اور قصرِ شاعری کے نہاں خانوں تک باریابی ہو جاتی ہے۔ صناعی کی کامرانی اسی بات پر منحصر ہے کہ تخلیقی حاملِ تجربات و واردات کی ہمہ گیری پُرتاثیر فنی علامتوں اور اظہار کے واسطوں کی مدد سے بہتر سے بہتر طور پر ممکن ہو جائے۔

آئیے جمیل کے عالمِ شعر میں باریابی کے لئے پہلے ہم اس کی فن کارانہ شخصیت و انفرادیت سے آشنا ہوں ؎

دیکھنے والوں نے سمجھا مری منزل اس کو
میں جہاں بیٹھ گیا حسرت منزل لے کر

نالہ جز موسیقیٔ طبع خداداد نہیں
یہ ایک افتاد طبیعت ہے تری یاد نہیں

دیکھیں ارباب نظر ملنگ میں ان کی موتی
ہم تو پلکوں پہ جو چمکے وہ گہر دیکھتے ہیں

پڑھو کتاب وفا ہے جمیل کا چہرہ
بنا لیا ہے محبت نے ترجماں اس کو!

مرے شعلوں کو ایک بجلی تک کے کینکر نہ حیرت سے
وہ خرمن ہوں جو جل اٹھا ہے آپ اپنی حرارت سے
جنوں ایک شغل ہے بجز جلی ہوئی تخئیل رنگیں کی
کھلا یہ راز مجھ پر اپنے عنوان طبیعت سے

جرس ہوں میں مرا نالہ مری طبیعت ہے
یہ کیوں کہوں کہ کسی کو پکارتا ہوں میں!

کچھ ایسا بڑا جمیل کا دل کہ ہر طرف اک مقام ہو کے
بتوں کا کیا تذکرہ ہے خدا کا بھی اب گذر نہیں ہے

اے موسم گل تجھ سے ہم سادہ مزاجوں نے
گل پیرہنی مانگی ۔ خوشی کتنی پائی

جس طرف دیکھیے ایک ہے سواد تشکیک

مظہری محفل کی آنکھوں میں ہے دنیا تاریک
روشنی دل کی بہت کم ہے خدا خیر کرے

جمیل مثالیت پرست ہیں۔ اور ہمیشہ ناآسودہ حسرت منزل اور ذوق و نظر کا سفر مدام ان کی رفعت کا باعث ہے۔ ان کی افتاد طبع میں نالہ فرسائی ہے۔ ان کی محبت ناک فطرت انہیں عشق کی رسمیت سے پرے لیجاتی ہے۔ ان کا شوق نا تمام انہیں محروم ابدی بنا تا ہے۔ ان کا وجود سراسر محبت ہے۔ لیکن ان کی محبت کے تقاضے لامتناہی ہیں۔ اور وہ "پرستار تجلی" نہیں "خریدار بصیرت" ہیں وہ اپنی سادہ مزاجی میں موسم گل سے آرزوئے گل پیراہنی کرتے ہیں۔ اور خوشی کتنی پاتے ہیں۔ جمیل بہت بھولے ہیں۔ وہ جنوں اور فطرت حسن کی قتالگی کو دیر میں سمجھ۔ ان کا دل اجڑ کر رہ گیا۔ وہ حیات و کائنات کے خیر و شر کے متعلق متشکک ہیں۔ اور ان کی تمنائیں دل کی روشنی کی تلاش میں جلتی رہتی ہیں۔ جب چراغ آرزو سے اپنا دامن آپ جل جائے۔ اپنا آشیاں آپ پھونک جائے تو پھر برق تجلی کی ستم کیشیوں کی کیا حاجت۔ جمیل تخیل پرست اور ارمان پرور ہیں۔ ان کا حصہ سوز ازلی اور درد لا دوا ہے۔ شاعر کا مزاج بتدریج بنتا رہا ہے۔ اور اس کے نظریئے اس کی واردات و محسوسات کے پروردہ ہیں۔ ملاحظہ ہو سے

دل مایوس پہ تسکین کا عالم ہے آج
جس سے بنتا ہے بتدریج محبت کا مزاج
وہ خلش رات سے کچھ کم ہے خدا خیر کرے
یہ سحر ہی فطرت کے بھونہ سکیں ان کو
آج ان کی مجلس رنگین جھومتا نہ کہیں انکو

یہ سہل نہیں ہیں یہ سے انکا رہے میں انکار ہے
دل کے لئے کرنوں کا اک جال بچھاتے ہیں
بس دور سے جلوؤں کی خیرات لٹاتے ہیں
کب گود میں آتے ہیں یہ چاند ہوں یا تارے

اب ہم جمیل کی کائنات شاعری میں بار پانے کی سعی کرتے ہیں۔ شاعری کی رفعت ایک نوع کی معراج روحانی ہے۔ شاعر اپنے روحانی سفر کا حال ناقدانہ اور صناعانہ رنگ میں بیان کرتا ہے۔ صناعت و شعریت کا عالم پر کیف دیکھئے۔ فضا تغزل کی ہے۔ لیکن تسلسل خیال اس شکست کو نظم مربوط کا آہنگ عطا کرتا ہے ؎

سن میرے دل کی دھڑکنیں میری خودی کے اضطراب
میرا مذاق شاعری ہے میری روح کی فغاں
دام تخیلات میں طائر عرش پر فشاں
میرا فروغ بے محل میرا گداز بے طلب
پوچھ نہ میری زندگی جیسے ہو ماہ نصف شب
مسجد و دیر کا چراغ حاصل سوز رائیگاں
اس کا جواب ایک ہے اس کا سوال ایک ہے
جلوہ ہو یا نگاہ ہو دونوں کا حال ایک ہے
یہ بھی حجاب درمیاں وہ بھی حجاب درمیاں
عشق نے کچھ کیا نہیں حسن نے کچھ دیا نہیں،
یعنی مزاج دہر نے کوئی اثر لیا نہیں
تیرا فسوں بھی رائیگاں میرا جنوں بھی رائیگاں

فغان روح اور عرش تک پر فشانی کی آرزو کے لئے کوئی سہارا نہیں۔ کوئی تسلی نہیں۔ حاصل جنوں، سوز رائیگاں اور حجاب درمیاں۔ مگر اس کے باوجود ؎

کم نہ ہوا کسی طرح نشہ جاوداں مرا
آتش و آب خاک و باد لے چکے امتحاں مرا
تھک گئی گردش نجوم، تھک گیا دور آسماں

آزمائش مسلسل کے باوجود نامرادی پیہم کے باوصف شاعر کا نشہ جاوداں نہیں اترا۔ اس جہان میں صرف شعور نارسائی کو پختگی حاصل ہوئی ہے ؎

سن ابھی نالۂ جرس، نغمۂ ساربان ہے دور
عالم تو منتظر جس کا وہ کارواں ہے دور
سامنے دیکھتا ہے جو پردہ غبار کارواں

شاعر نے کتنی قیمتی خیالات کو روح شعریت اور حسن صحت بخشی ہے۔ جمیل کی عمر بھر کی بصیرت کا حاصل دیکھئے ۱۹۴۲ء تا ۱۹۵۹ء شاعر کا نظریہ زندگی اور سلیقۂ حسن کاری اپنے کمال کو پہونچے ہیں ؎

پردا بھی کیا جلوہ بھی کیا، جلوہ بھی کیا پردا بھی کیا!!
آنکھوں سے گواہی عشق کی لی اور لیکے انہیں جھوٹا بھی کیا
اک کھیل رچایا جلوؤں کا رسوا بھی کئے رسوا بھی کیا

محاکات، تصویریت، پیکر تراشی، معنی آفرینی، لفظی اور اثر خیزی کی نادر مثال بھی دیکھتے چلئے اور رنگ جمیل میں نادر فن کاری کے ایسے نمونے اور بھی لیجئے گویا مصوری کے نمونے!

ہم خالی کٹورا دل کا لے آئے جو ترے میخانے میں
ساقی نے انڈیل کر ڈی سی ایک چیز ترے پیمانے میں
اور اپنا تبسم گھول کے پھر اس زہر کو میٹھا بھی کیا

مکتب دہر سے شاعر نے یہ سبق لیا ہے ؎
وہ رنگ بنے یا سنگ بنے معنی کی حقیقت کیا ہے کیا
اک ذوق نظر کی خوشی نہیں لے حسن ترا بنیاد کیا

جمیل کی بالیدہ فکری وحسی انفرادیت ہیں کی منزل حواس سے آگے بڑھ گئی ہے۔ اب جمیل کے لئے ایک

حسین شے مسرت جاوداں کا باعث نہیں۔ جمیل ایک صوفی کی طرح مگر شاعرانہ پکار اٹھتا ہے ؎

شانے نے جگر بھی چاک کیا زلفوں میں الجھ کر رہ بھی گیا
کنگھے کی قسمت کیا کہیے کچھ چپ بھی رہا کچھ کہہ بھی دیا
گویائی کی دولت جو ملی، بینائی نے کو تکا بھی کیا

کیسے تخلیقی استعاروں کے ذریعہ جمیل اپنے عالم حیرت اور نیرنگ حسن کی تجلیوں کی آئینہ سامانی کرتے ہیں۔ یہ پوری مثنوی شہکار جمیل ہے۔

مظہری کی شاعری میں ہمیں نفسیات حسن و عشق سے بڑی آگاہی حاصل ہوتی ہے کہتے ہیں ؎

عشق کی اصطلاح میں نام ہے اس ادا کا کیا
جو کہ لبوں پہ روک دے خندۂ بے قرار کو

غصے کو بنائے ہیں متانت
شوخی کو حیا بنانے والے

جمیل بری خموشی جو ناگوار ہوئی!
تو خود بہ خود متوجہ نگاہ یار ہوئی!

حیا کیز ہو جس کی وہ منفعل پندار
بہانہ جو ہو تو پھر اس ادا کو کیا کہیے

سکون کیا اضطراب شوق کی ہنگامہ آرائی
وہ حاصل ہو تو کاوش درد یا مستی درماں

حسن اور عشق کی آشفتہ مزاجی کا لحاظ
زلف شانوں پہ بکھرتی ہے بکھرنے دیجے

تبسم جب کسی کا روح میں تحلیل ہوتا ہے
تو دل کی بانسری سے نت نئے نغمے نکلتے ہیں

کیوں ہم سے خفا ہو ناز ان کا آنکھوں نے کہا کب ہنسنا تھا
خود جلوے تھے بیتاب اُنکے خود پردہ تھا غماز ان کا

ہم نے تو نگاہیں بھی پھیریں ہم نے تو ذرا پردا بھی کیا
کہتے ہیں جسے سب ننگ و فا وہ رسم جمیل ایجاد بھی کی
شکوے بھی کئے فریاد بھی کی، تسکین دل ناشاد بھی کی
جب حسن نے چپ کی داد نہ دی تو عشق نے پھر نالہ بھی کیا

اس باب میں بھی شاعرانہ صناعت کی جلوہ گری ملتی ہے کہیں ترکیب کا حسن ہے، کہیں طنز کی لطافت، کہیں مصوری کا جمال، کہیں لب و لہجہ کی تاثیر آفرینی کا کمال کہیں محاکات کی خوبصورتی، کہیں پیکر تراشی کی سندرتا اور کہیں نغمگی کا سحر اور ان ہی تجلیات فن کے اندر حقائق کا پر اثر اظہار ہوا ہے۔ جمیل فلسفی نہیں شاعر ہیں ؎

تم سے عاشق کی خودی الگ رہی ہے تم کو
عشق کا حسن تقاضا ہے وفا کچھ بھی نہیں
اس تغافل پہ محبت کو ہنسی آتی ہے
ہے جفا نام اسی کا تو جفا کچھ بھی نہیں
حسن بیباک نگاہوں سے پریشان ہے جمیل
ایک سہمی ہوئی شوخی ہے حیا کچھ بھی نہیں

اس کی معصوم نگاہوں کی جفا کیا کہیں!
ہے سو بھی ہوں جو بسمل تو وہ جلاد نہیں
وہ تغافل کہ جو ہو ضبط محبت کی دلیل
دل عاشق کے لیے داد ہے بیداد نہیں
شوق کا حد سے گزرنا بھی ہے احساس کی موت
اب تو یہ حال کسی کا ہے کہ تم یاد نہیں

نہ رہی قید تعلق، مگر اے قید وفا!
اس نے آزاد کیا اور میں آزاد نہیں

جمیل کی روداد محبت کا بہت بڑا حصہ ذاتی تجربہ پر مبنی ہے۔ یہیں اخلاص تازہ کاری، اور تازہ خیالی پیدا ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو ؂

ہو چلی صبح اے خدا اور مرا دل بجھا نہیں
مجھ کو جلا رہا ہے کیوں ہیں تو کوئی دیا نہیں
شمع جلے تو اس کے پاس آئیں پتنگے دوڑ کے
کب سے سلگ رہا ہوں میں اور کوئی پوچھتا نہیں

کچھ ایسا رنگ مری زندگی نے پکڑا تھا
کہ ابتدا ہی سے ترکیب تھی فسانے کی

درد جمیل اس دنیا میں شاعر کا سرمایہ ہے
شاعر اس کو کہتے ہیں جو اپنی بیتی گاتا ہو

جمیل راد ھا کی (اکھڑ) لوید نے جو رس پلایا تھا زندگی کو
وہ کیوں نہ غزلوں میں میری چھلکے پیالہ دل کا بھرا ہوا ہے

محبت عرفانی کے عالم قدس میں بھی جمیل کے جذبات بلا شرکت غیرے ہیں۔ اس عالم میں بھی شاعر نجی واردات محسوسات دو فنکار کو فن کا یادانہ طور پر پیش کرتا ہے ؂

کچھ بھی نہ ملا ہاتھ کو کشکول بنا کے!
یہ دست دعا کا سہ خالی ہے خودی کا
جلوے ترے لیسیل مری افسوں نظری سے

افسوں تھا قائل مری انصاف نہ کر کی تھا
رہ رہ کے جو بھر آتی ہے، اس آنکھ سے پانی
بھرتے نہیں دیکھا کبھی پیمانہ کسی کا

حقیقتوں کی نمائش کا یہ اصول غلط
نہ یہ ظہور ہے تیرا، نہ یہ ظہور مرا
کیا نہ اس نے خرابیوں میں مرا شمار
مگر غرور سے آلودہ تھا سرور مرا
تو اس فضا میں جہاں ہو رہی ہے دے آواز
پکارتا ہے تجھے قلب ناصبور مرا
میں سن رہا ہوں ترے دل کی دھڑکنیں پیہم
ہے تیرا دل متلاشی کہیں ضرور مرا
یہ زندگی کی مصیبت، یہ آگہی کا عذاب
یہ خواہشوں کا ستایا ہوا غرور مرا
یہ آب گل کے تقاضے یہ رنگ و بو کے فریب
یہ اک ملیح کا ترسا ہوا شعور مرا
مدد کا وقت ہے آ، بن کے آ نجات مری
تجھے وفا کی قسم بخش دے قصور مرا

کون فریب کھائے اب فتنۂ رنگ و آب کا
مل گئی تشنگی کو آنکھ، سمجھ گیا دل سراب کا
تیری عطا کے تلخ نوش، پی کے بنا رہے ہیں منھ
گھول دے اک ذرا سا رنگ نرگس نیم خواب کا
حسن کہاں کہاں نہ تھا، ہم نظر جھکی رہی
آنکھ مل سکا جمیل سے ناز ترے حجاب کا

کسی کا خون سہی ایک کھار دے تو دیا

خزاں کو تم نے لباسِ بہار دے تو دیا
مرے شعور کو کلیاں اب اور کیا دیتیں
تصورِ لبِ رنگین یار دے تو دیا
بہار آئے نہ آئے مگر لہو نے مرے
چمن کے خواب کو اک اعتبار دے تو دیا
قرار مانگ رہے تھے قرار دے تو دیا

دستِ دعا گدا کا کشکول ہے اور خودی کا کاسہ خالی۔ تشبیہ کے ساتھ درد و گداز، تخیل و معنویت کا کیف و اثر ملاحظہ ہو۔ دعائے نارسا سے کیسی رسوائی خود میں ہوتی ہے۔ محرومی نے رسوائی کو اور زہریلا بنا دیا۔ اس غزل کی سلیس، نرم شیریں زبان کے بدن میں تازگی تجربے گھلے ہوئے ہیں طرزِ درد و گداز، لب و لہجہ تخیل سب اختراعی ہیں۔ دوسری غزل بھی تخلیقی وارداتی ہے ایک ایک لفظ میں تجربے کی بجلی کوندتی ہے۔ ہر ہر مصرع دلِ ناصبور کی طرح دھڑک رہا ہے۔ پر اثر محاکات کی ساحری اور معنویت کے معجزات توجہ کش ہیں۔ والہانہ شگفتگی غزل کی رگ رگ کو شیریں کسک بخشتی ہے۔ سرور آلودہ غرور ہو کر عصمتِ آرزو و پاکیزگیِ عشق کو داغدار بناتا ہے۔ کیف و محبت کو بھی معصوم ہونا چاہیئے تاکہ کا عذاب خواہشوں کا ستایا ہوا غرور، اور ایک عمر کا ترسا ہوا شعور، کی ترکیبیں گہرے احساسات اور تہ دار جذبات کی نازک ہم آہنگی اتفاقی ہیں۔

تیسری اور چوتھی غزل بھی سحرِ حلال ہے۔ تشنگی کی آنکھ اور سراب کا دل کیسے کیسے نادر تخلیقی ٹکڑے ہیں۔ پورا شعر معجزۂ تخیل و معنی ہے۔ تصویر زندہ پیکر کی طرح اور رنگین تاثیر ملاحظہ ہو سے

تیری عطا کے تلخ نوش پی کے بنا رہے ہیں لمحہ
گھول دے وا لئے ....

صرف طنز و مزاح فن نہیں بلکہ انہیں نئی روح عطا کرنا فن کاری ہے۔ اور روح جتنی لطیف ہوگی جمالی تاثیر اتنا ہی زیادہ عمیق و پائندہ ہوگی۔ چوتھی غزل میں طنزِ لطیف کے ذریعہ خلاقی اثر دیکھیے ”تصورِ لبِ رنگین یار“ کی حسرت سامانیاں اور ”قرار دے تو دیا“ کی قاتل الم ناکیاں نوعِ انسان کے ازلی و ابدی المیہ پر کیسا فن کارانہ تبصرہ ہیں۔ ایک اور نازک ترحم خیز المیہ دیکھیے۔ آپ بیتی کو شاعرانہ جگ بیتی بنا دیا ہے۔ اور اپنا درد بانٹتا ہے۔ یا پھر سارے زمانے کا درد اپنے دل میں سمیٹ لیا ہے سے

ہم نے اک ناؤ جو چھوڑی بھی تو ڈوبتے ڈوبتے
اس پہ چلیں یہ جبیں ہو گیا دریا تیرا

جمیل کی شاعری احساسات کی نزاکت، جذبات کی لطافت و ندرت، خیالات کی جدت و نفاست، تازہ کار و فکر انگیز معنویت، اسلوب کی برق تابی، طرز کی سلامت و لچک، زبان کی فصاحت، لب و لہجہ کی نرمی، اور رسیلے پن، ترنم کی پر کیف فضا، تشبیہات و استعارات کی جاندار صناعت کی دوسری اداؤں اور تماشوں کے اختراعی استعمال، الفاظ کی مصوری و پیکر تراشی، اور نفیس و نادر تنظیم و تہذیب تجربہ کی جہتوں سے رفتہ رفتہ نہایت صناعانہ کمال کو پہونچی ہے۔ جمیل نے احساسات کے نئے پہلو، جذبات کی نئی آنچ، مشاہدات کے نئے زاویئے واردات کے تازہ گوشے، تخیلات کی نئی اڑان، سوز و گداز کے نئے دھارے، تصورات کے جدید صنم کدے افکار کی نئی سمتیں اور وسعتیں، غور کی ان دیکھی گہرائیاں

نظر کی اچھوتی بلندیاں، اور تخلیق کے البیلے امکانات پیش کئے ہیں۔ ان کے لب و لہجہ کی نرمی اور پیش کش کی جمالیاتی خوش اسلوبی سے کلام کی قوت نفوذ اور بڑھ جاتی ہے۔ ان کے بعض اشعار نہایت کنٹیلے ہوتے ہیں۔ وہ گمبھیر گھاؤ کرتے ہیں۔ ان کی تاثیر روح میں سرایت کر جاتی ہے۔ جمیل کے فن میں بیان کے نرالے تیور، طرز کی بانک پن آدائیں، آہنگ کی نئی اور رسیلی لرزشیں، ترنم کی پر کیف لچک، اور تاثرات کی اجالی فضا ملتی ہیں۔ وہ اپنی صناعی سے غیر مرئی عالم کو مرئی بنا دیتے ہیں۔ معنی کو صورت عطا کرتے ہیں اور واردات کی عجوبہ لہروں کو فن کی شیشہ گری سے مسحور و رنگین ارتعاشات میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ان کی شاعری، فطرت انسانی، اور فطرت خداوندی پر شاعرانہ تبصرہ بھی ہے۔ استعارہ و تمثیل کے علاوہ طنز و تیور بھی ان کے فن کے ساز و برگ ہیں۔ لیکن وہ کڑوے انتقاد اور تیکھے طنز کو گھلاوٹ اور سجاوٹ سے شیریں و رنگین بنا دیتے ہیں۔ یہ ساری خصوصیات ترکیب پا کر جمیل مظہری کی شاعرانہ انفرادیت بنتی ہیں، لیکن فنکار کو اپنا بلند مقام بہت سی لغزش و افتاد کے بعد حاصل ہوا ہے۔ مزید ثبوت کے طور پر ہم چند اشعار پیش کرتا ہوں

۵ تصور اس ابروئے حسین کا دماغ میں اس طرح بسا تھا
کہ میری حیرت نے لاشعور میں بھی ایک ہلکا سا خم بنایا

نہ جانے اس شعر کے امکانات معنی کہاں کہاں پہنچے ہیں۔

سحر ہے! شوق نے سنجھا لی گردن کو یہ خم
تیری نظروں کو چھری دی تجھے جلاد کیا

اپنی زنجیروں کا تحفہ لے آتی ہے خرد
ہو نہ مغرور اگر عشق نے آزاد کیا

ایسے عالم میں کہ جب محفل کا مہماں تھا بنو
زلف کی چھاؤں میں سو یا کیا سودا تیرا

بس ایک احساس نارسائی، نہ جوش اتنے نہ ہوش اتنا
جنوں پہ حالت بلوغ کی، خرد پہ عالم غنودگی کا
وہ لاکھ جھکوا لے سر کو تیرے مگر دل اب یہ نہیں جھکے گا
کہ کبریائی سے بھی زیادہ مزاج نازک ہے بندگی کا

کرن آفتاب کی دشت و در پہ تپش چھڑک کے چلی گئی
مگر ایک ذرہ منفعل جو بچا رہا سو بچا رہا

کیا ہو اب عشق سے جذبات فسردہ کا علاج
حسن جلووں کو یہ معیار نظر دے نہ سکا

حقیقتوں نے اوڑھ لی ہے جب نقاب رنگ و بو
تو احترام فرض ہے ہر آنکھ پر نقاب کا

ہے تیرے صحرائے آفرینش میں کوئی جائے پناہ ایسی
لگائے بستر جہاں مسافر، لٹا ہوا شہر آرزو کا

اتنی تعجیل ہے کیوں ناز مسیحائی کو!؟
ابھی کچھ درد میں لذت ہے دوا مت دینا

اناالحق یہ تبسم!!
ہونٹوں پہ جنازہ ہے ہنسی کا

خزاں ایک کنایہ بہار اک اشارہ
یہ سارا نظارا اک تبسم تمہارا
اٹھایا جو لفظ و معانی کا پردا
محبت بھی تھی ایک حسیں استعارا

محبت میں آئی اک ایسی بھی منزل
کہ ڈھونڈا جنوں نے خرد کا سہارا

میں چلتا رہا مظہری اپنی دھن میں
بتوں نے بلایا، خدا نے پکارا

حجاب خودنمائی شوخی تفصیل تو دیکھی
غرور منفعل کا خندۂ ابہام کیا ہوگا
لب خاموش کو جو جرأت عرض تمنا دے
جمیل اس ناز کا تیری لغت میں نام کیا ہوگا

اپنے بکھرے ہوئے جلوؤں کی قسم ہے تجھکو
رحم کر میری پریشاں نظری پر اے دوست

میں نے ظلمت کو بھی سمجھا ترے چہرے کی نقاب
ایک تبسم میری اس خوش نظری پر اے دوست

ہے غلط یہ نوحہ گری دل نوحہ گری سے خفا نہ ہوا
جو پسند ہو وہی دھن بجا، تجھے اختیار ہے ساز پر
میں ادھر ادھر جو بڑھا رہا ہوں ہوس کے دست دراز کو
مری زندگی کا یہ طنز ہے تیری شان بندہ نواز پر

نظر کو کیا ہوا جو مسکرائی اس کے جلوے پر
جبیں کا حال کیا ہوگا شکن ہے جگر پردے پر

یہ قبائے کہنہ اتار دو نہ سبک ہو چشم نیاز میں
کہ جگہ جگہ سے ہے کہنگی کا اثر لباس مجاز میں
یہ خودی کہ عارض مہوشاں میں بھی الجھ الجھ کے بگڑ گیا
مرا آئینہ کے رچا ہوا تھا مذاق آئینہ ساز میں

وہ بھی ہے دست ہوس دست دعا جسکو کہیں
انفعال اپنی خودی کا ہے خدا جس کو کہیں
بے حجابی میں بھی چہرے سے اٹھاتے نہیں آپ
وہ نقاب رخ زیبا کو حیا جس کو کہیں

وہ ہیں امیر نظام جہاں بناتے ہیں
میں فقیر مزاج جہاں بدلتا ہوں

وہ جگر کو زخم نہ دے سکے، مری جبیں پہ داغ نہ دے سکا
وہ نگاہ ناز اٹھی نہیں، یہ سر نیاز جھکا نہیں

اضطراب خودنمائی کو حیا سمجھا تھا میں
وہ نگاہ ناز کیا کہتی تھی کیا سمجھا تھا میں

چھپی نہ جب خاک آستاں سے چھپے گی کیا چشم نکتہ داں سے
وہ اک ذرا سی شکن جو ابھری جبیں مجبور بندگی میں
ادھر اندھیرے کی لغزشیں ہیں ادھر اجالے کی رنجشیں ہیں
تیرے مسافر لگائیں بستر کہاں یہ صحرائے زندگی میں

تمہاری اک نظر میں ہزار معذرتیں
یہ کہہ رہی ہیں کہ اب تابِ بے رخی نہ رہی
ایک اضطراب کو شوخی سمجھنے والی آنکھ
اداشناسِ حجاباتِ دلبری نہ رہی

اک شعلگی کی روح میں تازندگی رہی
وہ بھی مگر مزاجِ محبت نہ ہو سکی

مرے دل تلک نہ پہونچے تری چشمِ سرمہ سا سے
وہ کنایہ ہائے نازک جو لچک گئے حیا سے
کبھی وہ بھی زندگی تھی کہ خدا تجلی تھا جو
کبھی یہ بھی زندگی ہے کہ تجلی ہوں میں خدا سے

کسی دن آئے غرورِ عشق عرضِ مدعا کر دے
مزاجِ حسن کو تھوڑی سی بیچینی عطا کر دے
تمہاری کم نگاہی کے سوا کس میں یہ قدرت ہے
ہوس کو تربیت دے، تربیت دیکر وفا کر دے

ادائے جلوہ گری دروائے ظلمت و نور
کرشمہ سازئی اسلوب و زبان پہ سبھی!
گئے وقت اک نگاہ کہ کب سے کھڑے ہیں ہم
کسی کو سینہ فگاری، کسی کو غنچہ لبی!

اس شام سے ڈرو جو ستاروں کی چھاؤں میں
آتی ہو اک حسین اندھیرا لئے ہوئے
گئے وقت اک نگاہ کہ کب سے کھڑے ہیں ہم
آئینۂ تصورِ فردا لئے ہوئے

ایک بات کہہ کے تیری نظر ہو گئی خفیف
جھٹلا دیا جو خندۂ بے اختیار نے
ہم نے بھری بہار میں مانگی تھی اک کلی
تنہا گم ... یہ جیب رہ رزگار نے
یہ ورودِ خزاں پہ خزاں کا اثر نہ پوچھ
جو زخمِ دل اگرچہ جھنجھوڑا بہار نے

گوشۂ چشم میں اک تابِ تغافل ہی سہی
کچھ سہارے تو ضروری ہیں محبت کیلئے
اس کے ہونٹوں پہ تبسم ہے نہ ابرو پہ شکن
جس کو مرنا ہے مرے اور جسے جینا ہو جئے

جمیل کے مندرجہ بالا اشعار کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاعرِ خیال، ہیں کیسے کیسے نادر و بیش قیمت خیالات کو تراشیدہ و تابناک اسلوب کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے اور ان تنویر و تجلی کا مصدر سوز و گداز دل ہے۔ اظہار و بیان کسی اس حسین و حیرت افزا قدرت کے باوجود فنکار کو عجزِ اظہار کا احساس ہے ؎

مجھے ڈر ہے اے سخن آفریں، یہ لباس ان پہ گراں نہ ہو
جو حقیقتیں نہیں سکیں وہ قبائے معنی و لفظ کیا

تاہم ہر سخن آفریں نت نئی قبائیں تراشتا رہتا ہے جمیل نے ہیئت سازی کے بکثرت تجربے کئے ہیں۔ غالباً مظہری نے بھی غزل کے مفرد اشعار کی تنگ دامانی محسوس کی۔ اور اس فشار کو دور کرنے کے لئے انہوں نے مسلسل غزلیں لکھیں۔ قطعہ بندیاں اور بالیدہ مثلث

باقی صفحہ ۱۰۹ پر

جمیل مظہری کی ہجو نگاری

رضا نقوی

شاید بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہو کہ جمیل مظہری کی زندگی میں ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ جب انہوں نے ہجونگاری کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ یہ سلسلہ ان کے چند صحافتی دوستوں کی بدولت شروع ہوا تھا۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک کا زمانہ جمیل مظہری کی صحافتی زندگی کا دور تھا کلکتہ میں ان کے بعض احباب نے فلمی رسالے نکالے اور فلمی صحافت کا ابتذال کی اس حد تک پہونچا! کہ مولانا شائق احمد عثمانی مولانا صدیق انصاری، اور اردو کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری کو ناگوار ہونے لگا۔ ان فلمی صحافیوں نے فن کی قدردانی کے سلسلے میں فلمی ایکٹرسوں کو خانم اور بیگم بنا ڈالا۔ کسی نے کسی کو سیدانی ثابت کرنا چاہا۔ تو کسی نے کسی کو جوش محبت میں اپنی بہن لکھ ڈالا۔ عام طور پر یہ فلمی صحافی ایکٹرسوں کے مستقل دربار دار ہو گئے۔ جمیل مظہری نے بعض دوستوں اور بزرگوں کے اشارے سے اس طرف توجہ کی اور ان کی طبیعت میں خود جو انقباض تھی وہ سب سے پہلے ایک قطعہ کی صورت میں برآمد ہوا یہی قطعہ جمیل مظہری کی ہجونگاری کی ابتدا ہے فرماتے ہیں ؂

کل مل گئے مجھ سے میرے ایک عزیز دوست
ہم مشرب و ہم عقیدہ بہ ایمان صابری
زیر بغل خطوط و تصاویر مہ رخاں
وردِ زباں حدیث سبیتا و مادھری
میں نے پس از سلام و پس از تہنیت کہا
افزوں ہے بعد آپ کی فلمی برادری
گونجی ہوئی ہے عشق کے نغموں سے کائنات
ہر نوجواں کا دل ہے کنہیا کا بانسری
لیکن معاف مجھے پوچھنا یہ ہے
کس روگ کی دوا ہے یہ فلمی ایڈیٹری
یہ اشتہائے نفس ہے یا تشنگی روح
یہ کاروبارِ عشق ہے یا جنگ زرگری
یہ خدمت وطن ہے کہ عیاشی خیال
یہ خواہش شہود ہے یا قوم پروری
میں نے تو یہ سنا ہے کہ ہے فیض عشق سے
یہ جذبۂ پرستش و ذوق ثنا گری
لیکن سوائے داغ جگر کچھ نہیں حصول
شیشے میں آج تک کوئی اتری نہیں پری
ایک شب کے واسطے بھی حریم وصال میں
حاصل ہوا نہ آپ کو اعزاز شوہری
آئینہ سامنے ہے ادھر دیکھئے ذرا
سجدوں کا داغ اور جبین ایڈیٹری!

اس کے بعد ان سوالوں کا جواب بھی فلمی ایڈیٹر
صاحب کی زبان سے ملاحظہ ہو

کہنے لگے بگڑ کے کہ حاسد ہیں آپ لوگ
پوچھا ہے صاف صاف تو سنئے کھری کھری
ہم ہیں مبصرِ در دندان و لعل لب
جوہر اگر ہے حسن تو ہم لوگ جوہری
ہم سامنے حسینوں کے رکھتے ہیں آئینہ
ہم مضمحل دلوں کو سکھاتے ہیں شاعری
ہم بیچتے ہیں شربتِ وصل و دوائے دل
ورنہ مرض سے عشق کے مشکل تھی جانبری
عزت ہماری دیکھئے بازارِ حسن میں
مس مہ جبیں بڑھاتی ہیں پالوں کی تشتری
کچن جواب دیتی ہے ہنس کر سلام کا
ہوتی ہے ملتفت نگہہ ناز اختری
یہ تشنگیٔ ذوقِ نظر کا ہے مسئلہ
سمجھیں گے آپ کیا عملی ہے یہ شاعری
اس نکتۂ لطیف کو غالبؔ سے پوچھئے
کرتے ہیں ہر رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے
عارفؔ ہمیشہ مست مئے ذات چاہیئے

اسی سلسلے کا ایک بڑا جو یہ کارنامہ مسدس شہر آشوب صحافت تھا۔ یہ مسدس مسدس حالی کی پیروڈی کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس پہ صحافت پر کی گئی گزری حالت پر خون کے آنسو کی جگہ ہنسی اور قہقہوں کی پھلجھڑیاں چھوڑی گئی ہیں۔ ابتدا کے چار بند ملاحظہ ہوں۔

یہ کل خواب میں ہم نے حالیؔ سے پوچھا
مرض قوم میں آج مہلک ہیں کیا کیا!

کہا یہ کہ مفلس کو بوسے کا لپکا۔
اور اس پہ ادادت کا سنگین سودا

فلاکت میں دردِ محبت غضب ہے
جہالت ۔۔۔ صحافت غضب ہے

یہی حال دنیا میں اس شخص کا ہے
جو زلفوں کی لہروں میں آکر پھنسا ہو
گماں ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے
ایڈیٹر ہے لیکن طفیلی بنا ہے
لگاتی ہے معشوقہ جوتی پہ جوتی،
مگر پھر بھی کھلتی نہیں آنکھ ان کی

فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
فلمچی سے پاؤں اپنے دبوا رہی ہے
حلیم نائیکاس سے بھروا رہی ہے
جیب و راست سے یہ صدا آرہی ہے
کہ نادار عاشق کا انجام دیکھو
ایڈیٹر کی درگت سرِ بام دیکھو

اس کے بعد اس دور کی صحافتی بدحالی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے کہ کیونکر ادبی رسائل فلمی رسالے بن گئے۔ اور معاملہ یہاں تک پہونچا کہ مشہور صحافتی ادیب خواجہ حسن نظامی نے ایکٹرلیسوں کے فلمی چہرے لکھے۔ اس موقعے کے چند بند بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں ؎

جو پنجاب میں کچھ رنگیلے جواں ہیں
صحافت میں مشہورِ ہندوستاں ہیں،
مگر رنڈیوں کے بڑے مدح خواں ہیں
مبصر ہیں، نقاد ہیں، نکتہ داں ہیں
صحافت نہ بھولے گی احسان ان کے
ٹپکتے ہیں کاغذ پہ ادمان ان کے

یہ سر پیچ نے اور فتنے جگائے
کہ فلمی ایڈیشن کے طوفان اٹھائے
صحافت کا جنازہ بھی نکالا
یہ نیرنگ والے نیا رنگ لائے
کہ علمی رسالے کو فلمی بنایا!
مقدر میں لکھا جو تھا کر دکھایا!

وہ دلی کے مشہور پیر نظامی
تصوف میں رشک ثنائی وجامی
ہے خواجہ حسن جن کا اسم گرامی
قلم ان کا دے رنڈیوں کو سلامی
لکھے فلمی چہرے ہوا اپنی کھودی
صحافت کی خواجہ نے لٹیا ڈبو دی

کسی بیوا کو تلم پہ سجایا !!!
کسی مال زادی کو بیگم بنایا
لقب دے کے بلبل کا اونچا اڑایا
اڑایا اڑا کر زمیں پہ گرایا!
جو دے تعدہ گن گاتے ہیں اس کا
نہ کس طرح کائیں کہ کھاتے ہیں اس کا

اب فلمی ایڈیٹروں کا طوائفوں سے کیا رشتہ ہے
یہ بھی ملاحظہ ہو سے

طوائف ہے بھاڑو تو بھترا ایڈیٹر!
طوائف کے سر کا سینچرا ایڈیٹر!
وہ ہے تانہ بل اور بندرا ایڈیٹر!
وہ فٹ بال ہے انفلیٹرا ایڈیٹر!
طوائف ہے گاڑی، ایڈیٹر ہے گھوڑا
سلامت یہ جوڑی مبارک یہ جوڑا

ان ایڈیٹروں کے روزانہ کے مشاغل کیا تھے
تاریخ اسے شاعر کی زبان سے یوں دہراتی ہے

یہ لوسوں کے سائل یہ جلوؤں کے بھوکے،
پھرا کرتے ہیں شام سے کوٹھے کوٹھے
طوائف کی جانب ہیں اس طرح تکتے
تکیں خوان نعمت کو جس طرح کتے
مگر ایک لقمہ بھی ملتا نہیں ہے
رئیسوں کا جوٹھا بھی ملتا نہیں ہے

فلمی رسائل کے ان ایڈیٹروں کا جو اس وقت حال تھا آج بھی ان حالات کے پیش نظر ہمارے فلمی صحافی [illegible] عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ فلمی رسائل کے افراد جاہل۔!!
جو ہیں لوح ہستی پہ اک حرف باطل۔!!
نہ انسان میں داخل نہ جانور میں شامل
نہ جورو کے لائق نہ دھوبی کے قابل
نہ جورو لکھی ہے نہ رنڈی لکھی ہے
مقدر میں بس ان کے جوتی لکھی ہے

نہ محفل میں تبلہ بجا سکتے ہیں یہ
نہ میلے میں بندر نچا سکتے ہیں یہ
نہ ہوٹل میں میجک دکھا سکتے ہیں یہ
فقط لات رنڈی کی کھا سکتے ہیں یہ
خدا جانے کس مرض کی یہ دوا ہیں
بظاہر یہ الو کی دم فاختہ ہیں

نہ کھیتوں میں یہ ہل چلانے کے قابل
نہ بازار میں بوجھ اٹھانے کے قابل
نہ چکی میں روٹی کمانے کے قابل
نہ سڑکوں پہ رکشہ چلانے کے قابل
نہ بھنگی کا پیشہ، نہ مہتر کا پیشہ

لیپندران کو آیا ایڈیٹر کا پیشہ

یہ کہتا تھا اک تاڑی خانے کا پاسی
کہ یہی صحافت ہے ام المعاصی
[illegible] جوتیاں سر پہ گن گن کے خاصی
پچاسی چھیاسی ستاسی اٹھاسی
رکے ہاتھ ہرگز نہ ننانوے تک
نہ پہچانتے یہ الف اور با تک

جہالت کے نشے سے مخمور ہیں یہ
شرافت کے سینے پہ ناسور ہیں یہ
طوائف کے دلال مشہور ہیں یہ
اٹھانے میں نازان کے مزدور ہیں یہ
غلاظت بھری ہے طبیعت میں انکی
پلیشن ہے گوبر کا طینت میں انکی

اس عہد کے فلمی صحافیوں میں بعض شاعر کے مخلص دوست بھی تھے۔ ان کو چڑھانے کی غرض سے معاملہ کچھ آگے بڑھا اور ان کی محبوباؤں کی تعریف میں قصیدے بھی لکھے گئے۔ مسدس کا نمونہ آپ نے دیکھ لیا اب قصیدہ کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو۔ ایک قصیدہ میں ایک ممدوحہ کا سراپا یوں نظم کیا گیا ہے:

وہ پاک و صاف و مطہر ہے آپ کا آنچل
کہ کل بنے گا شہیدان آرزو کا کفن
کچھ اس طرح ہے حیا کا خمیر فطرت میں
کہ مارے شرم کے ابھرا نہ آج تک جوبن
جلال حسن پہ ہے وہ کمال موسیقی
کہ رقص کرتی ہے ہر ادا پہ لیلیٰ فن
حریم ناز کی کھڑکی ہے طور کی چوٹی
ہے بازار کا فٹ پاتھ وادی ایمن

ہوا بتاتا ہے پنجابیوں کو غمزہ حسن
کنویں جھنکاتا ہے مارواڑیوں کو چاہ ذقن

قصیدہ کے آخر میں ممدوح کے لئے دعا اور اپنے لئے عرض حال ہوتی ہے۔ اس قصیدے میں بھی یہ التزام مخصوص پیرائے میں ملحوظ رکھا ہے۔ دیکھئے کیا دعا دی جا رہی ہے۔

خدا کرے کوئی راجہ ان کو لے بھاگے
بٹھا کے اپنے ہوائی جہاز پہ لندن

ختم قصیدے پر عرض حال ملاحظہ ہو:

ہے اب ختم قصیدہ یہ التجائے نیاز
کسی دن آئے جھروکے پہ دیجئے درشن
ہمارا چاک جگر بھی رفو کا ہے محتاج
نگاہ آپ کی بخیہ گری ہے سوزن
یہ مانتا ہوں کہ مفلس کو حق عشق نہیں
لٹا رہا ہوں مگر لعل بے بہائے سخن
سوائے نقد دل اور سکہ ہائے داغ جگر
ہماری جیب میں کوڑی نہیں برائے کفن

دلے اگر تو چہ آوری دل ما را،
بہ چند بوسہ بخشیم رام پور و دکن،

پہلی ممدوحہ کے بعد دوسری بھی شاعر کے ایک بہت ہی گہرے دوست کی معشوقہ طنازہ تھیں ان کی بھی باری آئی۔ اس قصیدہ میں تشبیب ایک خاص رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

اگرچہ شہر میں گرم حسن کا بازار،
مگر کہیں نہیں ملتا ہے اک بوسہ ادھار
ہر ایک دوکان پہ ہنگی ہے درد دل کی دوا۔
کدھر علاج کو جائے یہ شاعر بیمار
کسی نے بھی نہ یہ پوچھا کہ چاہئے کیا ہو

میں نقد دل لئے پھرا ہوں بازار بازار،
مرام پور کے نواب سے، خدا نہ پوچھے
کہ ایک بوسہ کی قیمت لگا رہے پانچ ہزار
دماغ ہی نہیں ملتا ادا فروشوں کا
اب اس زمانے میں سودائے عشق ہو کہ خوار

تشبیب کے بعد گریز کی بے ساختگی دیکھئے:

متاع دل کا نہیں قدر داں کوئی اے بخت
اب اس میں زہرہ جبیں ہوں یا کہ ہو مختار
مگر ہے ایک گھر ایسا جہاں ہے جنس شرف
سخی و بنت سخی ہے یہ جس کی سرکار

اب اس سخی اور بنت سخی کی مدح میں شاعر کا جوش عقیدت ملاحظہ ہو ؎

آئینہ دل دیں تیری چھاتیوں کا ابھار
ہے تکیہ گاہ تمنائے عاشق بیمار!!
وہ قبہ جس میں کہ ہیں دفن حسرتیں دل کی
وہ قبہ جس پہ کہ پٹنہ کا گول گھر ہو نثار
زباں منجھی ہوئی، قینچی بجھا ہوا نشتر
نظر کھچی ہوئی، برچھی کھنچی ہوئی تلوار

قصیدہ میں جو شوکت الفاظ ہونا چاہئے۔ وہ اس قصیدہ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

اشارہ دیدۂ عیار کا تشنج روح
نظارہ شعلہ رخسار کا عذاب النار

غالباً یہ ممدوح سبحولی والی تھی۔ ذرا اس کی طرف لطیف اشارہ ملاحظہ ہو ؎

صدف کی قطرہ نوازی اسی سے ظاہر ہے
اگل چکی کئی موتی جو ہیں گلے کے ہار!

ایک تیسری ممدوح کی درگت بھی دیکھتے چلئے۔ فرض کر لیجئے ان کا نام لیلیٰ ہے ؎

رہی لیلیٰ کو تمھیں ہاتھ گردش شمل چاند
رسیلی آنکھ کا رس پی گئے یا مانڈ نہ جانا
کی جاتی ہے کھلی جاتی ہے گل ہوتی جاتی
کرے کیا تجھ زینت بلا مچلے پھولا

اس قصیدہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اختتام پر شاعر نے اپنی ممدوح کو مخلصانہ نصیحت کی ہے۔

خدارا ہوش میں آ رحم کر اپنی جوانی پر
جوانی تیری ڈھلتی چھاؤں ہے اے جان جاناں
ہوا جس روز خالی نے سے ساغر چشم میگوں کا
کھسک جائیں گے متوالے اجڑ جائے گا میخانہ

جمیل مظہری نے جب صحافتی زندگی ترک کر کے حکومت بہار کے محکمہ نشر و اشاعت میں اعلیٰ ملازمت کا عہدہ سنبھالا تو کلکتہ کی صحافت میں ہجو کی یہ گرم بازاری ختم ہو گئی۔ لیکن ہجو کا چسکا جن طبیعتوں کو پڑ جاتا ہے ان کی کوئی گوشہ نشینی ہی جاتا ہے۔ چنانچہ پٹنہ جا کر جمیل مظہری کی طبیعت نے اپنے لئے ایک گوشہ نکال ہی لیا۔ بات یہ ہوئی کہ موصوف علیل تھے۔ ان کے لئے سبزی باغ کے مشہور گھی فروش مولوی مکھن کی دوکان سے گھی آیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ گھی ایسا ناقص آیا کہ مرض میں اضافہ ہو گیا۔ پھر تو جمیل مظہری کے دل میں سودا کی روح جھنجھلا اٹھی۔ اور ایک ایسا ہجویہ نظم قلم سے بے اختیار ٹپک پڑا جو اردو ہجو نگاری میں شاید سنگ میل ہو۔ ابتذال کی حد تک پہنچ کر گالیاں کھٹی ہو جاتی تھیں۔ جمیل مظہری کی ہجو کی یہ خصوصیت ہے کہ مہذب لوگوں کے سامنے بھی پڑھی جا سکتی ہیں اور خود اس کے ہونٹوں پر بھی تبسم لا سکتی ہیں۔ جس کی درگت بنائی گئی ہے چنانچہ روایت سنی گئی ہے کہ کلکتہ کی جن ایکٹریسوں کی ہجو میں

لکھی گئیں ان میں سے بعض کو ہجو کے اکثر اشعار زبانی یاد تھے مدھیپورہ کے ممدوح مولوی مکھن کو بھی اپنے مدحیہ اشعار آج تک زبانی یاد ہیں۔ ہجو نگاری کی تعریف میں نہ یہ شرف الاری کو حاصل ہوا نہ سودا کو مولوی مکھن کے ہجو کے چند اشعار جو ڈھاکہ سے لے کر مدھیپورہ تک زبان زد خلائق ہیں۔ سنتے چلئے

اے مولوی مکھن
تم عقل کے دشمن ہو کہ ایمان کے دشمن
یا اپنی اس اٹھتی ہوئی دوکان کے دشمن
کیوں اپنے خریداروں کی ہو جان کے دشمن
اے مولوی مکھن، اے مولوی مکھن

گھی بیچتے ہیں آپ کہ ہیں بیچتے ایمان
کھا کھا کے دبلے ہوئے پیٹ کے سلوان
کمہلا گئے معشوقوں کے ابھرے ہوئے جوبن
اے مولوی مکھن اے ....

تم شیخ ہو یا قوم کے بقال بتاؤ
تم مولوی ہو کہ چنڈال بتاؤ
تم آدمی ہو کہ ہو بجو قیہار برہمن
اے مولوی مکھن اے ....

چربی کا بہت گھی میں ملانا نہیں اچھا
ہو جائے گا بدنام زمانہ نہیں اچھا
جن جن
پہنائے گی ہاتھوں میں پولس چوڑیاں
اے مولوی مکھن ....

اے مولوی قربان تیری فتنہ گری کے
دوکان میں بکتا ہے بینام سے گھی کے
مسجد کے چراغوں کا چرایا ہوا روغن
اے مولوی مکھن ....

جائے گا جہنم میں جو تو حکم خدا سے
آگ اور بڑھے گی تیری ڈاڑھی کی بدولت
اور پھر لگا اسی گھی میں بھگو یا ہوا ایندھن
اے مولوی مکھن ....

جمیل مظہری کا ذوق ہجو گوئی جب بالیدہ ہونے لگا تو ان کے بعض مخصوص اور گہرے دوستوں نے اپنی اپنی ہجویں فرمائش کر کے لکھوائیں۔ یہ شرف بھی شاید، ہجو نگاری میں صرف جمیل مظہری کو حاصل ہے۔ اس قسم کی دوستانہ ہجو میں جمیل مظہری کا فن انتہائی عروج کمال پر پہنچا نظر آتا ہے اس قسم کی ہجو یہ نظموں میں جو عموماً مثنویاں ہوتی ہیں جمیل مظہری اپنے ایک دوست کی شان میں ایک کہانی گڑھتے ہیں۔ اور وہ کہانی اس کے نام سے منسوب کر کے شاعری کے پھول بکھیرتے جاتے ہیں۔ اس طرح کہ ایک کہانی کچھ ان کی زبانی کچھ میری زبانی سنئے ان کے ایک دوست لکھنؤ تشریف لے گئے ہیں اور لکھنؤ کے چوک پر ان کی کیا درگت بنتی ہے۔

ستی مہاجن کی دو لوٹ جیب سبری
ایسے عالم میں سوجھتی ہے صری

دل میں طوفان رنگ و بو کے لئے۔
نکلے یہ سیر لکھنؤ کے لئے !!

لکھنؤ کے تمدنی بہاروں کے متعلق اردو ادب میں نظم و نثر دونوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اب دیکھئے ایک بہاری شاعر لکھنؤ کے چوک کی تصویر کشی کس طرح کرتا ہے

لکھنؤ دختر جہاں نا باد
تو دھشیم اودھ عروس بلاد !
اپنے جوبن پہ مسکراتی تھی !
گومتی آئینہ دکھاتی تھی !
چوک کا حلیہ، کہکشاں کہئے !
خم بہ دستے دلبراں کہئے !

وہ جھروکوں پہ مہ وشوں کی بہار
ہار میں جیسے موتیوں کی قطار

[illegible] ملیے لکھنؤ کے چوک کی ایک دوکان کی ایک دوسری [illegible] ی دیکھیے جو اپنی جگہ نادر ہے۔

[illegible] دم گیسوؤں میں ڈالے ہوئے
[illegible] شام اودھ نکالے ہوئے۔
جسم پر ایک سرمئی چادر
نور و ظلمت کی ملگجی چادر
[illegible] ش نازک سے ڈھلکی جاتی تھی
[illegible] ک تاروں سے جھلملاتی تھی

اس منظر کشی کے بعد داستان آگے بڑھتی ہے

[illegible] ی جھروکے پہ ایک بت مغرور
[illegible] ام تھا جس کا دیوی مشہور
[illegible]
چربی اور گوشت کا حسین پہاڑ
رخ کی گولائی گنبد دوّار
اس پہ عاشق ہوئے میری سرکار
عقل رخصت ہوئی نگاہ کے ساتھ
دل میں اٹھا مرور آہ کے ساتھ

[illegible] سرکار کوٹھے پر چڑھے فیس پوچھی گئی مول تول شروع ہوا۔ مگر دام اتنے تھے کہ ممدوح کو ہمت نہ پڑی، اس وقت ان کی نفسیاتی کیفیت کیا تھی شاعر کی زبان سے سنئے۔

چونکہ سرکار آدمی ہیں بخیل
بولی خفت کہ دید و عشق کو ڈھیل
[illegible] لیکن بڑی خوشامد کی
دی قسم اپنے شوق بے حد کی
پھر یہ طبیعت ہوئی کچھ آمادہ

ڈھونڈا صیاد بہر صیاد ہ،

بہر حال ایک صیاد نے بیس روپیہ پر سونے کی وہ چڑیا پھانس دی۔ اور حضرت خلوت وصال میں پہونچے، وہاں کیا حشر ہوا سنئے۔ چونکہ محبوبہ تن و توش سے پہاڑ تھی اس لئے ؎

منعقد جب شب وصال ہوئی۔
عشق پر زندگی وبال ہوئی
جیں نے اپنی طرف انہیں کھینچا
گود میں لے کے زور سے بھینچا
دونوں شانے دہائی دینے لگے
قصر جنت دکھائی دینے لگے۔

حال بے چارے کا ہوا جو تباہ
اک غلط راستے سے نکلی آہ !!

غلط راستے کی داد نہیں دی جا سکتی ہے۔ خیر ان کا تو یہ حال تھا۔ ادھر کی کیفیت ملاحظہ ہو۔

اللہ وہ بدمست بکھری جاتی تھی
سسکیوں میں صدا یہ آتی تھی
آستانے کا احترام کرو
خان صاحب اٹھو سلام کرو

آگے کے اشعار پڑھئے آپ نے شوق کی مثنویوں میں دیکھا ہوگا کہ ہیروئن کس طرح بے تکلف اور بامحاورہ گفتگو کرتی ہے۔ غور کرتے چلئے کہ جمیل مظہری اگر اس طرح کی مثنویاں لکھتے تو کیسی ہوتیں۔

جب ممدوح بقول داستان گو اپنی قسمت سے ناکام رہتے ہیں۔ تو محبوبہ جھنجھلا کے کہتی ہے ؎

ڈھل گئی رات صبح ہوتی ہے
میری تقدیر مجھکو روتی ہے
جاؤ میں جھونکو خود پرستی کو

آگ لگ جائے الیسی مسی کو
لوٹ یہ ٹھنڈی گرمیاں توبہ!
کردیں انگیا کی دھجیاں توبہ!
اب تو چھوڑو کہ جان زار گئی
تم کہا چھوڑو میاں میں ہار گئی
واری جاؤں رہے گا احسان یاد
اپنی لونڈی کو اب کرو آزاد
اب میں سمجھی بڑے نواب ہو تم
اللہ آمیں سے پا تراب ہو تم
اٹھو گنڈی میں کھول دیتی ہوں
جوتی بھر سونا تول دیتی ہوں
الغرض منفعل ہوئے سرکار
سن کے طعنے خجل ہوئے سرکار
چھینپے شرمائے منہ تھتھلائے ہوئے
اترے کوٹھے سے سر جھکائے ہوئے

اسی طرح ایک اور دوست کو شامت آئی اور انہوں نے خود اپنی ہجو کی فرمائش کی جمیل مظہری کے یہ ممدوح ریاست بہار میں ایک ممتاز عہدے پر فائز ہیں۔ ان کی تصویر ملاحظہ ہو

اس کو ہنستا دیکھ کر سوجھا یہ مضمون دور کا
جس طرح لڈو بکھر جاتا ہے موتی چور کا
یہ رم بے ساختہ بھی دکھلاتا ہے یہ لنگور کا
یہ سراجلاس نشستہ بھی ہے مغرور کا

افسرانہ ٹھاٹ بھی کچھ اینڈ بھی!
طوق قدرش کی طرح زیب گلو اک بینڈ بھی

دلبرانہ حسن کا رنگین چہرے پہ نکھار
عاشقانہ ابھی بھی بھوت بھی سر پہ سوار!
ان اداؤں پر دکھیلوں کو بھی آجاتا ہے پیار

خون دل دوات میں کیونکر نہ گھولے پیشکار
واقعہ آرہ کا ہے پٹنہ میں افسانہ ہوا!
اک موکل برسراجلاس دیوانہ ہوا!!

یہ ہجو اس دور کی ہے جبکہ جمیل مظہری کے یہ ممدوح دوست دنیائے حسن و عشق سے کچھ کبیدہ ہو کر خدا پرستوں کے حلقہ میں مرید ہو گئے تھے اس طرف جو اشارہ ہے وہ بھی دو شعروں میں ملاحظہ ہو

یہ نیا انداز ہے اور یہ نئی تفریح ہے
زلف خوباں کی جگہ اب حلقۂ تسبیح ہے
عابد و زاہد بنایا کس نے اس حیوان کو
تعزیت اللہ کو اور تہنیت شیطان کو

ایک ایسی ہجو کا تعارف آپ سے کراتا ہوں جو اپنی شگفتگی اور سنجیدہ ستم ظریفی کے لحاظ سے اپنے خاص معنی خیز تھی جو شاعر کے استاد محترم مولانا رضا علی وحشت مرحوم اور ایک صوفی بزرگ حکیم ابوالعلا عاطق کے سامنے بزم احباب کلکتہ کی ایک نشست میں پڑھی گئی۔ اس ہجو کی شان نزول یہ تھی کہ جمیل مظہری کے ایک گہرے دوست بزم احباب کے ممبر تھے جو بزم کے جلسوں میں عموماً غیر حاضر رہا کرتے تھے۔ چونکہ آدمی دلچسپ تھے اس لئے ان کی غیر حاضری دوستوں کو کھلتی تھی۔ باوجود اصرار کے جب انہوں نے عادت نہیں بدلی۔ تو احباب نے جمیل مظہری سے فرمائش کی کہ یہ ان کی شان میں کچھ لکھیں۔ موصوف نے اس وعدے پر کہ ان کے دوست پلاؤ خوری کی ایک دعوت بزم کو دیں گے۔ ان کی شان میں یہ مدحیہ مثنوی لکھی۔

اس کے اشعار کی روانی اور برجستگی میں وہ ساری خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جو ایک کامیاب مثنوی کی خصوصیت ہو سکتی ہے۔ اس ہجو میں بھی ایک کہانی

حسب معمول بیان کی گئی ہے۔ احباب دوست کی بے وفائی
پر جل کر کچھ بددعائیں دی گئی ہیں۔ اور یہ بددعائیں ہجو یہ
اشعار بن گئی ہیں۔ یہ حضرت تاش کے بڑے شوقین تھے
کلب میں بیٹھتے تو بارہ بجے رات سے پہلے کبھی نہیں اٹھتے
اور بزم کے جلسوں کا وقت بھی بھول جایا کرتے۔ اس کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے کہا۔

الغرض سب کا مدعا یہ ہے
جملہ احباب کی دعا یہ ہے
کہ نوازے وہ دستِ ناز تمہیں
کرے پاپوش سرفراز تمہیں!

ہے دعا یہ بھی برسر ما ہے
تاش جب کھیلنے کو جی چاہے
نہ ملے کوئی کھیلنے والا
چپکے بیٹھے رہو تم اے لالہ
اور کھیلو تو ہو بڑی تو ہین
یعنی بن جاؤ پیسنے کی مشین
کوٹ پتّہ وہ ہوں اور بو نیاسا
پیتے پیتے ہو آدھی رات
منہ بنائے جو گھر کو جاؤ تم
در تو بہ کو بند پاؤ تم

اب یہیں سے ہجو میں وہ گرمی ہوئی کہانی شروع ہوتی
ہے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں بیوی نے دروازہ بند
کر دیا ہے۔ ہر چند کوشش کرتے ہیں لیکن دروازہ نہیں کھلتا
آخر کار ۔ ؎

ایک کھڑکی کھلی ہوئی جائے
غنچۂ دل تمہارا کھل جائے
چونکہ تم اپنے فن پیچ کا مل ہو
چور کی طرح گھر میں داخل ہو
سست اس خوف سے قدم کی چاپ
کہیں بیگم نہ جاگیں باپ رے باپ
کھانا کھانے کی میز پر جاؤ
ہمہ پلیٹوں میں ہی طرف ستھراؤ
نان ہانڈی میں ساگ تک نہ ملے
سرد چولہے میں آگ تک نہ ملے
اپنی حالت سے زار ہو کر تم!
بھوک سے بے قرار ہو کر تم!
عاجزانہ جگاؤ دائی کو!!
چھوؤ جیسے ہی چارپائی کو
وہ یہ سمجھے تمہارے اس ڈھب سے
کہ تم آئے ہو اور مطلب سے
پھر تو گھبرا کے غل مچا دے وہ
فتنۂ خفتہ کو جگا دے وہ
تیز دھڑکن ہو قلب عالم کی
یعنی کھل جائے آنکھ بیگم کی
آتش غیظ و شعلہ رخسار
وقنا ربنا عذاب النار
بستر ناز سے اٹھے طوفان
کل من کل من علیہا فان
پھر تو ہو گھر میں غلغلہ دوست اربیے
اترے سب تاش کا خمار اے دوست
لفظ و معنی کا دو بگڑ ہے
بن کے احباب کی دعا برسے

اب دیکھیے لفظ و معنی کا یہ دو بگڑا کس طرح برستا
ہے اور نواب مرزا شوق کی روح اس شاعر کی زبان دانی

کس طرح دعائیں دیتی ہے۔ بیگم صاحبہ غیظ میں فرماتی ہیں۔

تف ہے اس بے حیا طبیعت پر
ایک کالی کلوٹی عورت پر
جی نگوڑا مچل گیا توبہ!
پانی آنکھوں کا ڈھل گیا توبہ
لوج اس سن میں یہ ندیدہ پن
باؤلے ہو گئے تھے کیا دشمن
کس نگوڑی پہ یہ ستم ہوں گے
ایسے مردیکھے جیسے کم ہوں گے
دائی سوکن بنے خدا کی شان
اڑی چوٹی پہ میں کروں قربان
آج سمجھی میں ہتھکنڈے ان کے
کہ مجھے بھیجتے تھے کیوں میکے!
میں بھلا ان کی جان چھوڑوں گی
اسی چوکھٹ پہ سر کو پھوڑوں گی

الغرض جب شاعر کی بددعا سے یہ طوفان برپا ہوگا تو اس کا نتیجہ کیا مرتب ہوگا ؎

بکتے بکتے یوں ہی سحر ہو جائے
گھر سے باہر بھی خبر ہو جائے
چھوکرا کہہ دے جا کے مالی سے
اور مالی کہے ڈفالی سے
اور ڈفالی سے سن لے عبدالمجید
شہر میں اس خبر پہ ہو تنقید
جھوٹی باتوں کی آندھیاں آئیں
جس طرف جاؤ انگلیاں اٹھیں
ایک سے ایک مسکرا کے کہے
کنکھیوں سے تمہیں بتا کے کہے

وہ جو بیٹھے ہیں چارپائی پر
جان دیتے ہیں اپنی دائی پر
اور وہ کچھ ایسی مہ لقا بھی نہیں
لطف یہ ہے کہ پارسا بھی نہیں
ایسے ویسے کو منہ لگاتی ہے
اور ٹھینگا انہیں دکھاتی ہے
ایک بولے کہ وجہ کیا ہے یار
کہ وہ عورت ہے ان سے یوں بیزار
دوسرا بولے آدمی ہیں بخیل
پیسے دینے میں کرتے ہوں گے ڈھیل
تیسرا بولے وجہ ہے کچھ اور
ہے ضرورت علاج کی فی الفور
کیوں وہ عذرا خفا ہے وامق سے
اس کو پوچھو حکیم ناطق سے
الغرض مفت جگ ہنسائی ہو
بے سبب بدگمان خدائی ہو
ہم کہیں ہنس کے ہاتھ لائے یار!
صبر احباب کا پڑا ہے اسیار
اب کوئی اس میں کیا دلیل کرے
جس کو چاہے خدا ذلیل کرے

اس کے بعد مثنوی کے ختم ہونے سے پہلے شاعر اپنے دوستوں کو تنبیہ کرتا ہے۔

بزم سے جو اگر چرائو گے
مار میرے قلم کی کھاؤ گے
مجھ سے یاں کس کو رستگاری ہے
آج یہ کل تمہاری باری ہے

جمیل مظہری جب محکمۂ نشر و اشاعت سے محکمۂ تعلیم میں منتقل کئے گئے تو کالج کی ثقہ اور سنجیدہ زندگی میں بھی ان کا ذوق ہجوگوئی سنجلا نہ بیٹھا۔ اور اپنے بہت ہی عزیز دوست پروفیسر امبیٹ کی شان میں ایک مدحیہ نظم تیار ہی کر دی۔ پروفیسر امبیٹ کالج کے اندر امتحانات کے انچارج تھے۔ امتحانات کے سلسلے میں وہ پروفیسروں کو گارڈنگ کے لئے متعین کیا کرتے تھے جمیل مظہری صاحب کو بھی حسب دستور یہ ڈیوٹی کئی مرتبہ ملی۔ ان کی شاعرانہ طبعیت اس چوکیداری سے جب اُکتا گئی تو انھوں نے امبیٹ صاحب سے گذارش کی کہ آپ ایک شاعر سے کیوں ایسا کام لیتے ہیں جو اس کے بس کا نہیں۔ شاعر تو اکزامیشن ہال میں پہونچتا ہے اور اپنے خیال کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ اس کو اس سے غرض نہیں کہ کون لڑکا لکھ رہا ہے اور کون چوری کر رہا ہے۔ شاعر کی جب اس گذارش پر بھی پروفیسر امبیٹ نے اس ڈیوٹی سے آزاد نہیں کیا۔ تو عین اکزامینشن ہال میں شاعر کی طبعیت کو تاؤ آگیا۔ اس نظم میں کچھ پروفیسر امبیٹ کی مدحیہ اشعار ہیں۔ اور کچھ شاعر نے اپنا حال زار اکزامیشن ہال میں دکھلایا ہے۔ ہال کی تصویر ملاحظہ ہو سے

یہ امبیٹ صاحب کی کرد دیکھئے
تماشائے عقل و خرد دیکھئے
کہ شاعر کو کانسٹبل کر دیا
جو تھا ہاف میڈ اس کو فل کر دیا
نہ غائب ہوں کیونکہ حواس اسکے پانچ
کہ لونڈے سنجاتے رہیں تکنی کے ناچ
ہے کہتا کوئی ... ... بلاؤ
تقاضہ کسی کا ہے پنکھا چلاؤ
بدل کر کوئی اپنی چتون کا روپ
یہ کہتا ہے چہرے پہ آئی ہے دھوپ
کسی خوش نوا کی بہار یہ رٹ
کہ سر ایک سچنے میں ہے کئے منٹ
کھڑا ہو کے کہتا ہے ایک نیک ذات
سیاہی سے خالی ہے میری دوات
کہیں لاؤ کاپی کی تکرار ہے
بلوٹنگ کا کوئی طلب گار ہے
غرض شور سا ہر طرف ہال میں
بکیں مچھلیاں جیسے بنگال میں
کدھر جائیے اور کدھر دوڑیئے
ادھر دوڑیئے یا ادھر دوڑیئے
وہ دیں حکم تو اب زادے کی طرح
اور استاد دوڑے پیادے کی طرح

اب اس کے بعد اکزامینشن ہال میں شاعر کی بدحواسی ملاحظہ ہو سے

کوئی دیکھے شاعر کو اس ڈھونگ میں
بھلا شاعری کیا ہو ہڑبونگ میں
ادھر چیختا ہے کوئی بے ڈھنگ
ادھر لفظ و معنی میں جاری ہے جنگ
ادھر طعنہ زن ہے زبان حریف
ادھر قافیے سے خفا ہے ردیف
ادھر ذہن شاعر کا ماؤف ہے
ادھر چوکیداری میں مصروف ہے
جو شاعر سے لے چوکیداری کا کام
حماقت کرے اس کو جھک کر سلام
ہیں امبیٹ صاحب بھی کتنے ناہیں

بناتے ہیں جو آدمی کو شین

اب ابھیت صاحب کی مدح میں چند اشعار سنئے

چلئے ؎

بڑا محنتی اور ہوشیار ہے
جفاکش ہے لیکن جفاکار ہے
طبیعت اگرچہ نہیں ہے بڑی
زبان منہ میں لیکن ہے میٹھی چھری
قلم اس کا تلوار سے کم نہیں
کہیں زخم کا جس کے مرہم نہیں
قلم سے جو شاعر کا کاٹے گلا،
گلا کاٹ رہے وہ اور اس کی کلا،
ہے ساری کلاؤں سے بڑھ کر حسین
بہ از جنبش ابروئے نکتہ چیں

لیجئے میں نے سرسری طور سے جمیل مظہری کی ہجویہ شاعری سے آپ کو روشناس کرا دیا۔ یوں تو موصوف کا ہجویہ کلام اور بھی ہوگا۔ لیکن مجھے رضا مظہری سے چند چھپے پرانے کاغذات دستیاب ہو گئے تھے۔ جن پر اس مضمون میں شامل ہونے والے اشعار پنسل سے لکھے ہوئے تھے۔ ان اشعار کے نزول کی داستان کچھ ادھر ادھر سے سن لی تھی۔ اور کچھ رضا مظہری نے بیان کی تھی۔ اسی بنیاد پر یہ مضمون تیار کیا گیا ہے •

جمیل مظہری کی شاعری میں عورت

شاہدہ حیدری ایم اے

بقول رشید احمد صدیقی ہمارے یہاں شاعری اور عاشقی تو اس دھوم دھام سے ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ، خصوصًا حالی کی روایت شکنی سے پہلے کے ماحول پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ہر شاعر چاہے وہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ یا تو کوئے یار کا چکر لگا رہا ہے۔ یا بوئے یار یا گل روئے یار کی یادوں میں غلطاں و پیچاں ہے۔ گل و بلبل کی داستانوں نے جو ایک ہالہ سا ہمارے شاعروں کے گرد بنا لیا تھا اس سے باہر نکلنے کی کوشش کم ہی نظر آتی ہے۔

لیکن تعجب ہے کہ اس دھوم دھام کے باوجود اردو شاعروں کی مجبوبہ —— عورت —— اپنے اصل روپ میں جلوہ گر نہیں ہوتی۔ تمیر کے یہاں صاحب مومن کے یہاں اور ستم پیشہ ڈومنی کے نام غالب کے یہاں اور اسی طرح کے دو ایک نام کا پتہ بھی کچھ ملتا ہے۔ تو اتنا مبہم کہ ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔

عورت اگر سچ مچ کچھ نظر آتی ہے۔ تو مثنویوں میں —— وہ بھی شہزادی یا درباری خواصوں کی کی حیثیت سے۔ بس ایک زہر عشق کی ہیروئن ہی وہ عورت ہے۔ جن کی شخصیت ان خیالی محبوباؤں سے مختلف ہے۔ مگر یہ عورت زہر عشق کے علاوہ اور کسی بھی مثنوی میں دوبارہ نظر نہ آسکی۔

عشقیہ شاعری کا بڑا ذخیرہ ہمارے یہاں غزلوں کی شکل میں ہے۔ اور غزل کا مزاج اس بات کی اجازت ہی نہ دے سکا کہ اس میں عورت کے لئے کوئی نمایاں جگہ حاصل ہو سکے۔ شاید اسی پابندی، رسوم و قیود، کا اثر تھا یا پھر ذہنی یا سماجی ماحول کا تقاضا کہ ایک غیر صحت مندی سی محرومی اردو شاعروں میں پھیلی جس نے بعد میں ریختی کی صورت اختیار کر لی —— عورت کا ذکر تو ہوا مگر ابتذال کی حدوں میں داخل ہونے کے بعد، آرٹ کی ایسی سطح سے تنگ آکر اقبال کو "ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس" ان سبھوں سے یہ شکوہ تھا کہ ان کے اعصاب پر عورت سوار نظر آتی ہے۔

سچ پوچھئے تو ان حالات میں عورت اعصاب پر ہی سوار ہو سکتی ہے۔ ذہن اور شعور کے پردے پر اس کا عکس بھی نہیں پڑ سکتا۔ خود اقبال جیسا انقلابی اور بت شکن شاعر بھی جب اپنے سماجی اور معاشرتی ماحول کی گرفت کے زیر اثر عورت کی آزادی کے گیت نہ گا سکا تو میر اور وں کا کیا ذکر ہے۔ اقبال کی نظر میں عورت عظیم ہستی تو ہے کہ "اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطون"

"مگر یہ حالات فلاطون نہ لکھ سکی" والی مجبوری اور کم مائگی بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔

دوسروں سے اور اقبال سے فرق صرف اتنا ہے کہ اقبال نے عورت کے لئے انہیں بندھے ٹکے فرائض کو جو وہ پہلے سے فطری طور پر انجام دے رہی تھی۔ ایک پیام کی شکل میں نازل کر دیا۔ اور ان فرائض کی ادائیگی کا سلسلہ بھی اپنے فلسفہ خودی سے جا ملایا۔ اور کوئی نئی بات عورت کے لئے نہیں کی۔ علم و دانش سے اسے محروم ہی رکھنے کی حمایت کی۔

عورت ہماری شاعری میں ایک بھرپور شخصیت اور یہ تمام رعنائی و دلربائی اس وقت آئی جب اردو میں رومانیت کا دور کہا جاتا ہے۔ جوش اور اختر شیرانی نے اس دور کی بنیاد ڈالی۔ اور اختر نے تو ایک بار اتنی بہت سی منزلیں طے کر ڈالیں کہ روایت اور بے جا پابندیوں کے سارے بت ٹوٹ گئے۔ اور پھر عورت اور ہماری شاعری کے درمیان کوئی تکلف، کوئی دوری یا بیگانگی باقی نہ رہی ——— نظموں کا تو ذکر ہی کیا ہے غزلوں میں بھی رمزیت اور سخت پردہ داری کے باوجود محبوب کے رُخِ روشن سے نقاب سرکنے لگا۔ اور حسن کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔

جن شاعروں نے اسی رجحان کو، کمال احسن و خوبی اپنایا اور نبھایا۔ ان میں حسرت، جگر، فراق، حفیظ، احسان دانش، وغیرہ کے ساتھ جمیل مظہری کا نام خاص اہمیت کا مستحق ہے ——— خاص اہمیت اس لئے کہ ایک تو جمیل بہت دنوں تک گمنامی میں پڑا رہا اور کسی کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اپنے ہم عصروں کی طرح انہوں نے بھی عشق، محبوب، رومان، فلسفہ اور سیاسیات پر کچھ کہا ہے۔ اور دوسروں کے درمیان ان کا کیا درجہ ہے۔ دوسرے جو روپ عورت کا جمیل کے یہاں نظر آتا ہے۔ جو دلکشی، جو وقار، اور احترام جو خالص ہندوستانی پن اور سب سے بڑھ کر جو گھریلو پن انہوں نے عورت کو بخشی ہے وہ اردو کے شاعروں میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

ان کے ہم عصروں سے جب ہم موازنہ کرتے ہیں تو یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔

جوش کو لیجئے۔ ایسی فضا میں جب کہ شعر و ادب میں عورت کا نام لیتے ہوئے اقبال جیسا روایت شکن بھی جھجکتا ہے۔ جوش نے ذکرِ عورت کا کیا اور ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی ——— یہ ان کا کارنامہ ضرور ہے اس کے باوجود ان کے یہاں عورت کے ذکر میں جو کمزوریاں ہیں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ایک تو ان کی تصوراتی کمزوری ——— ایک مخصوص ماحول اور چند مخصوص سماجی رکاوٹوں کے زیر اثر انہوں نے عورت کے متعلق جو رائے قائم کیا ہے۔ وہ اتنا فرسودہ اور پچھڑا ہوا ہے کہ اس کی ٹھوس آئیڈیالوجی یا پختہ غور و فکر کا عکس تک نظر نہیں آتا یہی وجہ ہے کہ جب وہ عورت کی بلند کرداری، علم، پردہ، اور عورت کے جیسے بڑے بڑے موضوع پر بحث چھیڑ دیتے جاتے ہیں تو کوئی صحت مند نتیجہ نہیں اخذ کر پاتے۔ اپنی باتوں میں کوئی وزن یا گہرائی نہیں رکھ پاتے۔ عورت کا احترام عورت سے ہمدردی اور عورت کی اہمیت کا اقرار کرنے کے باوجود وہ ایک عورت کو فلسفی یا ایک مفکر کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔

دوسرے جو کردار انہوں نے عورت کے اپنی

نظموں میں لائے ہیں۔ انہیں گو اس مقصد سے پیش کیا گیا ہے کہ نچلے طبقے کی بدحالی ظاہر ہو سکے۔ مگر ان کے جذباتی ابال نے ان کے ساتھ بھی خاطر خواہ انصاف نہیں کیا۔ مالن کی بیٹی۔ جامن والی۔ اور سڑک پہ بیچتی ہوئی نوجوان قبرانی کو دیکھ کر جوش ہمدردی اور غربت پر افسوس ظاہر کرنے سے زیادہ ایک جذباتی ہیجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

محبوبہ سے عشق اور اس عشق کی پوترتا اور بات ہے۔ اور راہ چلتے رندی اور چھیڑ دوسری بات ہے۔ جوش اس رندی اور سچے عشق میں فرق کر سکتے ہیں۔ عشق کا ایک بلند تصور رکھتے ہیں۔ پھر بھی اس قسم کی بے اعتدالیوں سے دامن نہیں چھڑا سکتے۔

وہ کرداروں کی ایک سماجی اہمیت ہے اور جنھیں اس غرض سے دکھایا گیا ہے کہ ان کا ذکر کر کے ایک مخصوص مظلوم طبقے کی مشکلات کا اظہار ہو سکے۔ اپنی اصل اہمیت کھو بیٹھتے ہیں۔ مفکرانہ نظر کی کمی انہیں کچھ کا کچھ بنا دیتی ہے۔

تصور اور عمل کا یہ تضاد اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ اور جب جذبہ اور ذہن کی کش مکش کو سنبھالنے کی طاقت شعور میں نہیں ہوتی۔ شاعری میں جذبات کی ناؤ پر بہتے جانے کی رومانی کیفیت ایک بنیادی ضرورت ہے۔ مگر دل کے ساتھ پاسبان عقل کا سہارا نہ رہے تو شاعر اپنی باتوں کا توازن کھو بیٹھتا ہے۔ کہیں افراط، کہیں تفریط، کہیں اعتدال اور تضاد پیدا ہونے کا ڈر رہتا ہے۔

جمیل کے ذہن اور شعور میں جو استحکام ہے تیاگ اور ریاض سے حاصل کی ہوئی۔ جو تربیت یافتہ پختگی کی دولت ہے اس نے انہیں ہر قدم پر بے اعتدالیوں سے بچایا ہے ان کی شاعری کا یہ مخصوص پہلو بھی جس میں انہوں نے عورت اور محبوبہ کا ذکر کیا ہے۔ اور جہاں پہونچکر بڑے بڑے کہنہ مشقوں کے پاؤں بھی اکثر ڈگمگا جاتے ہیں۔ نہایت ہی متوازن اور پروقار ہے۔

ان کے یہاں عورت کے بارے میں ایک سوچی سمجھی ہوئی فلسفیانہ آئیڈیالوجی ملتی ہے۔ جو نہ روایتی ہے اور نہ انتہا پسندی کی حد تک جدت پسند، نہ ایک دم جذباتی ہے، نہ الہامی، نہ آسمانی، یا کسی مذہب یا سخت اصول کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی ــــــ بیدار شعور اور فلسفیانہ طرز فکر نے ان کی نظر کو جو گہرائی اور تیزی دی ہے وہ ان تمام حدوں اور سماج کی گڑھی ہوئی پابندیوں سے بہت پرے دیکھ سکتی ہے۔

نظم عورت کو پڑھئے، جس میں انہوں نے عورت کی عظمت اور معصومیت کے گیت گائے ہیں۔ تو اگرچہ اس چھوٹی سی نظم میں بہت تھوڑی سی باتیں عورت سے متعلق کہی گئی ہیں۔ مگر آواز میں جو یقین، جذبے میں جو انضمام خیالات میں جو وزن اور وسعت ہے۔ وہ کسی درجے رنگ روپ، یا زمان یا مکان کی بندش میں اسیر نہیں۔ عورت کی تعریف بس کچھ کم نہیں کہ وہ عورت ہے۔ نظریہ کی یہ آفاقیت صرف ایک مفکر ذہن کا ہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔

عورت کی جفاؤں کو بھی معصوم کہتے وقت تو جمیل صاحب اس بے پناہ ہمدردی اور خلوص کی انتہا کر دیتے ہیں۔ جو عورت کے لئے ان کے دل میں ہے محبوبہ کی جفائیں بھی جیسے وفائیں نظر آئیں اس کی وسعت نظری کیا کہئے۔

محبوبہ کا ذکر جمیل کے ہم عصروں میں جتنا اختر شیرانی نے کیا ہے کسی نے نہیں کیا۔ ان کی شاعری میں عورت سب کچھ ہے۔ ان کا رومانی رجحان یہاں ان کی شاعری

سب سے بڑی خصوصیت بھی ہے اور زیور بھی۔ اس میں والہانہ پن اور جمال میں گم ہو جانے والی کیفیت تو ہے عورت جیسے ملکوتی حسن کا بیان بھی ہے۔ کہیں کہیں چند خطوط کے ذریعہ اس کا سراپا بھی پیش کیا گیا ہے۔ مگر عورت پھر بھی ہم سے دور بہت دور بستی ہے۔ وہ کوئی آسمانی حور یا وادیوں میں اڑنے والی پریوں کی حسین شہزادی سے زیادہ نہیں۔ جیسے ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہوگا۔ یا شاعر کے تخیل نے ورنہ اور کسی نے نہیں دیکھا۔ سلمیٰ، ریحانہ، عذرا، شیریں، یہ سب ایسی تصویریں ہیں۔ جن میں رنگ و روغن، حسن و دلکشی سبھی کچھ موجود ہے۔ صرف زندگی نہیں، گوشت و پوست کی حرارت سے خالی غیر مرئی مورتیں ہیں۔ جو دیکھنے میں جیتی جاگتی معلوم ہوتی ہیں مگر اس دنیا میں ان کا کہیں کچھ نشان نہیں۔

جمیل کے یہاں بھی رومانی رجحان ہے خصوصاً رومانیات، وشبابیات کے زیر عنوان انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس میں وہی کیف، وہی سرشاری، جذب و شوق اور وجدانی کیفیت ہے۔ جو رومانی شاعروں کو باریک ترین احساسات کی دنیا میں کھینچ لاتی ہے۔ مگر اختر شیرانی کے یہاں ان کے یہاں صرف رومان میں سب کچھ نہیں۔ رومان اور حقیقت کا خوب صورت امتزاج ہے۔ جس میں حقیقت سب کچھ ہے اور رومانیت صرف اتنی کہ جو حقیقت میں گھل مل کر اسے سنوارنے اور نوک پلک درست کرنے میں مددگار ثابت ہو سکے۔ یوں کہیے کہ حقیقت میں رومانیت جذب ہو گئی ہے۔ بلکہ رچ گئی ہے۔ اختر کے یہاں اس کے برعکس ہے۔ یعنی رومانیت میں حقیقت کھو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اختر کے یہاں رومانی رجحان فرار کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور محبوبہ کو ساتھ لے کر ایسی دنیا بسانا چاہتے ہیں جو شام زندگی موت اور سناٹا کی تلخیوں حقیقتوں سے بہت دور ہو۔ جمیل کے یہاں زندگی کی تلخیوں اور حقیقتوں کا خون ہو جانے کے اعتراف کے باوجود انھیں میں رہ کر زندگی کرنے کا جو جگرا ہے قدم قدم پہ سنبھل کر نبھانے کا جو اٹوٹ حوصلہ ہے وہ انھیں جم کر مقابلہ کرنے والے مجاہد کا رتبہ بخش دیتا ہے۔ اور یہی حوصلہ ان کی محبوبہ کو بھی شاعری کی خیالی دنیا سے نکال کر اسی مٹی بھری زمین پر لا کھڑا کرتا ہے۔ جہاں زندگی اپنی چہل پہل کے ساتھ رقص کر رہی ہے۔ ان کی عذرا اور سلمیٰ صرف تخیل کی جھوٹی تصویریں نہیں۔ جیتی جاگتی زندگی سے بھرپور حقیقتیں ہیں جنھیں تخیل نے رنگ بھر کر زیادہ جاندار اور پیارا بنا دیا ہے۔ کہ ہم ان کے دل کی دھڑکنیں ان کے سانس کی ایک ایک آواز تک سن سکتے ہیں۔ انھیں ہر ہندوستانی گھرانے میں کسی نہ کسی روپ میں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ ہمارے ادب کے لئے زبردست سماجی کردار ہیں۔ جن کی سماجی اہمیت کو کامیابی سے نبھانے کی صلاحیت کی کم از کم جمیل کے زمانے میں بڑی کمی تھی۔ حسرت، جگر، فراق، حفیظ وغیرہ نے غزلوں اور نظموں کے ذریعہ عورت کا چاہے جو بھی روپ پیش کیا ہو سماجی کردار کے جو پہلو جمیل نے روشن کر کے دکھائے ہیں۔ اور جس سلیقے سے دکھائے ہیں وہاں سب کے لئے قابل رشک ہیں۔

حسرت تو غزل کے شاعر ہیں۔ وہ بھی روایتی رنگ میں غزل کو بہترین طریقے سے نبھانے والے اور جلا دینے والے شاعر، اس لئے ان سے تو توقع بھی نہیں کی جاسکتی

کہ عورت کا کردار پیش کرتے ہوئے ۔ وہ روایتی انداز سے دامن بچا سکیں گے ۔ اور پھر یہ ان کا کمال ہے کہ انہوں نے کثرِ غزل گوئی کے باوجود محبوبہ کے روپ میں گھر کی شریف لڑکی کا کردار پیش کیا ہے ۔ اور حتی الامکان اس کردار کی تمام خصوصیات کو نبھانے کی کوشش کی ہے مگر غزل کی رسم اور خنجر و تلوار اور تیغ ابرو میں اسیر ہونے کے سبب ان کی محبوبہ پر ہر روایتی چھاپ اتنی گہری ہے کہ سماجی پہلو پوری طرح ابھر نہیں پاتا ۔

فراق کی محبوبہ جا ہے ہندی میتھولوجی کے اثر سے تراشی ہوئی کوئی دیوی نما عورت ہو یا اردو شاعری کی محبوباؤں کی طرح ستم ڈھانے والی ساحرہ ، وہ روایتی حیثیت سے آگے نہیں بڑھتی ۔

حفیظ نے البتہ اپنی نظموں میں کہیں کہیں عورتوں کے جوبن کی تصویریں دکھائی ہیں ۔ ساون کے جھولوں ان کے ملہاروں ، رنگین دوپٹوں ، اور دھانی ساریوں کا ذکر بہ کمال حسن و خوبی کیا ہے ۔ ہندوستانی پن کی فضا پیش کی ہے ۔ مگر ان میں ایک خاص موقعہ اور موڈ کی صرف اوپری جھلک ہے ۔ لہراتے آنچلوں کے سائے میں چھپے ہوئے دل اور اس کے جذبات کا بیان نہیں ۔ عورت کی اس سماج میں گھٹی گھٹی زندگی ، درد میں ڈوبے ہوئے اس کے بے حد معصوم احساسات کا ایسا موثر اور دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا ہوا کامیاب اظہار کہ اس سے سماج کے بے ڈھنگے پن کا پردہ فاش ہوا ۔ اور اس کے ستم ڈھانے والوں سے نفرت ہو جائے ، یہ باتیں کہیں نہیں ۔ !

ان زاویوں سے جمیل کی نظموں کو اگر پرکھئے تو ان میں ایک بھی ایسی نہیں جن میں یہ خصوصیات نہ پائی جاتی ہوں ۔ عورت کا جو کردار ان کی نظموں میں ابھرتا ہے ۔ اس کا تجزیہ تو بعد میں ہوگا ——— پہلے ذرا اس مصوری کے چند نمونے ملاحظہ فرمائے ۔ جو جمیل کے قلم نے پیش کئے ہیں ۔ تاکہ جمیل کی محبوبہ کی دل کی آواز سے پہلے ہم رُخِ تاباں کے کچھ جلوے دیکھ لیں ۔

فراق کی طرح جمیل کے قلم میں بھی یہ معجزہ ہے کہ صرف چند دل آویز خطوط " اور ہلکے رنگوں کی مدد سے جو جادو ان تصویروں میں ڈال دیتے ہیں ۔ وہ شاید سراپا پیش کرنے والے کے یہاں بھی مشکل ہی سے ملتا ہے ۔ انہیں خود بھی اس مصوری کا احساس ہے ؎

جمیل اپنی سخنوری بھی فسوں گری ہے مصوری ہے
بنا کے تصویر مہ جبینوں کی رنگ بھرتا ہوں آرزو کا

اس مصوری کا کمال پہلے ان غزلوں میں دیکھیے جنہیں ہندی طرز پر کہا گیا ہے ۔ جن میں رادھا کی چھلکتی ہوئی گگری اور کرشن کی بنسری کی تانیں ہیں ۔ تیغ و ابرو اور ناز و غمزہ کی جگہ سہاگ کے سیندور ، کاجل کی لکیروں ، پازیب کی جھنکاروں اور چوڑیوں کی چھن چھن اور دھانی ساریوں کی بہار ہے غزلوں میں عورت کو اس کی تمام نسائیت اور نزاکت کے ساتھ پیش کرنے کا شاید اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہندی طرز پر کہی گئی ان غزلوں نے عورت اور غزل کے درمیان نزدیکی کے باوجود جو روایتی بندشوں کا فاصلہ تھا سرے سے دور کر دیا ہے ؎

کھڑی ہے مندر میں اک حسینہ سیاہ جوڑا کھلا ہوا ہے
نشیلی آنکھوں میں ایک تمنا کوئی لے ہو تو دیپ اک جلا ہو

اس حسینہ کا دوسرا روپ بھی دیکھیے ؎

میں تیری مظلومیت کے قربان یہ بال الجھے یہ میلی ساری
بُرا ہو کمبخت جذبِ دل کا کہ تجھ کو جوگن بنا دیا ہے

یہ مظلومیت اور جذب دل کی ٹیس جمیل کی محبوبہ کو ہندی شاعری عورت کی سی سپردگی عطا کرتی ہے۔ وہ عاشق کو جلانے سے زیادہ خود عشق کی آگ میں جلنا پسند کرتی ہے ؎

نشیلی آنکھیں ڈبڈبائی گلابی چہرہ ستا ہوا ہے۔

مبہوت رادھا کی محویت اور عشق کی تاثیر دیکھئے، سر سے آنچل ڈھل آیا ہے۔ پنگھٹ پر گگری رکھی ہے۔ ایک چپ سی لگی ہے۔ رادھا کو اور سورج چھپتا جاتا ہے۔ کبھی رادھا کا سانولا سلونا پن یوں ستم ڈھاتا ہے ؎

کوندتی ہے یوں ظالم بجلی آج برستے بادل میں
جیسے ہماری سانولی رادھا لڑتے میں ہنس دیتی ہو

کبھی سہانگھر کر رادھا جب دھانی ساری پہنتی ہے اور چنچل سکھیاں اسے ساتھ لے کر پانی بھرنے جاتی ہیں۔ تو فضا قوس و قزح کے رنگوں کی طرح حسین ہو جاتی ہے۔

تو اور تیری چنچل سکھیاں جب پانی بھرنے جاتی ہیں!!!
تب سائے دھانی ہوتے ہیں، تب دھوپ گلابی ہوتی ہے

اور کبھی اسی ہنستی مسکراتی رادھا کی آنکھوں میں کاجل کی پھیلی ہوئی لکیریں اس دکھ کی کہانی بھی کہتی ہے۔ جو دل کو گھلائے جا رہا ہے ؎

خلوت ہو یا آئینہ حیرت سے منہ تکتا ہو!
آنسو چھپ چھپ بہتے ہوں کاجل پھیلا پھیلا ہو

یا۔

تم رو رہی ہو رادھا اور صبح ہو رہی ہے
میرے گلابی سپنے کاجل میں گھل رہے ہیں

نظموں میں تو یہ مصوری اور بھی مکمل ہے۔

نقش جمیل میں رومانیات اور شبابیات کے زیر عنوان کہی ہوئی نظموں میں پہلی ہی نظم نالۂ سحر کو پڑھئے تو بقول خلیل الرحمٰن اعظمی، ہندوستان کے سانولی سلونی مٹی سے بنی ہوئی شاما کی مورت ہمیں چونکا دیتی ہے۔ دوشیزہ بنگالہ کو دیکھئے تو شانۂ عریاں پر سلجھائی ہوئی زلفیں، اور چپ آنکھوں کا کیف و حیرانی، کچھ رنگ صباحت کی چھاؤں ملاحت کی۔ ان سب نے مل کر سچ مچ ایک "سوی گرل" کر دی ہے۔

یوں تو جمیل کی جتنی بھی عشقیہ نظمیں ہیں۔ جن میں انہوں نے عورت کا ذکر کیا ہے۔ انہیں اگر لگاتار پڑھئے تو حسن کاری اور مصوری کے ساتھ اوپر کی تمام خصوصیات بیک وقت جمع نظر آئیں گی۔ مگر جن نظموں میں یہ خصوصیات اپنے شباب پر ہیں۔ وہ کہانی، یہ کیا ہوا تم کو، ڈر و خدا سے ڈر رو، سلام ماضی، عشق ناتمام جیسی نظمیں ہیں۔

کہانی کے اشعار کو پڑھئے تو معلوم ہوگا جیسے کوئی اپنے گھر آنگن کی کہانی دہرا رہا ہے ؎

ہے ابھی چشم تصور میں وہ گھر کا آنگن
اور اس آنگن کا ایک چھوٹی سی دنیا ہونا
وہ لڑکپن کے گھروندے میں جوانی کا کھیل
اور اس کھیل کا ایک فتنۂ فردا ہونا
عشق معصوم کے وہ غیر شعوری اقدام
یعنی رخساروں کا رخساروں پہ رکھا ہونا

یہاں تک تو محبت کے معصوم اقدام کا ذکر ہے جب کہ عاشق کے ساتھ محبوب بھی عشق کی معصوم نادانیوں سے بے خبر بچپن اور جوانی کی شوخ و چنچل ابروں پر بہتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے کے بھی اشعار یکساں طور پر پرکشش ہیں۔ ہر بات کا اتنا واضح نقش ابھارا کہ جمیل نے نظم نگاری کے اصولوں سے مکمل فائدہ اٹھایا ہے ؎

وہ تیرے عشق کے چرچے وہ بزرگوں کا عتاب

وہ تیرا پردے میں چھپنا میرا رسوا ہونا
وہ تیرا غیر کی آغوش میں چھپ جانا
میری امیدوں کی دنیا میں اندھیرا ہونا

اور ان سب کے ساتھ ساتھ

اف تیرا پھولوں میں تلنا سہاگن بن کر
میرے گلزار تخیل کا وہ صحرا ہونا

پڑھتے جائیے تو درد و غم میں ڈوبے ہوئے دبے دبے جوش کے ساتھ ساتھ محبوبہ کا کتنا جانا پہچانا اور دل اور جذبات سے قریب نقش ابھرتا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے جمیل کی محبوبہ اور دنیا کی ان تمام معصوم اور گھر کی چہار دیواریوں میں بند رہنے والی بے گناہ لڑکیوں سے جنہیں سماج کے کٹر پن نے برباد کیا ہے۔ کوئی اندرونی اور کوئی جانا پہچانا رشتہ ہے۔ بزرگوں کے عتاب در پردے میں چھپنے کے بعد سہاگن بن کر پھولوں میں تلنا —— کیا یہ سب کچھ پڑھ کر ایک سہمی ہوئی سی محبوبہ دلہن کی صورت آنکھوں میں نہیں پھرتی۔ جو فرض کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی محبت اور محبوب دونوں سے دل کے رشتے ہمیشہ کے لئے توڑ رہی ہے۔

پھر عاشق کے جذبات کا کیا دل سوز اظہار ہے کہ پڑھتے ہی جی رو اٹھے۔

اس نظم کے آخری چند اشعار پڑھئے تو یہ ظاہر ہوتا ہے جیسے جمیل کی محبوبہ بھی جمیل کی طرح دل و دماغ رکھنے والی شخصیت ہے جو زندگی کو سرد و گرم کو سلیقے سے نبھانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور کہیں کہیں ناکام آرزوں کے صحرا میں کبھی کوئی پھول کھلتا نظر آتا ہے۔ تو وہ کھل کھلا اٹھتے ہیں۔ اور غم کا بوجھ کچھ کم ہو جاتا ہے۔

انقلابات زمانہ سے پھر اک جا ہونا

اور

ایک مدت سے دلوں کے دریچے جو بند
ان کا اک مرتبہ بے ساختہ پھر وا ہونا
وہ تیرا دل لئے بجھی شمع کو پیشکش کرنا
میری دنیا میں اچانک وہ اجالا ہونا

مگر یہ اجالا اس تاریکی کو چھپا نہیں سکتا۔ جو محبوب اور شاعر کے درمیان حائل ہو چکی ہے۔ اس لئے شاعر محبوب کی طرف سے وہم و شکوک میں مبتلا نہیں ہوتا۔ اور اس سے شکوہ کرنے کی بجائے ہمدردی کرتا ہے۔ اس میں وہ جھلاہٹ نہیں جو مجاز کے یہاں یوں ابھر آئی ہے۔

اب میرے پاس جو آئی ہو تو کیا آئی ہو؟

کیونکہ قصوروار نہ محبوب ہے نہ شاعر نہ وہ معصوم محبت جس نے ان دونوں کو پاس بھی کیا اور دور بھی۔ قصوروار صرف سماج ہے۔ محبوبہ کو مورد الزام ٹھہرانے یا اپنی محرومی کا ماتم کرنے سے زیادہ شاعر کا ذہن گتھیوں کو سلجھانے اور ایک دوسرے کی مجبوریوں کو سمجھنے میں محو ہو جاتا ہے اس وقت محبوبہ پرائی ہو کر بھی تقدس معصومیت اور پوترتا کی دیوی نظر آتی ہے۔

محبوبہ کے اس تصور کے پیچھے جذبہ سے زیادہ جمیل کا ذہن کام کرتا ہے۔ وہ فلسفی زیادہ ہیں۔ جذباتی کم۔ یا شاعری میں کم از کم ایسے ہی نظر آتے ہیں۔ ان کی نظم یہ کیا ہوا مگر اس اعتبار سے قابل ذکر ہے اس میں محبوبہ سے شکوہ صرف لہجے میں ہے۔ حقیقت میں تو ان حالات سے شکوہ ہے۔ جنھوں نے ان کی محبوبہ کو بے رخی برتنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس بے رخی پر انہیں حیرت تو ہوتی ہے مگر رنج اور جھنجھلاہٹ نہیں ہوتی۔ نہ کسی قسم کی رسوائی محسوس ہوتی ہے۔ محبوبہ اور محبت پر

اُلوٹ بھروسہ اور بے پناہ ضبط اور ٹھہراؤ کا مادہ انہیں یہ —
سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتا کہ ان کی محبوبہ کبھی جان بوجھ کر
بے رخی بھی برت سکتی ہے۔ انہیں تو اس بے رخی سے بھی
ہمدردی ہے ؎

یہ کس نے پیکر سنگین بنا دیا تم کو!

الزام ہے تو حالات کی ناسازی پر، کتنی قربت اور اپنا پن
ہے ان الفاظ میں، پہلا ہی شعر یوں ہے۔

کیا ہوا میری عذرا یہ کیا ہوا تم کو!

اس پرسشِ احوال پر میٹھی التجا کے ساتھ جو دیرینہ آشنائی
اور بے تکلفی کا احساس ہے وہ زمانے بھر کی محبت کو ماند
کر دینے کے لئے کافی ہے محبوبہ پر اعتماد و محرومی کے باوجود
ایک ایک لفظ سے ابلا پڑتا ہے۔ بعض بندوں میں عورت
کی نفسیات کا اتنا سچا بیان بھی تعجب انگیز ہے۔ دیکھئے!

زبان شوق و لب مدعا سے برہم ہو!
میری نگاہ سے اپنی ادا سے برہم ہو!
سرک گیا ہے جو آنچل ہوا سے برہم ہو
کسی نے یوں نہیں دیکھا خفا کیا تم کو!
یہ کیا ہوا تم کو
....

دبی ہوئی تمناؤں کو بھول جانے کی کوشش میں انسان کے
ذہن میں شعور و لاشعور کی جو کشمکش ہوتی ہے اس کی وجہ
سے انسان کا مزاج، گفتگو اور کردار سبھی بدل جاتے ہیں
کبھی کبھی ـــــ محرومیاں اور ناکامیاں کبھی آدمی کو اتنا
چڑچڑا بنا دیتی ہیں سماج کے انگشت نماؤں کے لئے وہ
ایک تماشہ بن جاتا ہے۔ ایسی ہی کچھ حالت اسی وقت
جمیل کی محبوبہ کی بھی ہے جو بہ یک وقت ہوا، اور سبھی سے
برہم ہے۔ اور نہیں جانتی کہ کیوں برہم ہے۔
نفسیاتی حقائق کے بیان کے اعتبار سے تو،
"ڈرو خدا سے ڈرو" جمیل کا شاہکار ہے۔ یہ نظم ہر اس
عورت کے دل کی جذبات کی تصویر ہے جو کسی بھی وجہ سے
محبت اور زندگی کی راحتوں سے محروم کر دی گئی ہو۔ وہ
عورت بھی جس کی جوانی بڑھاپے کے ساتھ باندھ دی
گئی ہو۔ ایک تو زندگی کا اتنا بڑا المیہ دوسرے اس پر
محبوب سے دور رہنے کا غم۔ پابندیوں اور لبوں پر مہر
لگا کر جینے کی مہم، سماج کی ناانصافیوں اور کسی عورت کی
برباد زندگی کا اتنا بے رحم تجزیہ کہ خون کے آنسو رلائے۔
جمیل کے زور قلم اور حساس دل کی باہم رفاقت کا کرشمہ
ہے۔

عورت کی زبان سے یہ ساری باتیں کہلوائی گئی
ہیں اس لئے لہجے پر بھی خاص دھیان ہے۔ مٹھاس، لچک
اور نزاکت کے ساتھ معصوم سادگی پر بے حد زور دیا
گیا ہے۔ سب سے پہلے اس مجبوری اور لاچاری کو دیکھئے
جو اس مظلوم کو ہر وقت گھیرے رہتی ہے۔ وہ اپنے
محبوب سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

یہ تم مجھکو تصور میں پیار کرتے ہو
جو نام لے کے مرا آہ سرد بھرتے ہو
تمہیں خبر بھی ہے کیا مجھ پہ کر گزرتے ہو
نہ جذب دل کو بڑھاؤ ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو
یہ کیا کہ دل میں کسی کے سمائے جاتے ہو
رگوں میں خون کا تموج بڑھائے جاتے ہو
ہر ایک بوند کو آنسو بنائے جاتے ہو
کسی کو یوں نہ گھلاؤ ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو
جھکائے سر کو جو بیٹھوں تو تم نظر آؤ

کبھی کتاب جو کھولوں تو تم نظر آؤ
اٹھا کے آئینہ دیکھوں تو تم نظر آؤ
نہ یوں نظر میں سماؤ ڈرو خدا سے ڈرو

بار بار ڈرو خدا سے ڈرو الفاظ دہراتے ہوئے وہ جیسے اپنے شعور کی ابھرتی ہوئی لہراتی تمناؤں کا اور امنگوں کا سر کچلنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہر لفظ سے کیسی گھٹی گھٹی آرزوں اور دبی دبی ہوئی آہوں کا دھواں اٹھتا دکھائی دیتا ہے۔ ان باتوں کے علاوہ اس نظم میں عورت کے گھریلو پن اور روز مرہ کے چھوٹے چھوٹے نجی مسائل کے درمیان اس کی شخصیت کی تصویر بھی ایک کارنامہ ہے جس کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ دیکھیے ؎

کروں خدا کو جو سجدے تو تم نظر آؤ
نماز میں نہ ستاؤ ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے یاد نہ کرو
جو پاس چولہے کے اماں کے ڈر سے جاتی ہوں
تو خود بھی جلتی ہوں، سالن کو بھی جلاتی ہوں
نمک سمجھ کے شکر دال میں ملاتی ہوں
نہ یوں دوانہ بناؤ، ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے یاد نہ کرو!

یہ اردو کی ان روایتی محبوباؤں سے بالکل مختلف ہے جن کے ناز و عشوہ کے لیے اس قسم کی گھریلو باتوں کا ہلکا سا سایہ بھی بار ہو۔ جو صرف تیغ و تلوار سے گھائل کرنا جانتی ہو، پیار کرنا نہیں۔ یہ خود زمانے کے ہاتھوں گھائل کی ہوئی چڑیا ہے۔ جسے صیاد نے قفس میں پھڑپھڑانے کے لئے چھوڑ دیا ہے اس کی محرومی ایک سچے عاشق کی محرومی سے بڑھ کر ہے اس لئے جو ہمدردی اس کی ذات سے ہمیں ہوتی ہے اس کے چاہنے والے سے کبھی نہیں ہوتی۔ جس سے مخاطب ہو کر وہ فریاد کر رہی ہے۔ ذرا اس تڑپا دینے والی آہوں کو سنیے ؎

کہاں رکھوں دل خانہ خراب کی میت
کنوارے پن کے پر ارمان خواب کی میت
میں خود اٹھاؤں گی اپنے شباب کی میت
نہ ہاتھ اپنے لگاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو!
میں [illegible] بیج نسب کا بو نہیں سکتی
حیا کا نام ڈبو دوں ڈبو نہیں سکتی
کسی طرح بھی تمہاری میں ہو نہیں سکتی
میں صدقے جاؤں نہ کڑھاؤ ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو—!

اس بے بسی کے بعد یہ التجا!

میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں تمہیں خدا کی قسم
شکستہ پائی عذرائے بے وفا کی قسم
جو جل رہی ہوں بتدریج اس چتا کی قسم
ہوس کی آگ بڑھاؤ
ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے یاد نہ کرو!

آنسوؤں کا ایک سمندر ہے جو سیلاب کی طرح بہہ جانے اور دوسروں کو بھی بہا لے جانے، زندگی کو تہہ و بالا کر دینے کا زور و شور رکھتا ہے۔ مگر جس کی سطح اتنی خاموش اور ساکن ہے کہ موجوں کا تلاطم اندر ہی اندر ٹکراتا اور سر پٹکتا رہ جاتا ہے۔

محبوبہ کے روپ میں ایک مظلوم عورت کا انسانی کردار پیش کر کے جمیل نے اردو شاعری کو محبوبہ کے نئے تصور سے آشنا کیا ہے اب تک محبوبہ نے عاشقوں پر ستم ڈھائے تھے۔ مگر جمیل کی محبوبہ پر اس سماج نے ستم ڈھائے ہیں وہ

سب سے پہلے ایک انسان ہے گوشت پوست کی بنی ہوئی ایک عورت ہے جو اپنی زندگی کے کچھ مطالبے اپنی ذات کے کچھ تقاضے رکھتی ہے۔ وہ صرف محبوبہ نہیں۔ کسی کی بیٹی بن کر گھر کے ماحول میں حصہ لیتی ہے۔ کسی کی مظلوم بیوی بن کر فرائض کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی زندگی کے تلخ گھونٹ پی لیتی ہے اور پھر کسی کی محبوبہ بن کر دل کے زخموں پر پیار کا مرہم رکھتی ہے محبوب کو ملیخوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ غلط اقدام اور فطری لغزشوں کی طرف آگاہ کرتی ہے۔

"سلام ماضی" بھی جمیل کے ان بے حد حسین نظموں میں سے ہے جس میں دل کا جذبہ زبان بن گیا ہے۔ ایک ایک لفظ سے خون جگر ٹپکتا ہے۔

محبوبہ کی تصویر یہاں بھی اپنی آن بان میں ایک انفرادی شان رکھتی ہے۔ محبوبہ کے ذکر کے ساتھ روزمرہ کی زندگی اور اس زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کا ایسا ساحرانہ بیان ہے کہ اس کے آگے بڑی بڑی حقیقت بیانیاں بھی ماند پڑ جائیں۔ کہیں بھی محبوبہ کا سراپا نہیں کھینچا گیا۔ اس نظم میں تو خط و خال تک کا ذکر نہیں۔ صرف ماضی کی چند شگفتہ یادوں کا حسرت ناک بیان ہے۔ مگر اس طرح ہے کہ جمیل کی کی محبوبہ کی ایک ایک ادا، چال ڈھال، ہنسنا، مسکرانا، رونا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، حتیٰ کہ شکل و صورت کی تصویر آنکھوں میں گھوم جاتی ہے۔

جمیل تو ماضی کے دھندلکوں اور محبوب کی یادوں کے ساتھ آنسو بہاتے جاتے ہیں۔ اور پڑھنے والا اس تصویر کو دیکھنے میں محو ہو جاتا ہے۔ جس میں ایک متوسط گھرانے کے مخصوص ماحول اندرون سہن میں پلی ہوئی الہڑ سی لڑکی دکھائی دیتی ہے۔ جو کبھی گھر والوں اور عتاب ڈھانے والے . نیند گودوں سے نظریں بچا کر چھت پر کھڑی کسی کے آنے کا انتظار کر رہی ہے۔ کبھی حسین ملاقاتوں اور رنگین لمحوں کی گود میں سر مار رہی ہے۔ کبھی جدائی کی گھڑیوں کا خیال کر کے کاجل بھری سیاہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہا رہی ہے۔ کبھی ہاتھ میں سوئی دھاگہ لئے بڑے ناز سے محبوب کے گریبان پر ٹانکے لگا رہی ہے۔ کبھی بڑے پیار سے اس کی شوخ انگلیاں تکئے پر بیل بوٹے کاڑھ رہی ہے۔ اور آنکھوں کی پیاس اور دل کی دھڑکنیں ان سب کو ریشم کے ان پھولوں میں مجسم کئے دے رہی ہے۔ جو محبوب کے لئے ہدیہ محبت ہیں۔ ذرا ان اشعار کی سچائی ملاحظہ فرمائیں۔

تمہاری شوخ اداؤں سے جن کو جنبش تھی
جھکائے سر کو وہ پردے سلام کہتے ہیں

سکوت شام میں درد دل جہاں دھڑکتا ہے
وہ چھت اور اس کی اداسی سلام کہتا ہے

ایک اجڑی سیج پہ چادر کی سوگوار شکن!
اور اس شکن کی حکایت سلام کہتی ہے
ایک آستیں پہ کاجل کے جا بہ جا دھبے!
وہ آنسوؤں کی امانت سلام کہتی ہے

کسی قمیص کے ادھڑے ہوئے گریباں پر
تمہارے ہاتھ کے ٹانکے سلام کہتے ہیں۔

ابھر گئے تھے جو تکیوں پہ بن کے نقش و نگار
تمہارے دل کے وہ جذبے سلام کہتے ہیں

"بوئے پیرہن" سے سرشار ہو جانے والی کیفیت

وہ صرف بادِ صبا کے جھونکوں اور دیارِ محبوب سے خراماں
خراماں گذرنے والی نسیم سے ہی نہیں پوچھتے۔ بلکہ کبھی یوں
بھی کہتے ہیں۔

جسے تم اوڑھ کے سوئی تھیں اس دوشالے میں
تمہارے جسم کی خوشبو سلام کہتی ہے
کئی مہینوں کے مرجھائے باسی ہاروں میں
حدیثِ طرۂ گیسو سلام کہتی ہے

آخر میں دور ہوتی ہوئی محبوبہ سے التجا ہے۔ اسے پڑھ کر تو کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ناکام محبت کی ستائی ہوئی کسی سوگوار حسینہ کا ڈولا اٹھ رہا ہے۔ آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پہ آہیں تو ہیں مگر دنیا کی نظریں انہیں دیکھ نہیں سکتیں۔ صرف دور کھڑا ہوا شاعر اپنی محبت کی چھوٹی ہوئی چتا سے آخری التجا کر رہا ہے۔

سلام تم پہ ہو عذرا تمہارے ماضی کا
جو دور ہوتی ہو مجھ سے تو دور ہوتی جاؤ
مگر حیاتِ گذشتہ کے ان مزاروں پہ!
جلا کے دل کا دیا تھوڑی دیر روتی جاؤ

جمیل کے عشق میں جو ضبط و توازن اور ٹھہراؤ ہے۔ وہ ان کی نظم عشقِ ناتمام میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اس نظم کی بنیاد یہی صبر و طلبِ عاشقی پہ ہے۔ جو تمنا کو بے تاب نہیں ہونے دیتی۔ اس کی تربیت کرتی ہے اور عشق کو پر وقار بناتی ہے۔ یہ صبر صرف جمیل ہی کا نہیں ہے ان کے محبوبہ عشق کا بھی پورا ہے۔ [illegible] ان کی محبوبہ اپنی تمام خصوصیات کے علاوہ ایک نہایت سمجھدار، خوددار، اپنی بے پناہ معصومیت کے باوجود نہایت باخبر اور بالغ ذہن رکھنے والی عورت معلوم ہوتی ہے۔ وہ الھڑ اور کمسن ہو کر بھی نادان نہیں۔ وہ محبت کو صرف جذبات کا کھیل نہیں سمجھتی۔ عقل اور دماغ سے ایک ایک بات کو تول سکتی ہے۔ وہ اپنا ایک اصول اور ہر بات کے لئے ایک فیصلہ ایک فلسفہ رکھتی ہے۔ وہ مجاز کی محبوبہ کی طرح نئی روشنی اور نئے شعور سے آشنا تو نہیں جو آنچل کو پرچم بنا لینے کا حوصلہ بھی پیدا کر سکتی ہو۔ مگر اس کی متوازن شخصیت اور خوددار طبیعت ذہنی طور پر اسے ایک بیدار مغز اور بیدار شعور رکھنے والی ہستی کے مقابل ضرور لا کھڑا کرتی ہے۔ جمیل جو کچھ سوچ سکتے ہیں ان کی محبوبہ کا ذہن بھی اس کا ساتھ دے سکتا ہے۔

مجھے گمان کہ سوزِ عشق روح کا زوال ہے
انانیت کا ضعف ہے خودی کا انفعال ہے
تمہیں یقین کہ عشق اور انسانیت میں [illegible]
کہ جدھر کو دل ادھر نگاہ بھی گناہ ہے
مجھے یہ وہم دل سے دور ہو گی پاس آکے تم
تمہیں سو کہتی رہیں قدم بڑھا بڑھا کے تم
نتیجہ یہ ہوا کہ خون بہا سکا نہ کھو سکا
تمہیں وفا نہ آ سکی، مجھے جنوں نہ ہو سکا
برا ہو عقل کا کہ عشق کے مزے نہ آ سکے
نہ تم فریب کھا سکیں نہ ہم فریب کھا سکے۔

اور محبت یوں ہی جذبات اور عقل کے سنگ سے ٹکراتی ہوئی سہم سہم کر آگے بڑھتی رہی۔ مگر ہر قدم پہ۔

دل اپنی آگ سے نئے نئے شرار [illegible] رہے
ہم [illegible] جسنوں کی لاکھ ڈولتے رہے

ذہن اور دل کی اس کشمکش کے بعد وہی کٹھن منزل آگئی جس کا گمان تھا اور خوف بھی۔

دماغِ خشک کے آستانۂ حرم پہ سو گیا،
مگر حقیقتوں کی زندگی کا خون ہو گیا۔

اس کھونے کا دکھ، یہ جلنے کی حسرت، دل آنکھوں اور لہو کی

پیاس بجھانے کی آرزو، تلخ حقیقتوں میں زہر میں گھلی ہوئی طنزیہ مسکراہٹ یہ سبھی کچھ اس نظم میں ہیں۔ مگر محبوبہ اور شاعر کے درمیان ذہنی طور پر کسی دوری کا احساس نہیں۔ زندگی کی کڑواہٹ کو ہنس کر پی جانے کا حوصلہ ہے۔ بیزاری نہیں، روایتی شاعروں کی طرح جمیل بھی محبوب سے بدگمان نہیں۔ انہیں وفا نہ آسکی کا ہلکا سا طنز تو ہے۔ مگر لہجے میں جو یقین ہے وہ کہہ رہا ہے کہ جس طرح پیار کی نرم گھڑیوں میں وہ ان کی ساتھی تھی۔ اسی طرح غم کے بوجھل لمحوں میں بھی وہ ان کی ہمدم ہے آنکھوں سے دور سہی مگر دل کی راہیں ملی ہوئی ہیں جو غم جمیل کے دل کو کچوکے لگا رہا ہے وہ ان کی محبوبہ کے دل سے بھی الگ نہیں۔ زندگی کی حقیقتوں کا خون ہوا ہے۔ مگر ایک طرف نہیں۔

اس لئے جمیل صرف ایک رونا نہیں روتے۔ دو دلوں کے اجڑنے کی داستان بیان کرتے ہیں۔

جمیل کی محبوبہ اردو شاعری کی محبوباؤں کی طرح چاہی جانے والی شخصیت بھی ہے۔ اور ہندی کی شاعری کی عورت کی طرح صرف کسی کو چاہنے والی، وفا کی دیوی بھی ہے۔ اور اپنے محبوب کے لئے آنکھوں کے ساغر چھلکانے والی ستمگر بھی وہ بیک وقت ناز بھی ہے۔ نیاز بھی، سوز بھی ہے ساز بھی۔ ہندی اور اردو کے روایات کے بہترین عناصر کو ایک دوسرے میں سمو کر اور ان پر اپنے ذاتی تجربات، اور تخیل کی ملی جلی رنگ آمیزی کرکے جمیل نے محبوبہ کے روپ میں ایک بے حد پیاری شخصیت کو ہم سے متعارف کیا ہے۔ —— جس کے لئے اردو شاعری اور اردو زبان جمیل کی جتنی بھی ممنون ہو کم ہے۔

عورت کی عظمت کے متعلق ان کا یہ خیال ہے کہ جمیل تیری تعریف کر تو عورت ہے اس وقت بری طرح مجروح ہوتا ہے جب معاصر بازاروں میں بکتے دیکھے زینۂ خورشید بہ لب بام شکوہ ہے۔ مگر عصمت سے ہمدردی ہے۔ یہی ہمدردی انہیں اکساتی ہے کہ وہ شاہد بازار سے فطرت نسوانی پر تبرہ کرنے کی التجا کریں۔ اس التجا میں ملائمیت کے ساتھ ایک شرمندگی کا احساس دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس غلط رجحان سے نفرت کا بھی جس نے حسن سے رنگ حقیقت چھین لیا۔ پگھلنے والے دل کو پتھر بنا دیا۔ تڑپنے تڑپانے والی آتما کو منجمد کر دینے والی سرد مہری دیدی۔ وہ شاہد بازار سے مخاطب ہوتے وقت کہ ناتھا نہ زیادہ، متسلا نہیں ہوتے۔ اس لئے جس طرح اوروں کے یہاں شاہد بازار کے سلسلے میں جو کبھی کبھی بے کیفی ہر نامانت پیسا یا کبھی سماج کی بداحتیاطیوں سے ایک طرفہ قسم کی بیزاری ملتی ہے وہ ان کے یہاں نہیں۔ وہ اس کے لئے سماج کو بھی الزام دیتے ہیں اور حسن مجبور کو بھی جس کے لئے عریانی نسائیت کی تقدیس پر ایک بدنما داغ ہے۔ اگر صرف سماج کو مورد الزام ٹھہرایا جائے اور شاہد بازار کو یہ کہہ کر بری کر دیا جائے کہ وہ سماج کے تقاضوں کے ہاتھوں ایک کھلونا ہے۔ تو اس سے درد کی دوا تو نہیں ملتی، جمیل اس کی بھی سخت ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ کہ خود شاہد بازار کو بھی اصلاح کی طرف اکسایا جائے اپنی غلطیوں کا احساس دلایا جائے۔ اپنی عظمت اور حقیقت کو پہچاننے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اور یہ سب باتیں انھوں نے شاہد بازار سے متاثرکن انداز میں کہہ دی ہیں۔

جدید شاعروں کے یہاں محبوبہ اور عورت کا ذکر کوئی نئی بات نہیں رہی۔ مجاز، فیض، سردار، ساحر اور سبھی نے جو کچھ بھی کہا ہے اس میں عورت کی حیثیت صرف محبوبہ کے علاوہ دوست اور ہمدم و ساتھی کی ہو گئی ہے۔

مجاز کے یہاں عورت کا تصور، اس کا احترام، اس کی زبردست سماجی و ادبی اہمیت، فیض کے یہاں کی حسن کا ان حسین آنکھوں، رسیلے ہونٹوں، گداز جسم اور دراز قد کا،

بیان کہ "جن سے بیانیہ خالق اتر آئے۔ اور زبان شعر کو تعریف کرتے شرم کئے۔ رخسار، آنچل، ویرا ہن کی رنگا رنگی سر دار کے پہلو زنداں کی دیواروں، ان آنکھوں کے سائے میں دل نواز بانہوں، لرزتے آنچلوں، حسین، متحیر، معصوم مگر مخمور، آنکھوں کے طلسم کے ساتھ سیاہ لٹوں کی مچلتی ہوئی سرخ گولوں۔ دو پٹوں سے ٹپکتی ہوئی دھانی بوندوں کی جھلکیاں، یا عورت کے کردار میں بیوی، ماں، بہن، اور محبوبہ کی شخصیتوں کا تجزیہ ساحر کے یہاں کا نیا انداز۔ یادوں کی پرچھائیوں میں محبوبہ کا جیتا جاگتا تصور، ان سب کی اپنی اہمیت اور انفرادیت ناقابل فراموش ہے۔

نئے شاعروں سے جمیل کا موازنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ کیونکہ دراصل یہ جمیل کے ہمعصر نہیں ہیں۔ ہر زمانے کا ایک مخصوص رجحان ہوتا ہے جسے روح عصر کہتے ہیں۔ اور اس کے مطابق ہی موازنہ و مقابلہ کیا جانا چاہئے۔ جمیل کی شاعری نے اقبال کے سائے میں آنکھ کھولی ہے۔ جوش کی گھن گرج سنی، اردو شاعری میں عورت کا وقار تقدس کو جس روپ میں انہوں نے پیش کیا ہے۔ اور جو کردار اسے عطا کیا ہے۔ اس کے اور بھی ترقی پسندانہ روپ ہیں۔ مجاز، فیض، سردار، اور ساحر کے یہاں ملتے ہیں اس دور پر جوش اور جمیل کی پرچھائیاں کہیں صاف اور کہیں چھپی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جمیل نے بحیثیت شاعر و مفکر اپنے دور پر نمایاں اثر ڈالا ہے اور کئی ذہنوں نے ان سے کسب فیض کیا ہے۔

ہندوستان کا ماحول اس میں بسنے والی ان ہزاروں لڑکیوں کے دلی جذبات کا اظہار جو سماج کے چند بندھے ٹکے اصولوں کی گرفت میں گھری ہوئی چہار دیواریوں میں زندگی گزار دیتی ہیں۔ ان کی مجبوریاں ان کی محرومیوں، اور ان کی خوشیوں اور غموں کا ذکر، ان کے شوق و سنگھار کا ذکر، سہمے ہوئے معصوم پیار کا ذکر، ان کی ناکامیاں اور تلملاہٹوں میں گھٹ گھٹ کر جینے کا ذکر یہ ساری باتیں اگر جمیل اپنی نظموں کے ذریعہ ہم تک نہ پہونچاتے تو اردو شاعری کا ایک بڑا حصہ زندگی کے اس پہلو سے شاید ناواقف ہی رہتا افسانوں اور ناولوں نے سماج کے اس مخصوص رخ کو اجاگر کرنے میں جو خدمت انجام دی ہے۔ وہی جمیل کی نظموں نے دیا ہے۔ راشد الخیری کے یہاں ہمیں مظلوم عورت کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ مگر یہاں عورت ان آنسوؤں سے ابھر نہیں سکتی۔ بلکہ اس میں ڈوب کر فنا ہو گئی۔ اور اس طرح زندگی کی گھٹن سے اسکو نجات مل گئی۔

شاعر تو بہت ہوتے ہیں۔ ایسا شاعر جو روایت شکن ہو، اور روایت ساز بھی ہو۔ اور جس کی باتوں سے کوئی بڑا نتیجہ اخذ ہو سکے معدودے چند ہی ہوتے ہیں جمیل کی حیثیت ان ہی چیدہ ہستیوں میں سے ایک بڑے اور سچے شاعر کی طرح ہے۔ انھوں نے نہ تو دوسروں کے بتائے ہوئے راستے کو اپنایا اور نہ کہی ہوئی باتوں کو دہرایا۔ انہوں نے شاعری میں اپنی روایت آپ قائم کی ہے۔ اور اپنا انفرادی رول ادا کر کے خود کو ممتاز و نمایاں بنایا ہے۔

اعلان بابت ملکیت

متعلق فارم IV دیکھئے رول نمبر ۸

ماہنامہ سہیل ________ گیا

مقام اشاعت ________ آر۔ ایس روڈ گیا

وقفہ اشاعت ________ ماہانہ

پرنٹر، پبلشر اڈیٹر کا نام ________ ادریس سنبھارووی

قومیت ________ ہندوستانی

پتہ ________ آر ایس روڈ گیا

میں محمد ادریس سنبھارووی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق بالکل درست ہیں۔

(دستخط) محمد ادریس سنبھارووی

بہار اسٹیٹ صنعتی ترقیاتی کارپوریشن پر بہار کو کامیابیاں

عوامی حلقے میں کام کرنے والی یونٹ

۱۔ بہار اسٹیٹ سپر فاسفیٹ فیکٹری سندری، دھنباد
۲۔ ہائی ٹنشن انسولیٹر فیکٹری، نامکوم، رانچی
۳۔ الیکٹرک ایکوپمنٹ فیکٹری، ٹاٹی سلوئے، رانچی
۴۔ بہار اسپن سلک ملز، بھاگل پور
۵۔ بہار اسکوٹرس لمیٹڈ، فتوحا، پٹنہ
۶۔ این۔ پی کے۔ گرینولیشن پلانٹ سندری
۷۔ میلیبل کاسٹ آئرن فاؤنڈری، نامکوم، رانچی۔

جڑے حلقے میں کام کرنے والی صنعتی یونٹ

۱۔ بہار ایر پروڈکٹس لمیٹڈ، آدیت پور۔ جمشید پور
۲۔ راج ہنس اسٹیل لمیٹڈ، ہی جام، سنتھال پرگنہ

عوامی حلقہ کے تحت زیر تعمیر منصوبہ

۱۔ پیپر پروجکٹ، سہرسہ
۲۔ اسپننگ ملز، بھاگل پور

جڑے حلقے میں زیر تعمیر کمرشیل منصوبے

۱۔ بہار کاسٹک اینڈ کیمیکل لمیٹڈ گڑھوا روڈ، پلاموں
۲۔ بہار فاسٹنرس لمیٹڈ، گیا
۳۔ بہار جوٹ پروڈکٹس لمیٹڈ، کشن گنج
۴۔ بہار سالجنٹ اینڈ کیمیکل لمیٹڈ، لاتیہار، پلاموں
۵۔ ویشالی اون اینڈ ٹکسٹائل ملز لمیٹڈ حاجی پور، ویشالی

عوامی اور جڑے حلقے میں بھاوی منصوبے

پیج فائبر پائپ، سوڈا ایش، ایلیسلنس سیلمنٹ، منی سیمنٹ، گریفائیٹ الکٹروڈ، سیلرامک ٹکنکل اسپیٹ، اسپنونج آئرن، اینٹی فرکشن بیرنگ، واچ اسمبلنگ یونٹ، سنٹرل پروسیسنگ ہاؤس، جوٹ ملز وغیرہ۔

مالیاتی مدد

درمیانی اور بڑے صنعتوں کے ادھیمیوں کو سنچوکت علاقے میں لگنے والے صنعتوں کیلئے مالی امداد فراہم کیا جاتا ہے۔

تکنیکی مشورہ خدمت

ہیڈ آفس میں کام کرنے والے یوجنا اور وکاس پرانج ادھیمیوں کو یوجنا کیلئے مشورہ، انتظامی مشورہ منصوبہ پر رپورٹ دیدن جانچ وغیرہ مختلف مضمون پر تکنیکی خدمات فراہم کرتا ہے

ایل۔ دیال
آئی۔ اے۔ ایس
چیرمین کم مینیجنگ ڈائرکٹر
بہار اسٹیٹ انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن
بدھ گیا۔ پٹنہ ۔ ۸۰۰۰۰۱

فون ۲۵۵۴۹/۲۱۹۲۸/۲۱۸۶۱
گرام: انڈسٹریل
ٹیلکس: ۰۲۲۔۳۱۵

بہار کا خود ساختہ بحالی اسکیم

مذکورہ بالا اسکیم ٹکنیکل تعلیم یافتہ بیروزگاروں کو ریاستی حکومت کی مدد سے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے اور آگے بڑھانے کی گارنٹی کرتا ہے۔ ٹکنیکل گریجویٹ، آئی۔ٹی۔آئی۔ ڈپلوما ہولڈر، میڈیکل گریجویٹ اور ڈپلوما ہولڈر جو بیروزگار ہیں انہیں دس ہزار روپیہ تک کا قرض فراہم کیا جائے گا تاکہ وہ اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرکے آگے بڑھ سکیں۔

انجینئرنگ گریجویٹ کو دس ہزار۔ ایم۔بی۔بی۔ایس ڈگری ہولڈر اور ایگریکلچر گریجویٹ کو آٹھ ہزار روپیہ انجینئرنگ ڈپلوما ہولڈر کو سات ہزار روپیہ۔ ویٹنری ڈاکٹر اور آئی۔ٹی۔آئی ڈپلوما ہولڈر کو پانچ ہزار روپیہ۔ یونانی اور آیورویدک معالجوں کو دو ہزار روپیہ۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کو۔

ہر بلاک میں ۱۰ افراد کو کام شروع کرنے کے لئے قرض دیا جائے گا۔ اس طرح اس اسکیم سے ۱۹۸۱-۸۲ کے دوران ۵۸۸۰ افراد مستفید ہوں گے۔ کل ۴ء۷ کروڑ روپیہ میں سے ہر بلاک کو اسی ہزار روپیہ ایڈوانس کی شکل میں دیا جائیگا اس حقیقت کی تحقیقات کیلئے بی۔ڈی۔او کو ڈپٹی ڈیولپمنٹ کمشنر کی تصدیق شدہ درخواست پر غور کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ ہریجن، آدی باسی، خواتین اور غریب خاندان کو ترجیح دی جائے گی۔

خود ساختہ بحالی پر دی جانے والی رقم پر محض ۲ فی صد سود چارج کیا جائے گا۔ اس کے لئے کسی قسم کی گارنٹی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہر قرض لینے والے کو اپنا ذاتی بانڈ پیش کرنا ہوگا۔ قرض کی واپسی دو برس کے بعد ۶ ماہ میں ۱۰ قسطوں میں ادا کرنی ہوگی۔

IPR 669-D (PR277) 81

صرف خواتین کے لئے

خوشبودار

کلیمیک

غیر ضروری بالوں کو بہ آسانی منٹوں میں
دور کر دیتا ہے

۲۵ گرام کی ٹیوب ایک
قیمت :- ایک روپیہ
[illegible] سیلز ٹیکس
ہر اچھے اسٹور پر
دستیاب ہے

بنانے والے :-
ایچ - بی - اینڈ کمپنی

JAMEEL MAZHARI NUMBER
Regd with the R. N. P. at R...
43rd Years of Publications
The SOHAIL MONTHLY. River Side Road, GAYA : 823001



علامہ جمیل مظہری

ایگمارک

بھارت سرکار ایگ مارک کا لیبل
پیک شدہ اشیاء کے خالص اور اعلیٰ
کوالٹی کے ہونے کی گارنٹی کے طور
پر جاری کرتی ہے۔

اعتماد کے ساتھ خریدیئے!

ایگمارک پر بھروسہ کیجئے!!

گھی، مکھن، خوردنی تیلوں، شہد، دالوں اور
پسے ہوئے مسالوں کو ایگمارک لیبل تبھی جاری کیا
جاتا ہے جب اعلیٰ ساز و سامان سے لیس لیباریٹریوں
میں ان کی اچھی طرح بار بار جانچ پڑتال کر لی جاتی ہے۔



یہ خالص ج
اور اعلیٰ درجے
اشیاء ہوتی ہیں

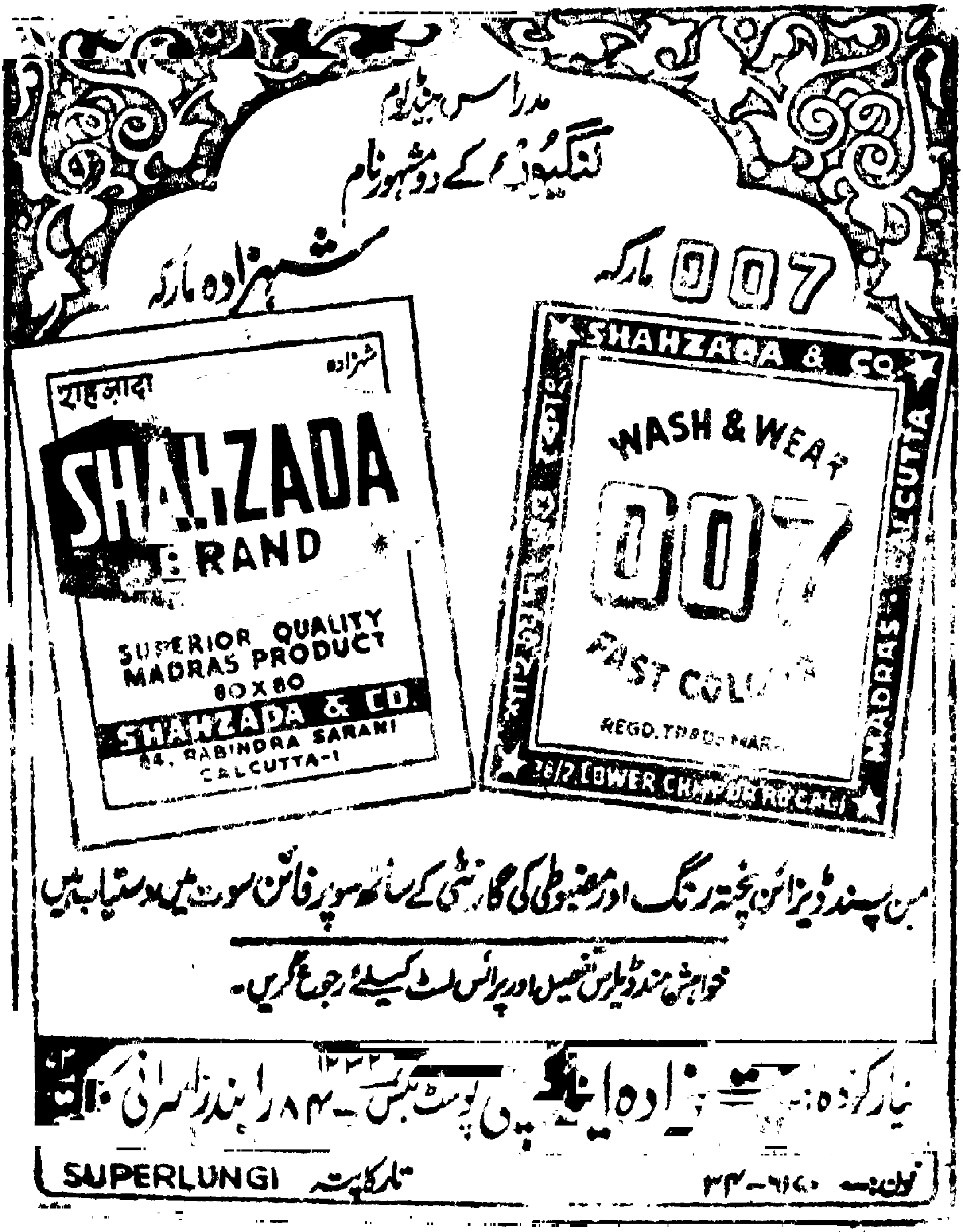
ہمیشہ ایگمارک لیبل والی اشیاء خریدیئے!

یہ پنساریوں اور جنرل اسٹوروں سے باسانی دستیاب ہیں

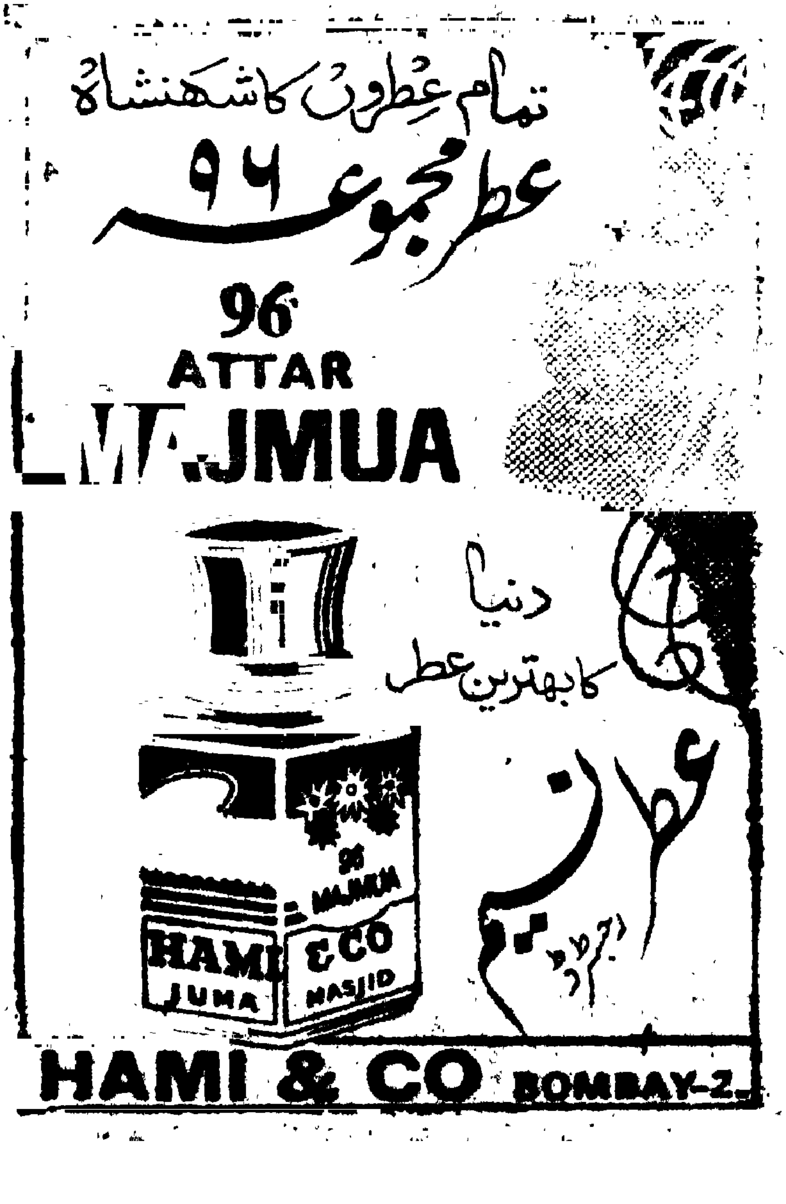
DAVP 81/317



سالہا سال سے مقبول عام گھریلو دوا
ہند تیل
جسمانی درد۔ چوٹ۔ موچ۔ زخم۔ جلنے کٹنے میں بے حد مفید ہے۔ اس کی مالش کمزور بچوں کو طاقتور بناتی ہے۔ ایک دو شیشی ضرور گھر میں رہنی چاہئے
ہیکو
ہند جوشازہ
بخار نزلہ زکام کے لئے طب یونانی کی بے حد مفید دوا ہے۔
ہند سالٹ
پیٹ کے سب امراض درد شکم مروڑ، بدہضمی کھٹی ڈکاریں اور پیٹ کی گیس کے لئے نہایت مفید ہے مگر معدہ کو قوت دیکر ہاضمہ بڑھاتا ہے۔
سرمہ مقوی نظر
مختلف امراض چشم میں فائدہ مند ہے۔ اس کا روزانہ استعمال آنکھوں کو خوبصورت اور نظر کو روشن رکھتا ہے۔
ہند سی سی ورکس۔ مئوناتھ بھنجن (یو۔پی)



مدراس ہینڈلوم
لنگیوں کے دو مشہور نام
شہزادہ مارکہ
007 مارکہ
شہزادہ
SHAHZADA
BRAND
SUPERIOR QUALITY MADRAS PRODUCT
80 X 80
SHAHZADA & CO.
84, RABINDRA SARANI
CALCUTTA-1
SHAHZADA & CO.
WASH & WEAR
007
FAST COLOUR
MADRAS · CALCUTTA
من پسند ڈیزائن پختہ رنگ اور مضبوطی کی گارنٹی کے ساتھ سوپر فائن سوت میں دستیاب ہیں
خواہش مند ڈیلرس تفصیل اور پرائس لسٹ کیلئے رجوع کریں۔
SUPERLUNGI
تار کا پتہ
فون نمبر



تمام عطروں کا شہنشاہ
عطر مجموعہ ۹۶
96
ATTAR
MAJMUA
دنیا
کا بہترین عطر
96
MAJMUA
HAMI & CO
JUMA MASJID
HAMI & CO BOMBAY-2.

بانی مولوی حافظ عبدالرحمن بسمل سنہاروی

بیادگار مولوی محمد زین العابدین احمر سنہاروی

ترقی پسند ادب کا ترجمان

ماہنامہ سہیل گیا

جلد ۴۳ شمارہ ۴۹-۵۰

اپریل، مئی ۱۹۸۲ء

مدیر اعلیٰ: مسعود منظر

مدیر: جمیل منظر سنہاروی

معاونین

شکیل احمد ● عبدالقیوم ابدالی

مجلس ادارت

ادریس سنہاروی
ڈاکٹر قمر رئیس
ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
اصغر علی انجینیر
سالک لکھنوی
شاہد احمد شعیب

زر سالانہ ۱۵ روپے ○ معاونین سے ۵۰ روپے ○ تاعمر خریداری ۲۵۰ روپے ○ ممالک غیر سے بحری ڈاک سے ۲½ پونڈ

توسیل زر کا پتہ
منیجر ماہنامہ سہیل
ریور سائڈ روڈ، گیا

فی پرچہ
ایک روپیہ پچیس ۱/۲۵
پیسے

خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر ماہنامہ سہیل
ریور سائڈ روڈ، گیا

پرنٹر، پبلشر، ڈیم ادریس نے تاج پریس، گیا میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ سہیل ریور سائڈ روڈ، گیا سے شائع کیا

فہرست

نمود

- یہ شمارہ "ضمیمہ علامہ جمیل مظہری نمبر" ہے۔ علامہ جمیل مظہری نمبر مارچ ۸۲ء میں شائع ہوگیا ہے۔ تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر ان مضامین کو نمبر میں شامل کرنا دشوار ہوگیا تھا کیونکہ نمبر کے شائع ہونے میں مزید تاخیر ہوجاتی جس کے لئے نہ تو ادارہ تیار تھا اور نہ قارئین ہی صبر کے لئے تیار تھے۔ علامہ پر لکھے گئے یہ مضامین بہت اہم ہیں اس لئے اس کی اشاعت ادبی مفاد میں ہے۔

- "علامہ جمیل مظہری نمبر" کے لئے ادارہ نے کوئی بلند بانگ دعوے نہیں کئے تھے لیکن کوشش ضرور تھی کہ علامہ مرحوم کے شایان شان ہی یہ خاص نمبر شائع کیا جائے۔ اہل قلم حضرات نے تعاون فرمایا اور یہ نمبر شائع ہوگیا۔ ادارہ کو کامیابی حاصل ہوئی یا نہیں یہ فیصلہ تو قارئین ہی کرسکتے ہیں لیکن اب تک اس خاص نمبر سے متعلق جتنے خطوط موصول ہوئے ہیں اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ ادارہ کو کسی حد تک کامیابی ضرور ہوئی ہے۔

  ادارہ نے علامہ پر کام کرنے کی ابتدا کردی ہے۔ اب دوسرے اداروں کا فرض ہے کہ اس کام کو آگے بڑھائیں۔

- ہند و پاک کے بے شمار قارئین اور احباب کے خطوط موصول ہو رہے ہیں کہ ترقی پسند ادب کی بلند و بالا شخصیت جناب علی سردار جعفری پر سہیل کا ایک خاص نمبر شائع کیا جائے۔ مجھے ادارہ کی تنگ دامانی کا احساس تو ہے لیکن اتنی بے ہمتی بھی نہیں کہ قارئین کی اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنایا جاسکے۔ ایسے تمام موقعوں پر اہل قلم حضرات نے ادارہ کے ساتھ تعاون کیا ہے اور آئندہ بھی اس کی توقع ہے۔

- ۵ سو صفحات پر مشتمل **"علی سردار جعفری نمبر"** نہ صرف ادبی دنیا میں ایک بلند مقام حاصل کرے گا بلکہ کتابت و طباعت کا اعلیٰ ترین نمونہ بھی پیش کرے گا۔

  اہل قلم حضرات اپنے تعاون کا یقین دلائیں تاکہ ان کے لئے صفحات محفوظ کردئے جائیں۔

جمیل منظر سنہاروی



قدرتی تیل
کارخانہ دارالصحت کا ایک بے نظیر تحفہ
QUDRATI TEL
DARUSSEHAT
درد، زخم، چوٹ
کٹنے، جلنے
سردی
مفید
جسکو خرید کر
آپ
خاندان کے ہر فرد کیلئے ایک وقت
ان مرضوں میں فوری فائدہ
پہنچا سکتے ہیں

قطعات

از: رضا مظہری

بیادِ برادرِ معظم حضرت علامہ جمیل مظہری (مرحوم)

(۱)

یہ مہر و ماہ فلک ڈوب کر اُبھرتے ہیں
یہی نظام ہے جاری جہاں میں قدرت کا
غروب تجھ میں ہوا جو زمینِ بھیکن پور[۱]
وہ آفتابِ سخن پھر کبھی نہ اُبھرے گا

(۲)

وہ آفتاب تہِ خاک اگرچہ پنہاں ہے
جہاں میں چھوڑ گیا ہے وہ اپنی تنویریں
جہانِ فکر میں اُبھریں گی جو نئی سمتیں
اسی کے خواب کی ہونگی حسین تعبیریں

(۳)

جو نظم و نثر کے ہیں نقش انکے سب ہیں جمیل
جمیل نام تھا انکا تو فکر بھی تھی جمیل
ادیب اور سخنور تو آج بھی ہیں بہت
مگر وہ طرزِ بیاں میں تھے آپ اپنی مثیل

[۱] نوٹ: بھیکن پور شہر ظفر پور سے پانچ میل شمال میں واقع ہے مرحوم وہیں مدفون ہیں۔

جمیل مظہری کی غزلیں

علی جواد زیدی

جس دور میں مظہری نے غزلیں کہی ہیں، وہ دور غزل کے مقابلے میں نظموں کی ترقی کا دور ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسی دور (بیسویں صدی) میں ہمارے کچھ بہت نمایاں غزل گو پیدا ہوئے ہیں۔ عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، آرزو لکھنوی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، یگانہ چنگیزی، حسرت موہانی، فراق گورکھپوری وغیرہ کا اس سلسلے میں فوراً خیال آتا ہے۔ انھیں اصحاب کی صف میں وہ گوشہ نشیں اور تنہائی پسند شاعر بھی شامل ہے جسے لوگ جمیل مظہری کے نام سے جانتے ہیں۔ اور وہ بھی شاعر کی حیثیت سے۔ غزل گو کی حیثیت سے ان پر نظر اس وجہ سے نہیں پڑی کہ وہ ہمیشہ مشاعروں سے اور اشتہار بازی سے کنارہ کش رہے۔ عمل کی زندگی نے انہیں جیل تک پہنچایا، وطن دوستی اور ترقی پسندی کے راستے سے کبھی مڑ کر نہیں ہٹے۔ اور عمر بھر ... اور آخر تنہائی میں مصروف ہے۔ انہیں دانست نے ... کر ان کو اس اعتراف پر مجبور کیا کہ "یہ غلط نہیں ہے کہ میں انجمن میں تنہا ہوں،" مگر یہ اب تنہا نظر آتا ہے کہ جس کی زندگی اس طرح کی تنہائی میں بسر ہوئی ہو وہ یوں گوشہ نشیں ہو۔ لیکن آخر انھیں

کے رفیقوں میں مولانا آزاد بھی تو تھے، بہرحال ان کا تغزل اس دور میں خاصے کی چیز ہے۔ اور ان کی انفرادیت اس میدان میں بھی اپنی طرف توجہ مبذول کرائے بغیر نہیں رہ سکتی۔

جمیل مظہری اردو کے ان طرحدار ادیبوں میں ہیں جن کا اپنا خاص مقام ہے۔ اور مشاعرہ بازی اور اشاعت کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی فنی اور فکری بلندیوں کی وجہ سے ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتے رہیں گے۔ وہ "انجمن میں تنہا" سہی لیکن وہ بجائے خود ایک محشرِ خیال بھی ہیں اور شاعری کو "طوفانِ محسوسات" کی ایک لہر اور "زندگی" کو "بیداریٔ احساس" کا مترادف مانتے ہیں۔ "عشق" کے معاملے میں طبعاً حسرت موہانی سے قریب ہیں۔ ان کی محبوبہ کے اردگرد گھریلو فضا ہے۔ جب نگاہِ وقت سورج کی دھوپ بھی کڑی ہونے لگتی ہے۔ تو عذرا کا آنچل سایہ بانی کے لیے جمیل کے سر تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ محبت "جلوہ تنک" سے نہیں بلکہ طویل رفاقت کی دھیمی آنچ پر پختہ ہوئی ہے۔ ع

جواں ہو کر محبت کیوں نہ ٹپکے اس کی چتونوں سے
مری معصوم بیتابی نے پوجا جس کو بچپن سے

اسی عذرا نے شاعر کو چلمنوں سے جھانکا ہے اور اس کی چوڑیوں کی سنگیت پر محبت نے نغمے گائے ہیں۔ اس نے ندعا

اور اس کی سکھیوں کو پانی بھرتے دیکھا ہے۔ اور محسوس کیا ہے کہ ان لمحوں میں سانولی رادھا کا گوری اور دھوپ گلابی ہو جاتا ہے اور اسکی رادھا کا نرم سے پر سر رکھ کر جنگل کے سناٹے میں شام ہونے تک آنسو بہاتی اور کرتی رہتی ہے۔ عذرا اور رادھا کے اشعار غالباً جمیل نے جان بوجھ کر چنے ہیں۔ ان کے محبوب لیلیٰ اور شیریں نہیں ہیں وہ ان لمحوں سے کام نہیں لیتے۔ ان کی قیسیت اور فرہادیت یکطرفہ نہیں ہے بلکہ لیلیٰ اور مجنوں، شیریں اور فرہاد کی تفریق مٹ گئی ہے وہ محبوب کی آنکھوں میں محبت پڑھتے ہیں اور اس کے لرزتے ہوئے آنسوؤں سے سکون حاصل کرتے ہیں ؎

اگر اس سے پہلے ملالِ جدائی۔ تو پھر اسکی آنکھوں میں آنسو گوارا
تمہاری ایک نظر میں ہزار معذرتیں۔ یہ کہہ رہی ہے کہ اب تاب بے رخی نہ رہی۔
ٹرکا کر کی منفعل نگاہیں کے ہیں محبت کے پینگ ہلکے
جھکی جھکی پر خلوص آنکھیں بنی ہیں گہوارا آرزو ... کا

یہ آگ ایسی ہے کوشش عشق سمجھتا ہے کہ وہ ساری دنیا کو اس آگ میں جلا ڈالے گا۔ ؎

سماج کیا ہے یہ اپنے سینوں کی سخت دیواریں توڑ دیں گے
کہ جب بڑھے آ رہے ہیں دو دل سوال پھر کیا ہے آبرو کا۔

لیکن یہ دنیا اور یہ سماج دونوں کی آگ کو کیا جانے۔ اور بے پروائی سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور یہ سوچتے بھی نہیں کہ اس تیز رفتار میں کیا کچھ پامال ہو گیا۔

بنائے تھے شوق کے گھروندے، طلسم باندھا تھا رنگ و بو کا۔
لگائی دنیا نے ایسی ٹھوکر اینٹ گیا خواب آرزو کا۔

بے ہوشی میں بھی ہوشیاری جمیل صاحب کو دوسرے غزل سراؤں سے ممتاز بناتی ہے۔ ان کی محبت گردوپیش کے ماحول سے پوری طرح باخبر ہے۔ اور اس کا باقاعدہ احساس رکھتی ہے۔ ؎

بدل جاتے ہیں دل حالات جب کروٹ بدلتے ہیں
محبت کے تصور بھی نئے سانچے میں ڈھلتے ہیں
اجالے کا پجاری مضمحل کیوں ہے اندھیرے سے
کہ یہ تارے نکلتے ہیں تو سورج بھی نکلتے ہیں

ان کی انفرادیت محبت، بھرتی دوروں میں اجتماعی احساس کو اپنا لیتی ہے، اور غمِ ذات، غمِ کائنات میں بدل جاتا ہے۔ ایسے اوقات محبت طلب کے راستے کی وہ ٹھوکر بن جاتی ہے کہ جس سے زندگی کی ریت میں زمزم ابلتے ہیں۔ اس وقت جمیل کی غزل صنفی حدود کو توڑ دیتی ہے۔ مگر اس طرح کہ آہنگ غزل پہ تبدیلی بار نہیں ہوتی۔ ملاحظہ ہو ؎

نہ آئے گی شفق ادھر اپنی بہار و رنگ و بو لے کر
کہ اس گلزار کی ہر شاخ میں اب زخم پلتے ہیں
وہاں تیری شب غم کی درازی کون ناپے گا
جہاں فاقہ کشوں کے دن بڑی مشکل سے ڈھلتے ہیں
وہاں کیا ہو گی ہمدردی تیرے چاک گریباں سے
جہاں عفت کے سینوں پہ پھٹے آنچل مچلتے ہیں
گئے وہ دن کہ جب زخم تمنا گل کھلاتا تھا
کہ اب تو زندگی کے کھیت انگارے اگلتے ہیں

یہ صاف طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ سیاسی رمزیت سے ایک قدم آگے کی منزل ہے۔ اور حالی سے اقبال تک نئی روایتوں کا جو ایک طویل سلسلہ ہے اسکی یہ ایک واضح کڑی ہے۔ یہ روایت جمیل پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ مجاز، سردار جعفری، جاں نثار اختر وغیرہ کے یہاں

اس روایت کو اپنا [illegible] اس کو آگے [illegible]
صاف پتہ چلتا ہے۔ ابھی تک تذکرہ نگاروں نے ترقی پسندی کے ابتدائی دور پر اختر شیرانی کی پرچھائیوں کا ذکر تو کیا ہے لیکن مظہری کے خاموش اثر کا اعتراف کم ہوا ہے۔ لیکن ارتقاء کی منزل میں قافلہ جن راہوں سے ہو کر گزرا ہے اس میں ایک اہم سنگِ میل مظہری کا تغزل بھی ہے۔

جمیل کے تغزل کی نمایاں خصوصیت اس کا سوز و گداز ہے مگر اس سوز و گداز میں رجائیت بھی صاف طور سے نمایاں ہے۔ اسکی نمایاں مثالیں ان اشعار میں نظر آئیں گی جن میں جمیل نے سفر و مسافرت کا ذکر کیا ہے۔ یہ سفر جمیل نے تنہا نہیں کیا ہے بلکہ ایک پورا کارواں ان کے ساتھ ہے اور جمیل تنہا نہیں چلنا چاہتے بلکہ کارواں کو ساتھ لیکر چلنا چاہتے ہیں۔ اور اسی لیے وہ ایسی تیز رفتاری کے قائل نہیں ہیں جو کارواں کو پیچھے چھوڑ کر تخیل پرستی کی سرحدوں میں داخل ہو جائے۔ راستہ ایسا ہے کہ بس سمت معلوم ہے لیکن اکثر موڑوں کا پتہ نہیں کہ ان کے بعد کیا ہوگا؟ راستہ میں صعوبتیں بھی ہیں اور اہلِ کارواں کو راستے تک [illegible] امید نہیں ہے۔ راہبر ہیں لیکن ان میں ایسے بھی ہیں جو بعض اوقات گھبرا جاتے ہیں، یا غلط فیصلے کر بیٹھتے ہیں۔ ایسے موقعوں میں اپنے ہی جذبۂ بے اختیار پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے، یہ جذبۂ بے اختیار کبھی کبھی جوانی کی بے راہ روی کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے، لیکن اس گمرہی سے رہبری کا مزاج بنتا ہے اور خود احتسابی، بلند کرداری کی ضامن بن جاتی ہے۔

جب آپ مندرجہ ذیل اشعار کو پڑھیں گے تو آپ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے کہ ان میں سماجی شعور اپنی تمام تابانیوں کے

[illegible] غزل کے کنایات میں عصری سیاسیات کی داستان سنائی جا رہی ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تاریخی اعتبار سے یہ اشعار آزادی کے حصول کے پہلے کے ہیں اور اسی دور کے مقتضیات کے پس منظر میں سمجھے جا سکتے ہیں۔

یہ میرا مڑ مڑ کے دیکھ لینا بھی ہے میری شانِ رہبرانہ
قدم میں کس طرح تیز کر دوں کہ میرے پیچھے ہے اک زمانہ
یہ محمل کب تک یہ چھاؤں کب تک رہیگا ہاتھوں میں پاؤں کب تک
جمیل کانٹے نکل چکے ہیں تو رحم کر اپنے رہنما پر
یہ گھر جوانی کی بے رہروی ہے۔ یہ دریا بنا لیگا خود ہی [illegible]
ہوا موافق بھی ہو عزیزو تو اس کنارے سے دور رہنا۔
میں بار کے اس کنارے پہ اپنی کشتی ڈبو چکا ہوں۔

کارواں سے تو چولہوں میں جھونک دیں گھنی شاخیں
اب نہیں کہیں سایہ یہ خستگی کہاں جائے
جرس بھی چپ ہے حدی خواں بھی سو گئے لیکن
تری نگاہ میں اب تک پکار ...... باقی ہے
نہ رہبروں پہ بھروسہ نہ راستوں پہ یقین
بس ایک جذبۂ بے اختیار باقی ہے
یہی بہت ہے کہ ساحلوں کے طوفان میں
سفینۂ دلِ امیدوار باقی ہے۔
جو نشیب آئیگا راستہ دکھائیگا
مہر و ماہ و انجم کو نقشِ پا بنایا ہے
راحت نہ کسی صورت اے بے وطنی پائی
بستر نہیں یاد آیا، جب چھاؤں گھنی آئی
اے موسمِ گل تجھ سے ہم سادہ مزاجوں نے

گُل ہیر ہنی مانگیں خوشیں کفنی پائی

لیکن ان اقتباسات سے یہ کوئی ایسا تصور قائم نہیں کرانا چاہتا کہ جمیل کی زندگی کا ہر لمحہ وقف سیاست رہا ہے اور اس میں محبوبہ کی حیثیت گھر میں بیٹھی انتظار کرنے والی حسینہ اور رفیقۂ سفر سے زیادہ کچھ اور نہیں ہے۔ غزلوں کے آئینے میں جمیل کے عشق کا جو عکس نظر آتا ہے اس میں شباب کی گرمی ہے، جذبات کا وفور ہے، وفا کا غرور ہے لیکن بوالہوسی نہیں ہے۔ وہ محبت کو ایک جذبہ سکوں سمجھتے ہیں۔ اور اس اضطرار و اضطراب کو جس کی نمائندگی مجنوں اور فرہاد کا عشق کرتا ہے، نقاہت عصبی قرار دیتے ہیں۔ ؎

سکوں ہو تو محبت کا کچھ سراغ ملے۔ یہ اضطراب تو ہے اک نقاہت عصبی

ان کا عشق مقصود بالذات ہے اور آرزو کا وجود ان کے "خودمشتہرہ" کو ناگوار گزرتا ہے ؎

فریب اسکے تمنائیں پھر گئیں یا یوسؔ
غرورِ عشق نے دورانِ دل کا بند کیا

جب مقصود بالذات ہو تو وہ ہمیشہ وسیع تر دنیا کی تلاش میں مصروف رہنے پر مجبور رہے اور یہیں سے معرفت کے دروازے کھلتے ہیں، یعنی اگر محبت کسی کونے میں بند ہو جائے تو یہ شوق کی کم ہمتی ہوگی۔ اگر محبت کا محور حسن ہے اور اگر حسن غیر محدود ہے تو پھر ایک کا ہو کر رہ جانا کیا۔ ؎

سچ تو یہ ہے کہ وفا بھی ہے تھکن کا احساس نگہ شوق کو میں گرم سفر رکھ نہ سکا

بایں ہمہ غرور محبت، وفا سے کیا۔ ایک تشنگی جو خرد محبت نہ ہو سکی

تعجب ہوتا ہے کہ اگر جلوۂ شوق کی راہ میں وفا حائل ہے تو پھر جمیل نے جلوۂ شوق ہی کیوں نہیں اپنایا، اس کا سبب وہ وفا ہے جو کہیں اور پیدا ہو چکی ہے اور جمیل کے دل میں الجھنے سے پہلے۔ ؎

کون کہتا ہے بڑھا شوق ادھر سے پہلے
کس نے دیکھا تھا کسے ترچھی نظر سے پہلے
جنبشِ مضطرِ پردۂ عصمت کی قسم
جلوئے بیتاب ہوئے ذوقِ نظر سے پہلے

اتنا ہی نہیں بلکہ جمیل کاجل بھری آنکھوں میں محبت کے آنسوؤں کو چھلکتے دیکھا، کاجل کی لکیر پھیلی دیکھی، بلکہ پھوٹ پھوٹ کر روتے سنا ہے، انھوں نے محبوبہ کا چہرہ ہنستا ہوا اور پیلا پایا ہے، انھوں نے بارہا محسوس کیا ہے کہ عاشق کا نام سنتے ہی محبوب کے ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے اور اسکی نگاہیں جھک جاتی ہیں۔ لیکن انجام وفا رہے ؎

مت جاؤ ادھر لے جا مجھے اس گھاٹ کو میں پہچانتا ہوں
پھونکی تھی وہیں تو ہم نے چتا اپنی مرحوم تمنا کی
کچھ ڈھیر راکھ کے ہیں کچھ ادھ جلی سی لکڑی
آیا تھا اک مسافر صحرائے زندگی میں۔

انجام وفا کچھ بھی ہو لیکن، محبت انجام سے نہیں آغاز سے ربط رکھتی ہے۔ اس بات کو جمیل نے بڑی خوبصورتی سے اور برجستگی سے دو سیدھے سادے شعروں میں نظم کر دیا ہے۔ ؎

میں کیا کہوں کہ عذرا کیا تھی تیری محبت
اک نخل مل گیا تھا صحرائے زندگی میں۔

دنیا کی معاشی فکروں نے یا اس کی دیوانی عذرا کی
اک بجلی تھی جو رہ رہ کر تاریک گھٹا میں چمکا کی

شاید اس نے شاعر کو باغی بنایا، یا اس کے سماج اور دوسرے حالات نے بھی، لیکن عشق اسے بغاوت تک لے گیا ضرور۔ اس بغاوت کا ذکر یہاں موضوع سے خارج ہے لیکن وہ تصادم احساس و فکر جس کا نام محبت

آرزوؤں کی چتا تیار کرنے سے پہلے بہت سی صدیاں پیار اور بہت سی انگیز راہوں سے بھی گزر رہے ہیں ۔۔۔ کے ان نہ راتوں میں رنگینیوں اور مستیوں کی گزر [illegible] رہا ہے ، اس وادی میں کانٹے بھی پھول بن گئے تھے [illegible] کا کیا کہنا ہے

تیری عطا کے تلخ نوش پی کے بنا رہے ہیں منہ
گھول دے اک ذرا سا رس نرگس نیم خواب کا

جمیل اس [illegible] رخ کو ہوا نہ دو ابھی ۔۔

اب اور چاہیئے کیا ، اک شرار دے تو دیا
مرے شعور کو کلیاں اب اور کب دیتیں ۔
تمہارے لب نے [illegible] پیار دے تو دیا ۔

ابھی دنیا حقیقت کا تحمل کر نہیں سکتی
ابھی نیچی نگاہوں میں چھپا رہنے دو راز اپنا

تمہاری ایک نظر میں ہزار عذر نہیں ۔
یہ کہہ رہی ہیں کہ اب تاب بے رخی نہ رہی

شرمگیں نگاہوں سے جو سوال پیدا ہیں
شوق کی حریص آنکھیں سوچ لیں جواب انکا

وہ جاچکے ہیں اور آنکھوں پہ اعتبار نہیں
وہ آچکے ہیں مگر انتظار باقی ہے ۔

حسن بیباک نگاہوں سے پریشاں ہے جمیل
ایک ہلکی سی شوخی ہے حیا کچھ بھی نہیں

لو لگا کے بیٹھے ہیں کشت آرزو والے
دیکھئے کہاں برسے جھومتا شباب ان کا

لائی ہے جب عکس تیری زلف کی چھاؤں میں مجھے
مانگ لے چند جھپکیاں نرگس نیم خواب سے

اس تبسم پہ فلسفہ ہو نثار !
دل کی گرہیں جو کھولتا جائے
سوال کا ایک تبسم جواب میں

تیری طرح جمیل کچھ [illegible] اگر سے کوئی
بکھرا دیئے کسی نے یہ ہنستے ہوئے پھول

مستوں کی طرح بادِ صبا جھوم رہی ہے

عشق کی اصطلاح میں نام ہے اس ادا کا کیا
جو کہ لبوں پہ روک لے خندۂ بے قرار کو

تبسم سے نرگس نیم خواب تک سفر طے کرتے کرتے ، مجاز حقیقت کی وادیوں میں جا بھٹکا اور مظہری نے محبت کو فلسفہ بنا ڈالا ۔ اس خالص دنیاوی محبت کے لیے کوئی شرعی جواز درکار تو نہیں تھا ، لیکن نظروں میں جب محبت کی وسعت پیدا ہوتی ہے اور احساس حسن بیدار ہوتا ہے تو ذرہ میں اپنا پن محسوس ہونے لگتا ہے ۔ اور حسن ہر رنگ میں سو رنگ پیدا کرتا ہے ۔ اور عشق ہر رنگ پر جھوم اٹھتا ہے ، جب کثرت میں وحدت کا یہ مجازی جلوہ نظر آتا ہے تو عشق کا فطری جلوہ ایک علوی جذبہ میں تبدیل ہو کر حقیقت کے ترانے گانے لگتا ہے ! اس منزل پر پہنچ کر ایک گروہ تو وہ ہے جو حقیقت کو مجاز سے جدا یعنی مجاز میں عکس حقیقت دیکھتا ہے اور دوسرا وہ جو وحدت وجود کا لحاظ کر کے " ہمہ اوست " کا نعرہ لگاتا ہے ، اور جمیل کا تعلق اسی آخر طبقہ سے ہے اگرچہ وہ اس عقیدے سے بھی وفادارانہ وابستگی نہیں رکھتے ۔

جمیل عرفان و عشق کے اقبالی مجرم ہیں ، اور اس میں شک نہیں کہ ان کی غزل پر شاعری بیشتر انہیں دو عناصر ترکیبی سے بنی ہے ۔ عاشقانہ مزاج کے شعر کہنے والے ہر دور میں بہت ہوئے ہیں ۔ اگر ایک طرف میر کا زخمی سوز و گداز ہے تو دوسری طرف دور انحطاط میں جنازوں کی دھوم ، شمع مزار کی جھلملاہٹ ، ضعف مرض ، جانکنی اور ماتم گساری ہے ۔ اگر ایک طرف جان صاحب کی رنگینی اور جرأت کی معاملہ

بندی نے لیکر میراجی کی بے رہ روانہ سراہٹ ہے تو دوسری طرف حسرت، نشتراقی اور جمیل مظہری کا وہ سنبھلا ہوا احساس عشق ہے جو حقیقت کی دنیاؤں کے ارد گرد چکر لگاتا ہے۔ یہاں رقیبوں کے جھگڑے نہیں ہیں بلکہ رقیب کے درد کا بھی احساس ہے اور یہ جذبہ سب سے زیادہ شدید جمیل مظہری کے یہاں ہے، انہوں نے غیر اور رقیب کی لفظیں ہی استعمال نہیں کی ہیں بلکہ انھوں نے اپنی ادھا کو رخصت کرتے وقت یہ تلقین کی ہے کہ ؂

چلی ہو لیکن یہ یاد رکھو کہ انہیں کوئی کمی نہ کرنا
ہمارا خونِ جگر بھی مانگے اگر تمہارا سہاگ تم سے

اور وحدت تصور کا یہ عالم ہے کہ جمیل اپنے بچپن کے ساتھی کو جدائی کے وقت یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ؂

یہ ساری تمنائیں مری اس مانگ کے سیندور کے صدقے
جو تیرا جیون ساتھی ہے وہ میرا جیون ساتھی ہے

یہ نغمۂ عشق ہونے کے باوجود، ایک نیا احساس حسن و عشق پیدا کرتا ہے، ایک نیا تصور دیتا ہے۔ جس سے یقیناً اس دور کی غزل نا واقف ہے، البتہ مجاز کے یہاں مادام نظموں میں جمیل کی اس تجربہ کی گونج سنائی دیتی ہے۔

عشق کی مجازی دنیا میں غیرت کے پردوں کے اٹھانے والا حقیقت کی دنیا میں کب من و تو کے جھگڑوں کو باقی رکھے گا۔ لیکن تصوف کے اب رسیا کتنے رہ گئے ہیں اور عارفانہ تغزل کی وادی میں تو شاید مظہری بالکل تنہا ہوں۔ شاید اسی لیئے کہتا ہوں کہ جگر مرادآبادی بھی اب تصوف کی طرف جھکے ہیں لیکن ان کے یہاں وہ فلسفیانہ اور مفکرانہ رکھ رکھاؤ نہیں ہے جو جمیل کا متصوفانہ شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ صوفی صافی ہیں اور وحدت وجود کے قائل ہیں، لیکن اس عقیدہ تک فلسفہ و منطق کی راہ سے بلکہ جذبات کی شاہراہ سے آئے ہیں اور اسی لیئے اپنے عقیدے و لفظوں کا پابند نہیں بنانا چاہتے۔ ؂

یہ کیا بتاؤں کہ تو کیا ہے اور کیا ہوں میں
ہجوم لفظ و معانی میں کھو گیا ہوں میں

اس زہر کی تلخی کو جو چکھو تو جمیل ایک دن
حافظ نے جسے پی کر شیریں سخنی پائی

جمیل کے یہاں جس آگاہی کا بار بار ذکر ملتا ہے اس کا تعلق بھی دل سے زیادہ اور دماغ سے کم ہے اور یہ رازِ آگہی وہ ہے جو وارفتگی تک پہونچا دیتی ہے۔ ؂

جمیل رازِ آگہی پر اپنی نہ ڈال وارفتگی کے پردے
نگاہ کتنی ہی منعکس ہو، مگر یہ تیور ہیں مجرمانہ

مت پوچھئے حال مظہری کا
مارا ہے فریب آگہی کا

سوزِ دل، شعلۂ فطری ہے جمیل
یہی بنیادِ تجلی ہے جمیل

روشنی آگ سے ہوتی ہے جمیل
نہ تپش ہو تو ضیا کیسا ہو گی

وارفتگی اور آگہی کے امتزاج نے جمیل کو وحدت وجود تک پہونچایا ہے۔ لیکن ,, کل و جزو " کا ایک فرق یا وجود کے جہات کا ایک احساس بھی جمیل مظہری کے یہاں ضرور ملتا ہے یہی احساس وحدت میں کثرت کے جلوے پیدا کرتا ہے اور وجود خاکی کو وجودِ نوری سے ممتاز بناتا ہے۔ غالباً حقیقت واحد کی ان جہتوں کو زمان و مکان کے تصور نے پیدا کیا ہے۔ اور زمان و مکان کے تصور کو احساس وجود کی جب یہ جہتیں مٹ جاتی ہیں تبھی وصال ہوتا ہے لیکن جب تک باقی رہتی ہیں قطرہ بہنا ہے دریا تک پہنچے کیلئے بیتاب رہتا ہے۔ ؂

مگر رہے گی ابد تک تلاش اسکی جمیل

بچھڑ گیا تھا ازل میں جو جزوِ نور میرا
ہستی ہے جدائی سے اس کی جب وصل ہوا تو کچھ بھی نہیں
دریا میں نہ تو قطرہ تھا، دریا میں ملا تو کچھ بھی نہیں

لیکن جمیل کی حقیقت پسندی مجاز کے واضح تصور سے اور مادی حقیقت کے احساس سے کا رشتہ جدا بھی نہیں ہونے دیتی۔ وہ مجاز کو کبھی حقیقت نہ کہہ کر صرف لباس حقیقت کہہ جاتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ مشاہدہ حق کی گفتگو بھی مجاز کا سہارا لئے بغیر کام نہیں چلتا کیونکہ اس زینہ کے بغیر بام حقیقت تک پہنچنا ناممکن ہے اور منطقیانہ موشگافیوں میں الجھ کر مجاز و حقیقت کے مابین کوئی ایسا خط فاصل کھینچنا جو ماہیت کا فرق واضح کرے ناممکن ہے۔ مجاز حقیقت کا اگر جز بھی مان لیا جائے تو جزو لاینفک ہے۔ جزو کل کا یہ فرق گنجینہ معنی کا ایک طلسم ہے۔ جو لفظوں میں سما نہیں پاتا۔ پھر بھی عرفان کی فضاؤں میں سیر کرنے والی نظریں لباس مجاز کے پردے دیکھ لیتی ہیں۔ اقبال تو اس کے متمنی ہی تھے۔ کہ حقیقت لباس مجاز میں نظر آجائے لیکن جمیل وحدت وجود کا سہارا لے کر اسے لباس مجاز میں بھی دیکھ رہے ہیں۔ (اگرچہ اس تصور کی کہنگی سے بیزار بھی ہیں) ؎

یہ قبائے کہنہ اتار دو، نہ سبک ہو چشم نیاز میں
کہ جگہ جگہ سے ہے کہنگی کا اثر لباس مجاز میں
اصلیت بھی یا دھوکہ تھا، اک فتنہ رنگین رہا تھا
سو جلوے تھے ایک پردہ تھا، پردہ نہ رہا تو کچھ بھی نہیں
خود مجاز ایک حقیقت ہے جمیل
یہ نہیں ہے تو حقیقت کیا ہے؟

وحدت وجود کا تصور علی العموم فرار تک لے جاتا ہے لیکن جمیل کے یہاں ایک نئی آگہی پیدا کرتا ہے۔ اور خیر و شر اور گناہ و ثواب کے تخیلات کو بدل دیتا ہے ؎

اسی سے دل نے بنائے چراغ دیر و حرم!
دیا گناہ نے جو سوز منفعل مجھ کو!
میں نے ظلمت کو بھی سمجھا ترے چہرے کی نقاب
اک تبسم مری اس خوش نظری پر اے دوست
تسکین نہ خواجگی نہ مزدوری سے
عاجز ہے غریب رنجوری سے،

بظاہر یہاں بشر کو وحدت سے الگ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے جو ایک بین تضاد ہے لیکن شاعر نے جزو کل کے ازل میں بچھڑ جانے اور حقیقت کے چہرے پر نقاب مجاز کا ذکر کرکے یہ واضح کرنا چاہا ہے کہ اگرچہ جزو کل سے جدا نہیں ہے پھر بھی جزو کل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگرچہ مجاز بھی حقیقت ہے لیکن کل حقیقت نہیں ہے۔ جزو کل کے اس اتحاد تفریق نے جمیل کو اس منزل پر پہونچایا ہے ؎

معیار ایک گڑھا ہوس اختیار نے
اللہ کہہ کے اس کو لگی خود پکارنے
ایک طاقت تھی جو مجھ سے لے رہی تھی اپنا کام
مدعا کو اس کے اپنا مدعا سمجھا تھا میں
ہے نظام شام و سحر میں بھی اسی کشمکش کی علامتیں
جو حجاب و نور کی کشمکش ہے ضمیر ناز و نیاز میں

درحقیقت یہ غالب و اقبال کے شعور و عرفان کے آگے یہ منزل ہے جو مادی حقیقت پسندی کے بہت قریب تک جاتی ہے۔ یعنی اقبال ہی کی طرح یہ دیار وہم" دشت خرد" تک پہنچتی ہے لیکن اقبال کو دشت خرد میں فلسفہ خودی کا سہارا مل جاتا ہے اور وہ وہیں ٹھہر جاتا ہے جمیل کو اس فلسفہ خودی سے تسکین نہیں ملتی۔ ان کا تصور خودی اقبال کے تصور سے بالکل مختلف

ہے بلکہ وہ اس تصویر کے مخالف ہیں ؎

اگرچہ پیمانۂ تخیل مرے ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا
کوئی محبت اس کے وجود پر بجز ایک لفظ انا نہیں
یہ خودی کی گونج جو تجھ میں ہے یہ کہاں سے جو خدا نہیں

سورج کا جلال آب و گل سے پوچھے
ذروں کے مزاج منفعل سے پوچھے
شاہین کی عظمت سے کسے ہے انکار
لیکن کوئی گنجشک کے دل سے پوچھے

یہی وجہ ہے کہ تہذیب حاضر کے انسان دشمن پہلوؤں پر جتنا بھرپور وار مظہری کے یہاں ملتا ہے وہ ان کے دوسرے ہم عصروں میں نہیں ملتا۔

جبیں بہرحال جھک رہی ہے گلے بہرحال کٹ رہے ہیں
ہوئی جو بدنام تیغ براں تو عاقلوں نے قلم بنا یا۔

اس شام سے ڈر رہو جو ستاروں کی چھاؤں میں
آتی ہو اک حسین اندھیرا لئے ہوئے۔

دنیا ہے محبت سے خالی اور دل ہے محبت کا جویا
صحرا میں ساغر پیاسا ہے ملتا نہیں پانی کیا کیجئے

یہی وجہ ہے کہ نئی دنیا" کا تصور اس کے یہاں ہر تصوف پسند اور غزل دوست شاعر سے زیادہ واضح ہے اور اس فسرار پسندی کے رجحان کے باوجود جو انہیں وحدت وجود تک لے گیا تھا۔ جمیل کی حیائیت ناقابل تسخیر ہے۔ چنانچہ اس صدی کی چوتھی دہائی میں حصول آزادی سے پہلے بھی یہ کہہ سکتے تھے ؎

وقت اب وہ ہے کہ مظلوموں کے نالوں سے جمیل
ابھی تک جو سکوت لب تھا [illegible]

• حقیقت کی یہ سنگینی کہاں تک بھیس بدلے گی!
یہ غازہ خون گل سے کب تلک اے نبت غزالی ہو گا
انہیں جھونکوں کی کوشش ہے وہ دن بھی جلد آئے گا
کہ جب آندھی کی زد میں اعتبار دو جہاں ہو گا
دلوں کی آگ تہذیبوں کی خرمن پھونکتی ہو گی
اندھیرے لو جو گر ہو نگے دھواں افسانہ خواں ہو گا

خدا اور مذہب کے بارے میں بھی جمیل کا تصور صحت مندانہ ہے اور صوفی بتکدوں میں بھی جاتے ہیں۔ اور حرم میں بھی۔ لیکن جمیل تو

میں چلتا رہا مظہری اپنی دھن میں
بتوں نے بلایا، خدا نے پکارا

ہماری میزان آگہی میں یقین کیا ہے گمان کی شدت
جو شک کی آغوش میں پلا ہو اصولاً ایمان بھی ہے کا

ہم کو انسانوں میں گنتی نہیں کیوں دنیا!
ہم تو ہندو بھی نہیں، مسلمان بھی نہیں!

وہ اپنے خدا سے ناز کرتا ہے، شکوے بھی کرتا ہے۔ جھگڑا بھی ہے۔ جبر و اختیار کی بحث بھی کرتا ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ بھی "جزو نور" سا ازل میں کچھ گیا تھا۔ وہ اسی تمام فضا میں کہیں نہ کہیں ضرور ہے۔

تو اس فضا میں جہاں ہو وہیں سے دے آواز
پکارتا ہے تجھے قلب ناصبور میرا

عبدالمغنی
وارثی کالج، عالم گنج، پٹنہ ۷

جمیل مظہری کی مرثیہ نگاری "عرفانِ جمیل" کی روشنی میں

ابھی تک اردو تنقید میں اصنافِ ادب کے بعض ان تصورات پر نظرِ ثانی نہیں کی گئی ہے جو کسی قاعدہ و اصول کی بجائے محض حادثات و روایات پر مبنی ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں اصناف مرثیہ و قصیدہ ہیں۔ اصلاً و اصولاً مرثیہ اظہارِ غم کے لئے مخصوص ہے اور قصیدہ مدح سرائی کے لئے۔ قدیم عربی ادب میں جو مراثی پائے جاتے ہیں ان کا تعلق ذاتی نقصان پر شخصی رنج و غم کے اظہار سے ہے۔ انگریزی میں مرثیہ کا مترادف ELEGY ہے جو ایک عزائیہ نظم ہے۔ قصیدہ فارسی میں تو بالعموم امرا و سلاطین کی مدح کے لئے مخصوص رہا ہے۔ اسی لئے اس کا عروج درباروں سے وابستہ رہا ہے مگر عربی کے مشہورِ زمانہ قصائد جو سبعہ معلقہ کے نام سے معروف ہیں کسی امیر و رئیس کی مدح میں نہیں لکھے گئے بلکہ شعراء نے ان میں اپنی داستانِ عشق بیان کی ہے۔ (؟) محبت اور محبوبہ کا ماجرا رقم کیا ہے۔ انگریزی میں قصیدہ کی صنفِ ادب کا کام نہیں کیا ہے کہ مدح سرائی پر مشتمل ہو، نظم کو انگریزی ادب میں PANEGYRIC کہا جاتا ہے۔ جب کہ ایک صنفِ شاعری ہے ODE جس میں اسلوبِ بیان کی وہ شوکت و رفعت پائی جاتی ہے جسے عام طور پر قصائد سے منسوب کرتے ہیں۔

اس مختصر تشریح سے واضح ہو جاتا ہے کہ مرثیہ کو نوحہ کے لئے اور قصیدہ کو مدح کے لئے جو ایک خاص معنی میں ہم نے مخصوص و محدود کر لیا ہے وہ تاریخِ ادب کی کوئی مسلّم حقیقت نہیں ہے۔ اسی طرح مرثیہ و قصیدہ کی اصل اور اصول ہمارے ادب میں روایتی طور پر جو بھی سمجھے جاتے ہوں ان کی توثیق نہ تو تمام مشرقی ادبیات سے ہوتی ہے نہ مغربی ادبیات سے۔ اب غور کرنے کا ایک نکتہ اور یہ ہے کہ جہاں تک مرثیہ کے عظیم الشان ادب کا تعلق ہے۔ کیا ہماری شاعری میں بھی اس کی روایات صرف نوحہ و ماتم کی ہیں؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اردو مراثی کا ایک اہم پہلو رجز بھی ہے؟ پھر سراپا نگاری، مرقعہ نگاری اور فطرت نگاری بھی کیا ہمارے مراثی میں بکثرت نہیں پائی جاتیں؟ ان اہم سوالات کا تعاقب کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اردو مرثیہ خاص کر اس کا عظیم ترین کارنامہ مراثیِ انیس، عربی نوحہ اور انگریزی ELEGY دونوں سے بہت مختلف ہیں۔ یقیناً ان مراثی میں نوحہ و ماتم بھی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ المیہ اور رزمیہ یعنی انگریزی اصطلاح میں ٹریجڈی اور ایپک کے عناصر بھی ان مراثی میں بدرجۂ کمال پائے جاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر اور بالکل بنیادی طور سے مرثیہ نگاری کی دنیا میں اردو مراثی بالخصوص مراثیِ انیس کا امتیاز و شرف یہ ہے کہ یہ کوئی ذاتی نوحہ نہیں ہے انسانی تاریخ کے ایک عظیم الشان واقعے اور اس کے عظیم ہیرو

کا المیہ ہے۔ پھر بھی المیہ بھی ذاتی جذبات کا نہیں ایک زبردست اصول کی وقتی وظاہری ناکامی کا وہ المیہ ہے جو نتائج و تاثرات کے لحاظ سے تاریخ کی ایک بڑی اور عہد آفریں کامیابی کا پیش خیمہ ہے۔ کربلا کا واقعہ حق و باطل کا معرکہ تھا۔ اس کی مرکزی شخصیت حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حق کے لئے باطل سے پنجہ آزمائی کرتے ہوئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد سب سے بڑی قربانی دی اور ہمیشہ کے لئے جہادِ حق کی اولوالعزمی اور سرفروشی کا ایک سنگ میل ایک مینارِ ہدایت نصب کر دیا۔ چنانچہ حضرت حسینؓ اور انکے رفقاء و متبعین کی مظلومی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے مگر اس کے ساتھ ہی مجاہدین فی سبیل اللہ کے ایثار و قربانی، بلند حوصلگی اور جاں سپاری کی داد نہ دینا بھی ظلم ہوگا۔ اُردو مرثیہ نگار بالخصوص ان کے سرخیل میر انیس شہادت حسینؓ کے تاریخی مضمرات کو سمجھتے ہیں۔ انہوں نے غمِ حسینؓ کے ساتھ عزمِ حسین کی بھی نہایت پُراثر تصویر کشی کی ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم السطور کا مضمون "اردو شاعری میں میر انیس کا امتیاز" جو میرے دوسرے مجموعہ مضامین "جادۂ اعتدال" میں شامل ہے)۔

جناب جمیل مظہری کے مراثی کو اگر مرثیہ کے اس غیر روایتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے جس کی طرف اشارہ سطور بالا میں کیا گیا تو معلوم ہوگا کہ موصوف نے مرثیہ نگاری کے فن میں اُردو مرثیہ کے حقیقی تصور ہی کو اپنا مطمع نظر بنایا ہے اور بہت ہی شعوری طور پر انہوں نے واقعۂ کربلا کے عظیم الشان تاریخی پس منظر کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ؎

قدرت کا ساز جسکو کہیں آدمی کا دل
تھی بزم آب و گل ... عالمِ سکوت میں

پھر ہو رہا تھا اپنی خموشی سے منفعل
تاروں سے آرہی تھی یہ آواز متصل
روحِ عمل کو لرزشِ بے تاب چاہیئے
مضراب چاہیئے ہمیں مضراب چاہیئے
مضراب بڑھ کے کردی مہیا حسین نے
خونِ اپنا نبضِ وقت کو بخشا حسین نے
خوابیدہ قوتوں کو جھنجھوڑا حسین نے
فطرت کو کردیا تہ و بالا حسین نے
اللہ رے صبر سنگ کا دل آب ہوگیا
ہر ماجرا فسانۂ مضراب ہوگیا

(مضرابِ شہادت)

اس پس منظر کی وضاحت ان شعروں میں ہے ؎

گو بخت ہے دلِ اصرار میں تیری تکبیر
تیرا پیغام ہے کیا حریتِ فکر و ضمیر
تو نے انساں کو سکھایا یہ سبق عالمگیر
غیر اللہ کو سجدہ ہے خودی کی تحقیر
شرک اک شکل اسی جذبۂ گمراہ کی ہے
بادشاہوں کی یہ دنیا نہیں اللہ کی ہے

(پیمانۂ وفا)

یہ اشارہ ہے ان دو تصورات کی طرف جن کا مقابلہ میدانِ کربلا میں ہوا۔ ایک تصور موروثی بادشاہت کا تھا جس کا تاج یزید کے سر پر رکھا ہوا تھا اور دوسرا تصور اصولِ خلافت کا تھا۔ جس کے علمبردار حضرت امام حسینؓ تھے۔ خلافتِ اسلام کا نظریۂ سلطنت ہے جس کے مطابق کسی مسلم سماج کا بہترین انسان ہی صدر ریاست ہوسکتا ہے اور اس کی حیثیت مطلق العنان اور مستند حکمران کی نہیں

ہوتی بلکہ وہ روئے زمین پر اللہ کا نائب اور اس کے احکام کا پابند ہوتا ہے اور اس سلسلے میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کرتا ہے۔ بحیثیت صدرِ ریاست اس کا انتخاب بھی مسلمانوں کی پسند اور اہل الرائے کے مشورے سے ہوتا ہے اور وہ حکمرانی بھی اہل الرائے مسلمانوں کے مشورے اور عامۃ المسلمین کی مرضی سے کرتا ہے۔ اس لئے کہ ہر مسلمان بحیثیت انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے اور تمام مسلمان بحیثیت خلق مل کر اپنے درمیان سے بہترین شخص کو امیر اور رسولؐ کا خلیفہ منتخب کرتے ہیں۔ امیر المومنین کی خلافت ان حدود کی پابند اور نہی کے مطابق عمل پر منحصر ہوتی ہے جو قرآن و سنت نے اسلام کے نظامِ حیات کی شکل میں متعین کر دی ہیں۔ اس طرح اسلامی خلافت فکری لحاظ سے جمہوریت پر مبنی ہے جبکہ ملوکیت یعنی موروثی بادشاہت اسلامی تصورِ خلافت کی نفی اور تنقیص ہے۔ اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ شریعت محمدی کی بنیاد پر قائم ہونے والے اولین معاشرے میں خلفاء اربعہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علی رضی اللہ عنہم کے وقت تک تو نظامِ ریاست خلافت کے اصول پر قائم رہا۔ اسی لئے خلفاءِ اربعہ کے دور کو "خلافتِ راشدہ" اور "خلافت علیٰ منہاج النبوت" کہتے ہیں۔ لیکن اس دور کے بعد ملوکیت کا آغاز ہو گیا اور یہ غیر اسلامی تصورِ ریاست یزید کے تخت نشین ہوتے ہی اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ چنانچہ یہ حضرت امام حسینؓ کی ایمانی فراست و جرأت تھی جس نے نہ صرف اسلامی تاریخ میں ملوکیت کے فتنے کے آثار و مضرات کو اچھی طرح سمجھ لیا بلکہ اس فتنے کو اس کی ابتدا ہی میں فرو کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اس طرح حضرت امام حسینؓ نے اسلامی تاریخ میں یہ نمونۂ عمل بھی قائم کر دیا کہ اگر کوئی مسلم کہلانے والا حکمران بھی اسلامی اصول کے خلاف ملوکیت کا جور و ستم بندگانِ خدا پر روا رکھے تو اس کے خلاف بھی علمِ بغاوت بلند کرنا ایک دینی اور ملی فریضہ اور افضل الجہاد ہے۔ (اس بحث کی تفصیل کے لئے عصرِ حاضر کے عظیم ترین مفکر علامہ ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی معرکۃ الآرا کتاب "خلافت و ملوکیت" کا مطالعہ مفید ہوگا۔ موصوف نے ناقابلِ تردید علمی شواہد کی روشنی میں حضرت امام حسینؓ بمقابلہ یزید کی تاریخی بحث کا حتمی اور قطعی فیصلہ کر دیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ حضرت امام حسینؓ نے شعوری و عملی طور پر اسلام کے نظریۂ خلافت کے تحفظ کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کیا۔ جب کہ یزید مسلم معاشرے میں ملوکیت کی بدعت اور ضلالت کو ترویج دے رہا تھا۔)

احیاءِ خلافت ہی سے وابستہ اور اس میں مضمر اسلامی جہاد کا وہ ہمہ گیر اور حیات بخش تصور ہے جو ایک خاص شان سے میدانِ کربلا میں بروئے عمل آیا۔ اور یہ وہ شان ہے جس کی خاص اہمیت دورِ حاضر کے اس تاریخی معرکے کے لئے واضح ہے جو آج پوری دنیا میں خیر و شر اور حق و باطل کے درمیان برپا ہے۔ یہ معرکہ یوں تو بیسویں صدی کے آغاز ہی سے شروع ہو چکا ہے جب ایک باطل نظامِ حیات دنیائے انسانیت پر بالکل غالب و طاری ہو گیا۔ لیکن صدی کے آخری چوتھائی میں یہ معرکہ اپنے عروج پر پہنچ چکا ہے اور ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گیا ہے جیسا کہ فلسطین اور اس کے بعد ایران اور افغانستان کے تازہ ترین واقعات سے ظاہر ہے۔ اس معرکہ میں اہلِ حق کے لئے حضرت امام حسینؓ کا نمونۂ عمل ایک مینارِ ہدایت ہے۔ شہادتِ حسینؓ کے اس خاص پہلو کو سب سے زیادہ ابھار کر اور سب سے زیادہ ولولہ انگیز

انداز میں جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، علامہ اقبالؒ نے پیش کیا ہے ؂

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

یہی پیغامِ عمل جمیل مظہری بھی پیش کرتے ہیں ؂

جس طرح آج قسمتِ انساں کو ہے زوال
دورِ یزید میں تھا یہی کچھ عرب کا حال
روحوں کو کر دیا تھا غلامی نے پائمال
مردانِ حق پرست کی تھی زندگی وبال
ایمان فروش مست طرب انجمن میں تھے
اصحابِ خیمہ منزلِ دار و رسن میں تھے
لیکن ہے اس لئے قوم کو کچھ زندگی ملے
غفلت کو ہیں، جمود کو کچھ بے کلی ملے
غیرت ملے، شعور ملے، آگہی ملے
مستقبلِ حیات کو اک روشنی ملے
میں جانتا ہوں مصلحتِ بے نیاز کو
مضراب چاہئے دلِ انساں کے ساز کو

(مضرابِ شہادت)

واقعہ کربلا کا عصری و عملی پہلو ان اشعار میں نمایاں ہے۔ اس پہلو سے مرثیہ نگاری جوش ملیح آبادی نے بھی کی ہے اور ابھی ابھی ایک مسدس ڈاکٹر وحید اختر نے بھی لکھا ہے (مطبوعہ "شب خون" بابت ماہ جون ۷۹ء) لیکن مرثیے کا یہ پہلو مزید توجہ کا متقاضی ہے۔ شاید اگر اقبالؒ جس پہلو سے مرثیہ نگاری کرتے یا اسی پہلو کو اپنی نظم نگاری کا موضوع زیادہ شرح و بسط کے بنا لیتے تو اس کے امکانات شاعری میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتے لیکن اقبالؒ کے سامنے جو ایک محیط و بسیط نصب العین تھا۔ اس نے انہیں اس اختصاص کی اجازت نہ دی، گرچہ اپنے نصب العین کا ایک بنیادی نکتہ اقبالؒ نے "مقامِ شبیری" کو بھی بنایا اور اس کو اس کے صحیح تاریخی و اسلامی پس منظر میں پیش کیا۔ چنانچہ اقبال کی شاعری کے اہم ترین استعارات و علامات میں ایک "شبیری" بھی ہے۔ جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری اور بعض دوسرے شعرا سے اس رزمیہ و جہادیہ پہلو واقعہ یہ ہے کہ ابھی مرثیہ نگاری میں اتنا مواد بھی فراہم نہیں کیا گیا ہے جتنا انیسؔ کے مراثی میں پایا جاتا ہے۔ بلاشبہ جناب جمیل مظہری کے مرثیوں میں گہرائی ان کے معاصرین سے زیادہ ہے لیکن مجموعی طور پر ان کے مرثیے اُس دفور اور جوش کے حامل نہیں جو انیس کے یہاں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جناب جمیل مظہری مرثیہ نگاری کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکتے ہیں اور ان کی چند کوششیں ان کی شاعری کے ثانوی مشغلے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

لیکن شہادتِ حسینؓ کے عصری و عملی پہلو کی طرف توجہ دینے اور چند قابلِ ذکر تخلیقات پیش کرنے کے باوجود جناب جمیل مظہری کے اس وسیع و اہم میدان میں آگے نہ بڑھنے کی ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے جس کی طرف اشارہ ان کے حسبِ ذیل اشعار سے ہوتا ہے ؂

بس اختصار مظہری بہتر ہے طول سے
اسرارِ عشق کیا کہوں قومِ جہول سے
ظاہر میں منحرف ہوں فروع اور اصول سے

وابستہ گو نہیں ہوں خدا اور رسول سے
لیکن میں پوجتا ہوں شہِ مشرقین کو
کرتا ہے میرا کفر بھی سجدہ حسینؑ کو

معراب شہادت کے مطلعِ ثانی کا آخری بند ہے۔ اس بند کے اشعار کے فکری تجزیے میں اگر عقیدے کی بحث نہیں بھی اٹھائی جائے تو کم از کم یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں کچھ تاملات و تحفظات ہیں اور اس کی طبیعت میں ایک گرہ پڑی ہوئی ہے اس کا دماغ جس اوہام و زعومات میں الجھا ہوا ہے اس کا تاریخی شعور واضح نہیں۔ اس معاملے میں جناب جمیل مظہری تنہا بھی نہیں ہیں۔ جوش بھی ان کے ہم سفر ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جوش و جمیل کی یہی فکری بوسیدگی ہے جس نے ان دونوں کو شہادت حسین کے عملی، عصری پہلو کی مرثیہ نگاری میں آگے نہیں بڑھنے دیا۔ جبکہ ان کے مقابلے میں انیس کا امتیاز یہ ہے کہ ان کی فکر مستحکم واضح اور موثر ہے۔ اسی لئے انیس کے مراثی میں ضمنی طور پر کہے گئے عملی پہلو کے جہادیہ اشعار ہیں۔ وہ ان تمام جدید مرثیہ گویوں کے پورے مرثیے پر بھاری ہیں۔ جنھوں نے خاص عملی پہلو کو اپنی مرثیہ نگاری کا موضوع بنایا ہے۔

اس بوسیدگیٔ فکر کا جس میں جوش، جمیل مبتلا ہیں سب سے بڑا ثبوت ان کا تضادِ فکر ہے جو بہرحال فکر کی کمزوری ہی کے سبب ہے۔ شبلی کا ایک شعر ہے ؎

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے
خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

مذکورہ بالا کے بعد جناب جمیل مظہری کے "کفر" کی "خود دلی" ملاحظہ ہو۔ کہتے ہیں، بقدر ظرف کہ مسلماں ہی رہیں
اتنی پلا کہ پی کے مسلمان ہی رہیں (عزم محکم)

ایک طرف ساقیِ ازل سے "مسلمان" رہنے کی دعا اور دوسری طرف خدا اور رسول سے عدم وابستگی کا اعلان، نتیجہ یہ ہے کہ اسی متیم و ضعیف فکر عمل کے میدان میں دور تک نہیں جا سکتی۔ عمل جہاد کے لئے حضرت امام حسینؑ کا "یقین محکم" چاہیے۔ اس قوت ایمانی کے بغیر نہ تو "عزم محکم" کی عکاسی ہو سکتی ہے نہ "عمل پیہم" کی اور نہ "محبت فاتح عالم" ہو سکتی ہے۔

بہرحال: جناب جمیل مظہری دورِ حاضر کے اردو شعراء کی صفِ اول میں اپنی ایک خاص جگہ رکھتے ہیں اور ان کی غزلوں اور نظموں دونوں میں مطالعۂ حیات کا وہ عنصر نمایاں ہے جسے محمد اکرام نے غالب کے مطالعۂ حیات کے ایک پہلو کی حیثیت سے "نفسیاتی ژرف بینی" کہا ہے۔ یہی نفسیاتی آگہی درحقیقت جناب جمیل مظہری کی شاعری کی خصوصیت اور امتیاز ہے۔ جسے بعض لوگ غلطی سے فکر و فلسفہ کہہ دیتے ہیں۔

جناب جمیل مظہری صرف احساسات کے شاعر ہیں' ——

ان کے تخیل میں تفکر کا نہ تو نظم و ضبط ہے۔ نہ استحکام، لیکن وہ حالات اور واقعات کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ اور اس شدتِ احساس کے سبب کسی سطحی جوش میں بہہ نہیں جاتے بلکہ محاورات کی تہوں میں اتر جاتے ہیں۔ نتیجۃً ان کے احساس میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ بہت باریکی اور نزاکت کے ساتھ اپنے اور دوسروں کے احساسات کی ترجمانی، توجیہ اور تشریح کر سکتے ہیں۔ ان کی یہی خوبی ان کے لئے مرثیہ نگاری کے اس حصے میں بہت کارآمد ثابت ہوئی جس کا تعلق جذبات نگاری سے ہے۔ اس سلسلے میں تیسرے مرثیہ "عزم محکم" کا وہ مکالمہ نہایت بصیرت افروز ہے جو حضرت امام حسینؑ اور حضرت زینبؑ کے درمیان ہوتا ہے اور جس میں [illegible] بہن خود کو کہتے ہیں کہ خوں ریزی سے بچنے کے لئے

یزید کی جانب سے پیش کی ہوئی مصالحت کی شرطیں مان لی جائیں یا حق کی خاطر آخر وقت تک لڑا جا سکے۔ اس مکالمے کا ایک مقام ملاحظہ ہو ؎

زینبؓ مرا ضمیر دوراہے پہ ہے کھڑا
منزل ادھر سکوں کی ادھر راہِ ابتلا
اس کشمکش میں اب ہے تمہاری صلاح کیا
سر کو اٹھا کے دخترِ زہراؓ نے یہ کہا
زینب کے دل کی تھاہ امامِ زماں نہ لیں
میں آپ کی بہن ہوں مرا امتحاں نہ لیں
میں گود میں پلی ہوں شہِ قلعہ گیر کی
ہوں حصہ دار خونِ جنابِ امیر کی
طاقت ہے میرے دل میں بھی نانی شیر کی
گرمی رگوں میں فاطمہ زہراؓ کے شیر کی
یہ چاہتی ہوں حق کا علم سرنگوں نہ ہو
بھائی کا خون ہو پہ سچائی کا خوں نہ ہو
عورت ہوں مجھکو گود کی دولت عزیز ہے
بھائی کی جان ماں کی امانت عزیز ہے
لیکن میں کیا کروں کہ صداقت عزیز ہے
کنبے کی لاج دین کی عزت عزیز ہے
جھکنے دے میری رائے جو حق کے نشان کو
روئے گا فرض عون و محمد کی جان کو

یہ اشعار بہت ہی گہرے احساسات اور بہت ہی تپے ہوئے جذبات سے لبریز ہیں۔ ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ ان کے اندر فرض اور عشق کی کشمکش اس طرح حائل ہوتی ہے کہ عشق فرض بن گیا ہے اور فرض عشق۔ شاعری اور مرثیہ نگاری میں جناب جمیل مظہری کا اصلی کمال یہی ہے۔

نفسیاتی ژرف بینی کے ساتھ احساسات کی عکاسی ہی ان کا خاص میدان ہے۔ اور اسی میدان میں انہوں نے معرکے سر کئے ہیں۔ اپنی مخصوص ذہنی ساخت کے پیشِ نظر جناب جمیل مظہری اپنے مراثی میں اگر احساسات نگاری ہی کو اپنا خصوصی موضوع بناتے تو مرثیہ نگاری کی عظیم الشان روایت میں زبردست توسیع اور مستقل اضافہ کرتے۔

جہاں تک نظم کی حیثیت سے مرثیوں کی ترتیب ہیئت کا تعلق ہے اس کی طرف جناب جمیل مظہری نے کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ شاید وہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ بالعموم وہ بغیر کسی ترتیب کے مختلف مراحل پر مختلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ گرچہ یہ ضرور ہے کہ کسی مرحلے پر کسی ایک بات کو جب وہ لیتے ہیں تو پھر وہ کئی بندوں تک مسلسل اسی بات کو سامنے رکھتے ہیں۔ مگر اول تو مختلف باتوں کے درمیان تقدیم و تاخیر کی کوئی منطقی ترتیب نہیں ہوتی پھر ایک ہی بات پر جو مسلسل کئی بند ہوتے ہیں ان کی باہمی ترتیب کا کافی حد تک خیال نہیں رکھا جاتا۔ اس کے علاوہ بعض وقت ایک ہی بند کے شعروں اور مصرعوں کے درمیان معنوی ربط کی بھی کمی ہوتی ہے۔ یہ صورتحال یقیناً منظم اور محکم فکر کے فقدان کے سبب ہے۔ جناب جمیل مظہری کی شاعری صرف احساسات کی شاعری ہے۔ اس لئے اس کی نوعیت محض تاثراتی ہے، اور تاثرات غیر مربوط ہوتے ہیں۔

بہر حال ایک چیز کا اہتمام جناب جمیل مظہری نے حیرت انگیز حد تک کیا ہے۔ وہ یہ کہ ہر مرثیے کے تمہیدی اشعار مرثیے کے خاص موضوع کے ساتھ واضح مناسبت رکھتے ہیں۔ اور تمہید و موضوع کے مابین اتنی ہم آہنگی ہوتی ہے کہ تمہید کے اشعار بالکل فطری طور پر موضوع کے اشعار میں پیوست ہوجاتے ہیں۔

تیسرے مرثیے "عزمِ محکم" کے یہ تمہیدی بند بہت خیال انگیز اور مناسب موقعے ہیں ؎

عشرت کدوں میں بادہ گساروں کی رات ہے
دنیائے رنگ و بو میں نگاروں کی رات ہے
اور کربلا میں سجدہ گزاروں کی رات ہے
یثرب کے ڈوبتے ہوئے تاروں کی رات ہے
مہلت ملی ہے شب کی امامِ حجاز کو
خیموں میں جا رہے ہیں نمازی نماز کو

ہے اہتمام جشنِ طرب فوجِ شام میں
روحِ یزید تیرتی پھرتی ہے جام میں
مصروف ہیں عمائدِ لشکر طعام میں
شمعیں کہ جو جلائی گئی ہیں خیام میں
وہ گم ہیں تیرگی میں قلوبِ سیاہ کی
لشکر پہ چھا رہی ہے سیاہی گناہ کی

کیوں کر نہ اوڑھے پیرِ فلک چادرِ عزا
ہے یہ شبِ شہادتِ سلطان دوسرا
صحرا میں نصف شب سے ہے جاروب کش صبا
کیوں کر نہ ہو کہ ارضِ مقدس کی یہ فضا
مشہد بنے گی سبطِ رسالت پناہ کی
شبنم سے دھل رہی ہے زمیں قتل گاہ کی۔

ان اشعار میں بہت لطیف احساسات کی نفیس شاعری بھی ہے اور شاعر کا تخیل باریک بینی اور نکتہ سنجی کے ساتھ اس فضا کی ارتنا فرینی اور تصویر کشی کر رہا ہے جو معرکے سے قبل میدانِ کربلا پر طاری تھی۔ یہ یقیناً اس جنگ کا موزوں پس منظر ہے جس میں دقتی طور پر اہلِ حق کو ہزیمت ہونے والی تھی۔ اگرچہ یہ شہادتِ حق درحقیقت باطل کو تاریخ میں ہمیشہ کے لیے سرنگوں کر دینے والی تھی۔

"عرفانِ جمیل" کے مراثی میں جگہ جگہ اس لطیف و نفیس شاعری کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔ کہیں پورا پورا بند شعریت میں ڈوبا ہوا ہے۔ کہیں بند کا کوئی ایک شعر۔ اس بند کے آخری شعر کی بے پناہ اور معنی پرور شعریت پر نظر ڈالیے ؎

یہ خادمانِ پیروزین آپ پر نثار
آج آپ سے ہے لشکرِ اسلام کا وقار
یہ کہہ کے مسن کی نظر سوئے میدانِ کارزار
اٹھی جو دل سے لہر شجاعت کی ایکبار
مہر مبیں رخ سے کرن پھوٹنے لگی
انگڑائیاں جو لیں تو زرہ ٹوٹنے لگی

زیرِ نظر "عرفانِ جمیل" میں جناب جمیل مظہری کے چھ مراثی ہیں۔ ان کے علاوہ آٹھ چھوٹے بڑے قصائد، چند قطعات و رباعیات اور سلام ہیں۔ مجموعے کا خاص ادبی سرمایہ مرثیہ ہی ہے اور قصیدے گویا توابع کے طور پر مراثی کے ہی چند مضامین کے گرد گھومتے ہیں۔ یہی نوعیت سلام، قطعات اور رباعیات کی ہے۔ یہ سب تخلیقات مل کر ایک مجموعی فضا تاریخِ اسلام کے ایک خاص موضوع اور اس تاریخ کی چند اہم ترین شخصیات کے متعلق پیدا کرتی ہیں۔ اسی فضا کے ذریعے اور اس کے درمیان شاعر اپنے زمانے اور انسانیت کو ایک پیغام دینا چاہتا ہے۔ اس طرح یہ مجموعہ یقیناً ایک ذکرِ جمیل پر مشتمل ہے اور اس میں عرفان کی لکیریں اور لہریں پائی جاتی ہیں۔ ▼▼ (شاعر بمبئی۔ جنوری ۶۸۲)

میکسوٹن

ہر موسم میں گھر بھر
کے لئے یکساں طور پر فائدہ بخش
جنرل ٹانک

بالک جیون

بچوں کی تندرستی اور صحیح
نشو ونما کیلئے
ہے

مولی منجن

دانتوں کو صاف اور چمکدار
بناتا ہے۔ پائیریا کا دشمن ہے
روزانہ استعمال کیجئے

جرم بول

اگر آپ خارش سے پریشان
ہیں اور راتوں کی نیند حرام ہے
تو صرف دو تین بار کی مالش سے
سکون ہو جائے گا۔

اکسیر صدر

نزلہ، زکام اور کھانسی
کی بہترین دوا

نیشنل دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۱۸ کلکتہ ۱

نذرِ جمیل

ایس، ایچ، نواب حسن ڈی۔ اد (ایل آئی سی۔ گیا)

رہا نہ شاعر جمیل جیسا تو لطف اب کیا ہے شاعری کا
وہ آدمی ہی نہیں رہا اب جو ذرہ رکھتا تھا آدمی کا

وہ کہنے والا ہی چل بسا اب جو راز کہتا تھا زندگی کا
وہ جسکی ہر جنبشِ قلم سے مذاق بدلا تھا شاعری کا

وہ خاکساری کا سچا پیکر وہ اک مرقع تھا عاجزی کا
وہ انکساری کے ساتھ لوگوں کو درس دیتا رہا خودی کا

وہ ہم نوا تھا ہر آدمی کا وہ آشنا تھا ہر اجنبی کا
وہ دشمنوں کے بھی ساتھ اکثر نباہ کرتا تھا دوستی کا

نوٹ:۔ مندرجہ بالا اشعار جمیل صاحب مرحوم کی مشہور غزل کی زمین میں لکھی گئی ہے

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

قطعات

بیادِ علامہ جمیل مظہری مرحوم

از: حصیر نوری، ڈھاکہ

اپنے اندازِ بیاں کے خود ہی بانی ہیں جمیل
وحشتِ مرحوم کے تابندہ نشانی ہیں جمیل
سامنے تھے اک مثالی علم داں کے روپ میں
اب جو دیکھا اک فسانہ اک کہانی ہیں جمیل

مرنے والا مر گیا ہے زندہ رہنا ہے اسے
کام جو ہوگا عمل سے منہ زبانی کیوں کریں
کس لئے ہم مجلسِ ماتم کریں برپا حصیر
ان کے نقشِ پا سنواریں نوحہ خوانی کیوں کریں

آؤ ان کے شرحِ نظم و نثر بن جائیں حصیر
سب سمجھ لیں، انکی کیا تحریر ہی تقریر ہے
لوگ کہہ دیں واقعی یہ ہیں عقیدت مند لوگ
یہ جمیلِ مظہری کے خواب کی تعبیر ہے

وقت ایسا کبھی ایک آتا ہے
غنچہ ہنستا ہے کھلکھلاتا ہے
حساضری دیکھے صحنِ گلشن میں
اپنی ڈالی سے ٹوٹ جاتا ہے

ڈاکٹر محمد ابراہیم

علامہ جمیل مظہری کی ذہنی ساخت اور ان کی غزلیں

جس طرح آتش دلّی اور لکھنؤ کا ایک حسین سنگم ہیں۔ علامہ جمیل مظہری عظیم آباد اور لکھنؤ کا ایک حسین سنگم ہیں۔ علامہ کا مولد قصبہ حسن پورہ ضلع سارن (چھپرہ) مزاج کے اعتبار سے بہار کا لکھنؤ مانا جاتا ہے۔ وہی تقریباتی مزاج وہی جاگیردارانہ مزاج، طبیعت میں وہی تفریح پسندی، طبائع میں وہی بانکپن، تکلف میں وہی اہتمام جو لکھنؤ کا خاصہ تھا۔ حسن پورے میں اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ علامہ کے بچپن میں موجود تھا۔ عید کے موقع پر میووں کی نوع بنوع قسمیں، چوسیروں کا مقابلہ اور محرم کے موقع پر بارے ٹکوں بٹوؤں کی تقسیم، گری، سونف اور دھنیاں کے مسالوں کا اہتمام، مجالس کی رسمی نشست و برخواست، غرض کہ زندگی کی ہر سطح پر تکلف تصنع اور ظاہر داریوں کی بھرمار، اس پر جاگیردارانہ مزاج کا رومان پسند عنصر علامہ جمیل مظہری کے ذہن کی تعمیر میں اہمیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف بیدل، راسخ، جوشش اور شاد عظیم آبادی کا ادبی ورثہ علامہ کی تربیت میں اہمیت کا حامل ہے۔ علامہ کے والد خورشید حسین خورشید خود ایک پرگو شاعر اور طبائع آدمی تھے۔ اسی ماحول کی تربیت کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو علامہ کے مزاج میں تکلفات راسخ ہو گئے تو دوسری طرف روایت پسندی، مروت مزاج کا جزو اعظم بن گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ حسن اور عشق کے معاملات کے لئے ایک تو یوں بھی عنفوانِ شباب میں دل کی زمین نرم ہوتی ہے اس پر لکھنؤی تہذیب نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور علامہ کے حساس، مہذب اور بامروت دل تک کسی سر سے چھلکتے ہوئے کنایہ نازک پہنچنے لگے۔ وضع داری اور مروت عقل کی راہ تک حائل ہو گئی۔ اور بجائے معشوق فریبی کے علامہ افلاطونی عشق میں مبتلا ہو گئے۔ یہ حادثہ ان کی زندگی کا اہم ترین حادثہ تھا جس نے اگر ایک طرف انہیں چور چور کر دیا تو دوسری طرف ان کے فن کا ایک ایسا شیش محل تیار کیا جس کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ اور دل سربسجود ہو جائیں۔ یہ مجازی عشق تدریجی مراحل سے گذرتا ہوا اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز رہا اور بالآخر

میں خدا سے روٹھتا ہوں، میں خدا کو پوجتا ہوں
یہ وہ نازِ بندگی ہے جسے پوچھئے خدا سے

تک پہونچا۔ اس نے علامہ کو اتنی شدید جذباتیت سے نوازا کہ علامہ کے ہم عصروں میں کسی کو میسر نہیں۔ اسی کا اعجاز ہے کہ علامہ کی فکریت بھی دماغ سے زیادہ دل کو متاثر کرتی رہی ہے۔ ؎

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

علامہ نے جذبۂ جستجو کا وہ کام لیا جو صوفیائے کرام نے لیا۔ اگرچہ خود انہوں نے اپنے آپ کو کبھی صوفی نہیں کہا، ہمیشہ مجذوب ہی بنے رہے لیکن صوفی صافی کی تمام صفات

ان میں آہستہ آہستہ نفوذ پاگئیں۔ اہلِ زندگی سے کنارہ کش رہنا، ظاہری رکھ رکھاؤ اور طمطراق سے دور ہوجانا، حال مست رہنا، یہی وہ طرزِ عمل اور Behaviour pattern تھا جو علامہ کی زندگی کا طرۂ امتیاز رہا۔ وہ ایک ادارۂ خیر تھے اور ان کا دل یکساں طور پر ہر آدمی کے لئے دھڑکتا تھا۔ اس میں کوئی تخصیص مذہب کی، قرابت داری کی، رنگ اور نسل کی نہ تھی۔ ان کی شدید جذباتیت نے عشقِ مجازی سے تدریجی ارتقا کے مراحل طے کرکے یہ منزل حاصل کی تھی۔

وہ محبت نہیں جو ایک سے بدنام رہے
وہ محبت جو خدائی کے لئے عام رہے

غزل چونکہ جذبات کا بہترین وسیلۂ اظہار ہے اس لئے جہاں جذبات کی شدت اور بے پایانی ہوتی ہے وہاں غزل میں نکھار اور بانکپن آتا ہے۔ علامہ کے جذبے کا میدانِ عمل مجاز سے لیکر حقیقت تک پھیلا ہوا ہے اور وہ پورے طور پر اس وسیع میدان پر چھائے ہوئے ہیں ؎

ہمارا ذوقِ نظر تنگ، ذوقِ عشق رہا
کہ ساری عمر تلاشِ رخِ نکو میں رہے

علامہ غزل کے مزاج کے متعلق صفی لکھنوی کے قول پوری طرح اتفاق رکھتے ہیں کہ غزل کا مزاج دھان پان ہے۔ جو نہ کسی ثقیل لفظ کا متحمل ہوسکتا ہے نہ ثقیل خیال کا، اور علامہ نے غزل کے اس مزاج کو برتنے کی پوری طرح کوشش کی ہے۔

محبت بھی ہے اک عجب آشنائی
بمعنی تعلق بہ صورت جدائی

ہمیں وہ کہ ہر بزم میں نیم بسمل
نگہ تیری آنکھوں نے فرصت نہ پائی

خدائی تمہاری نگاہوں کا صدقہ
تمہاری نگاہوں پہ صدقے خدائی

[illegible] نگاہوں کو جادو سلامت
یہ صدقے یہ آنکھیں [illegible]
جمیل اس تعلق سے کیا فائدہ ہے
بہ صورت تعلق، بمعنی جدائی

علامہ جمیل مظہری کا فن ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۸ء تک کی غزلوں میں بھی اتنا ہی نکھرا ہوا تھا جتنا ان کے بعد کی غزلوں میں ہے اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ علامہ کے اوائل غزلوں کے نمونے ان کے معراجِ کمال کی غزلوں سے کسی طرح بھی کم تر ہیں۔ یہ خیال رہے کہ علامہ کی عمر ۱۹۲۵ء میں صرف بیس سال تھی۔ میں نے جن چند غزلوں اور اشعار کا حوالہ دیا ہے وہ غزلیں بھی اسی ابتدائی دور کے نمونوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس زمانے کی غزلوں میں خصوصاً عشق اور حسن کا دباؤ زیادہ ہے۔ رفتہ رفتہ عشق کی یہ جذبات علامہ کے یہاں فکر کی نمائندگی میں تحلیل ہوتی گئی۔ فکرِ جمیل کے مرتب نے اس دور کی غزلوں کو پریم گیتا کا نام دیا گیا ہے۔ یہ نام بھی ذریعہ انشائے راز ہے اور علامہ کے عشق پردہ نشیں کا آئینہ دار بھی ہے۔ یہ عشق ماحول اور تہذیب کی جس کا آغاز انتہائی کم عمری میں ہوا۔ بچپن کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی، محبت یا دوستی کوئی Serious معاملہ نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی سنجیدہ معاملہ عام طور پر ہوا کرتی ہے۔ لیکن علامہ کی شدید جذباتیت نے اسے زندگی کا اہم ترین مسئلہ بنا دیا۔

جو پوچھ کہ میرے دل پہ وہ بوجھ کہاں ہے بیلوں پر
اے بیل والے تیز نہ چل اسمیں رادھا بھی میری ہے

اس شعر پر شادی کا یہ شعر یاد آتا ہے جب وہ کہتے ہیں کہ ؎

ساربان آہستہ رو آرام جاں در محمل است
اشتراں را بار بر پشت است و مارا بر دل است

بہرحال یہ کوئی سنجیدہ مسئلہ نہیں ہے۔ یہ اشعار بھی دیکھیے ؎

جمیل اس کو وہی سنے گا جو زندگی جس کی خود فسانہ
ہے کاجلوں میں بھی اک کہانی، ہے چوڑیوں میں بھی اک ترانہ

اُٹھا کے شیشے ہمارے دل میں اُتارے دُور کیوں کھڑی ہو
نہ ڈالا جاتا تم سے پانی نہ تاپا پانی جاتی ہے آگ تم سے

خلوت ہو اور آئینہ حیرت سے منہ تکتا ہو
آنسو چھپ چھپ بہتے ہوں کاجل پھیلا پھیلا ہو

ان اشعار کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کے یہاں عشق کی شدت، محبت کا خلوص، وفا کا جذبہ ابتدا سے ہی ایک ایسی اٹھان رکھتا تھا۔ جس میں تہذیبی روایتوں نے صبر زیادہ اور بے باکی کم، تحمل زیادہ اور جرأت کم رکھی تھی جس کا لازمی نتیجہ افلاطونی عشق کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یعنی ؎

نہ ترے آنچل پہ داغ کوئی، نہ اس گریباں چاک کوئی
خرد کے مارے ہوئے ہیں دونوں، نہ تو دِوانی نہ میں دِوانہ

ادا و ناز و حیا و شوخی بہت سی ہیں حسن کی زبانیں
مگر وہی بات معتبر ہے جو آنسوؤں کی کہی ہوئی ہے

کس سے کہوں کہ کیا ہوں میں آگ ہے غم او رچتا
ہو گیا جل کے راکھ دل، انکو خبر ہوئی کہیں

یہی دوری اور احتیاطِ عشق علامہ کے یہاں جب رچ بس جاتی ہے تو ؎

نظر کا بوجھ نہ سہہ سکیں وہ زباں کا بوجھ سہیں گی کیا
سُبک و لطیف اشارتوں پہ حجابِ معنی و لفظ کیا
مجھے ڈر ہے اے سخن آفریں یہ لباس ان پہ گراں نہ ہو
جو حقیقتیں نہ سہہ سکیں وہ قبائے معنی و لفظ کیا
نہ وہ بزم میں نہ قریب ہے وہ حجابِ فکر و نظر میں کہ
جو حجابِ فکر و نظر اٹھا تو رِدائے معنی و لفظ کیا

محبت کی اس جذباتی گیرائی نے علامہ کو ایک عجیب و غریب فلسفہ دیا۔ یہ فلسفۂ فکرِ جمیل کی دوسری غزل جس کا مطلع ہے ؎

پرکھ چکا ہے بارہا تجھے شعور مرا
مذاق اڑا نہ بہت اے حجابِ نور مرا

میں پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ غزل بھی ۱۹۳۸ء کی ہے یعنی اس زمانے کی جب عشق کا پہلا جھونکا گذر چکا تھا۔ سیلاب کی تندی میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا اور فکر کی دیواروں کی جڑوں میں جذبے کا پانی اتر چکا تھا۔ یہیں سے محبت نئے رنگ کی صورت میں علامہ کے ذہن پر طلوع ہو رہی تھی ؎

صفات بخشے، مکاں بخشا، جگہ جگہ اک حرم بنایا
ہماری صورت گری نے آخر خدا کو بھی اک صنم بنایا
حرم کو بھی بت کدہ سمجھنا ہے دوسری منزل ارتقا کی
وہ پہلا زینہ شعور کا تھا کہ بتکدے کو حرم بنایا
جبیں بہرحال جھک رہی ہے کہ بہرحال کٹ رہی ہیں
ہوئی جو بدنام تیغِ بُرّاں تو عاقلوں نے قلم بنایا
مسافروں میں جو تذکرہ کیا جمیلؔ اپنی سُبک روی کا
نہ ہم نے رستے میں گرد اڑائی نہ کوئی نقشِ قدم بنایا

یہ پوری غزل علامہ کے عشق کی تدریجی ارتقا کی کہانی ہے جو جذبے سے فکر تک اور مشاہدے سے وجدان تک پھیلی ہوئی ہے۔ علامہ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے فکر کو بھی جذبہ بنا دیا ہے۔

ایک اور غزل ملاحظہ ہو ؎

شکستِ رنگِ رُخ تو اک فسانہ ہے شباب کا
حکایتیں اور بھی ورق الٹ کتاب کا
مری نگاہِ اوّلیں ازل میں ایک سوال تھی
سوال منتظر رہا ابد تک جواب کا

حقیقتوں نے اوڑھلی نقابِ رنگ و بو
تو احترام فرض ہے ہر آنکھ پہ نقاب کا
یہاں بجز سراب کے نہیں علاجِ تشنگی
جمیلؔ پیاس ہے تو آ فریب کھا سراب کا

جیسا کہ مضمون کے آغاز میں کہا گیا ہے کہ علامہ روایات تکلفات اور تفکرات کا ایک نادر سنگم ہیں۔ ان کے یہاں جلی عشق اپنی شدت اور خلوص کے ساتھ ان منزلوں تک پہنچتا ہے جو منزلیں تنزیہہ، تطہیر اور ریاضت کی منزلوں سے قریب تر ہیں۔ یہ منزل وہ ہے جہاں جذبات و وجدان کا ہوجاتے ہیں۔ جہاں صنم خدا اور خدا صنم ہوجاتا ہے، جہاں مجاز حقیقت آثار اور حقیقت مجاز آثار ہوجاتی ہے۔ جہاں فکر جذبہ اور جذبہ تفکر بن جاتا ہے اور جہاں جنون کا نام خرد اور خرد کا جنون پڑ جاتا ہے۔ یہ اجتماع ضدین وہ بنیادی حقیقت ہے جو تکوینِ کائنات کا سبب ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں آشفتگی اور تابندگی 'ترتیب اور بے ترتیبی' شوق اور بے نیازی ایک مرکز پر جمع ہوجاتے ہیں۔ جہاں عاشق معشوق ہوجاتا ہے اور معشوق عاشق بن جاتا ہے۔ عشق کی بنیاد پر اس منزل کا حاصل کرنا یقیناً ایک کارِ دشوار ہے۔ یہ کام اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام نے کیا ہے۔ لیکن عام لوگوں کے یہ بس کی چیز نہ تھی، نہ ہے اور نہ ہوگی۔ علامہ کی کوئی صوفیانہ تربیت ہوئی ہو ایسا بھی نہیں جس سے یہ سمجھا جائے کہ تصوف کی کسی ڈسپلین نے ان میں جذبے کی یہ طہارت پیدا کی۔ علامہ کی حیات اور شاعری کے مطالعے سے ایک بڑا امکان سامنے آتا ہے وہ یہ کہ جذبے میں اگر خلوص کی شدت ہو تو وہ اپنی طہارت اور تنزیہہ آپ کر لینے پر قادر ہے۔ شاد عظیم آبادی کا تصوف بھی جذبے کی صداقت کا نتیجہ تھا۔ اور علامہ جمیل مظہری کی تشکیک بھی اسی جذبے کی صداقت کا پرتو ہے ؎

جس کو پینا ہے پئے، پی کے گرے، گر کے پئے
بھر کے خم رکھدیئے ساقی نے حریفوں کیلئے
گوشۂ چشم میں اک تابِ تغافل ہی سہی
کم سہارے تو ضروری ہیں محبت کے لئے
ت طاری ہوئی ہر شوق پہ رفتہ رفتہ
یہ مرنے کے جو ارماں تھے وہ کبھی نہ جیے
یہی دو چار نشیمن تھے بنائے تخریب
آندھیاں باغ میں آئیں انہیں تنکوں کیلئے
اس کے ہونٹوں پہ تبسم ہے نہ ابرو پہ شکن
جس کو مرنا ہے مرے جس کو جینا ہو جیے
ہم تو مجنوں تھے کہ دامن کی خبر لی نہ جمیلؔ
تم کو کیا مل گئے تم نے تو گریباں بھی سئے

علامہ کے ہم عصروں میں پرویز شاہدی اور اجتبیٰ رضوی دو ایسے شاعر ہیں جن کا محرکِ شاعری عشق رہا ہے، لیکن ان تینوں کے درمیان ایک خطِ فاصل ہے جس کا اندازہ بادی النظر میں ہر کسی کو نہیں ہوسکتا۔ پرویز شاہدی کے عشق میں بیباکی اور جارحیت تھی جس نے انہیں سیاسی انقلاب کی پناہ گاہ تک پہونچا دیا۔ اجتبیٰ رضوی کا عشق بنیادی طور پر متصوفانہ میلان سے نشو و نما پاکر روحانی تلاش اور جستجو کے بے پناہ صحرا میں پہونچا۔ ذاتی تجربے اور تفکر کا آہنگ پیدا ہوا جبکہ علامہ کا عشق مجاز کے گھروندے سے شروع ہوکر حقیقت کو گھروندا بنانے میں کامیاب ہوا ؎

ہر حقیقت ہوئی جاتی ہے مجاز
اعتبارات کی قیمت کیا ہے
جس نتیجے پہ پہنچتی ہے نظر
اس نتیجے کی حقیقت کیا ہے
نور ہے نور، نہ ظلمت ظلمت
یہ طلسماتِ بصیرت کیا ہے

خود مجاز ایک حقیقت ہے جمیل
یہ نہیں ہے تو حقیقت کیا ہے

اس میں موسم کی نہیں قید کہ اب آپ کی یاد
فارغِ گردشِ ایام ہوئی جاتی ہے
اب تو شرمائے تری پردہ نشینی کا غرور
بندگی فتنۂ ایام ہوئی جاتی ہے
مژدہ اے ذوقِ سخن جنبشِ لب ہائے جمیل
جنبشِ پردۂ الہام ہوئی جاتی ہے

علامہ کے مزاجِ غزل گوئی کے عناصرِ ثلاثہ یہ ہیں ۱۔ محبت ۲۔ شدتِ جذبہ ۳۔ عزتِ نفس۔ علامہ کی غزل گوئی انہیں تین عناصر کی ترکیب اور ترتیب کے مختلف ادوار کا نام ہے۔ محبت کا عنصر ایک طرف ایثار اور دوسری طرف وارفتگی دیتا ہے۔ یہ ایثار اور وارفتگی تدریجی ارتقائی منزل سے گذر کر ان کی رہنمائی تحقیقِ حقیقت تک کرتی ہے ؎

تری عطا کے تلخ نوش پی کے بنا رہے ہیں منھ
کھول دے اک ذرا سا رس نرگسِ نیم خواب کا

آپ اپنے کو لگا دیکھنے شیدا تیرا
ہر نظر اس کی اٹھانے لگی پردہ تیرا

سچ تو یہ ہے کہ وفا بھی تھکن کا احساس
نگہِ شوق کو میں گرمِ سفر رکھ نہ سکا

جنوں کے دامن سے وہ لگائیں خرد کی بخیہ گری کا رشتہ
پیام جن کو نہیں ملا ہے ابھی تری زلفِ مشک بو کا

مندرجہ بالا مثالوں میں محبت سے پیدا ہونے والے ایثار اور وارفتگی کے عنصر کے تدریجی تعمیری ارتقا سے مرتب ہونے والا تحقیقی مزاج پوری طرح اجاگر ہو جاتا ہے۔ آیئے اب علامہ کے مزاجِ تغزل کے دوسرے عنصر یعنی شدتِ جذبات کی چند مثالیں دیکھیں۔ شدتِ جذبہ سے کشش اور ردِ کشش کی بنیادوں پر جب کبھی تعمیری ارتقا رونما ہوتا ہے تو وہ تنزیہہ کی طرف لے جاتا ہے یعنی ایک ایسی منزل کی طرف جہاں کشش رہ جاتی ہے نہ ردِ کشش بلکہ ایک آہنگ سا رہ جاتا ہے۔

؎ تو اس فضائے جہاں ہے دہیں سے دے آواز
پکارتا ہے تجھے قلبِ ناصبور مرا
سو جمیل آئیں گے اک چاک گریباں کے لئے
لیلئ نجد سلامت رہے صحرا تیرا

ان اشعار میں جذبہ کی شدت کشش، ردِ کشش کی بنیادوں پر تعمیری ارتقا کے مراحل سے گذر کر تنزیہہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح ان کے مزاجِ تغزل کا تیسرا عنصر عزتِ نفس، احساسِ وجود اور احساسِ ذات کے زاویوں سے نکل کر تفویض کی منزل تک پہنچتا ہے ؎

جھکنا بھی برا اور جھکانا بھی برا ہے
جو کھوٹ سے مٹا داغ مری خیرہ سری کا

وہ رندِ فیاض، مردِ قانع جو اپنے حصے کی بھی پلا دے
وہی ترے میکدے میں ساقی رہین ہو ساغر و سبو کا

زیبا ہے اسی کو کبریائی
سمجھے جو مزاج آدمی کا

میں کیا بتاؤں کہ تو کیا ہے اور کیا ہوں میں
ہجومِ لفظ و معنی میں کھو گیا ہوں میں

یہ اشعار علامہ کے عزتِ نفس کے عنصر سے وجود ذات کے مراحل طے کر کے منزلِ تفویض تک پہنچتے ہیں۔ اس طرح علامہ کی غزل گوئی کا منتہی یا مقصدِ تحقیق تنزیہہ اور تفویض ہے۔ جہاں تک علامہ نے محبت، شدتِ جذبہ اور عزتِ نفس کے سہارے ہمیں سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ اپنی اس کوشش میں کسی نہ کسی طرح کامیاب رہے ہیں اور ان کا یہ دعا اپنی جگہ درست ہے ؎

بالآخر ان کو جو زباں داں ... [illegible]

جمیل مظہری اور ان کی شاعری

سیّد احمد قادری

جمیل مظہری کا شمار گوشہ نشیں اور تنہائی پسند شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے کلام کی اشاعت کی جانب توجہ نہ دی۔ اس کے باوجود جمیل مظہری نے اپنی شاعری کا جو سرمایہ چھوڑا ہے ان کی روشنی میں ہم بلا تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ جمیل مظہری کی شاعری اقبالؔ، جوشؔ، شادؔ اور نیاز وغیرہ کی شاعری سے بہت قریب ہے۔

جمیل مظہری کو شعر و سخن کا ذوق ورثہ میں ملا۔ ان کے دادا سید مظہر حسین مرحوم مرزا دبیر کے خاص شاگردوں میں تھے اور مختلف اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ جمیل مظہری کے والد مولانا سید خورشید حسن کا شمار بھی اس زمانے کے اچھے اور خوش گو شعراء میں ہوتا تھا۔ اور انھوں نے بذاتِ خود اپنے عزیز بیٹے سید کاظم علی (جمیل مظہری) کی شاعری کی رہنمائی کی۔ اس لئے کہ انھیں اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ جمیل مظہری کے اندر شاعرانہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ چونکہ جمیل مظہری چار پانچ سال کی عمر سے ہی شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ اس لئے ان کے والد کا ایسا سمجھنا غلط نہیں تھا۔ جمیل مظہری اس سلسلے میں لکھتے ہیں :-

"والد صاحب سے سنا تھا اور کچھ کچھ مجھے یاد ہے کہ چار پانچ برس کی عمر میں بھی اتفاقاً کبھی کبھی مصرعے موزوں ہو جایا کرتے تھے، والد مرحوم انیس کے مرثیوں کو پڑھتے تو میں ان کی نقلیں اتارا کرتا اور نقلیں اتارتے ہوئے کچھ مصرعے میرے اپنے ہو جاتے، والد مرحوم کہتے تھے کہ بعض جملے میری زبان سے ایسے نکل جاتے جو موزوں ہوتے۔"

جب جمیل مظہری کی شاعری میں تھوڑی بالیدگی آنے لگی تو انھوں نے جمیل مظہری کو مولانا رضا علی وحشت کلکتوی کی شاگردی اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ جو جمیل مظہری کے کلام کا فنی اور لسانی اصلاح فرمادیا کرتے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اس کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ اس لئے کہ جمیل مظہری کی خداداد شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ ان کے استاد کو بھی ہو گیا۔

آہستہ آہستہ جمیل مظہری نے اپنی محنت، لگن، کوشش اور گہرے مطالعے و مشاہدے سے تقریباً تمام اصناف سخن پر قدرت حاصل کر لیا اور غزلوں، نظموں کے علاوہ رباعیوں، مثنویوں، قصیدوں، ہجو، مرثیوں، گیتوں اور سلام وغیرہ جیسی اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی اور ان میں قابل قدر اضافے کئے۔

اس سے قبل کہ جمیل مظہری کی شاعری کا مختصر

طور پر جائزہ لیا جائے' میں ضروری سمجھتا ہوں کہ جمیل مظہری کی زندگی کے حالات پر ایک نظر ڈالی جائے۔ اس لئے کہ میرے خیال کے مطابق کسی بھی فنکار کے افکار و خیالات کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے اس فنکار کے حالاتِ زندگی کا سامنے ہونا نہایت ضروری ہے۔ تاکہ اس کا صحیح اندازہ ہو سکے کہ فنکار نے کن حالات میں اور کن واقعات سے متاثر ہو کر فکر و فن کے نمونے پیش کئے ہیں' اگر ایسا نہ ہوا تو پھر فنکار کے بہت سے فکر و فن لایعنی محسوس ہوں گے۔

جمیل مظہری ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن کا زیادہ تر حصہ عظیم آباد اور مظفر پور میں گذرا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے فارسی اور تاریخ میں ایم۔اے کیا۔ ایم۔اے کرنے کے بعد اردو صحافت سے منسلک ہو گئے۔ اس وقت ہندوستان کی سیاسی' سماجی اور معاشی صورت حال نازک موڑ پر کھڑی تھی غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکنے کی عملی جدوجہد زور پکڑتی جا رہی تھی۔ ایسے حالات میں ایک حساس شاعر کا حد درجہ متاثر ہونا عمومی بات تھی۔ چنانچہ جمیل مظہری بھی متاثر ہوئے اور اپنی شاعری سے لوگوں میں حوصلہ' جوش' ہمت اور ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن چونکہ جمیل مظہری کے ذہن نے مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے فلسفہ کو بھی قبول کیا تھا، اس لئے انھوں نے اپنی انقلابی شاعری یا ترانۂ آزادی میں گھن گرج کی بجائے سنجیدگی' متانت اور آزادی و انقلاب کے واضح تصور کو پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ صحافتی میدان میں بھی انقلاب کا نعرہ بلند کرتے رہے۔ اس میں انہیں کئی بار نقصانات [illegible]

اٹھانا پڑا' لیکن انھوں نے کبھی اس کی فکر نہیں کی اور ہمیشہ اپنے موقف پر قائم رہے۔

اسی درمیان بقول جمیل مظہری ——

"۱۹۳۷ء میں ہمارے محکمہ نشر و اشاعت کے لئے ایک پبلسٹی آفیسر کی ضرورت ہوئی' پروفیسر عبدالباری مرحوم نے کلکتہ سے بلوا کر وزیروں کے سامنے مجھے پیش کیا اور اس زمانہ میں مولانا آزاد بھی آئے۔ انھوں نے بھی سفارش کی اور میں ۲ دسمبر ۱۹۳۷ء میں سرکاری ملازم کی حیثیت سے پبلسٹی کا کام کرنے لگا۔ ۱۹۳۹ء میں جب وزارت نے استعفیٰ دیا تو میں راجندر بابو سے ملا' انھوں نے کہا کہ ابھی لڑائی فائنل نہیں ہے۔ اس لئے آپ ابھی محکمہ میں رہیں اور دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔ ۱۲ اگست ۱۹۴۲ء کو گاندھی جی گرفتار کر لئے گئے تو میں نے اپنا استعفیٰ داخل کر دیا، اس میں لکھا کہ "شہیدوں کے خون کی روشنائی میں اپنا قلم ڈبو کر میں حکومت برطانیہ کی پبلسٹی نہیں کرنا چاہتا"۔ کچھ دنوں کے بعد اس شبہ پر کہ میں کانگریس کا کچھ کام کر رہا ہوں' گرفتار کر لیا گیا۔ ایک ماہ تک سیکورٹی قیدی رہا ——"

لیکن جمیل مظہری کی سیاسی سرگرمی زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکی۔ اور وہ اس سے دھیرے دھیرے دور ہو گئے۔ اس لئے کہ جمیل مظہری کے ذہن میں جو آزادی کا تصور تھا' یعنی دل و دماغ' روح کی آزادی' سرمایہ دارانہ نظام اور [illegible] غریب اور مزدور طبقہ کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اور مکمل مساوات' لیکن خواب کی تعبیر جب دوسری شکل میں نظر آنے لگی تو انھوں نے اس سے الگ ہو جانا ہی مناسب سمجھا اور یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

پھوٹے آزاد تو کیا گرد غم دوراں ہے وہی

حسرت اے صبح وطن شام غریباں ہے وہی

اس کے بعد جمیل مظہری کلکتہ اور بمبئی تلاش معاش کے سلسلے میں گئے اور کچھ عرصہ تک جیسے آبادی کے کہنے پر ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۱ء تک فلمی دنیا سے وابستہ رہے جہاں وہ گانے، مکالمے، گیت اور کہانیاں لکھتے رہے۔

لیکن ایک شاعر کی نازک مزاجی سے کون واقف نہیں، میر کی طرح جمیل نے بھی نازک مزاج پایا تھا۔ چنانچہ یہ احساس انھیں جس دن ہو گیا کہ ہیرو ہیروئنوں سے آگے انھیں کمتر سمجھا جاتا ہے اور بات چیت میں تصنع ہی تصنع ہے۔ اسی دن کئی لوگوں کے کہنے اور سمجھانے کے باوجود انھوں نے فلمی دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا اس سلسلے میں جمیل مظہری ایک جگہ لکھتے ہیں ——

"فلمی دنیا ترک صرف اس لئے کی کہ اس دنیا میں ادیبوں اور شاعروں کی قدر کیا ہوتی؟ کھلے تذلیل ہوتی ہے ہیرو ہیروئنوں اور ہیرو سے سامنے وہ لوگ حقیر سے [illegible] جاتے ہیں، انھیں منشی کا لقب ملتا۔ غالباً آج بھی وہی حالت ہے اس لئے میں بھاگا" ——

جمیل مظہری نے فلمی دنیا کی خود غرضی، مفاد پرستی جھوٹ، مکر و فریب سے پُر زندگی اور پیسوں کے عوض فن کو بیچنے کے کرب کا اظہار اپنی دو نظموں "بھاگ رے شاعر بھاگ" اور "نول اپنے کو تول" میں بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

فلمی دنیا ترک کرنے کے بعد جمیل مظہری معاشی طور پر کچھ دن پریشان حال رہے لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جنوری ۱۹۵۰ء میں بہار سرکار نے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے پٹنہ یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر تقرر کر دیا۔ جہاں وہ انتقال سے چند سال قبل تک درس و تدریس کے فرائض حسن و خوبی انجام دیتے رہے۔

یوں تو جمیل مظہری اپنی نظموں اور غزلوں کی وجہ کر زیادہ مشہور ہوئے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جمیل مظہری نے اپنی نظموں اور غزلوں کے علاوہ جو دیگر اصناف سخن مثلاً رباعی، مثنوی، قصیدہ، ہجو، مرثیہ، گیت اور سلام وغیرہ پر جو طبع آزمائی کی ہے وہ یقیناً قابل قدر اضافہ ہے۔ اس لئے کہ ان تمام اصناف سخن میں جمیل مظہری کا اپنا فلسفۂ حیات، اپنے افکار و احساسات اور منفرد و مخصوص لب و لہجہ پوری جذباتیت کے ساتھ موجود ہے اس کے ساتھ ساتھ جمیل مظہری کی پوری شاعری انفرادیت میں ضم ہوتی نہیں نظر آتی بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جمیل مظہری نے اس سے خاطر خواہ روشنی حاصل کی ہے۔

آئیے جمیل مظہری کی نظموں اور غزلوں سے قبل ان کی دوسری صنف شاعری کا جائزہ لیا جائے۔

مثنویاں یوں تو کئی دوسرے شعراء کی طرح جمیل مظہری نے بھی کئی لکھیں، لیکن خود انھوں نے صرف ایک مثنوی کو اشاعت کے لائق سمجھا اور جو "آب و سراب" کے نام سے منظر عام پر آئی۔ یہ مثنوی بلاشبہ ایک اچھے اور بڑے شاعر کی مثنوی لگتی ہے۔ اس میں اشعار کی روانی اور برجستگی کی وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک کامیاب مثنوی کی خصوصیت ہو سکتی ہے میرے خیال سے جمیل مظہری کی اس مثنوی کو بھی وہی مقام دیا جا سکتا ہے جو حفیظ جالندھری اور علی سردار جعفری کی مثنویوں کو دیا گیا ہے۔

جمیل مظہری کے مرثیوں اور قصیدوں کا ایک مجموعہ "عرفان جمیل" کے نام سے منظر عام پر آ چکا

ہے۔ ان مرثیوں اور قصیدوں کو پڑھنے کے بعد بے اختیار میر تقی میر کے مرثیوں اور قصیدوں کی یاد آتی ہے۔

جمیل مظہری کی ہجو بھی خاصی مشہور ہیں۔ خاص طور پر کلکتہ اور عظیم آباد کے لوگ جمیل مظہری کی ہجو نگاری سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لئے کہ یہاں ان کے کئی دوستوں نے فرمائش کر کے اپنے دوستوں اور دشمنوں .... پر ہجو لکھوائیں۔ پٹنہ کے مشہور پرانے گھی فروش مولوی مکھن کے سلسلے میں جمیل مظہری کی ہجو کا بند ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

اے مولوی مکھن ....

تم عقل کے دشمن ہو کہ ایمان کے دشمن
میاں اپنی اٹھتی ہوئی دوکان کے دشمن
کیوں اپنے خریداروں کی ہو جان کے دشمن

اے مولوی مکھن... اے مولوی مکھن ...

گھی بیچتے ہیں آپ کہ ہیں بیچتے ایمان
کھا کر اسے دبلے ہوئے پٹنے کے پہلوان
کھلا گئے معشوقوں کے اُبھرے ہوئے پستان

اے مولوی مکھن ... اے مولوی مکھن ...

پٹنہ کالج میں امتحان کے انچارج پروفیسر امیسٹ کی درگت بھی قابل مطالعہ ہے ؎

یہ امیسٹ صاحب کی کد دیکھئے
تماشائے عقل و خرد دیکھئے
کہ شاعر کو کانسٹبل کر دیا
جو قابلیت میں تھا اس کو نل کر دیا

جمیل مظہری کی ان ہجو کے چند اشعار دیکھنے کے بعد ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ جمیل مظہری کے اندر ہجو لکھنے کی پوری صلاحیت تھی۔ خاص طور پر دلچسپ اور تیکھا لب و لہجہ جمیل مظہری کو ممتاز بناتا ہے۔

جمیل مظہری کی رباعیوں میں بھی فکر و فن کے نئے نئے گل و بوٹے کھلتے نظر آتے ہیں۔ جن میں دل آویزی اور سحر آفرینی کے نمونے بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جمیل مظہری کی رباعیوں کے سلسلے میں پروفیسر احتشام حسین رقم طراز ہیں :-

" فکر و فن میں "صدائے شکست" کے عنوان سے جو رباعیاں شامل ہیں۔ وہ توازن کے درہم برہم نہ ہونے، جذباتی بے چینی کے ساتھ ساتھ فکری ہیجان اور انسان اور قدرت کی باہمی آویزش کا بہت اچھا آئینہ ہیں۔ ذاتی تجربے اور انفرادی غم نے حقیقت غم، مجبوری، انسان، قوت مشیت وغیرہ کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا، پھر چونکہ اوروں نے بھی ان مسائل سے آنکھیں ملائی تھیں، اس لئے انفرادی تجربے عمومی فلسفوں میں ڈھلنے کی کوشش کرنے لگے۔"

مندرجہ بالا باتوں کی تائید کے لئے ایک رباعی بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں : ؎

مضراب سے تیری حاصل سازِ ستی
شیشے سے صدائے سنگ انداز سنی
ٹوٹا جو اچانک میرا ساغر کل رات
میں نے اک قہقہے کی آواز سنی

اب آئیے جمیل مظہری کی غزلوں کی جانب،

حالانکہ جمیل مظہری نے غزلوں سے زیادہ نظموں کی جانب جھکاؤ دیا ہے۔ لیکن جمیل مظہری کی غزلوں میں پائی جانے والی شگفتگی، رعنائی، دلکشی، سیاسی و سماجی تقاضے عصری مطالبے، نفسیاتی شعور، مخصوص فضا، موضوعات کا تنوع اور منفرد اور خوبصورت لب و لہجہ کے ساتھ ساتھ فنی مہارت نے جمیل مظہری کو بیسویں صدی کے چند اہم اور معتبر غزل گو شعراء میں ایک خاص مقام عطا

کردیا۔ جمیل مظہری کی شاعرانہ عظمت کے معترف ڈاکٹر وہاب اشرفی بھی ہیں جو یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ ۔

"میں جمیل مظہری کو ایک شاعر بھی مانتا ہوں اور بڑا بھی۔ اس لیے کہ وہ خاتمِ ہیں، نقال نہیں۔ ان کی شاعری میں انفرادیت ہے۔ اس کے رنگ و روپ اس کے اپنے ہیں۔ یہ بھیڑ میں گم نہیں ہوتی۔ یہ خزانے کا چرایا ہوا [illegible] نہیں۔"

جمیل مظہری کی غزلوں کے چند اشعار درج ذیل ہیں جو میری اور ڈاکٹر وہاب اشرفی کی درج بالا باتوں کا اعتراف اور خود جمیل مظہری کی کہی ہوئی بات کہ "میں اپنی غزلوں کو بہترین غزل نہیں سمجھتا" کی نفی کرتے ہیں۔

(۱)

اب تو دھوپ آ پہنچی جا لڑیوں [illegible]

اب پناہ لینے کو [illegible] کہاں جائے ...

(۲)

پاس آ کے [illegible] نہیں [illegible]

وہ سراب اچھا جو دور سے بلاتا ہو

(۳)

یہ اک سوال ہے میرا بلندیوں سے جمیل

کہ یہ زمین نہ ہوتی تو آسمان ہوتا

(۴)

تھی وہ شاید اپنی ہی بے چارگی کی اک پکار

جس کو اپنی سادہ لوحی سے خدا سمجھا تھا میں

غزلوں کے بعد جمیل مظہری کی نظموں، جنہیں وہ بذاتِ خود غزلوں سے زیادہ بہتر مانتے ہیں، کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ جمیل مظہری کی نظمیں "تفکرات و تاثرات" سیاسیات و عمرانیات، مذہبیات و جنسیات وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت [illegible] "ذیل" میں ملتی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی دوسری اچھی [illegible] نظمیں مختلف ادبی رسالوں میں نظر سے گزرتی رہی ہیں۔

جمیل مظہری کی [illegible] اس زمانے کی یاد دلاتی ہیں۔ جب ہندوستان پر جانبِ اہلِ مغل بھی ہوئی تھی۔ سیاسی و سماجی حالات بڑی تیزی سے اپنا رخ بدل رہے تھے۔ اضطراب اور جوش و خروش کی کیفیت لوگوں کے دلوں میں جگہ پا رہی تھی۔ جمیل مظہری بھی ہوا کے اس رخ سے متاثر ہوئے اور نظموں کے ذریعہ جنگ میں انگریزوں اور [illegible] کی غلامی کے خلاف آواز اٹھانے لگے۔ انہیں ملک کی آزادی کے لیے لوگوں کے دلوں میں احساسات و جذبات سے پُر نظموں میں ہمت، حوصلہ، جوش و ولولہ پیدا کرنے لگے۔ لیکن یہ جمیل مظہری نے [illegible] کے عدم تشدد کے فلسفہ کو بھی [illegible] کیا تھا اس لیے ان کی انقلابی اور سیاسی نظموں میں محض گرج، سیاسی نعروں یا جذباتی روش کی بجائے سنجیدگی، اعتدال، ضبط و تحمل اور آزادی و انقلاب کی واضح تصویریں ملتی ہیں۔ [illegible] اعلیٰ خیال، گہرے فکر و فن کے نمونے ملتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم جمیل مظہری کی کئی مشہور نظمیں مثلاً "نوائے جرس"، "تبرات"، "بغاوت کا دعوت نامہ"، "وقت کی دھارا پھیرنے والے"، "جشنِ آزادی"، "یومِ آزادی"، "دھارے"، "موسم کے اشارے" وغیرہ پیش کر سکتے ہیں۔

جمیل مظہری کی بقیہ دوسری نظمیں جو "تفکرات و تاثرات" کے تحت آتی ہیں، ان میں جمیل مظہری کے افکار و خیالات اعلیٰ و ارفع فکر کے ساتھ ساتھ تشکیک کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ خواہ وہ فلسفہ کا مطالعہ ہو یا مذاہب کا سوال۔ تشکیک بہرحال ہے۔

اور اس کی وجہ مختلف مذاہب اور فلسفۂ حیات کا گہرا مطالعہ ہے۔ اور ان مطالعوں کی روشنی میں جمیل مظہری کا ذہن منتشر نظر آتا ہے۔ جو تشکیک کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ عام طور پر جمیل مظہری کی تشکیک کو معقولیت کامل سے انحراف تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جمیل مظہری کا اس طرح کا اظہار خیال انکار اور اقرار کے درمیان کی کشمکش کے واضح ثبوت فراہم کرتا ہے اور خدا اور کائنات کے تخلیقی مقصود سے قریب کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ غور و فکر کے دروازے وا کرتا ہے۔ بقول پروفیسر احتشام حسین

"ان کی تشکیک خیال افروز بھی ہے اور تخلیقی بھی۔ وہ ان کو خدا اور کائنات کے ایک تخلیقی مقصد تک پہنچاتی ہے"

اس سلسلے میں جمیل مظہری کی دوسری کئی نظموں کے ساتھ ساتھ "پیام" ـ "آدم نو کا ترانہ" ـ "سفر نامۂ آدم اور ارتقاء" کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

جمیل مظہری کی ان نظموں کے علاوہ رومانیات اور شبابیات کے تحت جو نظمیں ہیں۔ ان میں اہم اور خاص بات یہ ہے کہ عشق و محبت کے فسانے، احساس محرومی، ناکامی اور بے بسی کی واضح اور صاف تصویر دوسرے کئی نظم گو شعراء کی طرح جمیل مظہری بھی پیش کرتے ہیں لیکن جو بات انھیں ممتاز اور منفرد کرتی ہے وہ ہے خیال اور تصور آتی دنیا سے گریز۔ جمیل مظہری ہمیشہ اختر شیرانی کی طرح سلمیٰ اور عذرا کی طرح گھریلو اور ارضی لڑکیوں سے عشق کرتے ہیں اور پھر ناکامیٔ عشق پر کہتے ہیں۔ "کیا ہوا تم کو" ـ "کہانی دوشیزۂ بنگال" ـ "اعتراف" ـ "اسے کو کیا محبت" ـ "ڈرو خدا سے ڈرو"

وغیرہ جیسی معرکۃ الآرا نظموں میں جمیل مظہری کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔

یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو جمیل مظہری کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کے لئے کافی ہیں اور میں ڈاکٹر وہاب اشرفی کی اس بات کی تائید کرتا ہوں جس میں انھوں نے کہا ہے کہ "میں جمیل مظہری کو ایک عظیم شاعر تسلیم کرتا ہوں جن کی شاعری پر وقت کی گرد نہیں پڑ سکتی۔"



مثنوی "آب و سراب" کا عمومی جائزہ

ظہیر ناشاد دربھنگوی

اردو مثنوی کی ابتدائی تاریخ بڑی شاندار ہے۔ دکن میں خصوصاً اس صنف شاعری کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ بہمنی، عادل اور قطب شاہی دور میں موضوع کے اعتبار سے ہر قسم کی مثنویاں لکھی گئیں۔ چونکہ شمالی ہند میں (میر کو چھوڑ کر) زیادہ غیر فطری، طلسماتی اور غیر معقول واقعات ہی کو خصوصیت کے ساتھ مثنوی کے قالب میں داخل کیا گیا، اس لئے مثنوی کا فن منتہائے عروج پر نہیں پہنچ سکا۔

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کا ہر ادب اپنا ایک خاص تہذیبی پس منظر رکھتا ہے جس کے مطابق ہی اس کا ارتقا ہوتا ہے۔ اردو مثنوی کا روایتی اور تہذیبی پس منظر بنیادی طور پر [illegible] بھی رہا ہے۔ ہمارے شعراء کی اکثریت عموماً حسن و عشق، [illegible] ہجر و وصل [illegible] کے واقعات وغیرہ کو مثنوی کا موضوع بنانے کی عادی رہی ہے اس لئے صنف مثنوی میں جنس نگاری، عریانیت اور [illegible] لذتیت وغیرہ کا رواج و رجحان شروع سے رہا ہے۔ دراصل دکنی کی "قطب مشتری" سے یہ رجحان شروع ہوا اور مرزا شوق نے اس کو انتہا تک پہنچا دیا۔ "قطب مشتری" ہو کہ "زہر عشق" [illegible]

"گلزار نسیم" ان میں حسن و عشق کی مصنوعی اور رسمی کہانیاں سطحی انداز میں بیان کی گئی ہیں اس لئے ان مثنویوں میں [illegible] افکار و خیالات اور اخلاق و مذاہب کی پستیاں اپنی جگہ برقرار رہیں البتہ [illegible] روانی، برجستگی، سلاست اور بے ساختگی کے علاوہ متحرک تصویر کشی کا نمایاں عکس ملتا ہے۔ کردار نگاری، منظر نگاری، مکالمہ، عورتوں کے سراپا، زیور، لباس، ماما کی گفتگو، بیگمات کی بول چال، فضا آفرینی، فراق کی کیفیت، وصال کی لذت کے دلچسپ تذکرے ملتے ہیں اور محبوب کے سراپا کی ہیجانی کیفیت اور نسوانی کردار کی بڑی جاندار ترجمانی کی گئی ہے۔ اس لئے ان کی علمی اور فنی حیثیت مسلم ہے۔

موجودہ عہد نے جن چند منفرد اور صاحب طرز شاعروں کو جنم دیا ہے ان میں جوش، فراق اور علامہ جمیل مظہری کے اسمائے گرامی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ علامہ جمیل مظہری کی متنوع شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ بقول علامہ نیاز فتح پوری:

"جمیل مظہری ایک ایسا شاعر ہے جس نے [illegible] دور جدید کی کوئی چیز تخلیق نہیں کی [illegible] دراصل [illegible]"

اور فنی بصیرت سے بطرز خاص نوازا تھا۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے پیش رووں اور معاصرین کی روش سے الگ تھلگ رہ کر اپنے فکر و فن کی تزئین و آرائش کی ہے اور اپنی شاعری میں عموماً زندگی کی تلخ حقیقتوں اور ماحول کی اثر آفرینی کو زیادہ سے زیادہ برتنے کی مجتہدانہ کوشش کی ہے۔ جمیل مظہری چونکہ ایک عظیم اور سچے فنکار ہیں اس لئے وہ اپنی روح کے کرب و اضطراب اور دل کے سوز و درد کو اپنے فن پارے میں بطرز احسن داخل کر دیتے ہیں جنانچہ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں جذبے کی آنچ، فکر کی بلندی، کلام کی شیرینی، تخیل کی تابانی و حرارت ملتی ہے۔ موصوف کی شاعری میں جگہ بجگہ وہم و یقین، کفر و ایمان، خیر و شر اور عقائد و نظریات کے تصادم کی گونج بھی سنائی دیتی ہے لیکن میرے خیال میں ان کے یہاں کوئی " واضح ذہنی تحریک " نہیں ملتی البتہ کہیں کہیں ذہنی تربیت کا مفید اور صالح میلان ضرور ملتا ہے جس کی وجہ سے بیسویں صدی کا اردو ادب کسی نہ کسی رنگ میں جمیل صاحب کے فکر و فن سے ضرور متاثر ہوا ہے۔

چونکہ علامہ جمیل مظہری کی شاعری کا کسی ایک مقالہ میں جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔ اس لئے زیر نظر مضمون میں ان کی مثنوی " آب و سراب " کا ایک عمومی جائزہ پیش کروں گا۔

علامہ جمیل مظہری نے اردو مثنوی کے غیر فطری میلان کو تبدیل کرنے کے سلسلہ میں قدم اٹھایا ہے اور ہمیشہ اپنے ماحول اور معاشرے کے بدلتے ہوئے معیاروں پر توجہ کی ہے اس لئے ان کے یہاں عصری آگہی اور اصلاحی میلان صاف نظر آتا ہے جس کی ایک عمدہ اور خوشگوار مثال ان کی مثنوی " آب و سراب " میں ملتی ہے۔

جمیل صاحب کے پیش رووں میں بیشتر مثنوی نگار شعراء محیر العقول، مافوق الفطرت واقعات، سستی رومانیت اور طلسماتی کہانیوں کی ادائیگی میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کرتے رہے ہیں لیکن جمیل صاحب نے اپنی فنکارانہ بصیرت اور فنی شعور سے صنف مثنوی کی کم مائیگی اور پستی کو دور کرنے کی اجتہادی کوشش کی ہے اور مثنوی کی تہی دامنی کو بہت حد تک پر کیا ہے۔

مثنوی آب و سراب " تشکیک و آگہی کے محور پر گردش کرتی ہے، اس میں عصری آگہی اور فلسفۂ مذہب کا گہرا شعور ملتا ہے، اس میں جو فلسفیانہ اور جذباتی کشش اور معنی آفرینی ہے وہ دل کو بھاتی ہے، اس میں خدا پرستی کا والہانہ جذبہ بھی ہے اور معرفت و صداقت کا رنگ بھی۔ انسان کی ذہنی کیفیت کی عکاسی بھی ہے اور مذہبی نظریات کی تحقیقات کی خوشبو بھی، خیال و فکر کی بلندی بھی ہے اور جذبۂ احساس کی لطافت بھی، مختصر یہ کہ اس میں تشکیک ایقان کی شمع فروزاں نظر آتی ہے۔ " آب و سراب " فنی نقطۂ نگاہ سے بھی اس قابل ہے کہ اسے اردو مثنویوں کی صف میں ایک ممتاز مقام دیا جا سکتا ہے۔ اس کے لب و لہجہ میں بڑی متانت اور سنجیدگی ہے۔ اپنے انداز بیان اور اختصار کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ زبان و خیال کی سلاست و پاکیزگی اور مضمون کی دل آویزی کے اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ مثنوی بالکل طبع زاد ہے جس میں انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کو برتا گیا ہے زبان خاص طور پر اتنی صاف اور آسان استعمال کی گئی ہے کہ بعض اشعار فوراً یاد ہو جاتے ہیں۔ نمونتاً یہ چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور لطف اٹھائیے :

تاریخ ہماری اور کیا ہے
اک تشنہ لبی کا مرثیہ ہے
نفرت ہو یہاں کہ محبت
دونوں ہیں یہ تشنگی کی حالت
پلتی ہے تشنگی گھروں میں
بٹتی رہی پیاس میکدوں میں
نفرت کا علاج ہے محبت
بیمار کو ہے اسی کی حاجت
دشمن سے جو دشمنی کرو گے
اس قرض کا سود بھی بھرو گے
فریاد یہی ہے بانسری کی
آواز یہی ہے شاعری کی

مثنوی کی مخصوص خوبیاں یہ ہیں کہ اس میں زمانے کے رسم و رواج، طور طریق کی مکمل تصویر ہو۔ اپنے سماجی سیاسی اور معاشرتی حالات کا ایک بہترین مرقع ہو، زندگی کی بوقلمونی اور انسان کی عظمت کا ترانہ اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ "آب و سراب" میں متذکرہ خوبیوں کی تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے

بیدار ہوئی ہے روح جمہور
طاقت کے نشے سے وہ بھی مخمور
کھانے کا امیر اسے نہ سمجھو
پینے کا وزیر اسے نہ سمجھو
جس قوم میں ہو خدا سے بیو پار
رشوت کا نہ کیوں ہو گرم بازار
جس ملک میں ہو یہ بد قماشی
حکام ہوں اس کے کیوں نہ فراشی

اس مثنوی میں شاعر کے تجربے کے اندر ایک نئی

معنویت اور تازگی پائی جاتی ہے

اللہ رے ان کی سرگرانی
قسمت سے کہیں ملا جو پانی
پانی کو وہ بھی سراب سمجھے
جلوہ تھا مگر نقاب سمجھے

ایک اور جگہ فرماتے ہیں

اے قلب و نظر کے تشنہ کامو
اے ریگ و سراب کے غلامو
احساس تمہاری تشنگی کا
رخ پھیر چکا ہے زندگی کا
پانی کی یہ نت نئی سبیلیں
اک پیاس کی نو بہ نو دلیلیں

شاعر کو کائنات کی پیاس کی شدت کا احساس ہی نہیں بلکہ شدید احساس ہے۔ وہ کائنات کی تشنگی کو بجھانا چاہتا ہے لیکن پیاس بجھ نہیں پاتی اس لئے وہ اس فکر میں غوطہ زن ہے کہ تہذیب نے فن و ادب اور مار العذب کے چشمے ہر جگہ جاری کئے۔ کوئی صنم اور دیر و حرم کے پنگھٹ پیاسوں کو اپنی جانب بلاتے رہے، خانقاہوں میں عرفان کے پیالے بھی پلائے گئے اور مدرسے میں فلسفہ کا خم بھی لنڈھایا گیا پھر بھی انسان کی تشنگی بجھ کیوں نہ سکی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جسے آج تک عقل انسانی حل نہیں کر سکی۔ اگرچہ جمیل مظہری بھی اس سوال کو حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں مگر چند واضح اشارے ایسے دلیل و براہین کے ساتھ پیش کرتے ہیں جن کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو جی چاہتا ہے۔

"آب و سراب" پر تبصرہ کرتے ہوئے محترم ابراہیم ہوش مدیر آبشار کلکتہ فرماتے ہیں
"اس میں بیک وقت کئی فلسفے جھلکتے نظر آتے

[illegible] ہو تا ہے [illegible]
[illegible] ذہنی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کہا ہے اس کا مطلب کیا ہے اور وہ قاری کو کہاں پہونچانا چاہتا ہے۔"

[illegible] میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ شاید ہوش مبا نے "آب و سراب" کا مطالعہ یکسوئی ذہن کے ساتھ نہیں کیا ہے ورنہ وہ اس قسم کا اعتراض نہیں کرتے کہ "قاری جب مثنوی ختم کرتا ہے تو اسے مطلق پتہ نہیں چلتا کہ آخر شاعر نے جو اتنا کچھ کہا ہے اس کا مطلب کیا ہے۔"

[illegible] ہے کہ
[illegible] کیا ہے کہ ایسا [illegible]
جو شک کی آغوش میں پلا ہو اصولاً ایمان بھی وہی ہے

علامہ جمیل مظہری کا قول ہے کہ "ایمان کامل وہ ہے جو شک کو اپنے اندر جذب کر لے"۔ اس لئے یہ مثنوی ایمان و گمان کی خوشبو سے لبریز ہے اور شاعر منطقی مرحلہ وہم و گمان اور منزل تشکیک سے گذرنے کے بعد اپنے قاری کو خود شناسی کی دعوت دیتا ہے۔ ع

جب تک نہ مٹے گی آدمیت
فطرت کے خلاف اک بغاوت
اس وقت تک یہ پیکر خاک
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] ہے اور [illegible] دل میں [illegible] کر لیتا ہے۔ چند اشعار نقل کرتا ہوں جن میں [illegible] اور [illegible] کا حسین گلدستہ نظر آتا ہے۔ ع

تم کیا ہو [illegible] تو بے ادب ہیں
اس تشنہ لبی کے دو سبب ہیں
[illegible] گراں
یعنی کہ ملا جو تم کو پانی
پانی نہیں عکس آب تھا وہ
جو کچھ بھی ملا سراب تھا وہ
اور دوسری وجہ جو ہے پیارے
وہ دل کی تہوں میں ہے تمہارے
جو روح پہ ہے ازل سے طاری
یہ تشنہ لبی نہیں تمہاری
یہ پیاس نہیں تمہاری بابا
تم میں جو خدا ہے وہ ہے پیاسا

"تاریخ اردو ادب" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اب تک مثنوی میں مافوق الفطرت مضامین ہی کی کثرت رہی ہے مثلاً کسی حسین شاہزادے کا حسین شہزادی یا پری پر عاشق ہونا، ہیرو کا مبالغہ کی حد تک حسین ہونا اور تمام خصوصیات کا ہیرو میں مجتمع ہونا وغیرہ وغیرہ جو یکسر مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے لیکن جمیل مظہری نے صنف مثنوی کو ایک نیا موڑ دینے کی کوشش کی ہے۔ "آب و سراب" میں زندگی کے پیکار و تصادم اور روز و شب کے حقیقی مسائل کی منہ بولتی تصویریں ملتی ہیں۔ مختصر یہ کہ جمیل صاحب نے صنف مثنوی کے اندر ایک نئے مزاج کا آغاز کیا ہے جس کی مثال گذشتہ مثنویوں میں [illegible] نہیں ملتی ہے۔

[illegible] عام طور پر شعراء مثنویوں کا آغاز حمد و نعت سے کرتے ہیں۔ اکثر مناجات بھی شامل ہوتی ہے جن میں صدق و جذبات اور خلوص کی بو کم سے کم ہوتی ہے

شعراء مذہبی عقیدت مندی کی وجہ سے فوراً [illegible] عقیدت
کی طرف جلد لوٹ آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جمیل صاحب
کی اجتہادی کوشش قابل تعریف ہی کہی جا سکتی ہے کہ
موصوف [illegible] بارہ معرکے کے ساتھ اس مرحلہ سخت
سے کامراں گذر گئے ہیں۔

"آب و سراب" کے آغاز ہی سے شاعر انسان
کو حواس میں آنے کی تلقین کرتا ہے اور آب آفریں کو سجدہ
کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ شاعر خود بھی تلاش آب آفریں
میں در بدر کی خاک چھانتا ہوا نظر آتا ہے۔ شاعر کی تمنا ہے
کہ کسی صورت اس کی کوشش انسان کی روح کی تشنگی کو
بجھانے میں کامیاب ثابت ہو جائے لہذا شاعر کی یہ
کوشش انسان دوستی کے جذبات سے سرشار نظر
آتی ہے۔ آخر میں شاعر اپنی شکست کا اعتراف کرتے
ہوئے کہتا ہے ؎

اور میں تو ہوں ایک مرد مجہول
دین و دانش کا ایک مقتول
جینا بھی نہیں ہے جو توانا
سچ ہے قول نسیم دانا
دم دھاگے میں رشتۂ نفس کے
پھندے میں پڑا ہے پیش و پس کے

اسے کہتے ہیں فنکاری اور شاعرانہ جدت۔ شاعر نے
اپنی کم مائیگی اور عجز کا اظہار کر کے اپنے نا قدروں کو حیرت
[illegible] میں ڈال دیا [illegible] ہے کہ اس ناکام
شکست کو کس چیز سے تشبیہ دوں ؎

عقل حیران ہے اسے کیا کہئے

غرض کہ شاعر پر ایک اضطرابی کیفیت طاری
ہے وہ کسی صورت سے آب آفریں حاصل کرنے کی فکر
میں غلطاں ہے۔ وہ ایک ماہر نفسیات کے روپ میں
انسان کی دماغی اور ذہنی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی جد
و جہد کرتا ہے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ ہر عہد اور ہر شخصیت
اپنے [illegible] کو [illegible] کا نام [illegible] نے
[illegible] دکھانے کے لئے اپنے خالق سے اصرار کیا تھا
علامہ اقبال نے شکوہ کیا۔ اور غالب کو اپنے گناہوں
کے جواز میں یہ کہنا پڑا کہ آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا
"آب و سراب" میں جمیل صاحب نے بھی چند جسارت
مندانہ اقدام کئے ہیں لیکن فوراً ہی ان کو اپنی گستاخی
کا احساس ہو جاتا ہے اور فرمانے لگتے ہیں ؎

بے وجہ ہو یا بے ضرورت
مجبور کا فرض ہے عبادت
وہ مانگے نہ مانگے تجھ سے سجدے
تو فرض ادا کر اپنا بندے

ان چند مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمیل صاحب
نے مثنوی کے بکھرے ہوئے گیسو کو سنوارا، اس
کے حسن کو نکھارا اور اسے توانائی بخشی۔ موصوف
نے مثنوی کی روایت کے برتنے میں بہت کچھ غور اور
فکر سے کام لیا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے "آب و سراب"
کی ادبی اہمیت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ "آب
و سراب" میں شروع سے آخر تک مضمون کی دلکشی کا
عالم کہیں ماند ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ؎

آندھی بے وجہ چل رہی ہے
[illegible] رہی ہے
بے وقت برس رہا ہے پانی
اے وائے تمہاری حکمرانی
کیوں ہو نہ یہ نقص بے انتظامی
فطرت کے نظام میں ہے خامی

یہ چند اشعار اتنے فکر انگیز ہیں جن پر الگ سے تفصیل کے ساتھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن بخوف طوالت قلم روک لینا پڑ رہا ہے۔ جمیل صاحب نے مثنوی کے آخر میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بلاشبہ آب زریں سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ؎

افسانہ ہے یہ غرض ہمارا
تشکیک بھی ہے فرض ہمارا
پڑھ پڑھ کے کتاب آسمانی
دیر اور حرم کی خاک چھانی
پوچھا دامن نگاہ کا بھی
پھیرا کیا خانقاہ کا بھی
لیکن نہ ہوا علاج اس کا
بگڑا ہی رہا مزاج اس کا
اٹھتے ہی رہے شکوک پیہم
بڑھتی رہی دل کی بھوک پیہم

آخر میں شاعر نے کتنی اچھوتی تمنا کا اظہار کیا ہے

اے کاش اک ایسا ابر آتا
جو روح کی پیاس بھی بجھاتا
مدت سے ہے بند نبض امکاں
آنے کو تو آ رہے ہیں طوفاں
جھونکا کوئی اس طرف بھی آجائے
چھینٹا کوئی اس طرف بھی آجائے
پھر نہال ہو آگہی ہماری
بجھ جائے یہ تشنگی ہماری

محولہ بالا اشعار کی روشنی میں یہ بات بلا خوف تردید بھی جا سکتی ہے کہ جمیل صاحب نے مثنوی کی مروجہ روایت کے خلاف ایک باغیانہ اور اجتہادی روش اختیار کر کے دنیائے مثنوی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ مثنوی جو ایک طویل عرصے سے ہماری عدم توجہی کے دبیز پردے میں پڑی ہوئی تھی اسے گمنامی کے پردے سے نکال کر ایک ایسی شاہراہ پر لا کھڑا کیا ہے جہاں سے اب راہ گیر کی توجہ کا مرکز بنے بغیر نہیں رہ سکتے مجھے امید ہے کہ اگر "آب و سراب" کی طرز پر مثنویاں لکھی گئیں تو مثنوی کا بازار پھر سے گرم بھی ہو سکتا ہے اور عوام پسندیدگی کی نگاہ سے بھی پڑھیں گے۔

سب سے آخر میں ڈاکٹر محمد حسن صاحب کی رائے نقل کرنا چاہتا ہوں۔ موصوف فرماتے ہیں "اس دور کے شعری سرمائے میں سب سے اہم مرتبہ جمیل مظہری کی مثنوی "آب و سراب" کو حاصل ہے جو نہ صرف شاعر کا اہم ترین سرمایہ ہے بلکہ اس دہائی کی بھی اہم ترین تخلیق ہے موضوع ہے عرفان حقیقت اور اس فلسفیانہ جستجو کے ماخذ انسان جن جن فلسفوں، عقیدوں، مذہبوں اور فکری پناہ گاہوں میں حقیقت کے سوتے تلاش کرتا ہے۔ پھر انسان کے سارے اضطراب کا حل انسان کی خود شناسی میں دریافت کر کے مثنوی کو ایک نئی فکری سطح بخشی گئی ہے۔ انسان کی الوہیت کا یہ رجز اردو شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔"

علامہ جمیل مظہری نے "آب و سراب" میں فلسفۂ یقین و تشکیک کے نکتے پیش کر کے نہ صرف یہ کہ اردو مثنوی کے دامن کو مالا مال کر دیا ہے اور اس صنف شاعری میں خوشگوار تبدیلیاں پیدا کی ہیں بلکہ اپنے ان متقدمین مثنوی نگاروں کی روح کو بھی شرمندہ کر دیا ہے جنہوں نے مثنوی نگاری کو محض جنسی اور تفریحی لذت کا وسیلہ بنا رکھا تھا۔

آہ جمیل مظہری

علامہ جمیل مظہری کے سانحہ ارتحال سے متاثر ہوکر

فخر بہار عظمت ہندوستاں جمیل
نکتہ شناس و نکتہ در و نکتہ داں جمیل
کل تک ہماری بزم میں تھا گلفشاں جمیل
خلد بریں میں آج ہے خلد آشیاں جمیل
سینے میں اُسکے سوز ولائے حسین تھا
وہ عاشق علی شہ مشرقین تھا

اس کا کلام دعوت بیداری و عمل
مضمر ہے اسمیں قوم کی دشواریوں کا حل
مانا ہر ایک فرد کو ہے لازمی اجل
مشکل ہے پھر جمیل کا آئے کوئی بدل
اللہ گر جمیل و یحبّ الجمال ہے
نقش جمیل مظہر اوج خیال ہے

▼▼

نکہت نسرین بی۔ اے۔ آنرس

ماتمِ جمیل

بجھی بجھی سی ہے سحر، دھواں دھواں سی شام ہے
نہ آفتاب ضوفشاں، نہ وہ مہ تمام ہے
بسیط کائنات پر یہ ناچتی اداسیاں
یہ کس کے سوگ میں ہے ڈوبا ڈوبا سارا آسماں
یہ سونی سونی رہ گذر یہ اونگھتے سے راستے
یہ کوئے دلبراں کے لڑکھڑاتے ناتواں دیئے
بجھی بجھی سی نغمگی، تھکی تھکی سی شاعری
سکوت بر لبانِ شوق دم بہ دم سخن وری
کہاں وہ شورِ مرحبا، کہاں وہ دادِ فکر و فن
کہاں وہ میرِ شاعراں کہاں وہ جانِ انجمن
وہ خانقاہِ ہو کہ بارگاہِ علم و فن
ہر ایک جا لبوں پہ ایک ہی سوال موجزن
جہانِ فکر و فن میں لازوال نقش چھوڑ کر
یہ کون اٹھ گیا تمام رشتے ناطے توڑ کر
سبو و جام پھینک دو رباب و چنگ پھینک دو
مناؤ سوگ ہم دمو، لٹاؤ اشک دوستو
کہ یہ غمِ جمیل ہے
یہ ماتمِ جمیل ہے

▼▼

ناظم سلطان پوری

لازمی بچت کی رقوم کی واپسی

انکم ٹیکس دہندگان!

کیا آپ نے لازمی بچت اسکیم (انکم ٹیکس دہندگان) ایکٹ 1974 کے تحت 76-1975ء، 77-1976، 78-1977، 79-1978ء و یا 80-1979ء و یکمالی برسوں کے دوران کوئی رقوم جمع کرائی ہیں۔

اگر کرائی ہیں تو آپ جمع شدہ رقوم بمعہ سود پانچ سالانہ اقساط میں واپس لینے کے حقدار ہیں۔ یہ واپس ادائیگی اس مالی سال سے جس میں آپ نے رقوم جمع کرائی ہوں گی۔ دو سال کے بعد سے شروع ہوگی۔

اس لئے

واپس ادائیگی پانچ اقساط میں بمعہ سود	جمع کرائی گئی رقوم	
1.4.82 ، 1.4.81 ، 1.4.80 ، 1.4.79 ، 1.4.78	31.3.1976	1.4.1975
1.4.83 ، 1.4.82 ، 1.4.81 ، 1.4.80 ، 1.4.79	31.3.1977	1.4.1976
1.4.84 ، 1.4.83 ، 1.4.82 ، 1.4.81 ، 1.4.80	31.3.1978	1.4.1977
1.4.85 ، 1.4.84 ، 1.4.83 ، 1.4.82 ، 1.4.81	31.3.1979	1.4.1978
1.4.86 ، 1.4.85 ، 1.4.84 ، 1.4.83 ، 1.4.82	31.3.1980	1.4.1979

رقوم واپس کیسے لیں؟ فارم "ای" پر اپنی پاس بک کے ساتھ اپنے جمع دفتر کو درخواست دیں۔ فارم "ای" آپ کو اپنے بینک سے ملے گا۔

جلدی کیجئے رقوم کی واپسی کلیم کیجئے جو کہ یکم اپریل 1978 ، یکم اپریل 1979 ، یکم اپریل 1980 یکم اپریل 1981ء کو واجب الادا ہو چکی ہیں۔

یہ بھی مت بھولیے بعد ازاں کی اقساط جو یکم اپریل 1982ء یکم اپریل 1983 ، یکم اپریل 1984 وغیرہ کو واجب الادا ہیں، انکے کلیم بھی آپ کو کرنا ہیں۔

یاد رکھیے یکم اپریل 1981ء سے جمع کنندگان کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ قابل بازیافت اقساط کی رقوم بمعہ سود واپس نہ لیں۔ اس حالت میں واپس نہ لی گئی رقوم پر سود اس وقت تک لگتا رہے گا جب تک وہ جمع رہیں گی جیسے کہ وہ لازمی بچت ہوں اور لازمی بچت اسکیم (آمدنی ٹیکس دہندگان) ایکٹ 1974ء کی دفعات ان رقوم اور ان پر واجب الادا سود پر لاگو رہیں گی۔ اس مقصد کے لئے جمع کنندہ کو کوئی تحریری رضامندی داخل کرنے کی ضرورت نہیں۔

ڈائریکٹر آف انسپکشن

(ریسرچ اسٹیٹسٹکس اینڈ پبلی کیشن)

انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

DAVP 81/381

حضرت علامہ جمیل مظہری

اور اُن کا فن

سید قطب الدین احمد ایم اے شاہین حمزہ پوری

"نقش جمیل اور فکر جمیل" کے آئینہ میں علامہ جمیل مظہری کی ادبی شخصیت ایک اہم اور معروف شخصیت ہے۔ ادبی دنیا اور دانشور طبقہ ان کے ادبی کارناموں سے صرف روشناس ہی نہیں بلکہ معترف بھی ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت کسی طرح بھی کم نہیں۔ علامہ جمیل مظہری نے اردو شاعری کے مختلف اصناف سخن پہ طبع آزمائی کی ہے۔ وہ شعر و شاعری کی دنیا میں ایک بلند قامت شاعر کی حیثیت سے آئے اور شعر و سخن کی دنیا میں اپنا لوہا منوا گئے۔ سرزمین بہار جو ہر لحاظ سے عموماً اور علم و ادب اور شعر و سخن کے لحاظ سے خصوصاً ہندوستان میں اپنا ایک بلند ترین مقام رکھتی ہے وہ شعر و ادب کی دنیا میں بھی کسی طرح پیچھے نہیں۔ دبستان شعر و سخن بہار کا ایک نیا باب علامہ جمیل مظہری کی آمد سے کھلتا ہے۔ سلسلۂ شعر و شاعری جو بلند پایہ شاعر مکرم جناب شاد عظیم آبادی کے وصال کے بعد کچھ رکا اور تھما تھما سا تھا وہ علامہ جمیل مظہری کے شعر و ادب کی دنیا میں آنے سے تیز تر اور جاندار ہو گیا۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں سلسلۂ شاد کا اختتام ہوتا ہے، وہیں سے علامہ جمیل مظہری کے رنگین دور اور مستحکم عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ کچھ شخصیتیں عہد ساز ہوتی ہیں، جن میں کمال کبھی اور وہبی قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتے ہیں اور جو اپنی ذہانت، ذکاوت اور جودت سے فلاح دنیا اور فلاح انسانیت کے لئے خدمت پر معمور ہوتی ہیں۔ شاد عظیم آبادی کی شخصیت کافی اہم اور نمایاں تھی ان کا فکر و فن اور زریں عہد اردو شعر و ادب کی دنیا کا ایک تاریخ ساز اور ناقابل فراموش باب ہے۔ ٹھیک اسی طرح جمیل مظہری نے بھی اپنا ایک مقام پیدا کیا ہے۔ لہذا ان کی شخصیت اردو ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ انھوں نے اپنے زیر سایہ باکمال نوجوان شاعروں کی ایک نسل کو پروان چڑھایا۔ علامہ جمیل مظہری کی شاعری سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ کے شاگردوں میں قاسم، صہبا، وفا ملک پوری اور دائم اہم ہیں۔ آپ کے ہم پلہ اور ہمعصر شعراء میں فیض احمد فیض۔ جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، مجاز لکھنوی، علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی خاص ہیں۔

مراثی اور مثنوی کے علاوہ علامہ جمیل مظہری کی کائنات شاعری دو الگ الگ مجموعوں پر مشتمل ہے۔ ایک مجموعہ "نقش جمیل" اور دوسرا مجموعہ "فکر جمیل" ہے۔ ان کے ہر دور کی مختلف عنوانات پہ ساری نظمیں "نقش جمیل" میں موجود ہیں۔ فکر جمیل میں بڑی تعداد

میں غزلیات کے علاوہ رباعیات، قطعات، مثلث، مخمس، تضمین، مربع، ریختی، گیت، ترجیع بند اور ترکیب بند بھی موجود ہیں۔ نقشِ جمیل میں ہر قسم کی مختلف عنوانات پر نظم موجود ہیں۔

یہاں میں فکرِ جمیل یعنی جمیل کی غزلیات کا خصوصی تذکرہ کروں گا۔ کیونکہ شروع سے اب تک صنفِ غزل حسن آفرینی، باریک بینی اور نازک خیالی کے لئے بہترین اور اہم صنف تسلیم کی گئی ہے۔ فکرِ جمیل کئی حصوں میں منقسم ہے۔ ہر حصہ کا نام علٰحدہ علٰحدہ ہے۔ مثلاً عرفان ووجدان، رنگ و بیرنگ، آہنگ نو اور پریم گیتا، ان چاروں حصوں میں الگ الگ ان کی صنف غزل کی لامحدود اور وسیع دنیا کوزے میں بند ہے۔ رنگ و بیرنگ میں ابتدائی دور کی غزلیں مثلاً ۱۹۴۲ء تک کی غزلیں ہیں۔ عرفان اور وجدان میں ۱۹۴۲ء کے بعد کی ساری غزلیات شامل ہیں۔ آہنگ نو میں جو غزلیں پیش کی گئی ہیں وہ سب کی سب جدید ترقی پسند رجحانات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ پریم گیتا میں ان کی رنگین رومانی اور جذباتی غزلیں موجود ہیں۔ نظم اور غزل کی پوری تشریح کے لئے دو الگ الگ ضخیم کتابوں کی ضرورت ہوگی۔ یہاں صراحت اور تشریح نہ مقصود ہے اور نہ ممکن۔

اردو شاعری میں حالی، اکبر اور اقبال کے بعد رومانی شاعری کا دور بڑی دھوم دھام سے شروع ہوا۔ شاعری میں حسن و عشق، جام و مینا، وصال و ہجر، گل و بلبل اور نالہ و فریاد کا رواج پڑ گیا۔ جناب اختر شیرانی کے سر باضابطہ طور پر رومانی اور رنگین شاعری کے آغاز کا سہرا ہے۔ گویا یہ اس طرز کے موجد ہیں اور شاید اسی لئے انہیں شاعرِ رومان کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی کے بعد علامہ جمیل مظہری شانِ امتیازی طمطراق اور ہمہ گیر شخصیت کے ساتھ آسمانِ رومان پر جلوہ افروز ہوئے۔ انھوں نے رومانی شاعری میں بھی اپنا اور اپنے طرز کا منفرد عکس چھوڑا ہے۔ ان شاعروں نے صرف روایتی رومانی شاعری سے صرف احتراز ہی نہیں کیا بلکہ حسن و عشق کی دنیا کو سچائی اور صداقت سے قریب تر کر دیا۔ تخیلاتی اور موہوم شاعری کا زور گھٹتا گیا اور اس کی جگہ حقیقت پسندی نے لے لی۔ ان شعرائے کرام کی شاعری میں عورت یعنی صنفِ نازک کو ایک خاص مقام ملا۔ ان کی معشوقائیں خیالی، تصوراتی اور ماورائی قطعی نہیں۔ فوق الفطرت اور فوق البشری صفتوں، عادتوں، خصلتوں اور جبلتوں سے ان کی معشوقائیں پاک ہیں۔ وہ سب کی سب زمین پر رہتی، کھاتی، پیتی، سوتی، جاگتی، اٹھتی، بیٹھتی، چلتی، پھرتی، روتی، ہنستی، گاتی اور دنیا کے سارے کام کرتی نظر آتی ہیں۔ سماجی، تمدنی، تہذیبی اور معاشرتی حاجتوں اور صفتوں سے قریب تر ہیں۔ وہ سب کی سب انسانی ماحول میں معاشرے کے اندر رہتی ہیں اور سارے کام کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اختر شیرانی کی پوری شاعری رومانی شاعری ہے اور وہ سلمیٰ اور ریحانہ کے گرد گھومتی ہے۔ شاعر نے ہندوستانی ماحول کی سچی تصویر کشی کی ہے۔ وہ کہیں عورت کو حور کا درجہ دیتا ہے، کہیں عصمت و عفت کو جوہرِ نسواں قرار دیتا ہے اور کہیں اس کی عظمت اور وقار میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ جوش ملیح آبادی رومانی ہونے کے ساتھ ساتھ انقلابی شاعر کی بھی حیثیت رکھتے ہیں۔ جوش نے ہندوستانی سماج میں رہنے والے

ہر دھڑکتے دل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ جوش کی شاعری میں ہر طبقے اور گروہ کی عورت ملتی ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے زیادہ وسعت اور وسیع نظری سے کام لیتے ہوئے رومان کو انقلاب کا نام اور احساس دیا ہے۔ ساغر نظامی رومانیت اور صرف رومانیت کے قائل ہیں۔ عورت کو وہ ایک پھول اور خوشبو سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ سچائی اور حقیقت کی سرحد پار کرکے محض تخیل کی حسین ترین وادیوں میں معشوقاؤں کے ساتھ جا کے پناہ ڈھونڈنا اور شراب و شباب جام و صہبا، گل و بلبل، نالہ و فریاد، حسن ستم کش اور اور عاشق نامراد کی باتیں کرنا سطحیت کے قریب ماورائیت کی دنیا میں ڈھکیل کر حقیقت سے دور کر دیتا ہے۔ شیلی، کیٹس اور بائرن کے علاوہ اگر ورڈس ورتھ کی بھی مثال پیش کی جائے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ کس کے یہاں کیا رومان ہے تو یہ ایک الگ بات ہے مگر دور جدید میں ترقی پسندی کا ہمیشہ یہ رجحان رہا ہے کہ صنف شاعری کے ہر عنوان کو اس کی روح کے ساتھ حقیقت اور سچائی کے بالکل قریب لایا جائے۔ یہ امر مسلمہ ہے اور اس پر سب متفق ہیں کہ سچائی، خلوص اور حقیقت کی دنیا میں شاعر اور ادیب کو آنکھ کھول کر اور ذکی الحس ہو کر زندگی گذارنی چاہیے اور وہ جو بھی تخلیقات ادب پاروں ہی پیش کرے وہ سو فیصدی حقیقت پر مبنی ہوں۔

ساغر نظامی کے بعد رومانی شاعری میں علامہ جمیل مظہری آتے ہیں۔ رومانی شاعری میں ان کا چوتھا نمبر ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے دیوہیکل شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں فلسفہ، غم اور عشق کی سعی مسلسل ہے۔ وہ عشق کی ترجمانی میں غم والم اور صعوبت برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ قید و بند سے قطعی دل برداشتہ نہیں ہوتے۔ جذباتیت سے دور وہ غم دوراں اور غم جاناں کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس سعیٔ پیہم اور مسلسل کاوش سے وہ گریز نہیں کرتے۔ لہٰذا ارضیت اور خالص معاشرتی اور سماجی کشمکش میں اپنی معشوقہ کے ساتھ زندگی گذارتے نظر آتے ہیں۔ وہ ناکامیوں نامرادیوں اور تشنہ کامیوں کا ماتم ضرور کرتے ہیں۔ غافل آنکھوں کو رُلاتے بھی ہیں مگر وہ اپنی عذرا، شیاما اور راما کے ساتھ ماورائیت کی معلق دنیا میں جانا پسند نہیں کرتے۔ انہیں دکھ درد آلام، مصائب اور غم و اندوہ پسند ہیں۔ وہ کشمکش حیات اور جد وجہد زندگی سے فرار اختیار نہیں کرتے عمل کے قائل عمل کی دنیا سجائے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ ان کی عورت انسانی ماحول میں سانس لیتی اور جد وجہد کرتی نظر آتی ہے۔ وہ ماورائیت کی دنیا آباد نہیں کرتی۔ تصوراتی اور خیالی دنیا سے کوسوں دور حقیقت کی دنیا میں بستی ہے۔ ان کی رنگین رومانی تخلیق میں ارضی رنگینیاں، رعنائیاں اور دنیاوی کشمکشیں پوری طرح موجود ہیں۔ علامہ جمیل کی ساری نظمیں ان خصوصیات سے پُر ہیں۔ وہ خالص ہندوستانی سماج اور تہذیب پیش کرتے ہیں۔ انداز فکر اور اسلوب وطرز خالص ہندوستانی ہیں۔ ہر جگہ معشوق کے خد و خال، عادات و اطوار اور فطرت و جبلت کے جذبوں کو بھی خوب اجاگر اور نمایاں کیا ہے کہیں تشنگی نہیں رہتی۔ نظمیں سلاست، روانی، سادگی معنی آفرینی اور تشبیہ و استعاروں سے بھری پڑی ہیں ترکیب کی بندش، مصرعوں کی چستی و اشعار کی درستگی بذاتہ خود ایک مستقل حسن میں داخل ہیں۔ سب سے بڑی خصوصیت

جمیل کے یہاں یہ ہے کہ اردو ہندی الفاظ کے حسین امتزاج نے ان کی شاعری کے حسن کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے۔ انھوں نے رومانی شاعری میں اختر شیرانی کی تقلید ضرور کی ہے مگر ماورائیت سے وہ کوسوں دور ہیں۔ وہاں سے ان کے تخیلات کی پرواز اور بلند ہو کر رومانیت اور حقیقت کے بیچ منڈلانے لگتی ہیں۔ یہی وہ نقطۂ عروج ہے جو جمیل مظہری کو رومانی شاعری میں دوسرے رومانی شعرائے کرام سے ممتاز کرتی ہے یہی وجہ تھی کہ ان کی نظموں کے مجموعہ نقش جمیل کے شائع ہوتے ہی برصغیر ہند و پاک میں تہلکہ مچ گیا اور ان کی غزلوں کے مجموعہ کو بھی منظر عام پر لانے کا تقاضہ شدت اختیار کر گیا۔ اردو دنیا بے چینی سے ان کے شائع ہونے والے کلام کا انتظار کرنے لگی۔

اس خسرو اقلیم سخن کی تخلیقات اور ادبی ادبی صلاحیتوں کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی شخصیت اردو ادب کی دنیا میں کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ جس طرح انھوں نے نقش جمیل کے آئینے میں رنگ برنگ کی نظموں کی جلوہ نمائی کی ہے اسی طرح اسی ڈھنگ اور اسی آہنگ و طمطراق سے فکر جمیل کے ذخیروں میں غزلیات کے گوہر نایاب بھر دئے ہیں۔ تو جمیل مظہری کا تغزل کے سلسلہ میں نظریہ ہے کہ اس کے ذریعہ تحت الشعور کی باتوں احساسوں اور خیالوں کو لطیف انداز بیان کے ذریعہ حسین پیرایوں میں شعور کے پردے پر لایا جاتا ہے۔ چونکہ شاعر بھی انسانی معاشرے اور سماج کی پیداوار ہے اس لئے وہ بھی ایک فرد واحد کی حیثیت سے سماج کی اکائی کہلانے کا مستحق ہے۔ لہذا وہ سماج میں اور ادیبوں آرٹسٹوں دانشوروں اور فنکاروں کی طرح لوگوں سے رابطہ اور واسطہ رکھتا ہے۔ زندگی کی نت نئی ضرورتوں اور حاجتوں سے باخبر ہوتا ہے۔ زندگی کے تنوع تضاد کشمکش الجھن اور رنگارنگی میں شریک ہوتا ہے۔ حساس دل و دماغ کے ساتھ ادیب اور شاعر سوسائٹی میں رہتا اور ساری باتوں کا جائزہ لیتا ہے۔ عمیق مطالعہ اور گہرا مشاہدہ کرتا ہے اور پھر وہ زندگی کی صحیح عکاسی اور ترجمانی کرتا ہے۔ تخلیقی تصویر کشی کی ایک دنیائے بسیط ہوتی ہے۔ ان کے ادب پاروں میں۔ لہذا وہ زندگی سے جس قدر قریب ہوگا اتنا ہی کامیاب ہوگا۔

اب آیئے فکر جمیل کی روشنی میں ان کی غزل نگاری کا جائزہ لیں۔ جمیل مظہری کی اردو شاعری کی دنیا میں اپنی ایک انفرادیت بر وقت قائم ہے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے ذکی الحس اور باذوق فنکار کی حیثیت سے شعر و ادب کے میدان میں قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ ایک بلند فنکار کے ذوق بالا اور احساس لطیف کے جذبات سے سرشار ہیں۔ لہذا ادب کے میدان میں ان کا جو بھی قدم اٹھتا ہے وہ جچا تلا ہوا اٹھتا ہے، وہ ہر قدم پر اپنا ایک نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ انھوں نے صنعت غزل میں بھی بڑی صناعی برتی ہے۔ ان کے غزلیات کے سرمایہ تین ادوار میں تقسیم ہیں۔ ان تینوں ادوار میں جمیل صاحب کی فنی اور ادبی تہذیبی ارتقا کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے ارتقائی منزل کی طرف قدم بہ قدم بڑھتے ہی نظر آتے ہیں۔ ابتدائی دور کی دور کی غزلوں میں پرانے روایتی اسالیب کا رنگ غالب ہے۔ خیالات، احساسات، تجربات اور میلانات کا وہی امتزاج ملتا ہے جو پرانے شعرائے کرام کے یہاں ملتا ہے جو پرانے شعرائے کرام کے یہاں ملتا ہے۔ مگر ابتدائی ابتدائی دور میں بھی وہ ہر جگہ ممتاز حیثیت کے مالک ہیں

اور کہیں بھی قادر الکلامی میں پیچھے نظر نہیں آتے پرانے روایات اور اسالیب کے قالب میں نئی نئی بات اور نیا خیال پیش کرنے میں نہیں ہچکچاتے۔ بلا پس و پیش روانی، بلاغت اور فصاحت کے ساتھ اپنی بات، اپنا فلسفہ اور اپنا خیال ظاہر کرتے چلے جاتے ہیں۔ چند مثالیں غور فرمائیے۔ ؎

اس کو کیا حق ہے کہ قطرے سے سمندر مانگے
جس نے قطرے کو سکھایا نہیں دریا ہونا

حال محمل نشیں ترے دل کا
کہتا جاتا ہے پردہ محمل کا

چلمن کبھی کبھی تو اٹھایا کرے کوئی
کچھ احترام دیدۂ بینا کرے کوئی

بڑھتا ہے اور حسن سے ذوق نظر کی پیاس
تب تک مذاق عشق کو رسوا کرے کوئی

علامہ کی تغزلانی ادراک کا جائزہ لیجئے تو وہ عشق مجازی میں بھی اپنا رنگ دکھلاتے ہیں۔ یہاں ہر طرح کی رنگینی اور بانکپن دیکھئے تو ملتا ہے نازک ذہنی، ادا و ناز، سوز و ساز کے سنگم پر وہ دل کے جذبات، احساسات اور خیالات کو گہرائی اور گیرائی بخشتے ہیں۔ مگر علامہ کبھی حقیقت اور ارضیاتی حدود سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ آہستہ آہستہ ان کا عشق مجازی تدریجی ترقی کرتا ہوا عشق حقیقی کی کس طرح ترجمانی کرتا ہے غور فرمائیے ؎

میں خدا سے روٹھتا ہوں میں خدا کو پوجتا ہوں
یہ وہ ناز بندگی ہے جسے پوچھئے خدا سے

یہاں علامہ دماغ سے زیادہ دل کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ ان کا وہ انداز بیان ہے جو ان کے ہم عصروں کو میسر نہیں۔ ذرا اس شعر کی تازگی اور کارفرمائی ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ ذوق و شوق اور جذبہ جستجو و تلاش کا وہ کام لیا ہے جو صوفیائے کرام کا طرۂ امتیاز ہے۔ گرچہ وہ صوفی ہونے کے داعی نہیں تھے۔ مگر طبیعت میں سادگی متانت، فقیرانہ مستی، عالمی انسانیت کی اخوت، غیر جانبداری، عام ہمدردی اور انسان دوستی کا زبردست جذبہ موجود تھا۔ دیکھئے وہ کیا کہتے ہیں ؎

وہ محبت نہیں جو ایک سے بدنام رہے
وہ محبت جو خدائی کے لئے عام رہے

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

غزل نازک خیالی، معنی آفرینی اور جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ فنکارانہ جذبات میں جب شدت آتی ہے تو غزل میں نکھار اور بانکپن پیدا ہوتا ہے۔ علامہ کی شاعری کا میدان مجاز سے حقیقت تک طویل طور پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ پورے طمطراق کے ساتھ پورے میدان میں جولانیاں دکھاتے ہیں۔ وہ غزل کا مزاج نازک اور نازک ترین تسلیم کرتے ہیں مگر اسے موہوم تصور نہیں کرتے۔ وہ بھی مانتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ سادہ اور سلیس زبان غزل کے لئے استعمال کی جائے۔ فنکارانہ انداز سے سادے اور سلیس الفاظ کے قالب میں بڑے بڑے خیالوں اور مسئلوں کو ڈھالنا اور اچھا استعمال کرنا دشوار گذار ہی نہیں مشکل ترین امر ہے پھر بھی علامہ جمیل مظہری اپنے سادہ اور سلیس اسالیب اور طرز بیان سے رو گردانی نہیں کرتے۔ ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے سادگی، سلاست اور روانی ؎

محبت بھی ہے اک عجیب آشنائی
بہ معنی تعلق بہ صورت جدائی

ہمیں رہ گئے بزم میں تبسم بسمل
مگر تیری آنکھوں نے فرصت نہ پائی

خدائی تمہاری نگاہوں کا صدقہ
تمہاری نگاہوں پہ صدقے خدائی

تخیلی نگاہوں کا جادو سلامت
میں صدقے یہ آنکھیں نہیں کیوں ڈبڈبائی

جمیل اس تعلق سے کیا فائدہ ہے
بصورت تعلق بہ معنی جدائی

ان کی اوائل عمری یعنی ابتدائی غزلوں میں بھی بعد کے ادوار کی غزلوں کی طرح نکھار اور بانکپن ہے۔ معنی آفرینی گہرائی اور گیرائی کا وہاں وہی رنگ نمایاں ہے جو بعد کی غزلوں میں۔ یہ ہم کہتا ہیں وہ اس امتزاج کو برقرار رکھتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:۔

جو بوجھ کہ میرے دل پر ہے، وہ بوجھ کہاں ہے بیلوں پر
اے بیلی والے دھیرے چل اس میں راادھا بھی میری ہے

دوسرا شعر دیکھیے:۔

جمیل اس کو وہی سنے گا، ہے زندگی جس کی خود فسانہ
ہے کا جلوں میں بھی ایک کہانی، ہے جھڑیوں میں بھی اک ترنم

اٹھا کے شعلے بہا کے دل میں الاؤ سے دو دھیپ کھڑی ہو
نہ ڈالا جاتا ہے تم سے پانی، نہ تاپی جاتی ہے آگ تم سے

خلوت ہو اور آئینہ حیرت سے منھ تکتا ہو
آنسو چپ چپ بہتے ہوں اور کاجل پھیلا پھیلا ہو

نہ تیرے آنچل پہ داغ کوئی نہ اس گریباں میں چاک کوئی
خرد کے مارے ہوئے ہیں دونوں نہ تو دوانی نہ میں دوانہ

ادا و ناز و حیا و شوخی بہت سی ہیں حسن کی ادائیں
مگر وہی بات معتبر ہے جو آنسوؤں کی کہی ہوئی ہے

اسی طرح ہزاروں اشعار ہیں جو سادگی، نازکی، خیال آفرینی، باریک بینی اور معنی آفرینی سے پر ہیں۔ علامہ کے کلام میں ابتدا ہی سے عشق کی شدت، خلوص محبت اور وفا کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ علامہ کے جذبے، فکر، مشاہدے اور وجدان کو دیکھئے:

صفات بخشتا، مکان بخشتا، جگہ جگہ اک حرم بنایا
ہماری صورت گری نے آخر خدا کو بھی اک صنم بنایا

حرم کو بھی بتکدہ سمجھتا ہو دوسری منزل اتفاقی
وہ پہلا زینہ شعور کا تھا کہ بتکدے کو حرم بنایا

مسافروں میں ہوتا تذکرہ کیا جمیل اپنی سبک روی کا
نہ ہم نے رستے میں گرد اڑائی نہ کوئی نقش قدم بنایا

اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی اور ساغر نظامی کے بعد جمیل مظہری آتے ہیں پران کے ہم عصروں میں پرویز شاہدی اور اجتبیٰ رضوی بھی رومانی شاعری میں دوش بدوش ہیں۔ پرویز شاہدی اپنی رومانی اور عشقیہ شاعری کے ذریعہ بیباکی اور جارحیت کے راستہ کو طے کرتے ہوئے انقلاب کی منزل تک پہنچتے ہیں اور اس کے برعکس اجتبیٰ رضوی متصوفانہ میلان اور رجحان کی بدولت روحانیت کی آماجگاہ تک پہنچتے ہیں۔ مگر ان دونوں کے مقابلہ میں بھی علامہ جمیل مظہری مجاز اور حقیقت، حقیقت اور مجاز کی بلند باریک اور دشوار گذار فلسفیانہ ارتقائی پرواز نظر آتے ہیں۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ہر حقیقت ہوئی جاتی ہے مجاز
اعتبارات کی قیمت کیا ہے

جس نتیجے پہ پہنچتی ہے نظر
اس نتیجے کی حقیقت کیا ہے

نور ہے نور نہ ظلمت ظلمت
یہ تشبیہات بصیرت کیا ہے

خود مجاز ایک حقیقت ہے جمیل
یہ نہیں ہے تو حقیقت کیا ہے

دیکھئے۔ دیکھا آپ نے، کس طرح حقیقت اور مجاز، مجاز اور حقیقت کے نازک رشتے اور تانے بانے کو ملاتے ہیں۔ جہاں حقیقتاً عقل حیران ہی نہیں رہ جاتی بلکہ ہم بصیرت و فکر کے بلندی پرواز کی دعوت فکر دیتی ہے۔ یہاں عقل اتنی جسارت کرتی ہے کہ دل پر گہری چھاپ چھوڑ جاتی ہے جہاں دل کچھ اور زیادہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے ان کے چند دوسرے اشعار بھی ملاحظہ کرتے چلئے۔ وہ محبت سے جس راہ پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں اس میں جذبے کی شدت سے مزید رغبت پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر تعریف یہ ہے کہ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر عزت نفس اور خودداری نہیں کھو پاتے ہے

اس میں موسم کی نہیں قید کہ اب آپ کی یاد
دعوتِ گردشِ ایام ہوئی جاتی ہے

اب تو شرمائے تیری پردہ نشینی کا غرور
بندگی فتنہ ابہام ہوئی جاتی ہے

آپ اپنے کو لگا دیکھئے شیدا تیرا
ہر نظر اس کی اٹھانے لگی پردا تیرا

سچ تو یہ ہے کہ وفا بھی ہے تھکن کا احساس
نگہ شوق کو میں گرم سفر رکھ نہ سکا

جنوں کے دامن سے وہ لگا ہیں خرد کی بخیہ گری کا فتنہ
پیام جوں کو نہیں ملا ہے ابھی تری مشک بو کا

علامہ جمیل مظہری کی شاعری میں محبت کے بے پایاں جذبات کا اظہار تو کمال عروج کی سیڑھیوں تک جا پہنچا۔ اب ذرا شدتِ جذبات بھی دیکھتے چلئے عزت جذبات بھی چھلکتا ہوا پیمانہ ہے۔ یہ تدریجی تعمیری ارتقا عشق کی منزلوں اور دنیا تک کس طرح پہنچتا اور عزت نفس بن جاتا ہے۔ دیکھئے۔

تو اس وضع میں جہاں ہے وہیں سے دے آواز
پکارتا ہے تجھے قلب نا صبور میرا

سو جیں گے آئینہ گر اک چاک گریباں کے لئے
لیلیٰ نجد سلامت رہے صحرا تیرا

خزاں ایک کنایہ بہار ایک اشارہ
یہ سارا نظام اک تبسم تمہارا

یہ دونوں اشعار ذرا اور قریب دیکھائی دے ہے لیجئے اور معنی آفرینی کا لطف اٹھائیے ہے

زیبا ہے اسی کو کبریائی
جچے جو مزاج آدمی کا

کوئی حجت اس کے وجود پر بجز اک لفظ انا نہیں
بیخودی کی گونج جو تجھ میں ہے یہ کہاں سے ہے جو خدا نہیں

پھر اس سلسلے کا آخری شعر بھی سن لیجئے ہے

میں کیا بتاؤں کہ تو کیا ہے اور کیا ہوں میں
ہجوم لفظ و معانی میں کھو گیا ہوں میں

خلوص کے ساتھ محبت، پاکیزگی کے ساتھ جذبے کی شدت اور بلندی افکار کے ساتھ عزت نفس پر گامزن رہتے ہوئے علامہ جس طرح منزل مقصود پر پہنچے ہیں اور جو مرتبہ حاصل کرتے ہیں، کوئی کہہ سکتا ہے کہ حقیقت کی روشنی میں حقیقت کی تلاش جستجو کا جواب نہیں۔ روحانیت اور حقانیت کی تلاش میں وہ بھی گوہر مراد پالیتے ہیں۔ وہ ایک مخلص انسان، ہمدرد معلم، ترقی پسند استاد، سماجی کارکن، ایماندار صحافی، اچھے ادیب اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ اردو شاعری کی دنیا میں ان کی شخصیت ایک بلند مینار کی حیثیت رکھتی ہے۔

علامہ کی تصانیف میں صرف نظموں کا مجموعہ "نقش جمیل" اور غزلیں، قطعات اور دیگر اہم متفرقات کا مجموعہ "فکر جمیل" ہی نہیں بلکہ مراثی و قصائد کا مجموعہ

"عرفان جمیل" بھی ہے۔ اس کے علاوہ علامہ کی ایک مثنوی بھی ہے جو "آب و سراب" کے نام سے موسوم ہے انھوں نے "فریاد" کے نام سے ایک مسدس کی بھی تخلیق کی ہے۔ شعری ادب کے علاوہ علامہ کی نثری تصانیف بھی ہیں۔ مثلاً "فرض کی قربان گاہ پر" کے عنوان سے ایک ناولٹ "شکست و فتح" کے نام سے ایک طویل افسانہ اور دوسرے افسانے جیسے "گناہ کا کفنہ" وغیرہ۔

"عکس جمیل" میں علامہ کی بعد کی نظمیں اور غزلیں ہیں۔ "نقد جمیل" میں تبصرے اور تعارف ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بہار کی سرزمین سے اٹھا ہوا یہ شاعر جو پہلو بہ پہلو ادیب بھی ہے، اردو زبان و ادب کو ایک لازوال سرمایہ اور خزانہ دے جاتا ہے۔ وہ ایک شاعر، ادیب اور صحافی کے قالب میں بلند بالا اور مدبر انسان تھا۔ جس کا دل ہمیشہ انسانیت کی فلاح و بہبود اور تعمیر و ترقی کے لئے دھڑکتا تھا۔ شاد عظیم آبادی اور اختر اورینوی کے بعد جمیل عظیم آبادی اور علامہ جمیل مظہری نے بہار کے علمی اور ادبی آسمان میں "خلا" پیدا کر دیا ہے جسے قدرت ہی اپنی دین سے پورا کر سکتی ہے۔

اداسیوں نے ہمیں مایوس کر دیا شاہین
ذرا دیکھوں، کھنڈر میں چراغ جلتے ہیں

جمیل مظہری کی نظمیں

ایس کیو امین (ریسرچ اسکالر۔ کلکتہ یونیورسٹی)

علامہ جمیل مظہری کی نظموں کا مجموعہ "نقش جمیل" میرے سامنے ہے۔ میں نے ان نظموں کو ذوق و شوق سے پڑھا اور اب میں ان نظموں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں میں اُن کی نظموں اور نظم نگاری کے بارے میں کچھ کہوں یا تنقید کروں یہ ممکن نہیں اس لیے کہ یہ آفتاب کو چراغ دکھانے والی بات ہو جائے گی۔ میں "نقش جمیل" کی مختصر تفصیل اور اپنے تاثرات بیان کروں گا۔

نقش جمیل (۱۹۵۳) = اس مجموعہ کی کل نظمیں پانچ ابواب میں منقسم ہیں:۔

الف : تفکرات و تاثرات :

اس باب میں وہ نظمیں ہیں جو جمیل مظہری کے مفکرانہ رجحان کی آئینہ دار ہیں۔ ان نظموں میں "ارتقاء" اور "تول اپنے کو تول" غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔

ب : سیاسیات و عمرانیات :۔

اس باب میں سیاسی اور انقلابی نظمیں ہیں جن کے اندر ہنگامی حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ "یوم آزادی" اس باب کی اہم ترین نظم ہے۔

ج : رومانیات و شبابیات :۔

اس باب میں شاعر کی عشقیہ روداد ہے۔ اس باب میں تقریباً تمام نظمیں خوبصورت ہیں جن میں "ڈرو خدا سے ڈرو"۔ "یہ کیا ہوا تم کو" "اے بھول جا بھلانے" "کہتے ہیں اسی کو کیا محبت" اور "عشق ناتمام" اہم اور حسین ترین نظمیں ہیں۔

د : متفرقات :۔

اس باب میں وہ ہنگامی نظمیں ہیں جو کسی خاص تقریب کے لئے لکھی گئی ہیں۔ ان نظموں میں بھی ہر جگہ شاعر کی عظمت فکر و نظر اپنے مخصوص رنگ میں عیاں ہے۔

و : باقیات :۔

اس باب میں بچپن سے جوانی تک کی وہ نظمیں ہیں جن میں ان وقفوں کی روداد ہے۔ اس باب میں "عورت" اہم نظم ہے۔

تاثرات :۔

جمیل مظہری بیسویں صدی کے نظم نگاروں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے غزلوں اور نظموں کا ایک ذخیرہ اردو شاعری کو دیا ہے لیکن ان کی نظم گوئی یہ بات واضح کرتی ہے کہ علامہ نظم کے بادشاہ ہیں اگرچہ غزلیں بھی ان کے رنگ خصوص کی مظہر ہیں۔ بیسویں صدی میں اردو شاعری کے افق پر بہت سارے نظم نگار نمودار ہوئے۔ اقبال، جوش، اختر شیرانی، فیض، مجاز اور اختر الایمان وغیرہ۔

مکمل اور جامع نظم نگاروں میں اقبال کے بعد

جو ہستیاں شاعری کی دنیا میں نمودار ہوئیں ان میں جمیل مظہری کا نام اہم ہے۔ جمیل مظہری کے یہاں کئی ایک نظمیں خوبصورت ہیں۔ جمیل مظہری کے یہاں ایک اہم اور مخصوص بات یہ ہے کہ اب تک 'عورت' کو غزلوں میں پیش کیا جاتا رہا ہے لیکن جمیل مظہری نے اس روایت کے برعکس 'عورت' کو اس محبت اور داخلیت کے ساتھ نظموں میں پیش کیا ہے۔

ان کی رومانی نظموں میں "یہ کیا ہوا تم کو" "ڈرو خدا سے ڈرو" "پیام" "اسے بھول جا کھلا دستہ" "کہانی" اور "عشق نا تمام" اہم نظمیں ہیں۔ "ڈرو خدا سے ڈرو" میں عورت کی نفسیات کی عکاسی شاعرانہ پیش کش کی گئی ہے۔ ساتھ ساتھ یہ نظم شاعر کے کچلے ہوئے جذبات اور محرومی کے احساس کی عکاسی ہے۔ اس نظم کی فضا درد وکرب کے بیچ تیار کی گئی ہے:-

جھکائے سر کو جو بیٹھوں تو تم نظر آؤ
کبھی کتاب جو کھولوں تو تم نظر آؤ
اٹھا کے آئینہ دیکھوں تو تم نظر آؤ
نہ یوں نظر میں سماؤ، ڈرو خدا سے ڈرو

ادھر ادھر نظر اٹھے تو سامنے تم ہو
ہلیں ہوا سے جو پردے تو سامنے تم ہو
کروں خدا کو جو سجدے تو سامنے تم ہو
نماز میں نہ ستاؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو۔

اس نظم میں ایک خاص جذبہ پُر حزن ہے۔ لب و لہجہ سوز و گداز سے پُر ہے۔ ناکامی محبت کا احساس تقریباً ان کی تمام رومانی نظموں میں ملتا ہے لیکن "یہ کیا ہوا تم کو" "عشق نا تمام" اس قدر پر سوز ہے کہ اس کا اثر غیر محدود مدت کے لئے دل پر ثبت ہو جاتا ہے جمیل کے انداز بیان ... میں بے ساختگی ہے یہ اپنے جذبات کا اظہار متوازن طریقے سے کرنے کے عادی ہیں:-

ان آنکھوں میں دل خود دار اب نہیں آتا
لبوں پر منظرۂ افکار اب نہیں آتا
میرے جنوں پہ تمہیں پیار اب نہیں آتا
یہ کس نے پیکر سنگیں بنا دیا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

ان کے ترنم لب و لہجہ میں مخصوص تاثیر ہے جو ان کا ہی حصہ ہے۔ ان کی نظموں کے تمام اشعار مربوط ہیں جو اچھی نظم کی علامت ہے۔

نظم میں تغزل کا ہونا، نظم کی خوبی ہے۔ اور یہ خوبی جمیل صاحب کے یہاں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ "کہتے ہیں اسی کو کیا محبت" اور "عشق نا تمام" میں تغزل اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ موجود ہے۔ جمیل صاحب کی وہ نظمیں جن میں ان کا منفرد رنگ اور مخصوص ڈھنگ ہے نہایت ہی اہم اور پُر تاثیر ہیں۔ ان کی تمام نظمیں گہری اور شگفتہ ہیں۔ 'انتظار'، 'تول اپنے کو تول' اہم نظمیں ہیں۔ "تول اپنے کو تول" انھوں نے اس وقت لکھیں جب یہ فلمی دنیا میں داخل ہوئے تو ان کو وہاں اپنی شخصیت مسخ ہوتی ہوئی نظر آئی اور انھوں نے زندگی کی لذتوں کی خاطر اپنے فن کو بیچنا گوارا نہیں کیا۔ یہ نظم ان کے ضمیر کی زندگی کی علامت ہے:-

تول اپنے کو تول
تیری خود داری کا دشمن ہے ذوق تصنیف
اپنی نظمیں آپ سناتا ہے اپنی تخفیف
کر دیتی ہے نفس کو موٹا یاروں کی تعریف
لے آتے ہیں نیچے تجھ کو ان کے میٹھے بول
تول اپنے کو تول

اور جو بھی مایا موہ جو بھی مایا کل سنسار
ایک اٹھتا بازار ہے دنیا ایک ٹھٹا بازار
اس اٹھتے بازار میں مت آ اے مرد زردار
اس کے ہنگامے ہیں سہانے دور کا جیسے ڈھول

تول اپنے کو تول

علامہ مظہری اقبال اور جوش سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اقبال سے زندگی کے مسائل میں دلچسپی لینی سیکھی۔ "یوم آزادی" کے یہ اشعار انہی مسائل کے مظہر ہیں :-

یہ غلام ابن غلام ابن غلام
کرنے آئے ہیں زبردست کی لاٹھی کو سلام

مختصر یہ کہ سجدے وہی ڈیوڑھی بھی وہی
آستانہ وہی کتے وہی ہڈی بھی وہی

یہ انداز تخاطب جوش کے اثر کو نمایاں کرتا ہے۔

جمیل صاحب کی سیاسی نظمیں بھی شگفتہ اور میٹھی ہیں۔ جوش کی سی گھن گرج نہیں۔ پھر خطابت کا عنصر غالب ہے۔ بیسویں صدی کے سیاسی مسائل وطن کی محبت، سرمایہ دارانہ استحصال اور اس عہد کی کشمکش کو انھوں نے اپنے فن میں سمو دیا۔ اپنے ذہن دماغ کے گہرے شعور ضبط و توازن اور فن کارانہ کمال کی بدولت کسی الجھن اور چپقلش کا شکار نہیں ہوئے اس لیے ان کی سیاسی نظمیں بھی دلکشی اور ادبی حسن کی مظہر ہیں۔

ان کی سیاسی نظموں میں "موسم کے اشارے" اچھی نظم ہے۔ اس نظم میں جمیل صاحب انگریزی سامراج سے مخاطب ہیں برطانوی حکمراں کو ملاح کے نام سے پکارتے ہیں :-

ملاح اگر بنتے ہو بیارے
سمجھو موسم کے بھی اشارے

پتوار نہ توڑ دیں تمہاری
حالات کے تند و تیز دھارے

اس نظم کی بعض بند اہم اور معنی خیز ہے لیکن بحیثیت مجموعی پوری نظم توازن کے اعتبار سے کمزور ہے۔ ملاح کو انھوں نے قانون ساز بھی بنا دیا ہے۔ ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ طوفان کی وجہ سے لنگر ڈالا چکا۔ تو پھر ملاح سے یہ شکایت :

"کشتی چلتی نہیں ہے تم سے"

خیالات اور استعارے کی ناہم آہنگی کو ظاہر کرتا ہے۔

'متفرقات' کے عنوان سے جو نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں گاندھی جی' اہم ترین نظم ہے۔ اور یہ سوز جذبات سے لبریز ہے :-

نثار ہوتے ہیں شعلے یہ کس کی میت پر
یہ کون ہو گیا قربان روح و ملت پر
یہ کس کے خون کے دھبے ہیں آدمیت پر
مقام حیف ہے اے ہند تیری قسمت پر

بہار آتے ہی لوٹا خزاں نے باغ ترا
تری ہواؤں نے گل کر دیا چراغ ترا

ان کی نظموں میں ایسا گداز ہے جو خوشگوار متاثر کن ہے۔

"تعزیت" بھی ایک ایسی نظم ہے جسے ایک قابل قدر کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ طرز یہ نظم علامہ کے متنوع ذہانت اور ہمہ گیر مزاجی کا پتہ دیتی ہے۔

نظم "ہم کون ہیں کیا ہیں" طرز فکر، مخصوص تکنیک اور فنکارانہ کمال کی آئینہ دار ہے۔ علامہ مظہری علامہ اقبال کی طرح ہر وقت حرکت و عمل کی تلقین کرتے ہیں۔

علامہ جمیل مظہری کی عشقیہ نظمیں ان کے عشق کے ذاتی تجربے کی عکاسی ہیں۔ عشق ناتمام بھی ایک اچھوتی نظم ہے جو جمیل کے حسرت عشق کی ترجمان ہے۔ گرچہ جمیل

صاحب تکنیک کی پابندیوں کا بہت زیادہ لحاظ نہیں کرتے پھر بھی ان کے نظمیہ کلام میں شعریت بدرجہ انتہا موجود ہے۔ ان کی نظم نگاری تسلسل، ربط اور الفاظ کی شستگی کی وجہ سے اہمیت و انفرادیت کی حامل ہے۔

جمیل مظہری کی نظم نگاری ایک اور زاویے سے منفرد اور مخصوص ہے وہ یہ کہ انھوں نے اپنی نظموں میں خالص ہندوستانی رنگ بھرا ہے۔

جمیل مظہری کی تمام نظمیں ان کی گہری بصیرت، غیر معمولی ذہنی توازن اور فنکارانہ عروج کا پتہ دیتی ہیں۔ اور انہیں بیسویں صدی کے نظم نگاروں میں نمایاں مقام عطا کرتی ہیں۔





مٹھائیاں
اور
ٹافیاں
آر ایس فیکٹری

بہار میں انقلابی قدم سماجیک تحفظ پروگرام سے
۲۲ لاکھ لوگوں کو فائدہ

اس ملک کے پورے صوبوں میں بہار پہلا صوبہ ہے جو اتنے بڑے پیمانے پر بوڑھوں اور اپاہج آدمیوں کو تحفظ اور ان کی مالی امداد کے لئے سماجی تحفظ پروگرام کے تحت بے زمین کھیت مزدور، بوڑھوں، اپاہجوں، بیواؤں اور بندھوا مزدوروں کو ۳۰ روپیہ ماہ کا پنشن دے رہا ہے۔

اس پروگرام کے تحت بے سہارا بیواؤں، اپاہجوں و بندھوا مزدوروں کے علاوہ یہ پنشن ان لوگوں کو بھی دیا جا رہا ہے جو ۶۰ سال سے زیادہ عمر کے ہیں اور جو چھوٹا ناگپور اور سنتھال پرگنہ علاقے میں ڈھائی ایکڑ تک غیر سینچائی زمین اور صوبے کے کسی علاقے میں ایک ایکڑ تک زمین رکھتے ہیں اور جن کی آمدنی ۵۰ روپیہ ہر ماہ سے کم ہے۔

کام میں تیزی لانے کے لئے ۱۵ دسمبر ۱۹۸۰ء سے ۳۱ جنوری ۱۹۸۱ء تک ایک تحریک چلایا گیا، جس کے تحت اب تک ۲۲ لاکھ لوگ اس یوجنا کے تحت پنشن پانے لگے ہیں۔ اس کام کے لئے ایک ڈائرکٹوریٹ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ سنہ ۱۹۸۲-۸۳ء میں اس پروگرام کے لئے ۴۵ کروڑ روپے کا انتظام کیا گیا ہے۔

اب آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ بہار کے سبھی گاؤں اور قصبوں میں سماجیک تحفظ پروگرام کی کرنوں نے روشنی پھیلائی ہے اور لاکھوں لوگوں کے اندھیری زندگی میں روشنی پھیلائی ہے۔

ہم بڑھ رہے ہیں ——— بہتر بہار بنانے

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ بہار پٹنہ

सजसनि - 107 स (कू-70)82-83

بہار میں فصل بیمہ پروگرام لاگو

بہار میں پہلی بار اس سال فصل بیمہ پروگرام لاگو کرکے چھوٹے اور سیمانت کسانوں کو قدرتی دشواریوں جیسے بارش، سوکھا سے راحت دینے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ یہ پروگرام امتحان کی شکل میں اس سال سے لاگو کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس پروگرام کو امداد باہمی ڈیپارٹمنٹ کے ذریعہ سانکھیسی اور مویانکی ڈائرکٹوریٹ اور فنانس ڈائرکٹوریٹ کی مدد سے کیا جائے گا۔ ہر ایک فصل و علاقے کے لئے الگ فصل بیمہ ہوگا۔ علاقے کا انتخاب انڈین سنٹرل انشورنس کارپوریشن کے ذریعہ صوبائی حکومت سے مشورہ کرکے کیا جائے گا۔ جنرل انشورنس کارپوریشن کے فصل بیمہ یوجنا کے تحت صوبائی حکومت ایک مددگار کی شکل میں حصہ لے گی۔ اور پریمیم دوے میں ۲۵ فیصد تک اپنی مدد دے گی۔

اس پروگرام کا فائدہ صرف انہیں چھوٹے اور سیمانت کسانوں کو حاصل ہوگا جنہیں سنٹرل کوآپریٹو بینک اور دوسرے بینکوں سے فصل پر قرض ملے گا۔

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار، پٹنہ

सू ज स नि - 101 स (सू-70)82-83